سچی کہانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں

ماہنامہ
سرگزشت
کراچی

دسمبر 2015

نگران اعلیٰ
معراج رسول

PDFBOOKSFREE.PK

شاعرِ خوش نوا: علامہ جمیل مظہری کی روداد حیات

انقلابی: کمیونسٹوں کی آپسی رسہ کشی کا آئینہ دار ایک بڑے روسی رہنما کا زندگی نامہ

موقع: ایک انوکھی ڈکیتی نے اس کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا، نہایت دلچسپ سچ بیانی



پاکستانی فلمی دنیا سے
ایک نامور اداکار کی داستان



بلند حوصلوں اور بے مثل ولولوں
سے گندھی تہلکہ خیز داستان



ایک انوکھی ڈکیتی
نے اس کی زندگی بدل دی



وہ عشق میں سچی تھی تبھی
تو وہ ٹرین کے نیچے کود گئی



مرد ہی بیوی کا محافظ ہوتا
ہے لیکن وہ ایسا نہ تھا



اس نے دل توڑنے کی
سزا خوب خوب پائی



ڈاکٹر مسیحائی کی
بجائے لوٹنے پر آمادہ تھے



اس نے بروقت
توبہ کا راستہ اختیار کر لیا



وہ اپنی ماں کو اولڈ ہوم
میں داخل کر گئی تھی



اسے اپنے ہی گھر میں رہنے
کی آرزو میں شادی کرنا پڑی



اس نے دھوکے باز کو زندگی
بھر کی سزا دے دی

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 25 ☆ شمارہ 10 ☆ ستمبر 2015ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

ہمارا معاشرہ، خاص کر برصغیر کا، ایک ایسا معاشرہ ہے جس میں ادب آداب کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ بڑے چھوٹے کا ادب ہماری پہچان کہلاتی ہے۔ ہم اپنے بزرگوں، خواہ وہ خونی رشتے دار نہ بھی ہوں لیکن ہم انہیں عزت و تکریم دے کر خوش ہوتے ہیں لیکن اب...... مغربی معاشرے کی مسموم ہوا نے سب کچھ بدلنے کا تہیہ کرلیا ہے اور ہم آنکھیں بند کیے عمیق کھائی کی جانب بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نئے والدین، معاشرے کے نئے ساربان، چھوٹی چھوٹی باتوں کو چھوٹا سمجھ کر نظر انداز کرتے جا رہے ہیں۔ ہمارے وقت میں محلے کا کوئی بچہ غلط روش پر بڑھتا نظر آتا تو اس کی سرزنش کرنا محلے کے بزرگ اپنا حق سمجھتے لیکن آج کوئی کسی کے بچے کو آنکھیں بھی دکھا دے تو اس کے گھر والے قیامت اٹھا دیں۔ یہی وجہ ہے کہ نئی پود بے مہار ہورہی ہے۔ ماں باپ بچوں کے روز نامچے پر، دن بھر کی روٹین پر نظر نہیں رکھتے اور بچے ہر قسم کی حدود و قیود سے آزاد ہوتے جا رہے ہیں۔ گو کہ یہ بہت معمولی سی بات ہے لیکن اس کے اثرات آئندہ نسلوں پر یقیناً پڑیں گے۔ لوگ بچوں کو کھلونا پستول دے کر خوش ہوتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ ان ننھے اذہان پر پستول سے محبت کا اثر بڑھ رہا ہے اور ایک وقت وہ آجاتا ہے جب انہیں اصلی پستول کی چاہت گھیر لیتی ہے۔ اگر کچے ذہنوں کو مسموم کرنے کی روش نہ بدلی تو ایک دن پورا معاشرہ گہری کھائی میں نظر آئے گا۔ بقول سلیم کوثر

تیرے ساتھی تیرے دشمن کی طرف ہوجائیں گے
اس بھرے میلے میں تو بے آسرا رہ جائے گا

معراج رسول

شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789
نمائندہ کراچی محمد صفدان خان 0333-2168391
رانا محمد حمید 0323-2895528
نمائندہ لاہور فرزند علی ہرش 0300-4214400

قیمت فی پرچہ 60 روپے ☆ زرِ سالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

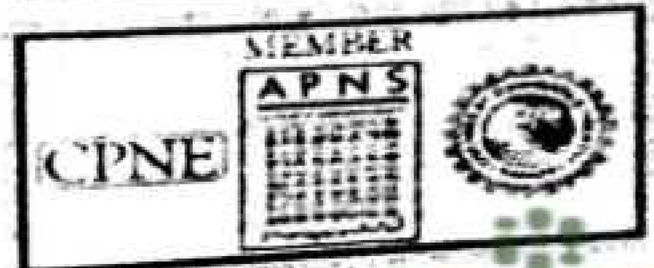
مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com



شہرِ خیال



☆منشی محمد عزیز مئے کی لڈن وہاڑی سے تشریف آوری۔'' اکتوبر کا شمارہ خلافِ توقع 23 ستمبر کو ملا۔ جسے پا کر دل کو خوشگوار حیرت ہوئی۔ آفرین ہے آپ لوگوں کی اس مستعدی پر۔ شاباش، بہت خوب۔ سرورق دیکھ کر میرے ذہن میں یہ گمان پیدا ہوا کہ کچھ ماہ سے سرورق میں منفرد سی تبدیلی آرہی ہے۔ یعنی یہ مختلف خانوں میں بٹا ہوتا ہے۔ سرورق کی حسینہ کی گردن کچھ زیادہ ہی ٹیڑھی ہوگئی ہے۔ ایک طرف طلبہ غالباً رزلٹ کارڈ لینے کے چکر میں اکٹھے کھڑے ہیں۔ سرورق کی تحریر نظام جہالت پڑھ کر سرورق سمجھ میں آگیا کہ محترم اسد اللہ کیا بتانا چاہتے ہیں (سرورق، کہانی پر بنتا ہے)۔ اداریہ میں انکل محترم عوام کو اپنی ذمہ داریاں یاد دلا رہے تھے۔ یک علمی داستان میں خواجہ احمد عباس کے حالاتِ زندگی سے آگاہی ہوئی۔ شہرِ خیال کے صدر محترم شاہد جہانگیر شاہد صاحب نے سرگزشت سے اپنے عشق کی داستان سنا کر میرے سوئے ہوئے ارمانوں کو جگا ڈالا۔ بہت مزہ دیا شاہد جی۔ آپ کی عشقیہ داستان نے۔ کاش کہ آپ اور زیادہ تفصیل سے لکھتے تو ہم مزے لے لے کر پڑھتے۔ عبدالجبار رومی! بھئی وہ بات تو برائے بات تھی۔ آپ یوں تاویل پیش نہ کریں اور خوش رہیں۔ محمد عمران جونانی نے بڑے عرصے بعد دیدار کرایا۔ جی ویلکم بیک۔ گڑیا جی! دیکھ لیں ہماری ساری التجائیں رائیگاں جارہی ہیں کہ اس بارے میں کوئی جواب ہی نہیں مل رہا ہے۔ رضا احمد خان! اللہ تعالیٰ آپ کی والدہ محترمہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور آپ کو یہ صدمہ برداشت کرنے کا حوصلہ عطا فرمائے، آمین۔ لگتا ہے باجی طاہرہ گلزار ناراض ہوگئی ہیں۔ طاہرہ باجی! آپ واپس آجایئے۔ آپ کو کوئی جرمانہ نہیں لگے گا۔ ہاں اگر نہ آئیں تب جرمانہ لگ سکتا ہے او کے؟ سبھی کے خطوط دلچسپ اور بھرپور تھے۔ پرویز بھائی! پلیز غیر حاضر ساتھیوں کا کوئی اتا پتا لگائیں۔ محترمہ شبانہ حنیف بھی کافی دنوں سے غیر حاضر ہیں۔ رانا محمد شاہد، رانا محمد سجاد، وحید ریاست بھٹی، احسان سحر، ایم اے خالق بھٹی کے علاوہ قرۃ العین زینب، ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری اور دیگر غیر حاضر ساتھیوں! اتنی لمبی جدائی اچھی نہیں ہوتی۔ یارو! اپنے ہونے کا کوئی اتا پتا تو دے جاؤ۔ ''محسن الملک'' ڈاکٹر صاحب کا ایک اور شاہکار تھا۔ ''کراچی کراچی'' بھی بہت معلوماتی تھی۔ یقیناً ہمیں اپنے تاریخی مقامات کے بارے میں مکمل آگاہی ہونی چاہیے۔ پشاور اور دیگر شہروں پر بھی کوئی معلوماتی مضمون شائع کریں۔ ''سنکی'' پڑھتے ہوئے اپنی ہنسی پر قابو نہیں پا سکا۔ بادشاہوں اور ملکاؤں کی عجیب وغریب عادتوں کے بارے میں پڑھ کر۔ عجیب شخص کے عنوان سے انور فرہاد صاحب، اسلم ڈار کی صلاحیتیں بیان کر رہے تھے۔ ''کالا چھپرا'' پڑھ کر وہ مشہور مصرع ذہن میں گونج اٹھا۔ حسرت ان غنچوں پہ ہے۔ ''چالاک چیتا'' نے تورات کی تاریکی میں دل دہلا دیا (پڑھتے ہوئے لائٹ جو چلی گئی تھی)۔ ''نیند اور خواب'' بھی زبردست مضمون تھا۔ خصوصاً اشعار نے بہت مزہ دیا۔ اکتوبر کی شخصیات بھی معلومات سے بھرپور مضمون ہے۔ بہت خوب محمد ایاز راہی صاحب۔ زمانۂ قدیم کی شاعرات پر بہت خوب مضمون لکھا ہے آپ نے۔ ''تاریخِ عالم'' اس بار مختصر سا ہے۔ ''جرم کی کھیتی'' میں ناصر بال بال بچ گیا اور جلال خان جعلی نوٹ کی وجہ سے اپنے ہی بچھائے ہوئے جال میں پھنس گیا۔ سب کچھ میں اگر طارق جمیل راہِ راست پر آگیا ہے تو اس کے لیے اسے بوڑھے سے پہلے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر فراز آفریدی کی ''آخر کیوں'' نے رنجیدہ کر دیا۔ ''تہی دامن'' میں ثمینا اپنے شوہر کی بے رحمی کا شکار ہوئی۔ زمین کے لیے میری نظر میں اس ماہ کی بہترین سچ بیانی تھی جس کا انجام خوشگوار تھا۔ شیخ صاحب اور خان صاحب کی دوستی تھی۔ بہت خوب تھی اور پھر دشمنی بھی کمال کی چیز تھی۔ زمین کے لیے ان لوگوں نے کیا کیا قربانیاں نہیں دیں اور ہم؟''

☆ ذیشان ریاض فیصل آباد سے لکھتے ہیں۔ ''میرا نام ذیشان ریاض ہے۔ یارن کا کام کرتا ہوں۔ اگست کے شمارے میں کنول چنا صاحبہ کی اسٹوری ''میں برہمن'' شائع ہوئی ہے۔ پڑھی بہت اچھی لگی ان کا سیل نمبر اگر مل سکے تو ممنون ہوں گا۔ ان سے پوچھ کر مجھے ایس ایم ایس پر مطلع کریں یا خط لکھ دیں۔ میں منتظر ہوں۔ (ادارہ کسی بھی مصنف کا خاص کر لکھنے والیوں کا پتا نہیں دیتا)۔''

☆ قیصر عباس خان کا نامۂ خلوص بھکر سے۔ ''اداریہ میں بہت اہم مسئلے پر توجہ مبذول کرائی ہے انکل نے۔ ایسا قانون جلد از جلد لایا جائے۔ تمام کالم نگار، اخبار ایڈیٹر، نیوز اینکر وغیرہ اس قانون کے حق میں رائے دیں۔ پروگرام میں وزیرِ تعلیم کو بلائیں تاکہ سرکاری اسکولوں کی بہتری ہو بہت مسائل ہیں، اساتذہ نہیں آتے۔ طلباء کی تعداد زیادہ ہے بلڈنگ کی صفائی پانی وغیرہ۔ تعلیم پر واقعی توجہ کم ہے حکومت کی۔ کیونکہ سیکورٹی پوزیشن بہت کمزور ہے۔ ضرب عضب آپریشن کی وجہ سے بہت بہتری آئی ہے اللہ پاک کرم کرے گا۔ اب آتے ہیں شہرِ خیال کی طرف۔ سب دوست حاضر تھے اچھے تبصروں کے ساتھ۔ خوشی ہوئی پڑھ کر کچھ لوگ غیر حاضر تھے اللہ ان کو خیریت سے رکھے، آمین۔ خالد محمود ملتان سے بہت ہی سخت تبصرہ کے ساتھ حاضر تھے۔ خالد صاحب آپ کا انداز بہت جارحانہ ہے۔ بہت سے قارئین نہیں جانتے تھے کہ لارڈ کلائیو کون تھا، ان کے واسطے بہتر معلومات تھی۔ آپ کو جواب مل گیا ناں؟ باقی ہم بے جا تعریف نہیں کرتے یہاں ہم خاندان جیسی حالت میں ہیں اس لیے سب ایک دوسرے کو اہمیت دیتے ہیں۔ آپ اصلاحی خط کے ساتھ آتے رہا کریں۔ آپ کی غدار والی بات اچھی نہیں لگی۔ کسی کے عیبوں کو کیوں منظرِ عام پر لایا جائے، کوئی بہتری نہیں ہوگی۔ نئی پود کو خطرہ غداروں سے زیادہ اپنوں سے ہے جو وطن عزیز اور معاشرے توجہ نہیں دے رہے موبائل، فیس بک، واٹس اپ، کیبل اور ڈش پر صرف وہ ڈرامے جس میں محبت جدائی، قتل، ماں باپ کی نافرمانی وغیرہ دکھائی جارہی ہے۔ اس کے خلاف ہیں ہم۔ اس کی بجائے معاشرے کی تعمیر کا پیغام عام کرنا چاہیے۔ اس کو لبرل روشن خیالی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ایک اور ادبی شخصیت ہمارے درمیان موجود ہے ان کی مہربانی کہ انہوں نے رائے دی کیوں کہ ادبی لوگ بہت مصروف ہوتے ہیں۔ نثار احمد گورگیج لاڑکانہ صاحب آپ کی رائے بہت پسند آئی آتے رہا کریں۔''

☆ اویس شیخ نے ٹوبہ ٹیک سنگھ سے لکھا ہے۔ ''سرگزشت کے تمام قارئین کو میرا اسلام، اس بار تبصرے کے لیے بالکل وقت نہیں بچا۔ انکل پچھلی بار کیا ہوا تھا؟ اگست کے شمارے سے میرا تبصرہ غائب تھا۔ اتنی محنت سے وقت نکال کر تبصرہ لکھتا ہوں۔ (پرچہ پریس جانے کے بعد خط پہنچا تھا)۔''

☆ منظر علی خان کا لاہور سے تبصرہ۔ ''ہم آپ کے ساتھ متفق ہیں کہ یکساں نظام تعلیم اور اردو زبان کا نفاذ ہماری معاشرتی ضرورت اور قومی تقاضوں کو پورا کرنے بلکہ قوم کو قوم بنانے کے لیے ناگزیر ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کا پست ترین نظام انسان اور انسانیت کی توہین اور تذلیل ہے۔ ''احسن الکلام'' کے عنوان سے جناب احسن مارہروی کی زندگی کا خاکہ اردو زبان اور ادب کے کئی پہلوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹے تھا۔ ''منی نہیں گیتا'' کے عنوان سے ایک بچی کے خاندان سے بچھڑنے کا معاملہ اخبارات اور عدلیہ میں بھی زیرِ بحث ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس معاشرے میں انسان بستے ہیں یا متعصب کٹھور لوگ خدا خیر کرے۔ (ایک خوشی کی خبر یہ ہے کہ گیتا کو اس کے گھر والے مل گئے۔ انہوں نے اپنی تصویر بھارتی ہائی کمشنر کے معرفت بھیجی تھی جسے گیتا نے پہچان کر ہر شخص جو اس تصویر میں ہے اس کی شناخت بتا دی۔ اب بہت جلد وہ اپنوں کے درمیان ہوگی) شکاریات کے سلسلے میں ''آدم خور'' بہت دلچسپ تھا۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ شخصیات کی تفصیل بہت پسند آئی۔ منظر امام صاحب کی تاریخ عالم علم کا ذخیرہ ہے۔ بہت سی تفصیلات درکار ہیں۔ تشنگی برقرار رہتی ہے۔ ''طوفانِ نوح'' کو چھ ہزار سال گزرے غالباً کوفہ میں وہ تنور اب بھی محفوظ ہے جہاں سے پانی ابلا تھا۔ کوہ جودی سے کشتی کی دریافت۔ اس قسم کے بہت سے موضوعات ہیں جن کو دلچسپ انداز میں تحریر کرکے دلکشی کو مزید بڑھایا جاسکتا ہے مگر صرف علمی انداز اختیار کرنے سے بھی افادیت کم نہیں ہوگی ہے۔ قلم نگری میں ''مولا جٹ'' کے عنوان سے مکالمہ تحریر کی روانی اور دلکشی کو کم کرتا ہے زیادہ نہیں۔ سفرِ امریکا، شاعر کوئی اور ہے اچھا لگا۔ ''سراب'' ایک نئے موڑ پر لاکر تجسس میں اضافہ کرتا ہے۔''

☆ فدا الرحمٰن عباسی نے سکھر سے لکھا ہے۔ ''سرگزشت ایک اچھا اور معیاری رسالہ ہے جس میں ہمیں بہت اچھی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ابن کبیر ایک اچھے رائٹر ہیں ہر رائٹرز کو چاہیے کہ اچھی سے اچھی کہانیاں لکھیں اور سچی کہانیاں بڑھائیں۔''

☆ سیف اللہ کی آمد ملک وال سے۔ ”بشریٰ افضل صاحبہ نے مبارک باد دی ان کا شکریہ۔ اس سے پتا چلا ہے کہ سرگزشت کا قاری پرچہ بڑی باریک بینی سے پڑھتا ہے اور جس پرچے کے قاری مجھ جیسے نئے اور عام آدمی کو دل میں جگہ دیں میں ان کا شکریہ ادا نہ کروں تو اور کیا کروں۔ اللہ آپ کے اس پرچے کو مزید بلندیوں پر لے جائے، آمین۔ سلمیٰ اعوان صاحبہ کی تحریر ”کیلاش“ کہانی پڑھ کر مجبور ہو گیا ہوں خط لکھنے پر۔ کمال کی تحریر ہے۔ یقیناً تمام پڑھنے والوں کو پسند آئے گی۔ یقیناً بہت زیادہ مبارک باد کی مستحق ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ انہیں ایسی تحریر لکھتے رہنے کی توفیق دے، آمین۔“

☆ نثار احمد کی گوٹھ گورگیج ضلع لاڑکانہ سے آمد۔ ”اُمید ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بخیریت ہوں گے، آمین۔ گزارش ہے کہ ماہنامہ سرگزشت کا ستمبر کا شمارہ ہاتھ میں ہے۔ مذکورہ ڈائجسٹ میں اپنا خط دیکھ کر خوشی کا احساس ہوا۔ سرگزشت میں خط کا شائع ہونا بھی اعزاز کی بات ہے۔ ڈائجسٹ کو پڑھنا شروع کیا۔ پہلے کی طرح بہت دلچسپ کہانیوں کا انتخاب تھا لیکن جب میں عزت مآب ابن کبیر کی تحریر ”خدمت گار“ پڑھنے لگا تو مجھے بہت عجیب لگا کیونکہ میں جس گاؤں سے تعلق رکھتا ہوں مجھے بھی وہ کوئی بنگلہ دیش کا کیمپ محسوس ہوا۔ میں اپنے گاؤں کی حالت الگ کاغذ پر تحریر کر رہا ہوں اگر آپ نے سرگزشت کے کسی کونے میں اس کو جگہ دی تو میں سمجھوں گا کہ آپ نے انسانیت کا حق ادا کر دیا۔ جس طرح محمد اسماعیل کی تحریر کسی طرح عزت مآب انوار اللہ خان صاحب کی آنکھ تک پہنچی تو بنگلہ دیش میں محصور بہاریوں کی زندگیاں تبدیل ہو گئیں اسی طرح مجھے بھی یہ خیال آگیا کہ اپنے گاؤں کی حالت تحریر کر کے سرگزشت میں بھیجوں جو کہ ایک انٹرنیشنل ڈائجسٹ ہے۔ ہو سکتا ہے یہ تحریر پڑھ کر کوئی اس گاؤں کے باسیوں کے لیے بھی سوچا جائے۔ جناب انوار اللہ صاحب کی طرح جناب ایڈیٹر! میں اپنی بات کی تصدیق اور زمینداری کے لیے این آئی سی کی ایک کاپی بھی آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔ بس آپ سے التجا ہے کہ سرگزشت میں ہماری یہ تحریر شائع کریں، زندگی بھر ہم آپ کے احسان مند رہیں گے (آپ کی تحریر نامکمل ہے، مزید تفصیلات ارسال کریں)۔“

☆ محمد عمران جونانی کا مکتوب کراچی سے۔ ”اکتوبر کا شمارہ آپ کے حسن انتظام کے تحت سرعت کے ساتھ عید سے کافی پہلے مارکیٹ میں آگیا اور عید کا بہترین تحفہ ثابت ہوا۔ شہر خیال کی صدارت شاہد جہانگیر کے حصے میں آئی۔ عمدہ تحریر ہے۔ ذاتیات کے بجائے تبصروں پر لکھنے کا مشورہ اچھا ہے۔ محمد اشفاق کی طرز تحریر عجیب سی لگی۔ رضا احمد خان! میرے بھائی زندگی آزمائش کا دوسرا نام ہے۔ ہمت رکھو۔ طاہرہ گلزار غائب ہیں یہ مناسب نہیں (خط لگ نہیں سکا تھا)۔ رومی انصاری، منشی ایم عزیز اور سدرہ بانو نے بھرپور تبصرہ کیا۔ خوب صورت تحریروں کا حق ادا کرتے ہیں یہ لوگ اس کے علاوہ اعجاز سحار، انور عباس، نجمی یو ایس اے، بشریٰ افضل، فلک شیر، مجید امجد ناصر حسین اور انجم فاروق کے نامے بھی پسند آئے۔ عبداللہ احمد حسن نے ہمارے خوب صورت شہر کے چیدہ چیدہ مقامات کی سیر کروائی۔ ویسے تو یہ شہر اتنا وسیع کہ عرصۂ دراز سے یہاں مقیم حضرات بھی اس کے چپے چپے سے واقف ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے لیکن انہوں نے جتنا دیکھا خوب صورتی سے بیان کیا۔ کراچی کی سنہری ٹھنڈی شامیں، صدر ایریا کے ایرانی ہوٹل، کھارادر، رنچھوڑ لائن کی بیٹھکیں 150/200 سال پرانی مساجد......! یہ سب چیزیں کراچی نامی پیاز کی پرتیں ہیں جن کا تذکرہ ہر بار نیا مزہ دیتا ہے۔ پہلے ساہیوال اب کراچی اگر یہ شہر ناموں کا سلسلہ چلتا رہے تو کیا کہنے۔ ”سنگی“ نامی مختصر مضمون میں سنک میں مبتلا حکمران کا احوال ہے۔ ویسے آج کے دور میں جتنے بھی حکمران ہیں وہ حب جاہ کے اعتبار سے سنکی ہی لگتے ہیں ورنہ ایسا جان جوکھوں کا کام چار دن کی زندگی میں صحیح العقل انسان تو نہیں کر سکتا۔ ”عجب شخص“ میں الانور فرہاد کا طرز تحریر پہلے کی نسبت بہتر لگا۔ کراچی اولڈ سٹی کے فلیٹوں کے جنگل میں رہائش پذیر بندہ کے لیے ایسا تذکرہ جنت کہانی کی طرح ہے۔ ”چالاک چیتا“ نے دوران مطالعہ اے آر راجپوت کے طرز تحریر کی بدولت ایک لمحہ کے لیے دھیان بھٹکنے نہ دیا۔ واقعی جواب نہیں۔ آگے چلیں تو میرے عزیز لکھاری امین بھایانی اور کشمالہ حسن نے کیا خوب صورت مضمون لکھا ہے۔ دل خوش کر دیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے معلومات کا بیش بہا سمندر بہتی لہروں کی صورت دل میں داخل ہو رہا ہے۔ امین بھائی تحریروں کے درمیان وقفہ کم کریں۔ صائمہ اقبال اس ماہ بھی اپنے قلم کا بھرم رکھنے میں کامیاب رہیں۔ اتفاق سے سیاسی اور میڈیا سے متعلق لوگوں کا ذکر زیادہ ہے۔ مختصر و جامع تذکرہ دلچسپی کا باعث ہے۔ ایاز الٰہی کی تحریر میں صرف تین شاعرات کا ذکر ہے جب کہ یہ موضوع کافی وسعت رکھتا ہے۔“

☆ فیض الحسن کا خط کوٹ ادو سے۔ ”اکتوبر کا شمارہ 28 ستمبر کو ملا۔ انکل معراج کی باتیں پڑھ کر محفلِ دوستاں میں جھانکا۔ شاہد جہانگیر اپنی آپ بیتی کے ساتھ کرسیٔ صدارت پر جلوہ افروز تھے۔ واہ جی واہ مبارکاں۔ باقی دوستوں میں احمد خان توحیدی، باجی بشریٰ افضل، منشی محمد عزیز مئے اور انجم فاروق ساحلی کا تبصرہ جاندار بلکہ شاندار تھا۔ اپنا خط اور شعر نہ پا کر دکھ ہوا۔ اکتوبر کی شخصیات میں جلال الدین محمد اکبر، صدر غلام اسحاق خان، اداکار بدر منیر، جاوید شیخ اور فیصل قریشی، صحافی حمید نظامی سے تعارف اچھا رہا۔ فیصل،

سعدیہ اور اب محمد اشفاق (سرائے عالمگیر) کے بارے میں پتا چلا کہ ان کے والدین بہن بھائیوں نے ان کی ہنستی مسکراتی زندگی میں زہر گھول رکھا ہے۔ ماں کو خدا کا روپ کہا جاتا ہے۔ جنت جیسی عظیم چیز ماں کے قدموں تلے ہو پھر اگر یہی ماں ناگن بن جائے تو زندگی واقعی جہنم بن جاتی ہے۔ مجھے ماں جی، ہاں حقیقی ماں نے گھر سے نکال دیا ہے اور میں اس وقت دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پر مجبور ہوں اگر عورت میں ممتا مر جائے تو اس کو ڈائن کہتے ہیں۔ منظر امام صاحب حسب سابق چھائے رہے۔ ''بیت بازی'' میں بی اے ریحان، ہادیہ ایمان ماہا ایمان، خرم علی راؤ کے اشعار پسند آئے۔ سچ بیانیوں میں جہالت سبق آموز تحریر تھی۔ ہم سب کا حق بنتا ہے کہ اصلاح معاشرہ کے لیے مل جل کر کوشش کریں تاکہ پھر کسی ٹیچر کے پلاٹ پر قبضہ نہ ہو۔ ''تہی دامن'' اچھی کاوش تھی۔ ''زمین کے لیے'' پڑھ کر آنکھیں بھیگ گئیں۔ خان صاحب نے زمین کا سودا نہیں کیا بلکہ ایثار و قربانی کی وہ داستان رقم کر گیا کہ شاید ہی کوئی ایسا کر سکے۔ ''جان لیوا'' اور ''انجام'' نے متاثر کیا۔ شکاریات کا سلسلہ بھی خوب جارہا ہے۔ ''سراب'' ہر کسی کو سراب کرتا کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔ اس سلسلے کو جاری رکھا جائے۔''

☆ سید انور عباس شاہ نے بھکر سے لکھا ہے۔ ''اس دفعہ اپنے صحیح وقت پر سرگزشت تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند ہماری گود میں آگرا۔ شاہد جہانگیر شاہد اپنے خوب صورت اور بھرپور تبصرے کے ساتھ کرسیٔ صدارت کی زینت بنے جناب بہت بہت مبارک ہو۔ احمد خان تو حیدی کی سچی اور کھری باتیں پڑھنے کو ملیں۔ اس کے علاوہ اعجاز حسین ستار، کے جی رحمان، سدرہ بانو ناگوری اور مجید احمد جائی کے تبصرے بھی خوب تھے۔ رضا احمد خان کی والدہ کے لیے ہم صدق دل سے دعاگو ہیں کہ خداوند کریم ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔ اب ہمیں یہ یقین ہو چلا ہے کہ ہماری ہر دلعزیز بہن طاہرہ گلزار ناراض ہو گئی ہیں کیونکہ وہ نظر نہیں آرہیں۔ ان سے گزارش ہے کہ وہ ناراضگی ختم کریں وہ آئیں اور ضمیر خیال کی محفل کی رونق کو دوبالا کریں۔ اس کے علاوہ رانا محمد سجاد اور قیصر عباس جیسے خوب صورت لوگ بھی محفل میں شامل نہ تھے جس کی کمی ہم نے شدت سے محسوس کی، محفل کو خوشگوار بنانے والی ان عظیم ہستیوں سے بھی گزارش ہے کہ وہ اپنی خیریت سے ضرور مطلع فرمائیں۔ جان لیوا ایک عبرت ناک تحریر تھی میرے خیال میں تو اس ساری صورت حال کا اصل ذمہ دار وسیم ٹھہرتا ہے جو کہ بے حد خود غرض اور سفاک ترین انسان تھا ایسے انسان سے اللہ ہر بہن بھائی کو محفوظ رکھے، آمین۔ ''سب کچھ'' ایک دل دکھا دینے والی تحریر تھی۔ وکیل صاحب نے لکھا ہے کہ بہت کچھ ہو گیا ہے۔ میرے ساتھ تو جناب آپ کے ساتھ تو فی الحال کچھ نہیں ہوا کیونکہ ابھی خدا کے حضور کچھ ہونا باقی ہے چاہے جیسا بھی ہو ہم تو چاہتے ہیں اللہ تعالیٰ آپ کے گناہ معاف فرمائے۔ ''آخر کیوں'' بھی ایک بے حد دکھی تحریر تھی۔ واقعی دنیا میں بعض انسان دکھ اور مصائب لے کر ہی پیدا ہوتے ہیں اور تمام زندگی دکھوں، مصیبتوں، بیماریوں کا سامنا کرتے کرتے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ بہر حال خدا کے بھید خدا ہی جانتا ہے ضروری نہیں ہے کہ خداوند کریم کا ہر راز انسان کی سمجھ میں آجائے۔ علاوہ ازیں ساتھ ہی ساتھ اس تحریر میں محکمۂ پولیس کی ہٹ دھرمی ناقص کارکردگی اور نااہلی بھی معلوم ہوئی جس کا علم عوام کو پہلے ہی سے ہے۔ ہمارے پیارے پاکستان کے دو محکمے واپڈا اور پولیس ایسے ہیں جو کبھی نہیں سدھریں گے چاہے کچھ بھی ہو جائے۔''

☆ ناصر حسین رند کا خلوص نامہ بہاولپور سے۔ ''آپ کے اظہاریہ میں پاک فوج کی تعریف، قابلِ تعریف عمل ہے۔ جنرل راحیل شریف نے واقعی دہشت گردوں کو نیست و نابود کر کے عوام کے دل میں اپنا ایک مقام بنا لیا ہے۔ ''کراچی کراچی'' واقعی ایک خاص تحفہ تھا۔ اگر آئندہ... جونا گڑھ کے نواب محمد جہانگیر خانجی کا انٹرویو اور جونا گڑھ کی تحریر بھی ساتھ شائع کر دیں تو ہم انتہائی شکر گزار ہوں گے۔ (آپ کی فرمائش نوٹ کرلی)۔ ''چالاک چیتا'' مزے لے کر پڑھی۔ اے آر راجپوت نے اچھی تحریر لکھی۔ ''نیند اور خواب'' نہایت باریک بینی سے لکھی گئی اور نہ جانے اس تحریر کو لکھے جانے پر کتنی کتابوں سے استفادہ حاصل کیا گیا ہوگا۔ یہ تحریر کس کی لکھی گئی تھی۔ امین بھایانی یا کشمالہ حسن کیونکہ اس تحریر پر دو رائٹروں کا نام تھا (دو تحریروں کو ملایا گیا ہے)۔ شاعرات میں ایران کی حسن و جمال میں اپنی مثال آپ عظیم شاعرہ قرۃ العین طاہرہ کی مکمل سرگزشت بھی کبھی شائع کر دیں (فروری 1999ء میں مکمل سرگزشت چھپی تھی)۔ قلوپطرہ کی طرح اس کے حسن کے چرچے بکھرے پڑے ہیں۔ غالباً موجودہ وقت کی ملکہ حسن ایشوریا رائے کی طرح ہو گی۔ جب وہ 16 سال کی عمر میں مس ورلڈ بنی تھی۔ محمد ایاز راہی ویل ڈن۔ سچ بیانیوں میں نظام جہالت میں اپنے ایک شاگرد کو حقیر سمجھنے والے استاد کو حیران کر گیا۔ ''جان لیوا'' میں سے اپنی طرف مائل کرنے والی لڑکی نے ڈھونگ رچا کر اپنا مستقبل تباہ کر ڈالا۔ ''انجام'' ایک کم عقل عورت نے اپنا بھرا پرا گھر تباہ کر ڈالا۔ ضمیر خیال میں شاہد جہانگیر شاہد کی آپ بیتی پڑھی اچھی لگی۔ احمد خان توحیدی، اعجاز حسین ستار اور عمران جونانی طویل غیر حاضری کے بعد نظر آئے۔ بشریٰ افضل بھی حاضر تھیں۔ سدرہ بانو ناگوری، عزیز مئے کی طرح ہماری سلور جوبلی نمبر کی تجویز کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھیں۔ اگر جنوری تک شائع کر دیں ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ محمد اشفاق بالکل درست

کہہ رہے تھے کہ خرم علی راؤ کو بلیک لسٹ کردیں۔ انجم فاروق ساحلی کا ''خطرہ'' ہو یا سرگزشت میں کوئی اور تحریر سب دل کو بھلی لگتی ہے۔ ہر مہینے کی مناسبت سے سرگزشت میں تحریر دیا کریں۔ محرم الحرام کے مہینے میں ذکرِ کربلا اور ربیع الاول کے مہینے میں ذکرِ حب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تحریر اگست میں وطن کی محبت کی تحریر اور ہر ستمبر میں ایک نشانِ حیدر پانے والے شہدا کی تحریر خصوصی طور پر شامل کریں۔ شہرِ خیال کی ساتھی روبینہ نفیس انصاری اپنے شوہر کی بیماری کی وجہ سے پریشان تھیں اللہ خیر کرے۔ کافی مہینوں سے کم ہیں۔ اطلاع کریں۔ رانا شاہد ہر مہینے نظر آتے تھے۔ اب اپنی والدہ کی جدائی کے بعد اور گھریلو پریشانیاں کی وجہ سے نظر آنا کم ہو گئے اللہ تعالیٰ انہیں سدا خوش رکھیں۔'' آمین

☆ ندیم اقبال کا ای میل امریکا سے۔ ''میں پچھلے سترہ سال سے نارتھ امریکا میں مقیم ہوں۔ یہ کہنا کہ مجھے سرگزشت بہت پسند ہے اور یہاں بھی ہر ماہ ہمارے گھر میں آتا ہے۔ تو یہ آپ کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہوگی۔ امریکا آنے سے پہلے مجھے سفر کرنے کا شوق رہا ہے۔ پاکستان میں، میں مستنصر حسین تارڑ صاحب کے ساتھ شمال کا سفر کر چکا ہوں۔ میں ملک سے باہر اس لیے نکلا تھا کہ دنیا دیکھوں۔ مرحوم آفاقی صاحب کے سفرنامے پڑھ کر میں اپنے آپ کو وہیں موجود پاتا ہوں جہاں آفاقی صاحب ہوتے ہیں۔ اسی مشاہدے کے شوق میں، میں کافی دنیا گھوم چکا اور لوگوں سے ملنا، ان کا تمدن دیکھنا، ان کی زندگی کا مشاہدہ کرنا میرا شوق ہے اور فوٹو گرافی میری کمزوری ہے۔ میں امریکا آنے سے پہلے نانگا پربت کے بیس کیمپ گیا تھا تو اپنا پہلا سفرنامہ لکھا۔ آج کل دوبارہ سے اس کی نوک پلک درست کر رہا ہوں۔ کچھ صحافی دوستوں کو دکھایا تو انہیں اچھا لگا۔ شاید وہ دوستی میں میرا دل رکھ رہے ہوں؟ اگر آپ کو چند صفحات بھیجوں اور آپ کو اچھے لگیں تو کیا آپ اس کو سرگزشت میں چھاپ سکتے ہیں۔ میں دوبارہ کہتا ہوں کہ اگر اس میں کچھ مواد ہو تو چھاپیے گا۔ اس طرح مجھے اپنی صلاحیت کے ہونے یا نہ ہونے کا پتا بھی چل جائے گا۔ مہربانی فرما کر جواب ضرور دیجیے گا میں انتظار کروں گا اگر ہو سکے تو فون نمبر بھی بھیج دیجیے گا۔ بہت شکریہ۔ (آپ سفرنامہ ارسال کردیں)۔''

☆ معین الدین اختر رحیم یار خان سے لکھتے ہیں۔ ''میں سرگزشت کا دیرینہ قاری ہوں اور جب سے سرگزشت سے ناطہ جڑا دیگر تمام ڈائجسٹ کو چھوڑ دیا۔ دراصل آپ نے سرگزشت کو متنوع پھولوں کا گلدستہ بنا دیا ہے کہ اس میں ہر رنگ کے پھول ہیں۔ سرگزشت کا پہلا صفحہ ہر بار ایک مکمل اور جامع تعارف کرواتا ہے۔ اس سے بعض اردو ادب کے چھپے ہوئے ہیروں کی پہچان بھی ہو جاتی ہے۔ شہرِ خیال قارئین کا یقیناً پسندیدہ حصہ ہے کہ ہر ایک اپنی بساط کے مطابق اظہار خیال کرتا ہے۔ شہرِ خیال کے بعد پہلی سرگزشت سے ہم نے ایسی ایسی شخصیات کے زندگی کے اوراق پڑھے جو شاید کہیں اور ممکن نہ تھے۔ علاوہ ازیں بعض شخصیات کا نام روزمرہ سنا جاتا تھا لیکن حالاتِ زندگی معلوم نہ تھے۔ سرگزشت نے اسے آسان کر دیا۔ سرگزشت نے رواں ماہ میں پیدا یا وفات پانے والوں کی مختصر حالاتِ زندگی سے انتہائی معلومات مہیا کی ہے۔ اردو ادب ہو یا غیر ملکی ادب اکثر کے قصے ہماری معلومات میں اضافے کا باعث ہیں۔ اللہ تعالیٰ علی سفیان آفاقی صاحب کی مغفرت فرمائے کہ انہوں نے ''فلمی الف لیلہ'' سے ہم جیسے قاریوں کو فلمی دنیا اور ادبی دنیا دونوں کے اندر کی باتیں بتائیں اور کئی گوشے بے نقاب کیے۔ اس ماہ سالگرہ کے دن کے عنوان سے انتہائی معلوماتی مضمون شائع کیا۔ آپ نے شمشاد بیگم کے حالاتِ زندگی اور فہرست گانوں کی شائع کر کے چار چاند لگا دیا تھا۔ سلسلہ وار ''سراب'' کا کیا کہنا۔ سرگزشت آتے ہی سب سے پہلے سراب کو پڑھا جاتا ہے اور یہ میں نہیں گھر کا ہر فرد ایسے ہی آغاز کرتا ہے۔ یعنی سب سے پہلے سراب۔ بیت بازی کا سلسلہ بہت خوب ہے اور یک مخفی شخصیت قارئین کو دعوت فکر و جستجو دیتی ہیں کہ شخصیت تلاش کرنے کے لیے جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ آخر میں شائع ہونے والی سچ بیانیاں میرا پسندیدہ حصہ ہے کہ اس میں متنوع قسم کی معلومات بھی میسر آجاتی ہے اور نصیحت بھی حاصل ہوتی ہے۔ بیرونی اندرونی دشمن دوست ظاہر ہوتے ہیں یعنی پانے والے کو بہت کچھ مل جاتا ہے۔ آخر میں سرگزشت کی تمام ٹیم کے لیے دعاگو ہوں کہ ہم جیسے قاریوں کو ایک ہی رسالے میں اتنا ڈھیر سارا مواد مہیا کیا جاتا ہے کہ ہمیں مزید کی چاہ نہیں رہتی۔''

☆ طاہر الدین بیگ کا اظہاریہ۔ ''شاہد جہانگیر شاہد بڑا خوب صورت تبصرہ لے کر آئے اور اول نمبر حاصل کیا ویلڈن تبصرہ تو محترمہ سدرہ ناگوری صاحبہ کا بھی زبردست رہا تو حیدی صاحب بھی اچھے رہے۔ اکتوبر کی شخصیات صائمہ اقبال نے بڑا معلوماتی ذخیرہ سرگزشت کے صفحات پر بکھیر دیا۔ یادگار اور شاندار معلوماتی تحریر ہے مگر ذرا سا گڑبڑ ہو گئی اب یہ سرگزشت کی غلطی ہے کہ سید کمال 29 اپریل کو پیدا ہوئے تو اکتوبر کی شخصیات میں کہاں سے آگئے (انتقال یکم اکتوبر 2009ء کو ہوا تھا یہ بات بھی مضمون میں مذکور ہے)۔ ''تاریخ عالم'' اور ''نیند اور خواب'' بھی دلچسپ اور معلوماتی تحریریں تھیں مگر جناب ''الو کھا گھر'' کا جواب نہیں ہے کہ کہاں کہاں سے دلچسپ اور معلوماتی تحریریں تلاش کر کے سرگزشت میں شامل ہوتی ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک۔ ''کالا چھپرا'' کو ہی لے لیں۔ شاندار تحریریں تھیں۔ کس کس کا ذکر کریں۔ ویلڈن سرگزشت ویلڈن۔ انور فرہاد صاحب نے اسلم ڈار پر خوب لکھا۔ آپ کافی پرانے لکھنے

والے ہیں اور خوب لکھتے ہیں اچھا ہو کہ دادا جان اور چاچا جان کے حصار سے نکل آئے۔ کراچی کی مختصر تحریر پڑھیے اور اس کراچی کو یاد کیجیے جب ٹرام چلتی تھیں اور رشدی مرحوم نے کیا خوب گایا تھا۔ بندر روڈ سے کیماڑی میری چلی ہے گھوڑا گاڑی۔ آپ بیتیوں کی طرف آتے ہیں سب کچھ، جان لیوا اور جرم کی کہانی سبق آموز ہیں۔''

☆ طاہرہ گلزار کی آمد پشاور سے۔''اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کے صدقے ہم سب کی بیماریاں اور مشکلات ختم کردے۔ ہمیں خوشیاں اور کامرانیاں عطا کرے۔ ہمارے ملک کو اندرونی اور بیرونی سازشوں سے اپنے امان میں رکھے۔ آمین۔ دوستوں آپ سب نے خوب خوب گوشت کھایا ہوگا اور ساتھ میں غریب غربا کو بھی خوب دیا ہوگا کیونکہ قربانی تو غریب غربا کی خاطر ہی کی جاتی ہے اور اللہ وہی قربانی منظور کرتا ہے جو غریب غربا اور ان رشتہ داروں میں تقسیم کیا ہو جو مستحق ہوتے ہیں۔ یہ اس عظیم قربانی جو حضرت اسماعیل علیہ السلام نے دی تھی تا قیامت یہ ان کی یاد میں کی جائے گی۔ قربانی کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں سے جانور کو کلمہ پڑھ کے ذبح کیا جائے اور بعد میں گوشت کے تین حصے کیے جائیں۔ ایک حصہ اپنے لیے، ایک حصہ غریبوں اور نادار رشتے داروں کے لیے ہے جنھوں نے قربانی نہیں کی۔ فریجوں کو بھرنے کے لیے قربانی نہیں کی جاتی۔ کیا ہم اللہ کے کرم سے سال کے بارہ مہینے نہیں کھاتے۔ ہمارے ملک میں ایک اور بہت بری اور بے حسی کا عمل کیا جاتا ہے پہلے لوگ سنت ابراہیمی کو پورا کرنے ثواب کی خاطر جانور قربان یعنی ذبح کرتے تھے لیکن اب یہ ایک مکمل نفع بخش بزنس بن گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں پر اور خاص کر ہم پاکستانیوں پر اپنی رحمتوں کی بارش ہمیشہ جاری رکھے۔ آمین۔ 22 ستمبر کو میرے عزیز دوست رضوان سلطان تنولی نے بتایا کہ میرے شہر کراچی میں تو سرگزشت آگیا ہے لیکن تمہارا خط موجود نہیں۔ پتا نہیں دو مہینے سے مسلسل میرے خطوط شائع نہیں ہوئے۔ عید سے ایک دن پہلے بھی اور تین دن کے بعد بھی گئی لیکن مجال ہے کہ پشاور میں وقت پر سسپنس، جاسوسی اور سرگزشت ملے۔ آج 29 ستمبر شام 5 بجے آخر میرا سویٹ سویٹ سرگزشت دکاندار نے میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ واہ وا کیا سرورق ہے۔ اوپر ایک کونے میں پر پل کلر میں لکھا سرگزشت جگمگا رہا تھا۔ دوسرے کونے میں مشہور شخصیت محسن الملک کی تصویر رونق برپا کر رہی تھی۔ اس کے بعد معراج رسول انکل کی کھری کھری اور سچی باتیں پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ یک مٹھی میں قلم کار میں خواجہ احمد عباس کے بارے میں پڑھا۔ سمندر کو کوزے میں بند کرنے والی بات ہے۔ ضمیر خیال کا دروازہ جیسے کھولا تو سامنے اپنے شہر کے شاہد جہانگیر شاہد صاحب کا خلوص نامہ پہلے نمبر پر ملا تو دل بہت خوش ہوا۔ جہانگیر صاحب سے میں مل چکی ہوں۔ وہ بہت ملنسار، سادے طبیعت اور خوش اخلاق انسان ہیں۔ شاہد صاحب کا خط بہت دلچسپ اور لاجواب رہا۔ ان کی سچی باتوں نے دل کو رلا دیا۔ میں تو ہر مہینے وقت پر خط پوسٹ کرتی ہوں لیکن لگتا ہے ڈاک خانے والوں کو بھی مجھ سے ضد ہو گئی ہے۔ احمد خان تو حیدی صاحب یہاں کوئی ڈفلیاں نہیں بجائے گا اور کیوں بجائے۔ تو حیدی بھائی آپ کے دین و دنیا اور تعلیم کے بارے میں سنہرے الفاظ نے دل دکھی کر دیا۔ اعجاز حسین سنجار بھائی آپ کا خط مجھے ہمیشہ بہت اچھا لگتا ہے۔ بھائی مرد خود 80 سال کا ہو شادی کے لیے 18 سال کی لڑکی مانگتا ہے لیکن خود کوئی 35 سال کا لڑکا 50 سال کی عورت سے شادی نہیں کرتا کیا یہ مردوں کی منافقت نہیں۔ سعید انور عباس شاہ بھائی ڈاک خانے سے ناراض ناراض نظر آئے شکریہ مجھے ہر دلعزیز بہن کہا۔ میں بھائیوں سے منہ نہیں موڑتی اور دشمنوں کو منہ توڑ جواب دیتی ہوں۔ عمران جونانی بھائی اپنے خوب صورت تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ واقعی آپ کی شاعری کا ذوق بہت لاجواب ہے۔ اب پھر غائب نہ ہو جانا۔ بشریٰ افضل بھی بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر تھی۔ خوشگوار احساس ہوا کہ بشریٰ جی نے دکھوں کو آخر شکست دے دی۔ ڈیئر یہی زندگی کا نام ہے خوش رہو رونے والوں کے ساتھ کوئی نہیں روتا۔ ہنسنے والے کے ساتھ دنیا چلتی ہے۔ سدرہ آپ بھی ظہیر احمد تبسم اور رانا حبیب الرحمٰن کی باتوں کو دل پر لے گئیں۔ سدرہ جی مجھے کوئی غلط فہمی نہیں۔ یہ میرا تجربہ ہے کہ مرد نے ہمیشہ عورت کو اپنے مقصد کے لیے کھلونا بنایا ہے اور عورتیں بے وقوفی کر کے اپنی جیسی عورت کی زندگی تباہ کر کے خود بھی بے سکون رہتی ہیں۔ سدرہ ڈیئر میری دعا ہے آپ کی زندگی میں دوسری عورت کا دکھ نہ آئے۔ فلک شیر آف رحیم یار خان کا تبصرہ بھی بہت شاندار رہا۔ خوشی ہوئی کہ یہ بھی میری طرح بار بار لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس بار تو بھائی عزیز مئے بھی حاضر تھے۔ دلچسپ اور شاندار تبصرہ کے ساتھ مگر مجال ہے کہ باجی کو یاد کیا ہو کیا ہوا خفا ہو باجی سے۔ رضا احمد خان صاحب اللہ آپ پر خصوصی رحم کریں، آمین ثم آمین۔''

☆ فلک شیر ملک، شاہ گڑھ رحیم یار خان سے رقمطراز ہیں۔''عید کی تعطیلات کے فوراً بعد ہی سرگزشت کی آمد ہو گئی تھی۔ جونہی رسالہ پڑھنا شروع کیا تو سارا سرگزشت ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔ (نماز اور کھانے کا وقفہ ہوا) شمارہ بڑا دلچسپ تھا۔ معراج صاحب نے ضرب عضب کی کامیابی کی بات کی۔ پچاسی فی صد امن ہو چکا ہے۔ اس آپریشن سے اور جو دہشت گرد تخریب کار

بچ گئے ہیں ان کے گرد بھی گھیرا تنگ کیا جا رہا ہے۔ بڑی خوش آیند بات ہے۔ باقی رہی بات عوام کی ذمہ داری کی وہ تو مشکل ہی لگتی ہے۔ شاہد جہانگیر شاہد نے جو اپنا واقعہ سرگزشت کے بارے میں بیان کیا قابلِ تحسین بات ہے۔ احمد خان تو حیدی کا فلسفہ ازدواجی زندگی بجا ہے مگر میں نے اس آگ کے بارے میں کہا تھا جو تحریر ''آگ'' اگست کے شمارے میں چھپی تھی۔ باجی سدرہ نا گوری صاحب نے بھی میری ایک تجویز پر تنقید کی تھی اور زورِ قلم بڑھانے کے لیے لکھا کہ وجودِ زن سے تصویرِ کائنات میں رنگ مگر شاید وہ بھول گئیں کہ وجودِ زن کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے جس سے پوری کائنات جگمگا رہی ہے۔ پھر عورت اور مرد ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں۔ یہ دونوں گاڑی کے دو پہیوں کی طرح ہیں۔ تب ہی زندگی کی گاڑی چلتی ہے۔ پھر میں نے نازیہ حسن کی جوان موت پر افسوس کیا تو مجید احمد جائی صاحب کو برا لگا۔ انہوں نے لکھا کہ وقت سے پہلے کوئی نہیں جاتا مگر مجید جائی صاحب افسوتاں لگدائے۔ ارمان تاں لگدا ہے۔ وضاحت ضروری تھی کر دی۔ معذرت کے ساتھ۔ ''محسن الملک'' کی حیات پر اچھے انداز میں لکھا گیا۔ علی گڑھ کالج، سرسید احمد اور محسن الملک کی ہی مرہونِ منت ہے۔ ''کراچی کراچی'' بھی زبردست انداز میں لکھی گئی۔ ''عجب شخص'' اسلم ڈار بطور ہدایت کار اور بطور انسان بہت کامیاب رہے۔ ان کے نام کا ڈنکا ہمیشہ بجتا رہے گا۔ اسی طرح ''اکتوبر کی شخصیات میں'' خواجہ خورشید انور مرحوم، دھنوں کا بادشاہ اپنی یادیں دلوں میں نقش کر گیا۔ وہ سدا بہار گیت آج بھی دلوں میں وجد کی کیفیت طاری کر دیتے ہیں۔ وحید مراد مرحوم بھی جلدی چلے گئے مگر اپنے انمٹ نقوش چھوڑ گئے۔ ''کالا چھپرا'' حسن رزاقی نے جس طرف اشارہ کیا ہے قابلِ غور ہے۔ اس جگہ کو کسی اور کام کے لیے استعمال میں لانا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ بحری جہازوں سے متعلق اچھا مضمون تھا۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے ''انوکھا گھر'' اس انداز میں دکھایا اور ایسی معلومات فراہم کیں کہ جیسے وہ خود اس گھر میں رہ رہے ہیں۔ خوب صورت انداز تھا۔ بہت اچھے رائٹر ہیں۔ منظر امام کی ''تاریخِ عالم'' مسلسل معلومات فراہم کر رہی ہے۔ ''شاعرات'' میں جن تین چار شاعرہ کا انٹروڈکشن ہوا واقعی حیرت ہوئی۔ اچھی کاوش تھی۔ ''سراب'' سے گزرے تو سچ بیانیوں نے ایک رنگ جما دیا۔ سب پر تبصرہ کرنا تو مشکل ہے مگر پھر بھی مختصر لکھتا ہوں۔ ''نظامِ جہالت'' ایک پرفیکٹ کہانی ہے جو اس دور کی صحیح عکاسی کر رہی ہے۔ ''جرم کی کھیتی'' میں جلال خان قاتل کی حیثیت اور جعلی کرنسی کے جرم میں پکڑا گیا۔ قانون کبھی کبھی دھوکا کھا جاتا ہے مگر جو کرے وہی بھرے والا معاملہ بھی ہو جاتا ہے۔ ''مضبوط عورت'' میں شائستہ کا کردار پسند آیا۔ ''سب کچھ'' مختصر اور ہلکی پھلکی سبق آموز تحریر تھی۔ انسان اکثر غلط فیصلے تو کر لیتا ہے مگر بعد میں وہی پچھتاوے بن کر عمر کا روگ بن جاتے ہیں۔ ''آخر کیوں'' انسان اتنا مجبور بھی ہو سکتا ہے۔ دو وقت کی روٹی کے لیے جیل میں رہنا گوارہ کر لیا۔ اچھی تحریر تھی ''جان لیوا'' غلطی ثمینہ ہی کی تھی۔ پہلے دن سے ہی وسیم کو ڈانٹ دیتی یا اپنے بھائی کو بتا دیتی تو اتنی تباہی نہ ہوتی۔ اچھی سچ بیانی تھی۔ ''انجام'' بھی سبق آموز سچ بیانی ہے۔ دلدار خان جیسے خوب صورت مرد، کم عقل لڑکیوں کو برباد کر دیتے ہیں۔ دھوکا دہی اور لالچی نوراں کا کردار کہانی کا مرکزی خیال تھا۔''

☆ عبدالجبار رومی انصاری نے لکھا ہے۔ ''حالات کی تازہ صورتِ حال کے پیشِ نظر سرورق حقیقی تصویر پیش کر رہا تھا یہی وجہ تھی کہ سادگی سے بجی سنوری خوب صورت دوشیزہ بھی جیسے سنجیدگی سے حالات پر غور کر رہی ہوں اور ادب کے محسن خاص محسن الملک کی جھروکے سے جھانکتی تصویر اچھی لگ رہی تھی۔ البتہ ان کی روح آج کے مسلم حالات پر ضرور نوحہ کناں ہوگی جنہوں نے خود بھی تعلیم حاصل کی اور سرسید احمد خان کے ساتھ مل کر تعلیمی میدان میں گرانقدر خدمات انجام دیں اور خود کو عام مسلمانوں کی تعلیم کے لیے وقف کر دیا اور دوسری طرف آج کے ترقی یافتہ دور کو دیکھیں جس میں تعلیم کو سستا ہونا چاہیے تھا اور صورتِ حال یہ ہے کہ پرائیویٹ اسکول مافیا فیس بڑھانے پر تلا ہوا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے اور سلام ہے۔ محسن الملک جیسے نیک انسانوں کو جنہوں نے تعلیم عام کرنے کے لیے علی گڑھ جیسے عظیم کالج کو بنوانے کے لیے اپنی جیب سے پیسا خرچ کیا تھا اور اس کے لیے شب و روز محنت بھی کی۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے محسن الملک کی شخصیت پر تحریر دے کر اپنا حق ادا کر دیا۔ اسی علی گڑھ کالج سے پڑھے ہوئے ہونہار طالب علم اور قلم کار خواجہ احمد عباس کی سرگزشت نے دل موہ لیا۔ تحریکِ پاکستان کے لیے ایسے لوگوں کی قربانیاں بے مثال تھیں جنہیں اپنی دنیا میں یاد رکھا جائے گا۔ ''معمہ خیال'' سے شاہد جہانگیر شاہد کی سرگزشت سے تعلق کی داستان زبردست ہے۔ مبارک ہو آپ کو۔ احمد خان توحیدی لگتا ہے آپ سفر میں ہی رہتے ہو۔ اعجاز حسین نے بھی ٹھیک کہا کئی لوگ ملنے سے گھبراتے ہیں اور کسی کو موقع نہیں ملتا ہوگا۔ سعید انور نے محکمہ ڈاک کی خوب خبر لی ہے بس یہ تو بروقت ڈاک کے اصول پر عمل کر لیں یہی بہت ہے۔ کے جی رحمان اور محمد عمران جونانی نے بھی اچھا تبصرہ کیا۔ بشریٰ افضل کو جیتے دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہر معاملے میں ثابت قدم رکھے۔ ساتھ میں سدرہ بانو ناگوری کا اظہار یہ بھی قابلِ تعریف تھا۔ ٹھیک کہا کسی سے اُمید تو کیا رکھی...... لیکن پھر بھی یہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی نا۔ منشی عزیز مئے ایک کیا سبھی خطوط کی کسر نکل جاتی ہے جب شائع ہو جاتے ہیں۔''

☆ رانا محمد شاہد، بورے والا سے لکھتے ہیں ”مجموعی طور پر سرورق جاذب نظر تھا۔ اداریے میں معراج رسول صاحب نے اہم نکتے کی طرف نشاندہی کی۔ اصل میں ہم ہر بات میں قانون نافذ کرنے والے اداروں کو ہی الزام دیتے ہیں۔ حالانکہ اگر سبھی لوگ اپنے اپنے کردار و ذمہ داری کا تعین کرلیں تو معاشرہ خود بخود امن کا گہوارہ بن جائے۔ شہرِ خیال میں شاہد جہانگیر شاہد کرسیٔ صدارت پر تھے۔ ان کی سرگزشت سے عشق کی داستان دلچسپی لے کر پڑھی۔ اچھی لگی۔ انور عباس شاہ! آپ نے محکمہ ڈاک کے حوالے سے حقیقت پر مبنی باتیں کیں۔ عام طور پر ڈاکیے کی ذرا سی بے پروائی کی سروس بہتر ضرور ہوئی ہے مگر اگر انسان خود ہی کام چور ہو جائے تو محکمہ کیا کرے؟ گزشتہ ماہ خط ٹائم پہ پوسٹ کیا تھا مگر نہیں پہنچا۔ اکثر ساتھیوں کی گفتگو کا جواب دیا ہوتا ہے جبکہ خط اگلے ماہ نہیں آتا تو ساتھی بدگمان ہو جاتے ہیں کہ ہم نے تو بڑے ادب سے مخاطب کیا تھا، یاد کیا تھا، تعزیت کی تھی یا کوئی بات شیئر کی تھی مگر دوسری طرف سے جواب دینا بھی گوارہ نہ کیا گیا اور ایسا خط نہ پہنچنے کی صورت میں اکثر ہو جاتا ہے۔ تبصرہ میں سدرہ بانو ناگوری نے بیٹی کی سالگرہ پر مبارک باد دی، اس کے لیے ان کا مشکور ہوں۔ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ مجی رحمٰن جیسے عمر رسیدہ لوگ دیارِ غیر میں رہ کر سرگزشت کے رسیا ہیں اور وطن کے ساتھ کسی نہ کسی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ محمد عمران جونانی کافی عرصے بعد نظر آئے ہیں۔ بشریٰ افضل بھی کبھی کبھار ہی نظر آتی ہیں اور طاہرہ گلزار بھی آج کل دکھائی نہیں دے رہیں۔ سدرہ بانو ناگوری نے صحیح ڈھونڈا، فاطمہ ثریا بجیا کا شمار ہماری معروف ڈراما رائٹرز میں ہوتا ہے۔ منشی محمد عزیز کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ رضا احمد خان! اللہ آپ کی والدہ محترمہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور آپ کو سکون عطا فرمائے (آمین) والدہ سے محرومی کیا ہوتی ہے؟ گزشتہ دسمبر میں میری والدہ ماجدہ بھی اللہ کے پاس چلی گئی تھیں۔ والدہ سے محرومی سب سے بڑی محرومی ہے۔ آپ نے میرے گزشتہ خطوط شاید پڑھے ہوں۔ میں شادی نہیں کروانا چاہتا تھا، والدہ نے زبردستی کی کہ میرے بعد تمہاری بیوی، بچے ہی تمہارے ہوں گے اور آج یہ تلخ حقیقت سامنے ہے۔ میرا بھی آپ کو مشورہ ہے کہ جیسے بھی ہو شادی کروالیں۔ آپ کی اپنی فیملی ہوگی، دل بھی لگنا شروع ہو جائے گا۔ آنے والے وقت میں حالات مزید تلخ ہوں گے۔“

☆ محمد سلیم قیصر نے ملتان سے لکھا ہے ”میں آپ سب سے بہت معذرت خواہ ہوں کہ چند وجوہات کے پیشِ نظر گزشتہ دو ماہ غیر حاضر رہا۔ تمبر کا شمارہ میری آنکھوں کے سامنے موجود ہے جس کا سرورق مجھے بہت اچھا لگا۔ معراج انکل! پرائیویٹ اسکولز اور آپ کی پُرسوز صدا کی تائید کرتا ہوں لیکن مجھے تو یہاں کہیں پہ بھی کچھ ٹھیک نہیں لگتا۔ ہمارے اس ملک کا سب کچھ آپ سب کے سامنے موجود ہے۔ بدعنوانی، لوٹ مار اور کرپشن کی بات ہو تو کوئی ایک سیاست داں بلکہ بہت سیاست دانوں کے نام سامنے آجاتے ہیں ادارہ نہیں بلکہ اداروں کے نام آتے ہیں۔ بدعنوانی، لوٹ مار اور کرپشن کا شجرۂ نسب ماتحت سے حاکم تک جاملتا ہے۔ آپ ہی بتائیں آشیانہ اسکیم، دانش اسکول، پیلی ٹیکسی، ہرے ٹریکٹر، میٹرو بس بھلا غریب کا ان سے کیا تعلق؟ میں نے تو آج تک کسی غریب کو پھلتا پھولتا نہیں دیکھا کہ جس کی باحیا حوا کی بیٹی پہ کسی وڈیرے، جاگیردار کی نظر اٹھتی ہو کہ جس کی محنت مزدوری کی کمائی سے بڑوں کے شکم بھرتے ہوں۔ ایک طرف والدین معصوم بیٹی کی عزت لٹنے پر ماتم کناں ہوں عدم انصاف پہ اک بیٹی خودسوزی کرنے پر مجبور ہو تو دوسری طرف کسی بڑے سیاست دان کے بیٹے کو مدعی پہچاننے سے انکار کردے، جہاں اک جج ماڈل پہ فردِ جرم عائد کرتے ہچکچاتا ہو۔ اک طرف کسی غریب کی دائر کوئی درخواست عدالت کے معزز جج تک پہنچنے سے پہلے رجسٹرار ہی خارج کردے اور دوسری طرف کسی سیاست دان کے نااہلی کیس کی سماعت سو سے زائد مرتبہ ہو۔ کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں۔ اب ذرا روٹھے ہوؤں کو منا لیا جائے۔ باجی گل اعلیٰ ظرف اور اعلیٰ خیالات کی مالک۔ بعض اوقات زندگی میں کچھ مزاج کے خلاف بھی ہو جاتا ہے درگزر کیجیے پلیز۔ ڈاکٹر قراۃ العین (اسلام آباد) عرصہ دراز سے غائب ہیں اب انہیں میں کیسے اور کہاں سے ڈھونڈوں۔ بہن سدرہ بانو ناگوری، بہن بشریٰ افضل کی مستقل مزاجی کو سلام۔ رانا حبیب الرحمٰن بھائی آپ کی تحریر کچھ عجیب سی لگی اللہ آپ کی رہائی کے اسباب پیدا فرمائے۔ میں بالخصوص ان تمام بہنوں، بھائیوں اور بڑوں کا تہہ دل سے بہت مشکور ہوں جو مجھے کبھی نہیں بھولتے۔“

☆ شاہد جہانگیر شاہد کا اظہاریہ پشاور سے ”دوستوں یہ تحریر میں لیڈی ریڈنگ اسپتال پشاور کے روم نمبر 11 کے بیڈ سے لکھ رہا ہوں جہاں میں گردے کے شدید درد میں مبتلا ہو کر ایڈمٹ ہوں۔ سرگزشت کا نیا شمارہ ساتھ لایا تھا کہ آرام سے پڑھوں گا اور تبصرہ لکھوں گا لیکن تکلیف کے دوران ایک ہمدرد نرس سرگزشت مانگ کر لے گئی اور پھر واپس نہیں لائی مجھے قوی اُمید ہے اتنا لاجواب رسالہ پڑھ کر وہ بھی پرچے کی گرویدہ ہو جائے گی۔ دوستوں سے خصوصی دعا کی درخواست ہے۔“

(تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط: احمد خان توحیدی، کراچی۔ شگفتہ مشتاق، لاہور۔ مجید احمد جائی، ملتان۔ آفتاب احمد اشرفی، کراچی۔ بشریٰ افضل، بہاولپور)

انقلابی

ڈاکٹر ساجد امجد

لینن اور ٹرائسکی یہ وہ دو نام ہیں جنھوں نے زار کے پنجے سے روسی عوام کو نجات دلائی تھی۔ مزدوروں، کسانوں، محنت کشوں کی حکومت قائم کرائی تھی لیکن جب اقتدار حاصل ہو گیا تو آزادی کی اس جنگ کا سرخیل کس طرح سازشوں کا شکار بنا دیا گیا۔ یہ روداد کمیونزم و سوشلزم کے سب سے بڑے مرکز روس کی اندرونی جنگ کی کہانی بیان کرتے ہوئے ان وجوہات کی نشاندہی بھی کررہی ہے کہ روس کیوں ٹوٹا، کس طرح اقتدار کی ہوس میں وہی لوگ جو 'حکومت غریبوں کی' کا نعرہ لگا کر سامنے آئے تھے، لینن اور لیون کے درمیان بڑھتے اختلافات کا سہارا لے کر کس طرح لیون کو موت کے گھاٹ اتارا گیا، اس ایک روداد میں بہت کچھ بیان کیا گیا ہے۔

روسی انقلاب کے ایک بڑے رہنما کی داستانِ زیست

اس کی ماں اسے کئی مرتبہ اٹھانے کے لیے آچکی تھی اور وہ کروٹ بدل کر پھر سو جاتا تھا۔ آخر اس طرح بار بار اٹھانے سے اس کی نیند اچٹ گئی۔ بستر سے وہ پھر بھی نہیں اٹھا تھا۔ اس کے کانوں میں کسی اجنبی کی آواز آئی تو وہ چونک گیا۔ شاید کوئی مہمان ہے جو صبح ہی صبح آدھمکا ہے۔ اب بات سمجھ میں آئی۔ اس کی ماں اسی لیے اسے بار بار اٹھانے کے لیے آرہی تھی۔ اس گاؤں کے گنے چنے افراد کے علاوہ اگر کوئی اور آنکلتا تھا تو اسے بھی بے حد خوشی ہوتی تھی۔ اس وقت بھی اسی خوشی نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اس نے دونوں ہتھیلیوں سے اپنی دونوں آنکھوں کو رگڑا اور چھلانگ لگا کر بستر سے کود گیا۔ اسے متوقع مہمان کو دیکھنے کی جلدی ہورہی تھی۔ اس نے جلدی جلدی منہ دھویا۔ بالوں کو اچھی طرح ماتھے پر چپکایا اور کھانے والے کمرے میں پہنچ گیا جہاں سے اس مہمان کی آواز آرہی تھی۔

''لیوا ان سے ہاتھ ملاؤ۔ یہ تمہارے استاد ہیں۔'' اس کی ماں نے کہا۔

اسے قریبی اسکول میں جاتے ہوئے ایک سال ہو چکا تھا۔ اس لیے ''استاد'' کے مفہوم سے بھی واقف تھا اور استاد کے احترام میں اسے کیا کرنا چاہیے یہ بھی اسے معلوم تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اس نئے استاد کی طرف دیکھا اور ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ جس شخص کو استاد کہا جا رہا تھا اس نے نہایت نرمی سے اس کا ہاتھ دبایا اور نہایت شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے الجھے ہوئے بالوں کو مزید الجھا دیا۔

''یہ تمہارے نئے استاد ہیں۔ شاید تم انہیں جانتے بھی نہ ہو۔ خیر جلد ہی جان لو گے۔ ہاں ایک بات تو میں تمہیں بتانا ہی بھول گئی۔ تمہیں اب چچا ابرام اور چچی راحیل کے گھر رہنا پڑے گا کیوں کہ تمہارا نیا اسکول ''گرومکلی'' میں ہے جہاں تمہارے چچا رہتے ہیں۔''

''میں وہاں ایک مرتبہ گیا تھا۔ وہ تو یہاں سے بہت دور ہے۔''

''کوئی ایسا دور نہیں ہے۔ یہاں سے صرف چار میل دور ہے اور تمہیں کون سا روز آنا جانا ہوگا۔ تم تو وہیں رہو گے تمہارے والد تمہیں وہاں آج تو نہیں کل چھوڑ آئیں گے۔''



اسے یہ اطلاعات دینے کے بعد اس کی ماں ایک مرتبہ پھر نئے استاد سے مخاطب ہوگئی۔ اب فیس وغیرہ کے معاملات طے ہورہے تھے۔

فیس کے نام پر روبل بھی طے ہوئے اور گندم کی بوریوں کی ایک مقررہ مقدار بھی۔

"یہ بھی طے ہوجائے کہ آپ اسے کیا کیا پڑھائیں گے۔"

"میں اسے روسی زبان کی تعلیم دوں گا۔ ریاضی پڑھاؤں گا البتہ توریت عبرانی زبان میں پڑھائی جائے گی۔"

"میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ یہ قابل ترین انسان بن جائے۔"

"میں پوری کوشش کروں گا۔"

"صرف کوشش نہیں۔ اس پر جتنی چاہو سختی کرنا۔ میں تم سے کبھی کوئی بازپرس نہیں کروں گی۔"

اس کی ماں نے اس کے استاد کو چند ہدایات اور بھی دے ڈالیں جن میں سے کچھ اس نے سنیں کچھ نہیں سنیں کیوں کہ وہ ناشتا کرنے میں مشغول ہوگیا تھا جو اس کی ماں نے اس کے سامنے لاکر رکھ دیا تھا۔

وہ ناشتا کر ہی رہا تھا کہ اس کی ماں اس کے نئے استاد کو رخصت کرنے کے لیے کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس نے ناشتا ختم کیا اور کرسی سے نیچے اتر گیا۔ اسی وقت ایوان و سیلائی وچ کمرے میں داخل ہوا اس کا جسم بھاری اور داڑھی کے بال بالکل سفید ہوچکے تھے۔ وہ اس کے گھر میں ملازم تھا۔ عمر اتنی سے بھی تجاوز کرچکی تھی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح لیوا سے مذاق کیا اور اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اپنے سر سے اونچا اٹھالیا۔

"میں تمہیں ماسکو دکھانے لے جاؤں؟"

"ہمیشہ کہتے ہی رہتے ہو کبھی لے کر تو گئے نہیں۔"

"اب کے تو بالکل لے جاؤں گا۔"

"اب کیا لے جاؤ گے بڑے میاں۔ اب تو میں گرومکلی جارہا ہوں۔ چچی راحیل کے گھر۔"

"ارے وہ بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے۔ ماسکو چلو ماسکو۔"

"گرومکلی میں تو اسکول ہے، تم بتاؤ ماسکو میں کیا ہے۔"

"مجھے کیا معلوم میں کون سا ماسکو گیا ہوں۔ تمہارے ساتھ جاؤں گا تو میں بھی دیکھ لوں گا۔ ویسے یہ تو پکی بات ہے کہ میں تمہیں گرومکلی تو نہیں جانے دوں گا۔"

"کیسے روکو گے مجھے؟"

"ہاں یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ میں نوکر ہوں تم آقا۔ میں تمہیں کیسے روک سکتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"ارے ارے تم روتے کیوں ہو۔ میں چھٹیوں میں آتا رہوں گا۔"

"تم واقعی جارہے ہو"

"اور میں تو کیا۔"

دوسرے کمرے میں اس کی بڑی بہن ایک پرانے پیانو پر انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اس کا بڑا بھائی بھی قریب ہی بیٹھا تھا۔ اس نے ان دونوں کو خوش خبری سنائی کہ وہ بھی چچی راحیل کے گھر جارہا ہے لیکن ان دونوں نے کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ غالباً ان دونوں کو پہلے سے معلوم تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

اس دن اس کا یہ حال تھا کہ اس کے سامنے جو آرہا تھا وہ اسے اپنی روانگی کے بارے میں بتا رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے اپنے گاؤں سے نکلنے کا موقع ابھی تک نہیں ملا تھا۔ صرف ایک مرتبہ گرومکلی گیا تھا۔ اسے بھی اب بہت دن ہوگئے تھے۔ ایک دھندلا سا نقش اس کے ذہن میں رہ گیا تھا۔

دوسرے دن اس کے باپ نے اسے گھوڑا گاڑی میں بٹھایا اور گرومکلی کی طرف چل دیا۔ راستے میں دونوں طرف کھیت ہی کھیت تھے۔ ان میں سے کچھ اس کے باپ کی ملکیت تھے مگر لیوا یہاں کبھی نہیں آیا تھا۔ اس کا باپ اسے ہر کھیت کے بارے میں تفصیل سے بتاتا جارہا تھا۔

اس کا پورا نام لیون ٹرائسکی تھا لیکن گھر میں سب اسے لیوا کہہ کر پکارتے تھے۔

اس کا باپ ایک کسان تھا۔ پہلے چھوٹے درجے کا اور بعد میں بڑے درجے کا۔ ابھی وہ چھوٹا ہی تھا کہ اپنے والدین کے ساتھ پولٹوفا صوبے میں یہودیوں کا قصبہ چھوڑ کر جہاں وہ پیدا ہوا تھا جنوبی روس کے میدانی علاقے میں آگیا تھا۔ یہ خرساں کا صوبہ تھا۔ یہاں یہودی کاشت کاروں کی کوئی چالیس بستیاں تھیں۔ جن کی کل آبادی پچیس ہزار افراد سے زیادہ نہیں تھی اور یہ بستیاں دور دور پھیلی ہوئی تھیں۔

صوبہ خرساں میں ایک جاگیردار یانوفلی تھا۔ اس کے نام پر ایک بڑے علاقے کا نام یانونکا رکھا گیا تھا۔ لیوا کے باپ نے اسے یانوفلی سے اڑھائی سو ایکڑ زمین خرید لی۔ اس کے علاوہ چار سو ایکڑ زمین کرائے پر بھی حاصل کی اور یانونکا ہی میں رہنے لگا۔

الیگزینڈر روم کے زمانے میں یانوفلی نے حکومت وقت سے تعاون کر کے بڑا عروج حاصل کیا تھا۔ حکومت نے اس کی خدمات سے خوش ہو کر خرسان کے صوبے میں اسے ایک ہزار ایکڑ غیر آباد علاقہ دے دیا تھا۔ وہاں اس نے گھاس پھونس اور گارے سے جھونپڑی نما گھر بنایا لیکن اس کی کاشت کاری ترقی نہ کر سکی اور اس نے یہ زمین بیچنا شروع کر دی۔ اس کی موت کے بعد یانونکا باقی رہ گیا لیکن خود اس کا کنبہ نقل مکانی کر گیا۔

لیوا کے باپ کی فصلیں ثمر آور ثابت ہوئیں۔ مویشیوں اور گھوڑوں کے ریوڑ بڑھتے رہے۔

لیوا کی پیدائش کا سال 1879ء زار روس پر پہلے بڑے حملے کا سال تھا۔ عوامی رضا نامی پارٹی وجود میں آ گئی تھی اور اس نے زار الیگزینڈر کو سزائے موت سنائی تھی۔ اسی سال الیگزینڈر دوم کی گاڑی کو دھماکے سے اڑانے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیوا اس سال کا تھا کہ الیگزینڈر روم کے قتل اور عوامی رضا پارٹی کی بیخ کنی پر ایک خوف ناک جدوجہد کا آغاز ہو گیا تھا لیکن الیگزینڈر دوم کی گاڑی دھماکے سے اڑانے کی آوازیں یانونکا تک پہنچنے سے معذور تھیں جہاں لیون ٹراٹسکی اپنا بچپن گزار رہا تھا۔

☆......☆

وہ کھیتوں اور کھلیانوں کے درمیان سے گزرتا ہوا گرومکلی پہنچ گیا۔

گرومکلی کے اندر ایک ندی بہتی تھی جس کے ایک طرف یہودی اور دوسری طرف جرمن آبادیاں تھیں۔ دونوں میں نمایاں فرق تھا جرمن گھر نسبتاً صاف ستھرے تھے۔ چھتوں کا کچھ حصہ ٹائلوں اور کچھ حصہ سرکنڈوں سے بنا ہوا تھا۔ گھوڑے بڑے اور گائیں زیادہ تندرست تھیں۔

یہودی آبادی کے گھر ٹوٹے پھوٹے، چھتیں بیٹھی ہوئی اور مویشی لاغر تھے۔

اس کے چچا کا مکان بہت بڑا تھا۔ مکان دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا تھا لیکن اسے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہاں چچا ابرام کی حکومت ہے اور حکومت بھی ناقابلِ برداشت، اپنی بیوی کے ساتھ اس کا سلوک نہایت ناروا تھا۔ بچوں سے بھی وہ قطعی روکھی پھیکی گفتگو کرتا تھا۔

لیوا کا باپ جب اسے چھوڑ کر آ گیا اور اس کا چچا کھانے کے لیے بیٹھا تو اکیلا تھا۔ کیا اس گھر میں سب ایک ساتھ کھانا نہیں کھاتے؟ لیوا کو بڑی حیرت ہو رہی تھی اس سے زیادہ حیرت اسے اس وقت ہوئی جب چچا نے اسے اپنے پاس بلایا اور کھانے پر اصرار کیا۔ اس کے اپنے دور بیٹھے تھے اور وہ اسے کھانے کی دعوت دے رہا تھا۔ لیوا چپ چاپ کھانے کے لیے بیٹھ گیا۔ کھانے کے دوران وہ یانونکا کے بارے میں باتیں بھی کرتا جا رہا تھا۔ کئی گھنٹے بعد لیون ٹراٹسکی کو معلوم ہوا کہ اس کا چچا باتیں بھی کرتا ہے۔

دوسرے دن اس کا نیا استاد آیا اور اپنے ساتھ اسکول لے گیا۔ اس استاد کا نام شوفر تھا۔ وہ اپنے اسکول کا واحد استاد تھا۔

اسکول پہنچنے میں اس کے ہاتھ میں سیاہ سلیٹ دے دی گئی جس پر اسے روسی زبان کے حروف تہجی کی مشق کرنی تھی۔ وہ ان حروف کی نقالی کرنے لگا جو اس کے استاد نے سلیٹ پر لکھ دیے تھے۔

وہ کئی مرتبہ سلیٹ پڑھ چکا تھا۔ اسے مٹا کر پھر لکھ لیتا تھا۔ اب اسے اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔ بیٹھے بیٹھے نیند بھی آنے لگی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اب اسے ریاضی بھی پڑھائی جائے لیکن وہ یہ بات استاد سے نہیں کر سکتا تھا۔ پھر جیسے اس کی دعا سن لی گئی ہو۔ کچھ تو تبدیلی آئی۔ ریاضی تو نہیں پڑھائی گئی لیکن سب نے مل کر بائبل پڑھی۔ یہ اس کے لیے خوشگوار اور انوکھا تجربہ تھا۔ اس کے بعد اسکول کی چھٹی ہو گئی۔

دوسرے دن پھر وہی لگے بندھے اصول وہی سلیٹ اور حروف کا کھیل۔

چھٹیوں میں گھر چلا جاتا تھا۔ آزادی کے یہ دن اسے بہت اچھے لگتے تھے۔

وہ اس اسکول میں قطعی خوش نہیں تھا۔ اس کا یہاں کوئی دوست نہیں بن سکا تھا کیوں کہ اسے عبرانی زبان نہیں آتی تھی۔

اس ناپسندیدگی کے باوجود اس نے اس اسکول میں بہت کچھ سیکھا۔ اس کے استاد نے ایسی مضبوط تعلیمی بنیاد رکھ دی جو زندگی بھر اس کے کام آئی۔

وہ ٹھیک ٹھاک پڑھنے لگا تھا۔ شعر نقل کر لیتا تھا۔ خود

بھی شعر کہنے کے قابل ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ وہ چھٹیوں میں گھر گیا تو اس نے اپنے شعر اپنی بڑی بہن کو سنائے۔ اس کی بہن نے فخریہ انداز میں ماں کو بتایا۔ ماں کے ذریعے باپ کو پتا چل گیا۔ وہ ان پڑھ کسان اتنا خوش ہوا کہ ہر آنے والے مہمان کے سامنے لیوا سے ضد کرتا کہ وہ مہمان کو اپنے شعر سنائے۔ وہ بھاگنے کی کوشش کرتا لیکن پکڑا جاتا۔ الٹے سیدھے اشعار جن میں سے اکثر بے وزن ہوتے اسے مہمانوں کو سنانے پڑتے۔

گرومکلی کے اسکول میں اس نے ایک سال گزار دیا تھا۔ وہ یانوفکا آیا ہوا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے کہ اس کی ماں کا ایک بھتیجا اٹھائیس سالہ فیلیورج چھٹیاں گزارنے یانوفکا آیا۔ اسے ایک چھوٹی سی سیاسی غلطی پر گریجویشن کرنے سے روک دیا گیا تھا ورنہ وہ نہایت ذہین اور مہذب تھا۔

اسے سب پیار سے مونیا کہہ کر پکار رہے تھے۔ وہ اس گھر میں آتے ہی لیون ٹراٹسکی کا دیوانہ ہو گیا۔ لیوا بھی اس طرح اس کے ساتھ مل گیا جیسے وہ اس کا ہم عمر ہو۔

بڑوں کی باتوں کے درمیان لیوا کو معلوم ہوا کہ مونیا کی ایک محبوبہ بھی ہے جو ایک یہودی اسکول کی پرنسپل ہے۔ یہاں اسے کوئی بھی نہیں جانتا تھا لیکن سب نے فیصلہ صادر کر دیا کہ وہ عام خواتین سے بہتر ہو گی کیوں کہ وہ اسکول کی پرنسپل ہے۔

مونیا نے گرمیوں کی تمام چھٹیاں یانوفکا میں گزار دیں۔ اس عرصے میں لیون ٹراٹسکی سے اس کی ایسی دوستی ہو گئی کہ جب اس کے جانے کے دن قریب آئے تو اس نے لیوا کے والدین سے اجازت لے لی کہ وہ اسے اپنے اسکول اوڈیسہ لے جائے گا جہاں اس کی بہتر تعلیم ہو سکتی ہے۔ وہ اسے اپنے ساتھ اپنے گھر پر رکھے گا۔

لیوا کی اس سے ایسی دوستی ہو گئی تھی کہ اسے کوئی اعتراض نہ ہوا بلکہ ایک طرح سے خوشی ہوئی کہ گرومکلی کے بے رنگ اسکول سے نجات ملی۔ یہ فوری تاثر تھا مگر یانوفکی سے رخصت ہوا تو بری طرح رو رہا تھا۔ اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا تھا کہ وہ یانوفکی سے کتنی محبت کرتا ہے۔

اس سفر میں اسے گھوڑا گاڑی سے نہیں ٹرین سے جانا تھا لہٰذا پہلے اسے یانوفکا سے کئی میل دور اسٹیشن جانا پڑا۔ پھر ٹرین پکڑی۔ یہ سفر صرف ٹرین سے ختم نہیں ہو گیا۔ ٹرین کا سفر ختم ہوا تو ایک دخانی کشتی میں بیٹھنا پڑا جس نے سمندر پار کرایا۔

اوڈیسہ پہنچ کر وہ جس گھر میں پہنچا یعنی فیلیورج کے گھر جہاں اسے رہنا تھا۔ وہ ایک پرانا مگر بہت بڑا گھر تھا۔ اس میں لڑکیوں کا اسکول بھی تھا۔ اسکول کی پرنسپل وہیں رہتی تھی۔ ایک کمرے کے ایک کونے میں بڑا پردہ پڑا تھا۔ اسی پردے کے پیچھے اسے جگہ دے دی گئی۔

ابھی وہ اس کونے کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ ایک بوڑھی عورت آئی اور اس نے لیوا کے گالوں اور پیشانی کو بوسے دیے۔ یہ فیلیورج کی ماں تھی۔

اس گھر میں آتے ہی اسے ڈسپلن کی چکی میں پسنا پڑ گیا۔ نو بجے سو جانا ہے۔ صبح بخیر کہنا نہیں بھولنا، ہاتھوں اور ناخنوں کو صاف رکھنا ہے، کاہلی کا مظاہرہ نہیں کرنا ہے۔ ملازموں کا شکریہ ادا کرنا ہے اور لوگوں کی پیٹھ پیچھے برائی نہیں کرنی ہے۔ اسے بڑی ترتیب سے شہری بنایا جا رہا تھا۔ ان پابندیوں کو دیکھ کر اسے یانوفکا کی آزادی یاد آتی تھی۔

اس گھر کی معاشی حالت بھی اس سے چھپی نہ رہ سکی۔ مالی ذرائع بس اتنے تھے کہ گزارہ ہو رہا تھا۔ فیلیورج کے پاس کرنے کو کوئی خاص کام نہیں تھا۔ وہ یونانی المیہ ڈراموں کو تبصرے کے ساتھ ترجمہ کرتا رہتا تھا۔ بچوں کے لیے کہانیاں لکھتا اور تاریخی کتب کا مطالعہ کرتا رہتا۔ اس کے علاوہ اسکول چلانے میں بیوی کی مدد کرتا۔

جب اسکول میں داخلے کا سوال آیا تو وہی سوال سامنے آیا جو اس وقت اخبارات کا محبوب مشغلہ تھا یعنی سرکاری اور پرائیویٹ اسکول میں کون سی تعلیم بہتر ہے۔ قدامت پسندوں کا خیال تھا کہ سرکاری تعلیم زیادہ ڈسپلن پیدا کرتی ہے۔ آزاد خیال لوگ پرائیویٹ تعلیم کے حق میں تھے۔

دس فیصد یہودی بچوں کا سرکاری اسکول میں داخلہ دینے کا قانون متعارف کرایا گیا تھا۔ دس فیصد کوٹا پورا ہونے کے بعد یہودی لڑکے پرائیویٹ اسکولوں میں داخلہ لینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ اس کا میزبان فیلیورج پہلے ہی پرائیویٹ تعلیم کے حق میں تھا لہٰذا لیوا نے اس کے کہنے پر سینٹ پال پرائیویٹ اسکول میں ہائی اسکول کے پہلے سال کے لیے داخلے کا امتحان دے دیا۔

اس نے یہ امتحان پاس کر لیا۔

وہ نئی یونیفارم میں اسکول گیا۔ زرد رنگ کے بارڈر والی ٹوپی پر اسکول کا مونوگرام بنا ہوا تھا۔ چمڑے کا اسکول بیگ بھی نیا تھا۔ کتابیں بھی نئی تھیں اور پینسل باکس بھی بالکل

نیا تھا۔ اسکول تک جانے والی سڑک خاصی لمبی تھی۔ اسے یہ فاصلہ اچھا معلوم ہو رہا تھا کیوں کہ اس طرح زیادہ سے زیادہ لوگ اسے دیکھ سکتے تھے۔ اسے یہی لگ رہا تھا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے دیکھتے ہوئے جا رہے ہیں وہ اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا کہ بارہ تیرہ سال کا دبلا پتلا ایک لڑکا اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں چند اوزار تھے۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ وہ کوئی مزدور لڑکا ہے۔ اس نے عجیب حرکت کی۔ کچھ دیر لیوا کی طرف حقارت سے دیکھا اور پھر اس کی جیکٹ پر تھوک کر آگے بڑھ گیا۔ لیوا اس وقت کچھ نہیں سمجھ سکا تھا کہ اس لڑکے نے یہ حرکت کیوں کی۔ یہ اسے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تقسیم دولت کے غلط نظام کا نتیجہ تھا۔ روس میں مزدوروں کی جو حالتِ زار تھی اس کے خلاف احتجاج تھا۔

اس نے سڑک پر پڑے ہوئے چند پتے اٹھائے اور اپنی جیکٹ صاف کر کے آگے بڑھ گیا۔ اسکول پہنچنے کے بعد اسے دوسرا صدمہ پہنچا جب مانیٹر اس کے ساتھ بڑی حقارت سے پیش آیا۔

''بیج اتار دو اور بیلٹ بھی تبدیل کر لو اور آیندہ سے عام قسم کی بیلٹ پہننا۔''

جرمن اور یہودیوں کے درمیان یہ ایک تفریق تھی جو اس کے سامنے آئی۔ ایک نقش تھا جو پھر بھی نہ مٹ سکا۔

سینٹ پال اسکول بنیادی طور پر ایک جرمن ادارہ تھا۔ اس کا مقصد اوڈیسہ اور جنوبی ضلع کے جرمن آباد کاروں کی تعلیمی ضرورت کو پورا کرنا تھا۔

پہلے دن تو کوئی پڑھائی نہیں ہوئی۔ دوسرے دن اس نے ریاضی میں اپنی ذہانت دکھائی اور بلیک بورڈ سے سوال پھرتی سے اتار لیے۔ اس پر اسے انعام ملا۔ لڑکوں کے ہاتھوں کا معائنہ ہوا تو اس کے ہاتھ سب سے صاف تھے۔ اسے پانچ نمبر ملے اس روز وہ اتنا خوش تھا کہ تقریباً دوڑتا ہوا گھر پہنچا۔

اب وہ اسکول جانے والا لڑکا بن چکا تھا۔ صبح جلدی اٹھتا، جلدی سے چائے پیتا، دوپہر کا کھانا اپنی جیبوں میں ٹھونستا اور صبح کی دعا میں شریک ہونے کے لیے اسکول کی طرف دوڑ پڑتا۔ وقت پر اپنی سیٹ پر بیٹھ جاتا، غور سے سبق سنتا اور احتیاط سے کاپی میں اتار لیتا۔ گھر کے لیے جو کام ملتا اسے بڑی محنت سے کرتا۔

وہ کسی مشکل کے بغیر ایک کلاس سے دوسری کلاس میں جاتا رہا۔

وہ شہر اور گاؤں کے درمیان تقسیم ہو گیا تھا۔ شہر ڈسپلن اور تعلیم کے لیے تھا اور جب چھٹیوں میں گاؤں جاتا تو آزادی کے ساتھ گھومنے پھرنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔

اوڈیسہ میں وہ اپنے لیے کوئی تفریح پیدا نہ کر سکا۔ اس نے جمنازیم میں بھی اپنے لیے کوئی جگہ پیدا نہ کی۔ اکثر لڑکے کشتی رانی کے لیے جاتے تھے، اسے یہ شوق بھی نہیں تھا۔ سمندر کے کنارے رہنے کے باوجود سمندر سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ صرف اس وقت سمندر دیکھتا جب گاؤں جاتا یا گاؤں سے واپس آتا۔ اسے پڑھا کو قسم کا لڑکا کہا جا سکتا تھا۔ گاؤں پہنچ کر وہ دوسری ہی قسم کا لڑکا بن جاتا تھا۔ اکیلا ہی گھوڑے پر سوار ہو کر دور نکل جاتا اور اکثر صبح کا گیا شام کو واپس آتا۔ خوب جی بھر کے دیہاتی کھیل کھیلتا۔

شہر آکر دوبارہ ڈسپلن کی چکی میں پسنے لگتا۔ بہت جلد ورزش اور کھیلوں کی جگہ کتابوں نے لے لی اوڈیسہ میں کتابوں کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ اس کے ساتھ رہنمائی کرنے والے بھی بہت تھے۔ وہ بڑے اشتیاق سے کتابوں کا مزہ اور پھر سیر کرنے باہر چلا جاتا۔ سیر کے دوران بھی جو کچھ پڑھا ہوتا اسے ذہن میں دہراتا جاتا۔ شام کو ہوم ورک ختم کرنے کے بعد کوئی کتاب لے کر لیٹ جاتا اور اس وقت تک پڑھتا رہتا جب تک فیلیو رچ یا اس کی ماں اسے تنبیہ نہ کرتے کہ بس اب سو جاؤ۔ ایک روز ٹالسٹائی کی کچھ تحریریں اس کے ہاتھ لگ گئیں۔ یہ اس کے معیار سے بلند چیزیں تھیں لیکن موضوع اس کے مزاج کے مطابق تھا۔ یہ تحریریں انقلاب پسند جمہوریت پر مشتمل تھیں۔ وہ جتنا کچھ روس کے بارے میں جانتا تھا جن ناانصافیوں کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ یہ تحریریں اس کی ترجمانی کر رہی تھیں۔ وہ شاید وقت سے پہلے سوچنے لگا کہ روس کا علاج ''انقلاب'' ہے۔ اب وہ ایسے لٹریچر کی تلاش میں رہنے لگا تھا۔ کئی کتابیں اس کے ہاتھ لگ بھی گئیں۔ ان کتابوں میں شہنشاہیت سے ٹکرانے اور مزدوروں کو ان کے حقوق دلانے پر اظہارِ خیال کیا گیا تھا۔

ایک روز فیلیو رچ کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ ماسکو میں ایسی خفیہ تنظیمیں کام کر رہی ہیں جو انقلابی لٹریچر شائع کرتی ہیں لیکن فیلیو رچ نے ایسے لٹریچر کے مطالعہ سے اسے منع کر دیا۔

ان دنوں ٹالسٹائی کا ڈراما ''اندھیرے کی طاقت'' نے عوام میں ہلچل پیدا کر دی تھی۔ اس میں کچھ ایسی باتیں

تھیں کہ الیگزینڈر سوم کو ترغیب دلا کر اس ڈرامے کو بند کرا دیا گیا۔

اس کے کمرے سے ملحق فیلیو رچ کا کمرا تھا۔ لیوا کو ایک دن محسوس ہوا جیسے برابر کے کمرے میں ٹالسٹائی کا ڈراما پڑھا جا رہا ہے۔ وہ اور اس کی بیوی دھیمی آواز میں اسے پڑھ رہے تھے۔

لیوا نے اجازت طلب کی۔ ''کیا میں بھی اس ڈرامے کو پڑھ سکتا ہوں۔''

''قطعی نہیں، تم ابھی بہت چھوٹے ہو۔''

بات اتنی قطعیت سے کہی گئی تھی کہ اس نے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا لیکن صبر پھر بھی نہ ہوا۔ جب یہ ڈراما کتابوں کی الماری میں رکھ دیا گیا تو اس نے اسے نکالا اور قسطوں میں پڑھ کر ختم کر ڈالا۔

اس ڈرامے نے اور کچھ تو نہیں کیا اسے تھیٹر جانے کا شوق ہو گیا۔ یہ شوق چند سال تک سر چڑھ کر بولتا رہا۔ یہ شوق اتنا بڑھا کہ اس نے چند ٹیوشن کر لیں تا کہ تھیٹر دیکھنے کے لیے پیسے کما سکے۔

کم روشنی اور کثرت مطالعہ کا اثر یہ ہوا کہ اس کی نظر کمزور ہو گئی۔ اس نے ڈاکٹر کو دکھایا اور چشمہ لگانے لگا۔ چشمہ لگانے کے بعد وہ خود کو مدبر اور دانش ور محسوس کرنے لگا۔ اسے گاؤں جانا تھا اسے اندازہ تھا کہ جب وہ عینک لگا کر گاؤں جائے گا تو اس کی توقیر میں اضافہ ہو گا لیکن ہوا اس کے برعکس اسے عینک میں دیکھ کر اس کے باپ کو شدید صدمہ ہوا۔ ''اسے فوراً اتار دو۔''

''میں اس کے بغیر لکھ پڑھ نہیں سکتا۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے لکھنے پڑھنے کی۔ اسے فوراً اتارو۔ میری عمر سے زیادہ کے لگ رہے ہو۔''

اس نے باپ کا دل رکھنے کے لیے جب تک گاؤں میں رہا کتاب کو ہاتھ لگانا ہی چھوڑ دیا۔ اگر کچھ پڑھنا بھی ہوتا تو باپ سے چھپ کر چشمہ لگا لیتا۔

چھٹیاں گزارنے کے بعد وہ شہر آیا، اس نے محسوس کیا کہ اس نے تمام کتابیں چاٹ لی ہیں۔ اب لکھنے کا مرحلہ باقی ہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک رسالہ نکالے گا۔ وہ کئی دن تک فیلیو رچ کے ساتھ مل کر تبادلۂ خیال کرتا رہا۔ رسالے کا نام تجویز ہوا۔ ''قطرہ'' رسالہ شائع ہوا تو اس میں زیادہ تر نظمیں اور مضامین اس کے تھے۔ وہ جوش ترنگ میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ اسکول سے کوئی رسالہ وغیرہ نکالنے کی ممانعت تھی۔ رسالہ شائع ہوتے ہی باز پرس ہوئی اور اسے سینٹ پال اسکول سے عارضی طور پر نکال دیا گیا۔

اساتذہ کی کونسل کے اجلاس میں اسکول سے نکالنے کے تین درجوں پر بحث ہوئی۔ کسی دوسرے اسکول میں داخلہ لینے کے حق سے محروم رکھنا، سینٹ پال اسکول میں داخلے کے حق سے محروم رکھنا اور دوبارہ داخلے کا حق دینا۔ اس کے لیے آخری اور سب سے نرم سزا تجویز کی گئی۔

اس نرم سزا کے باوجود اسے ایک سال تک انتظار کرنا تھا۔ جب داخلوں کا موسم آیا تو اس نے داخلے کا امتحان دیا اور ایک مرتبہ پھر اسکول جانے لگا۔

اس طرح گرتے سنبھلتے اس نے اسکول میں سات سال گزار دیے۔ اس نے چھ گریڈ پاس کیے تھے اور ساتویں گریڈ کے لیے نکولائیف جانا تھا کیوں کہ سینٹ پال میں چھ گریڈ ہی ہوا کرتے تھے۔

اسکول کے زمانے میں اس کے کوئی سیاسی نظریات نہیں تھے لیکن اس کے شعور میں مخالفت کی روح کام کرتی رہتی تھی۔ یہ شاید انقلابی لٹریچر کے مطالعے کا نتیجہ تھا۔

وہ موجودہ نظام، ناانصافی اور ظلم کے سخت خلاف تھا۔ اس کے ذہن میں یہ خیالات مطالعے سے زیادہ الیگزینڈر سوم کے جابرانہ عہدِ حکومت نے پیدا کیے تھے۔ پولیس کی بد دماغی، جاگیرداروں کا استحصال، نوکر شاہی کا غرور، کسانوں اور مزدوروں کے ساتھ ناانصافیاں وغیرہ، اس کے ذہن کو تبدیل کر رہی تھیں۔ ان باتوں کو وہ ذہن سے کھرچ بھی نہیں سکتا تھا کیوں کہ روس میں یہی ہو رہا تھا۔

روس کے سیاسی نظام سے نفرت کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ذہن میں یورپ اور امریکا کا ایک سہانا نقشہ بنا رہا تھا۔ اِدھر اُدھر سے معلومات جمع کر کے ایک ایسی ثقافت کو ذہن میں لا رہا تھا جو بہت بلند تھی۔ گویا وہ خواب دیکھنے کے عمل سے گزر رہا تھا۔

سترہ سال کا ایک لڑکا اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ وہ اپنے ذہنی رویوں میں اکیلا کھڑا تھا۔ نہ کوئی رہنمائی کرنے والا تھا نہ ساتھ چلنے والا۔ عدم مساوات کے نمونے دیکھتا بھی تھا اور ان پر کڑھتا بھی تھا لیکن کوئی راہ نہیں سوجھتی تھی۔ ایک طرف انقلاب تھا اور دوسری جانب مارکس ازم۔ کبھی وہ سوشلسٹ خیال جنت میں قدم رکھتا تھا کبھی انقلابی خیالات اس پر حاوی ہو جاتے تھے۔

کوئی فیصلہ کیے بغیر وہ نکولائیف چلا گیا جہاں اسے

ساتواں گریڈ مکمل کرنا تھا۔ اس کے بعد اس کی تعلیم مکمل ہو جاتی۔

وہ ایک خاتون کے گھر ٹھہرا۔ اس خاتون نے کچھ معاوضے کے عوض اسے رہنے کے لیے جگہ دی تھی۔ وہ اس وقت اپنے سوالوں میں الجھا ہوا ایک خاموش طالب علم تھا۔

اس خاتون کے بچے لیون ٹرائسکی سے ذرا بڑے تھے اور ان کا جھکاؤ بائیں جانب تھا جب کہ لیون ٹرائسکی اس وقت تک سوشلزم کے مخالفوں میں تھا یا کم از کم سوشلسٹ تحریکوں کی طرف سے شک میں مبتلا تھا۔ گھر میں اگر سیاسی بحثیں ہوتیں تو وہ ان سے دور رہنے کی کوشش کرتا۔ خاتون خانہ اسے اپنے بچوں کے سامنے بطور ماڈل پیش کرتی۔ ”یہ بھی تو نوجوان ہے لیکن کسی تحریک میں شامل نہیں۔ اسے اپنی پڑھائی سے کام ہے۔ تمہیں بھی ایسا بنا چاہیے۔“

ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ اس کے اندر جاری جنگ نے اسے مغلوب کرلیا۔ وہ قدامت پسندی کو چھوڑ کر اس تیزی سے بائیں جانب آیا کہ اس کے دوست اس کی تیز رفتاری سے خوف زدہ ہوگئے۔

نصابی کتابوں کی طرف سے اس کا دل اچاٹ ہوگیا لیکن وہ ایک بہترین طالب علم تھا لہٰذا یہاں بھی نمایاں طالب علم رہا۔

اس کی ضرورتوں نے یہاں مارکسیوں کے علاوہ سابق جلاوطن انقلابیوں کو ڈھونڈ نکالا اور ان کے خفیہ ٹھکانوں پر ان سے ملاقاتیں کرنے لگا۔ مارکسزم کی طرف سے جو غلط فہمیاں تھیں دور ہونے لگیں۔ وہ جیسے جیسے سوشلسٹ نظریات سے واقف ہوتا جارہا تھا مزدوروں اور کسانوں سے اس کی ہمدردیاں بڑھتی جارہی تھیں۔ سرمایہ داروں کے خلاف نفرت دل میں جگہ بناتی جارہی تھی۔ اب وہ تھا، تنہائی تھی اور کتابیں۔

وہ جس گھر میں ٹھہرا ہوا تھا وہاں ایک مالی تھا جس کا نام شیوگووسکی تھا۔ وہ آدمی اسے کچھ پُراسرار سا لگا۔ وہ حقیقت جاننے کے لیے اس کے قریب چلا گیا اور جلد ہی اس سے دوستی گانٹھ لی۔ کچھ دنوں کی دوستی کے بعد اس پر عجیب انکشاف ہوئے۔ وہ مالی چیک باشندہ تھا اور اتنا پڑھا لکھا کہ اخبارات میں مضامین لکھتا تھا، جرمن زبان پڑھ سکتا تھا، کلاسیکی ادب کو جانتا تھا اور مارکسزم پر ہونے والی بحثوں میں حصہ لیتا تھا۔ باغ کے اندر بنا ہوا اس کا کمرا سابق جلاوطنوں اور مقامی نوجوانوں سے ملاقات کی جگہ بنا ہوا تھا۔

لیون ٹرائسکی بھی ان مجلسوں میں شامل ہونے لگا۔ یہاں ایسے لوگ آتے تھے جن کے ذریعے کوئی بھی ممنوعہ کتاب حاصل کی جاسکتی تھی۔ وہ ان کتابوں کو ہضم کرتا جارہا تھا۔

اب اس کی مصروفیات ایسی ہوگئی تھیں کہ میزبان خاتون کے گھر میں اس کا گزارہ ممکن نہ تھا بلکہ اب تو اس کے خیالات جاننے کے بعد وہ خاتون اسے طعنے دینے لگی تھی۔ ”میں یونہی تمہیں اپنے بچوں کے سامنے ماڈل کے طور پر پیش کرتی رہی۔“

شیوگووسکی نے ایک بڑا باغ پٹے پر لے لیا تھا اور چند باغیانہ خیالات کے حامی نوجوانوں کے ساتھ اس باغ میں رہ رہا تھا۔ لیون ٹرائسکی بھی وہاں پہنچ گیا۔

یہ فقیرانہ زندگی گزارتے تھے۔ نیلے رنگ کے کرتے پہنتے تھے۔ بانس کی ہیٹ اور کالی چھڑیاں استعمال کرتے تھے۔ وہ بھی یہی لباس پہننے لگا۔ یہ ایک قسم کا حلقہ تھا جس میں سب مل کر کتابیں پڑھتے اور ان پر بحثیں کرتے۔

شہر میں خبر پھیلی ہوئی تھی کہ شیوگووسکی اور اس کے ساتھیوں نے کسی خفیہ تنظیم میں شمولیت اختیار کررکھی ہے۔ اس خبر پر پولیس تو بعد میں آتی لیوا کے والد پہلے آگئے۔

اس کے والد نکولاءیف کی اناج منڈی میں آئے تو سوچا لیوا سے بھی مل لیا جائے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ کن خاتون کے گھر میں رہ کر اپنی تعلیم مکمل کررہا ہے۔ وہ وہاں پہنچے اور خاتون کی زبانی جو باتیں انہیں معلوم ہوئیں اسے سن کر ان کے ہوش اڑ گئے۔ وہ فوراً اس باغ میں پہنچے جہاں وہ رہ رہا تھا۔ اسے فقیروں کے لباس میں دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ اسے ایک پیڑ کے نیچے لے کر بیٹھ گئے اور سمجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر باپ ہونے کی حیثیت سے ڈانٹ ڈپٹ پر اتر آئے لیکن اس نے یہ کہہ کر بات ختم کردی ”اپنی آزادی اور اپنا راستہ خود تلاش کرنے کا مجھے حق ہے۔“

”میں تمہیں گھر سے نکالتا ہوں۔ اب تم مجھ سے کسی قسم کی مالی مدد کی توقع مت رکھنا۔“ اس کے والد نے کہا اور باغ سے باہر نکل آئے۔

کچھ دنوں بعد لیون ٹرائسکی کو احساس ہوا کہ والد کے ساتھ اس سے کچھ زیادتی ہوگئی ہے۔ وہ گاؤں گیا تاکہ والد سے صلح کرلے۔ یہاں سب کا عجیب حال تھا۔ سب رو رہے تھے جیسے لیوا زندہ نہ ہو مرگیا ہو۔ اس کے انقلابی ہونے کی خبریں یہاں پہنچ چکی تھیں۔ لہٰذا سب یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ

ان کے ہاتھ سے گیا۔ سب سے زیادہ اس کی بہن رو رہی تھی جسے چپ کرانا مشکل تھا۔ والد تو بات کرنے ہی کو تیار نہیں تھے۔ والدہ کے کہنے پر وہ تیار ہوئے لیکن ایک شرط پر کہ ان کا پیارا لیوا انہیں انجینئر بن کر دکھائے۔ وہ باپ کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے انجینئر بننے کو تیار ہوگیا۔

اس کے ایک چچا جو انجینئر تھے اور اوڈیسہ میں ایک پلانٹ کے مالک تھے۔ ان دنوں یانوفکا آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے درجۂ حرارت کم کرنے کے لیے اسے مشورہ دیا کہ وہ اوڈیسہ میں ان سے آکر ملے۔ بحران وقتی طور پر ٹل گیا۔ سب کے چہرے کھل اٹھے۔ وہ گاؤں کی زندگی سے اس طرح لطف اندوز ہونے لگا جیسے چھٹیوں میں آیا کرتا تھا اور گھومتا پھرتا تھا۔ اس میں اتنا اضافہ اور ہوگیا تھا کہ گاؤں کے لوگ اسے پڑھا لکھا خیال کر کے اس کی خوب آؤ بھگت کرنے لگے۔

چچا کے چلے جانے کے بعد وہ بھی اوڈیسہ چلا گیا۔ اس نے چچا کے کہنے پر ریاضی کے کورس میں داخلہ لینے کا سوچا ضرور لیکن داخلہ لیا نہیں۔ جانے کس چیز کے انتظار میں تھا۔ اس کے برخلاف محنت کشوں سے آشنائی پیدا کرتا رہا، غیر قانونی لٹریچر حاصل کرتا رہا، پرائیویٹ طلبہ کو پڑھاتا رہا۔ آخر اس سے بھی تنگ آگیا اور دوبارہ نکولائیف آکر شیوگووسکی کے باغ میں قیام پذیر ہوگیا۔ پھر وہی انقلاب پر لمبی چوڑی بحثیں۔ پھر جلد ہی احساس ہوگیا کہ بحثیں کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ہمیں عملی جدوجہد کرنی ہوگی۔ کسی کے پاس کوئی پروگرام نہیں تھا کہ جدوجہد کیسے کی جائے۔

پیٹرزبرگ میں جولاہوں نے ہڑتال کر دی تھی۔ اس واقعے نے طلبہ میں حرکت پیدا کردی۔ جگہ جگہ مظاہرے ہونے لگے۔ سیکڑوں طلبہ کو یونیورسٹی سے نکال دیا گیا۔ جن شہروں میں یونیورسٹیاں تھیں وہاں ہنگامے شروع ہوگئے۔ لیون ٹراٹسکی نے بھی اپنے کام کا آغاز ان مظاہروں سے کیا۔ اس نے اپنے ہم عمر و ہم خیال کچھ لوگ جمع کر لیے۔

روس کی اقتصادی ترقی کا محور جنوب مشرق کی طرف ہوگیا تھا۔ نکولائیف میں بھی دو پلانٹ لگ رہے تھے۔ کم از کم آٹھ ہزار محنت کش یہاں کام کرنے کے لیے آگئے۔ یہ گویا بھوکے کو غذا ملنے والا معاملہ تھا۔

اس نے اپنا نام تبدیل کر کے ان محنت کشوں کو حکومت کے خلاف بھڑکانے کا کام شروع کر دیا۔ وہ اور اس کے ساتھی خاموشی سے اپنا کام کرتے رہے۔ پولیس بڑے امن سے سوتی رہی اور بیدار ہوئی تو اس وقت جب وہ مزدوروں کو بیدار کر چکے تھے۔ انہوں نے ایسے خفیہ ٹھکانے بنا لیے تھے جہاں یہ مزدور جمع ہوتے تھے اور بحثوں میں حصہ لیتے تھے۔ یہ سب کے سب معاشرتی تعلقات میں انصاف کے طلب گار تھے اور اس کے لیے سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہورہے تھے۔

اس نے جلد ہی اپنا ادب خود پیدا کرنا شروع کر دیا۔ یہ ایک طرح سے اس ادبی کام کی باقاعدہ ابتدا تھی جو انقلابی سرگرمیوں کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ وہ لمبے لمبے مضمون لکھتا رہتا پھر ان کی نقلیں کرتا۔ کئی کئی ہفتے کمر سیدھی کرنے کا موقع نہ ملتا لیکن ان مضامین کو پڑھ کر مزدور جس خوشی اور جذبے کا اظہار کرتے اسے دیکھ کر ساری تھکن اتر جاتی۔ پھر یہ کاغذ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتے رہتے۔

جس وقت یہ کاغذ لکھے جاتے ایک آدمی صحن میں پہرا دیتا رہتا۔ خطرے کی صورت میں ان کاغذوں کو جلانے کا پورا انتظام تھا پھر کہیں سے چھپائی کی مشین ہاتھ لگ گئی۔ ایک کارکن کا اپارٹمنٹ بھی مل گیا۔ چھپائی کا کام تیز ہوگیا لیکن پھر بھی یہ یقین نہیں آتا تھا کہ چند مفلس نوجوان کس طرح صدیوں پرانی حکومت کا تختہ الٹ دیں گے۔

جب بہت لوگ جمع ہوگئے تو باقاعدہ ایک تنظیم بنالی گئی۔ اس کا نام جنوبی روسی ورکرز یونین رکھا گیا۔ اس نے سوشل ڈیموکریٹک خطوط پر اس کا منشور بنایا۔

کثرت سے ہینڈ بل چھاپے جاتے تھے جو مزدوروں کو بیدار کر رہے تھے۔ مل مالکان کرائے کے مقرروں کے ذریعے اس اثر کو زائل کرنے کی کوشش کرتے۔ تنظیم اگلے ہی دن نئے پرچوں سے ان کا جواب دے دیتی۔

اس کھلی جنگ کا اثر یہ ہوا کہ پولیس کے کان کھڑے ہوگئے۔ پولیس کو یقین نہیں آرہا تھا کہ باغ میں رہنے والے چند مفلس نوجوان یہ کام کر رہے ہوں گے اور اگر کر رہے ہیں تو یقیناً ان کے پیچھے کوئی ہے۔ پولیس نے ان نوجوانوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھنی شروع کر دی۔

پولیس کی ان سرگرمیوں کو دیکھ کر تنظیم نے فیصلہ کیا کہ چند ہفتوں کے لیے تمام لوگ نکولائیف چھوڑ کر کہیں چلے جائیں۔ لیون ٹراٹسکی نے فیصلہ کیا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے اپنے گاؤں چلا جائے گا۔

اس تنظیم کا ایک رکن نستر نیکو رات کے وقت لیون ٹراٹسکی کے پاس آیا اور اصرار کیا کہ وہ اسے ہینڈ بلوں اور

کتابچوں کا ایک بنڈل اسے دیتا جائے۔ اس کام کے لیے اس نے رات کے پچھلے پہر قبرستان کے عقب میں ملنے کا وعدہ کیا۔

زمین گہری برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ چاند پوری طرح چمک رہا تھا۔ قبرستان کے عقب میں ایک ویرانہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ لیون ٹراٹسکی وہاں پہنچ گیا۔ نسترنیکو وہاں پہلے سے موجود تھا۔

''لے آئے۔''

''ہاں۔'' لیون ٹراٹسکی نے کہا اور کوٹ کے نیچے سے پیکٹ نکالا عین اسی وقت قبرستان کی دیوار کی طرف سے کوئی شخص چلتا ہوا ان کی طرف آیا۔

''یہ کون ہے۔''

''مجھے کیا معلوم۔''

اس شخص کے وہاں پہنچتے ہی پولیس کی کئی گاڑیاں آگئیں۔ لیون ٹراٹسکی کو کتابچوں اور ہینڈ بلوں سمیت گرفتار کرلیا گیا۔ صاف ظاہر ہوگیا کہ نسترنیکو پولیس کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ اس کی مخبری پر پولیس یہاں آئی تھی۔

لیون ٹراٹسکی کے گرفتار ہوتے ہی اسی رات تقریباً دو سو آدمی پکڑ لیے گئے۔

ان سب کو ماسکو کی جیل بھیج دیا گیا۔

مقدمہ چلتا رہا۔ دوسرے سال کے اختتام تک فیصلہ سنا دیا گیا۔ چار بڑے مجرموں کو جن میں ٹراٹسکی شامل تھا چار سال کے لیے جلاوطن کردیا گیا تھا۔

فیصلے کے بعد بھی ان چاروں کو عارضی طور پر ماسکو جیل میں رکھا گیا۔ یہ عرصہ اس نے نظریے کے گہرے مطالعے میں گزارا۔ یہیں اس نے پہلی بار لینن کا نام سنا۔ روسی سرمایہ داری پر اس کی کتاب پڑھی جو نئی نئی بازار میں آئی تھی۔ نکولائیف میں مزدور تحریک پر ایک پمفلٹ لکھا اور اسے جیل سے باہر اسمگل کرایا۔ تھوڑے دنوں بعد وہ جنیوا سے شائع ہوگیا۔

1900ء کے موسم خزاں میں ان چاروں کو ماسکو جیل سے نکالا اور پولیس کی نگرانی میں ان کی مقرر کردہ جلاوطنی کی جگہوں پر پہنچانے کا کام شروع ہوگیا۔ وہ دریائے لینا کی مدھم رو کے ساتھ نیچے کی طرف جارہے تھے۔ ساری رات سخت سردی میں گزری۔ ان چار میں ایک لڑکی الیگزینڈر لوفنا بھی تھی۔ یہ جنوبی روس ورکرز یونین میں بڑی اہم حیثیت رکھتی تھی۔ اس کی وفاداری کو ٹراٹسکی بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ پہلو بہ پہلو بیٹھی تھی۔

''لوفنا، کیا تم مجھ سے شادی کروگی؟''

''اس مصیبت کی گھڑی میں تمہیں شادی کا خیال کیسے آیا۔''

''اس کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ تم مجھ سے شادی پر تیار ہو۔''

''تم ایک اچھے آدمی ہو۔''

''دیکھو اب وقت آگیا ہے کہ یہ لوگ ہم میں سے ہر ایک کو مختلف جگہوں پر اتاریں گے۔ اگر میں ان سے کہوں گا کہ ہم میاں بیوی ہیں تو یہ ہمیں ایک ہی جگہ اتاریں گے۔ ہم دونوں مل کر انقلاب کے لیے بہت کچھ کرسکیں گے۔ ویسے بھی تم ایک لڑکی ہو جلاوطنی کی زندگی اکیلی کیسے گزاروگی۔''

''اس کے لیے شادی کی کیا ضرورت ہے تم ویسے بھی کہہ سکتے ہو کہ ہم نے شادی کرلی ہے۔''

''میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ تم اگر واقعی مجھ سے شادی کرسکتی ہو تو بتاؤ۔ جلدی کرو وقت کم ہے۔''

''میں تیار ہوں۔''

آنے والے دیہات میں ایک ایک کرکے لوگوں کو اتارا جارہا تھا۔ ماسکو سے چلنے کے بعد تقریباً تین ہفتوں بعد اوست کت نامی گاؤں آگیا۔ جہاں ٹراٹسکی کو اتارا جانا تھا۔ اسی وقت اس نے سپاہیوں کے سامنے یہ انکشاف کیا کہ وہ اور الیگزینڈر لوفنا شادی کے بندھن میں بند چکے ہیں لہٰذا انہیں ایک ساتھ اتارا جائے۔

''یہ شادی کب ہوئی؟''

''ماسکو جیل میں۔''

''ہمیں تو اطلاع نہیں۔''

''ہمارا ہر کام خفیہ ہوتا ہے۔ اب آپ لوگوں کا اخلاقی فرض ہے کہ ہم میاں بیوی کو ایک ساتھ رہنے دیں۔''

ان سپاہیوں کو تو انہیں ماسکو سے نکالنا مقصود تھا۔ اس تھکا دینے والے سفر سے وہ تنگ بھی آگئے ہوں گے لہٰذا انہیں دریا کے کنارے اتار دیا گیا۔

اوست کت نامی گاؤں کسانوں کے کوئی ایک سو جھونپڑوں پر مشتمل ہوگا۔

وہ دونوں گاؤں میں گئے اور رہنے کے لیے ایک جھونپڑی کے طلب گار ہوئے۔ ان لوگوں نے رحم کھا کر گاؤں کے کنارے بنی ہوئی ایک جھونپڑی نہایت معمولی قیمت کے عوض اسے دے دی۔ اس جھونپڑی کے گرد جنگل اور نیچے دریا تھا۔

دنیا سے دور افتادہ یہ گاؤں مصیبتوں کا پہاڑ تھا۔ رات کے وقت کاکروچ جھونپڑی کو بھر دیتے تھے۔ گرمیوں میں زہریلی مکھیاں زندگی کو اجیرن بنائے رکھتی تھیں۔ یہاں کے لوگ ان سے بچنے کے لیے چہروں پر جالیاں پہنے رہتے تھے۔ برسات میں سارا گاؤں ایک دلدل بن جاتا تھا۔

وہ اس مصیبت میں بھی مارکس کی تحریروں کا مطالعہ کرتا رہتا اور ایک ہاتھ سے کاکروچوں کو ہٹاتا جاتا۔

جو کسی سے خوف زدہ نہیں ہوا تھا۔ کاکروچوں سے خوف زدہ ہو گیا۔ وہ اپنی بیوی کو لے کر اڑھائی سو میل دور مشرق میں دریائے الم کے کنارے ایک ایسی جگہ نقل مکانی کر گیا جہاں اس کے چند دوست رہتے تھے۔ یہاں اسے ایک کروڑ پتی سوداگر کے پاس کلرک کی نوکری مل گئی۔

یہ نوکری چلتی ہی رہتی لیکن ایک غلطی نے اسے نکال باہر کیا۔ ایک دن اس نے غلطی سے ایک بل میں ایک پاؤنڈ کی بجائے چالیس پاؤنڈ لکھ دی اور اسے ایک دور دراز کے اسٹور پر بھیج دیا۔

اس غلطی نے اس کی ایمانداری پر سوالیہ نشان لگا دیا اور اسے ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔ اس بدنامی کے بعد وہاں رہنا مشکل تھا۔

وہ اوست کت واپس چلا آیا۔ لوفا اس کے ساتھ تھی۔ راستے میں نہایت خوف ناک سردی تھی۔ جگہ جگہ رک کر کوچوان کو گھوڑوں کی ایال سے برف جھاڑنی پڑتی تھی۔ اس کی گود میں دس ماہ کی بیٹی جسے اس نے "فر" کی ٹوپی میں چھپا رکھا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد برف ہٹانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھ لیا جاتا تھا کہ وہ زندہ ہے یا سردی کی وجہ سے مر گئی۔ بہرحال کوئی حادثہ پیش نہیں آیا اور وہ بہ خیریت اوست کت پہنچ گئے۔

اس نے یہاں چند ماہ ہی گزارے تھے کہ گورنر نے اسے ذرا دور جنوب میں درخولنسک نامی جگہ پر جانے کی اجازت دے دی جہاں اس کے بعض دوست رہتے تھے۔

سائبیریا کے مختلف مقامات جلاوطنوں کی آماجگاہیں بنتی جا رہی تھیں۔ ان سب کے آپس میں مل بیٹھ کر بحثیں کرنے کے بہانے بھی بن جاتے تھے۔ آنے والے اپنے ساتھ نیا لٹریچر لے کر بھی آتے تھے۔ ماسکو میں کیا ہو رہا ہے یہ خبریں بھی مل جاتی تھیں۔ اس نے اسی لٹریچر اور معلومات کی بنیاد پر ایک اخبار میں مضامین لکھنے شروع کر دیے۔ یہ مضامین وہ فرضی نام سے لکھتا تھا۔ یہ مضامین اس کی آمدن کا ذریعہ بھی بن گئے۔

اس طرح دو سال گزر گئے جو تحریک زیرِ زمین شروع ہوئی تھی اب شہر کی سڑکوں پر دکھائی دے رہی تھی۔ بعض اضلاع میں کسان بھی متحرک ہو رہے تھے۔ سائبریا میں بھی ڈیموکریٹک پارٹیاں وجود میں آ رہی تھیں۔ انہوں نے اس سے رابطہ کیا اور وہ ان کے لیے پمفلٹ اور ہینڈبل تیار کرنے لگا۔

جلاوطن لوگ اپنی جلاوطنی کی جگہوں پر ٹھہرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان میں فرار ہونے کے جذبے جوان ہو رہے تھے۔ 1902ء کے موسم گرما میں اس کے پاس باہر سے شائع شدہ کتابوں کا ایک بنڈل ملا۔ ان کتابوں سے اسے معلوم ہوا کہ سمارا میں "اسکرا" نام سے ایک اخبار نکلتا ہے جس کا بڑا مقصد تمام انقلابیوں کو ایک مرکزی تنظیم میں جمع کر کے باعمل بنانا ہے۔ ان کتابوں میں لینن کی ایک کتاب بھی تھی۔ اسے پڑھ کر وہ خود کو بہت حقیر سمجھنے لگا۔ اس نے اب تک جو ہینڈبل، پمفلٹ اور مضامین لکھے تھے وہ گرد نظر آنے لگے۔ اسے احساس ہوا کہ اپنے عمل اور سرگرمیوں کے لیے کسی اور میدان کی ضرورت ہے۔ اس کے ذہن میں اسکرا اخبار کا نام گونجا لیکن وہ تو پیرس میں ہے اور میں سائبیریا میں جلاوطنی کے دن گزار رہا ہوں۔ بہت سے لوگ فرار بھی تو ہو رہے ہیں۔ تو کیا میں بھی؟ وہ یہاں سے فرار کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ کئی دن خوب غور کرتا رہا۔ اس وقت تک اس کی دو بیٹیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ چھوٹی تو صرف چار ماہ کی تھی۔ اگر میں فرار ہو گیا تو لوفا پر دہرا بوجھ نہیں پڑ جائے گا؟ اس نے ڈرتے ڈرتے لوفا کے سامنے اپنی اسکیم رکھ دی۔

اسے یقین تھا کہ وہ معترض ہو گی لیکن اس نے کمال جرأت سے کہا۔ "تم جاؤ انقلاب کا فرض ہر ذاتی مسئلے سے بالاتر ہے۔"

"تم دو بچیوں کے بوجھ کے ساتھ رہ سکو گی؟"

"یہاں اتنے ساتھی جمع ہو گئے ہیں وہ سب میرا خیال رکھیں گے۔ میں فخر کے ساتھ کہا کروں گی کہ میں ایک عظیم انقلابی کی بیوی ہوں اور پھر ہم بہت جلد مل بھی تو جائیں گے۔"

لوفا نے اس کے تمام شبہات کو دور کر دیا اور اس نے فرار کے لیے محفوظ راستوں کے بارے میں غور کرنا شروع کر دیا۔ راستوں کو دشوار گزار بنانے والا موسمِ خزاں نزدیک

آ رہا تھا۔ اس سے پہلے ہی کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ ایک کسان دوست مارکس کی جلاوطن مترجم ای جی کو فرار میں مدد دینے والا ہے۔ وہ بھی اس کسان کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اسے بھی باہر نکالنے پر متفق ہوگیا۔

کسان کا کام اسٹیشن تک پہنچانے کے بعد ختم ہو جانا تھا پھر ٹراٹسکی جانے اور اس کا کام رات جب گہری ہوگئی تو کسان نے ان دونوں کو چھکڑے میں گھاس کے نیچے چھپا دیا جیسے وہ کوئی سامان ہوں۔ اسے بھی شاید جلدی تھی کہ بیٹھتے ہی چھکڑے کو بے تحاشا دوڑانے لگا۔ اتنی زور کے جھٹکے لگتے تھے کہ کمر چٹخنے لگتی۔ لڑکی کا تو برا حال تھا۔ کسی نہ کسی طرح اسٹیشن قریب آیا۔

اسٹیشن آنے سے پہلے ہی وہ دونوں چھکڑے سے اتر کر الگ الگ سمت میں چل دیے تاکہ اگر پکڑے بھی جائیں تو ایک ساتھ نہ پکڑے جائیں۔

لڑکی پر کیا گزری، خبر نہیں مگر وہ بہ حفاظت ریل کے ڈبے میں سوار ہوگیا۔ وہاں اس کے کچھ دوست پہلے سے موجود تھے۔ انہوں نے اسے ایک سوٹ کیس دیا جس میں کلف لگی قمیص، ٹائیاں اور دوسرا مہذب سامان تھا۔ پولیس اسے دیکھ رہی تھی لیکن کسی کو بھی شک نہیں گزرا۔

دیکھتے ہی دیکھتے سائبرین عورتوں، مردوں اور بچوں سے ڈبہ بھر گیا۔ اتنے لوگوں کو دیکھ کر اس کا خوف جاتا رہا۔ وہ سارے راستے کھڑکی سے باہر سر نکال کر اپنے آپ سے باتیں کرتا رہا۔

وہ ''اسکرا'' کے اسٹاف میں شامل ہونے کے لیے ''سمارا'' پہنچا اور اسٹاف کے سربراہ کلر سے ملاقات کی۔ یہ اس کا فرضی نام تھا۔

وہ بھی سمارا میں سرکاری طور پر اسکرا کے اسٹاف میں پیرو کے نام سے شامل ہوگیا۔ یہ اخبار از سر نو پارٹی کی تنظیم کے لیے نکالا گیا تھا۔

یہ اخبار دراصل لینن نے جاری کیا تھا جس کا مقصد انقلابیوں کی تربیت کا فریضہ انجام دینا اور انقلابی مارکسی پارٹی کی از سر نو تنظیم سازی تھی۔

سمارا تنظیم کی درخواست پر اس نے مختلف مقامات کے دورے کیے۔ ان دوروں کا مقصد ان انقلابیوں سے ملاقات کرنا تھا جو اسکرا میں شمولیت اختیار کر چکے تھے یا جنہیں شمولیت کی ترغیب دینی تھی۔

پولیس کے جاسوسوں نے اسکرا کی اشاعت گاہ کا پتا لگا لیا۔ پولیس نے چھاپے خانے کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اخباروں کی کاپیاں، کاغذ اور مشینیں اپنے قبضے میں لے لیں اور ایڈیٹوریل بورڈ کی گرفتاریوں کے لیے چھاپے مارے جانے لگے۔ لینن کا میونخ میں رہنا مشکل ہوگیا۔ اب اس نے اخبار کی اشاعت کے لیے لندن کا انتخاب کیا۔

گہرے رنگ کی آسمانی قمیص پہنے ہوئے پستہ قد اور گٹھے ہوئے جسم والا ایک آدمی لندن کے ایک کتب خانے میں بیٹھا مطالعے میں مصروف تھا۔ اس کا حلیہ صاف بتا رہا تھا کہ وہ روسی ہے۔ پھر کسی نے اسے مزدوروں کے جلسے میں دیکھا۔ وہ ایک کونے میں بیٹھا خاموشی سے تقریر سن رہا تھا۔ بہت جلد لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ یہ کوئی اور نہیں مشہور انقلابی لینن ہے۔ جو روس میں انقلاب لانے کی تیاری کر رہا ہے۔

ٹراٹسکی ابھی تک گرفتاری سے بچا ہوا تھا۔ اسکرا اسٹاف کے سربراہ کلر کے نام لینن کی ہدایت پہنچی کہ ٹراٹسکی جس کا قلمی نام اب پیرو ہوگیا تھا کو لندن بھیجنے کا انتظام کرو۔ کلر نے اس سفر کے لیے اخراجات کا بندوبست کر دیا۔

وہ سمارا کے ریلوے اسٹیشن پہنچ ضرور گیا لیکن ڈبے میں بیٹھا نہیں کیوں کہ پولیس اسے پہچان سکتی تھی۔ اس نے اپنی جگہ ایک اور شخص کو ڈبے میں بٹھا دیا جسے وہ اپنے ساتھ لایا تھا اور خود باہر کھیتوں میں اس وقت تک ٹہلتا رہا۔ جب تک ریل نے چلنے کی سیٹی نہیں بجادی وہ بھاگ کر ٹرین میں بیٹھ گیا۔ اس کی سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص چلتی ٹرین سے کود گیا۔

کسی مشکل کے بغیر وہ بارڈر پر پہنچ گیا۔ آخری اسٹیشن پر پولیس والے نے اس سے پاسپورٹ طلب کیا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ پاسپورٹ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ پولیس والے نے پاسپورٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اندراجات پڑھے اور پاسپورٹ اسے واپس کر کے تسلی کا اظہار کیا۔ اسے بڑی حیرت ہوئی کیوں کہ یہ پاسپورٹ اس نے خود جعلی طور پر تیار کیا تھا۔ اسے خود بخود ہنسی آگئی۔ یہ ہے یہاں کی پولیس۔ جعلی پاسپورٹ بھی نہیں پکڑ سکی۔ یہاں اسے ایک لڑکا ملا جو اس کے ساتھ کبھی پڑھتا رہا تھا اور لوگوں سے پیسے لے کر سرحد پار کرواتا تھا۔ وہ اسے ایک گھر میں لے گیا۔ ''کھڑکی کے راستے اندر چلے جاؤ۔'' اس نے کہا۔

''وہ کیوں؟''

''تمہیں رات یہاں گزارنی ہوگی۔''

''یہ کس کا گھر ہے۔''

''کسی کا بھی ہو تمہیں اس سے کیا۔ صبح پیسے تیار رکھنا

میں آؤں گا اور تمہیں سرحد پار کرادوں گا۔"

"مجھ سے بھی پیسے لوگے؟"

"کاروبار اپنی جگہ۔"

وہ کھڑکی سے کود کر اندر چلا گیا۔ ایک بستر پڑا تھا اس پر لیٹ گیا۔ ابھی آنکھیں بند ہی کی تھیں کہ کمرے میں روشنی ہوئی۔ ایک آدمی موم بتی پکڑے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"تم کون ہو؟" ٹراٹسکی نے خوف زدہ آواز میں کہا۔

"بہت خوب! میرے بستر پر لیٹے ہو اور مجھ سے پوچھ رہے ہو۔ میں اس گھر کا مالک ہوں۔"

"اس نے تو مجھ سے کہا تھا تم صبح آؤ گے۔"

"میرا گھر ہے میں جس وقت چاہوں گھر میں داخل ہوں۔" پھر اس نے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم ہے یہ حرکت الیگزینڈر کی ہوگی۔"

"آپ نے ٹھیک کہا وہ الیگزینڈر ہی تھا۔"

مالک مکان اس وضاحت کے بعد مطمئن ہو گیا۔ ٹراٹسکی نے یہ رات اس مکان میں گزاری۔ مالک مکان شفقت سے پیش آتا رہا۔ صبح ہوئی تو اس نے ناشتا بھی کرایا۔ الیگزینڈر آیا مگر اس طرح جیسے طوفان آتا ہے۔ کوئی بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اپنے پیسے کھرے کیے اور اسے لے جا کر اسمگلروں کے حوالے کر دیا۔ یہ لوگ اسے ایک باڑے میں لے گئے۔ اب دن بھر اسے اس باڑے میں گزارنا تھا اور رات کو سفر کرنا تھا۔ رات ہوئی تو ایک یوکرائنی کسان آیا۔ طوفانی بارش شروع ہو گئی تھی لیکن اندھیرے اور بارش کے باوجود وہ اسے سرحد کی طرف لے کر چل دیا۔ وہ ایک چھکڑے پر سوار تھے جو ہرگز اس تیز بارش میں چلنے کے لائق نہیں تھا۔ یہی ہوا کہ ایک جگہ دونوں مسافروں سمیت الٹ گیا۔ دونوں کیچڑ میں لت پت ہو گئے۔

"میری پشت پر سوار ہو جاؤ۔ آگے پانی ہے۔"

وہ کچھ ہچکچایا اور بالآخر اس کسان کی پشت پر سوار ہو کر سفر جاری رکھنا پڑا۔ بارش تھپیڑے مار رہی تھی اور کسان اس کا بوجھ اٹھائے پانی میں قدم قدم بڑی مشکل سے چل رہا تھا۔ وہ کسان اسے ایک جھونپڑے تک لے گیا جہاں ان دونوں کو اپنے کپڑے خشک کرنے تھے لیکن اس کا معاوضہ دینا تھا۔ معاوضہ تھا جھونپڑے میں پناہ لینے کا۔ اس کے مالی ذرائع بڑی تیزی سے خرچ ہو رہے تھے مگر وہ مجبور تھا۔ ابھی اسٹیشن پر پہنچنے کے لیے مزید آٹھ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا تھا۔

اسے پھر دو پہیوں والے ایک چھکڑے پر سفر کرنا پڑا جسے ایک یہودی مزدور چلا رہا تھا۔ بہرحال وہ ٹرین آنے سے بہت پہلے اسٹیشن پر پہنچ گیا۔

وہ 1902ء کے موسمِ خزاں میں زیورچ سے پیرس کے راستے لندن تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے گھوڑا گاڑی والے کو وہ پرچا تھما دیا جس پر لینن کے گھر کا ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ یہ صبح کا وقت تھا لینن ابھی بستر سے نہیں نکلا تھا۔ اس کی ملازمہ نے ٹراٹسکی کو اس کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ وہ اتنی صبح اسے اپنے سامنے دیکھ کر حیران سا ہو گیا تھا۔ یہ لینن سے اس کی پہلی ملاقات تھی۔ اس کی ملازمہ نے ہی اسے بتایا تھا کہ پیرو آ گیا ہے۔

کچھ دیر گھر میں گزارنے کے بعد لینن اسے لے کر لندن کی سیر کو نکل گیا۔ سیر کم اور باتیں زیادہ ہوتی رہیں۔ ٹراٹسکی نے اسے سائبیریا کے بارے میں بتایا۔ اس نے توجہ دلائی کہ وہاں ایک مرکزی تنظیم کی ضرورت ہے۔ ماسکو کے قید خانے کا احوال سناتا رہا۔ اس نے یہ کہہ کر اسے خوش کر دیا کہ اس نے لینن کی کتاب پڑھی ہے۔ آخر میں یہ طے ہوا کہ ٹراٹسکی کچھ دن یہاں ٹھہرے۔ اردگرد کا جائزہ لے اور کچھ عرصے بعد غیر قانونی طور پر دوبارہ روس میں داخل ہو اور وہاں انقلاب کے لیے کام کرے۔ اس کی رہائش کا بندوبست کر دیا گیا۔ اس نے یہاں رہ کر اسکرا میں شائع ہونے والے تبصروں اور مضامین کا مطالعہ شروع کر دیا اور پھر خود بھی اس کے لیے لکھنا شروع کر دیا۔ لینن کی معرفت سے اسے بھی برٹش میوزیم لائبریری میں داخلہ مل گیا۔ کتابوں کی بہتات دیکھ کر وہ ان پر ٹوٹ پڑا لیکن جلد ہی اسے لیکچرز دینے کے لیے پیرس بھیج دیا گیا۔ پیرس گئے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ اسے تار دے کر لندن بلا لیا گیا۔ لینن اسے روس بھیجنا چاہتا تھا کیوں کہ وہاں وسیع پیمانے پر گرفتاریاں ہو رہی تھیں اور تنظیم چلانے کے لیے وہاں آدمیوں کی کمی پڑ گئی تھی۔ وہ فوراً لندن پہنچا لیکن اس عرصے میں لینن نے منصوبہ بدل دیا تھا۔

اسے ایک مرتبہ پھر پیرس بھیج دیا گیا۔ یہاں لندن کے مقابلے میں روسی طلبہ بہت بڑی تعداد میں تھے۔ انہیں انقلاب کے لیے تیار کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ کام ٹراٹسکی کے سپرد کیا گیا تھا۔ یہ کام وہ پوری تندہی سے انجام دے رہا تھا۔ یہاں مارکس ازم کے مخالف بھی تھے جن سے مناظرے بھی ہوتے رہتے تھے۔

پیرس میں کام ختم کرنے کے بعد وہ ریسلز، لیگ اور سوئٹزرلینڈ میں روسی طلبہ کی کالونیوں اور بعض جرمن آبادیوں میں لیکچر دینے چلا گیا۔

لندن میں اخبار اسکرا کو مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ لہٰذا لینن اسے جنیوا لے آیا۔ ٹرائسکی کو بھی جنیوا بلا لیا گیا۔ وہ چونکہ جلاوطنی کے دوران سائبیرین یونین سے قریب رہا تھا اس لیے جب نئے سرے سے تنظیم سازی کی گئی تو اسے اس کا نمائندہ بنا دیا گیا تھا۔ لینن کی پارٹی میں ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی۔ کوئی سخت رویے کا قائل تھا کوئی نرمی چاہتا تھا۔ لینن مزدوروں کو مسلح ہونے کی تلقین کر رہا تھا۔

اس نے ایک طالب علم کے ذریعے نیا پاسپورٹ حاصل کیا اور اپنی دوسری بیوی اناطالیہ کے ہمراہ میونخ چلا گیا۔ وہاں ایک کامریڈ تھی پاروس نے اسے اپنے گھر ٹھہرایا۔

”دوست! تم نے ٹھیک لکھا تھا۔ واقعات نے تمہارے تجزیے کی تصدیق کر دی ہے۔ اب اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ لڑائی کے لیے عام ہڑتال بڑا ضروری ہتھیار ہے۔ 22 جنوری 1905ء کی ہڑتال ایک سیاسی ہڑتال تھی۔ جس میں زار کی پولیس نے گولی چلائی اور ہزاروں محنت کشوں کو ہلاک اور زخمی کر دیا۔ اب روس میں انقلاب محنت کشوں کی جمہوری حکومت لا کر ہی رہے گا۔“ پاروس کہہ رہا تھا۔

”میرے دوست میں اس کے لیے کوشش کر رہا ہوں اور تہیہ کر لیا ہے کہ روس جاؤں گا۔ اب جو کرنا ہے مجھے ہی کرنا ہے۔“

اس نے ایک ہیئر ڈریسر کے ذریعے اپنا حلیہ تبدیل کیا کیوں کہ اس کا پہلا حلیہ روسی پولیس اور اس کے بیرونی گماشتوں کی نظر میں آ چکا تھا۔

حلیہ تبدیل ہوتے ہی وہ میونخ سے ویانا چلا گیا۔ یہاں بھی زیادہ دن نہ ٹھہر سکا۔ ایک فرضی نام کے پاسپورٹ پر وہ کیف پہنچا۔ اس کی بیوی اس سے پہلے ہی پہنچ گئی تھی۔ چند ہفتوں تک وہ ایک گھر سے دوسرے گھر منتقل ہوتے رہے۔

زیرِ زمین پرنٹنگ پریس ان دنوں کیف میں کام کرتی تھی اور خفیہ پولیس کے چھاپوں کے باوجود پولیس کی ناک کے نیچے کام کر رہی تھی۔ یہ پریس کراسن نامی ایک انجینئر کی زیرِ نگرانی کام کر رہا تھا۔ یہ شخص بالشویک مرکزی کمیٹی کا رکن تھا۔ انقلابی پارٹی ان دنوں نئی نئی بنی تھی۔ اس کے ارکان کے عمل میں ابھی ناپختگی تھی۔ ادبی حلقوں کے ساتھ ساتھ ماسکو کے صنعتی علاقوں میں بھی اس کے رابطے تھے۔

کراسن سے ٹرائسکی کی ملاقات ایک تحفہ ثابت ہوئی۔

ٹرائسکی کے قدم اب ماسکو کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کارسن نے اسے پہلے سینٹ پیٹرز برگ جانے کا مشورہ دیا۔ اس نے ٹرائسکی کو کچھ خفیہ پتے بھی دیے۔ کچھ دن بعد کراسن کو بھی وہاں آنا تھا۔

پیٹرز برگ پہنچتے ہی ایک مرتبہ پھر اس نے اپنا نام تبدیل کیا۔ انقلابی حلقوں میں اسے پیٹر پیٹر دوچ کے نام سے جانا جانے لگا۔ یہاں ایک اجلاس کے بعد اس کی بیوی کو گرفتار کر لیا گیا۔ اسے کچھ عرصے کے لیے زیرِ زمین جانا پڑا اور پھر موقع ملتے ہی فن لینڈ چلا گیا۔

یہاں رہ کر اس نے اپنی تحریری سرگرمیاں شروع کر دیں جن کا محور انقلابِ روس تھا۔ ایک مضمون میں اس نے لکھا۔

”روس کو ایک جمہوری انقلاب کا سامنا ہے۔

انقلاب کی بنیاد زمین کی ملکیت کا سوال ہے۔ سیاسی طاقت پر وہی طبقہ یا جماعت قبضہ کرے گی جو زارِیت اور جاگیرداروں کے خلاف کسانوں کی قیادت کرے گی۔ آزاد خیال اور جمہوریت پسند دانشور ایسا کرنے کے اہل نہیں۔ ان کا وقت گزر چکا ہے۔ فقط محنت کشوں کے ذریعے ہی سوشل ڈیموکریسی کسانوں کو اپنی قیادت کے نیچے لا سکتی ہے۔"

فن لینڈ کا ماحول اس کی پہاڑیاں، چناروں کے درخت، جھیلیں، اس کے خزاں ایک مستقل انقلاب کی یاد دہانی کراتے رہے۔ وہ فطرت سے گلے ملنے فن لینڈ کے زیادہ اندرونی حصے میں چلا گیا اور ایک جھیل کے کنارے مکمل تنہائی میں ایک ہوٹل نما مینشن میں رہنے لگا۔

ایک روز شام کے وقت ڈاکیا کاغذوں کا ایک بنڈل لایا جو سینٹ پیٹرز برگ سے آیا تھا۔ ان کاغذوں نے اسے بتایا کہ ہڑتال ایک شہر سے دوسرے شہر تک پھیل رہی تھی۔ انقلاب اپنے پورے شباب پر تھا۔ وہ اس طوفان سے گلے ملنے کے لیے بے تاب ہو گیا۔

ماسکو کے مزدوروں نے حکومت کے خلاف مسلح بغاوت کا آغاز کر دیا تھا۔ دو بجے دن کا وقت تھا کہ توپیں گرجنے لگیں۔ زار کی فوج اور پیٹرز برگ سے آئی ہوئی پولیس نے مزدوروں پر ہلہ بول دیا۔ گھمسان کی لڑائی میں ریلوے اسٹیشن اور بازار خاص طور پر متاثر ہو رہے تھے۔ جگہ جگہ فوجیوں کو نہتا کیا جا رہا تھا۔ جنگ کے یہ شعلے ماسکو سے نکل کر دوسرے شہروں تک پھیل گئے۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے اس طوفان کے سامنے زار شاہی کے محلات زمین بوس ہو جائیں گے لیکن یہ سرگرمیاں اتنی غیر منظم ثابت ہوئیں کہ اچھا خاصا نقصان اٹھانے کے بعد زار کے فوجیوں نے اس بغاوت کو کچل دیا۔

ٹرانسکی اس طوفان سے گلے ملنے فن لینڈ سے پیٹرز برگ پہنچا تو ہڑتال اپنے عروج پر تھی مگر خطرہ یہ تھا کہ اگر تحریک کو کسی مرکزی تنظیم نے کنٹرول نہیں کیا تو یہ نتائج حاصل کیے بغیر دم توڑ دے گی۔ وہ فن لینڈ سے یہ منصوبہ اپنے ذہن میں لے کر آیا تھا کہ ایک ایسی منتخب غیر جماعتی تنظیم ہونی چاہیے جس کا ہر مندوب ایک ہزار محنت کشوں کی نمائندگی کرے۔

دس لاکھ لوگ سینٹ پیٹرز یونیورسٹی کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ بالکونی میں کھڑا انہیں بتا رہا تھا کہ وہ اپنی غیر مکمل فتح پر اس قدر شور نہ مچائیں۔

ایسا ہی ایک موقع دسمبر 1905ء میں پیش آیا جب سینٹ پیٹرز برگ کو فوج نے گھیر لیا۔ آنے جانے کے تمام راستے بند ہو گئے۔ ٹرانسکی کو ایک مرتبہ پھر گرفتار کر لیا گیا۔

اس مرتبہ اس کو پندرہ ماہ قید میں رکھنے کے بعد اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس مقدمے کی خاص بات یہ ہوئی کہ عدالت میں اس کے والد اور ماں بھی موجود تھیں۔ ایک زمانہ وہ تھا جب اس کے والد نے پہلی مرتبہ اس کی انقلابی سرگرمیوں کو دیکھ کر اس سے تعلقات منقطع کر لیے مگر اب وہ ایک اخبار کا مدیر تھا۔ بطور ادیب اس کا ایک نام تھا اور وہ سوویت کا چیئر مین تھا۔ اب وہ اس پر فخر کر رہے تھے۔ اس کی ماں رو ضرور رہی تھی لیکن اس کے یہ آنسو خوشی کے بھی ہو سکتے تھے کیوں کہ سماعت کے دوران وکیل اس کی تعریف میں زمین آسمان ایک کیے دے رہے تھے۔ اسے شاید یہ اُمید تھی کہ میں نہ صرف بری ہو جاؤں گا بلکہ مجھے کوئی امتیازی نشان بھی دیا جائے گا لیکن ہوا اس کے برعکس۔ اسے جلاوطنی کی سزا سنا دی گئی اور وہ بھی غیر معینہ عرصے کے لیے۔ اس کے ساتھ تیرہ اور قیدیوں کو بھی یہی سزا سنائی گئی۔

پندرہ دن عارضی جیل میں رہنے کے بعد انہیں بتایا گیا کہ انہیں ابدورسک نامی گاؤں میں لے جایا جائے گا جو بحر منجمد شمالی کے حلقے میں ہے۔

سفر کے دوران غیر معمولی حفاظتی ذرائع استعمال کیے گئے۔ سینٹ پیٹرز برگ میں ان سب کو کانوائے کی شکل میں لے جایا گیا۔ خفیہ پولیس کی گاڑی ساتھ ساتھ چل رہی تھی جو ہر اسٹاپ پر قیدیوں کی گاڑی کو گھیر لیتی تھی۔

متعدد ایسے علاقوں سے گزر کر جہاں کی آبادی ایک بخار میں مبتلا تھی وہ 33 دن بعد ایک مقام بیری زوف پہنچے۔ یہاں دو دن قیام کا اعلان کیا گیا۔ یہاں سے منزل مقصود یعنی ابدورسک کچھ نہیں تو پانچ سو میل دور تھا۔ یہاں سے فرار ممکن نہیں تھا کیوں کہ یہاں سے واپسی کا راستہ دریائے اوب میں سے ہو کر گزرتا تھا اس لیے محافظوں نے گھومنے پھرنے کی آزادی دے رکھی تھی۔

ٹرانسکی کے پاس اب اتنا وقت نہیں تھا کہ جلاوطنی میں ضائع کر دیتا۔ انقلاب کی منزل قریب تھی۔ وہ ہر حال میں یہاں سے فرار ہونا چاہتا تھا۔ بالآخر اس نے بیری زوف کے مکینوں میں سے ایک کو تلاش کر لیا جسے یہاں سے واپسی کا راستہ معلوم تھا۔ اس نے اسے راستہ سمجھا دیا لیکن

اس خطرے کے ساتھ کہ پولیس تو پکڑ نہیں سکتی مگر جنگل میں گم ہو جانے اور برف میں ختم ہونے کا خطرہ ضرور ہے۔ یہ فروری کا مہینہ تھا۔ برفانی طوفانوں کا مہینہ۔

قیدیوں میں ایک انقلابی ڈاکٹر تھا۔ اس کے سامنے جب یہ مسئلہ آیا تو اس نے بتایا کہ عرق النساء کے درد کا بہانہ کرکے وہ چند روز مزید اس علاقے (بیری زوف) میں رک سکتا ہوں۔ اس نے یہی بہانہ کیا۔ باقی قیدی آگے چلے گئے اسے بیری زوف میں روک لیا گیا اور اسپتال میں داخل کردیا گیا۔

وہاں کی انتظامیہ نے اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی بلکہ اگر ہمت ہو تو سیر کرنا اس کے حق میں اچھا قرار دیا گیا۔ انہیں معلوم تھا کہ یہاں سے کوئی بھاگ تو سکتا ہی نہیں۔

روشوسکی (بیری زوف کا مکین) برابر اس سے رابطے میں تھا۔ اس نے ٹراٹسکی کو ایک مقامی کسان سے ملوایا۔ اس کسان نے بڑی ہوشیاری سے فرار کا منصوبہ تیار کیا۔ اسی کسان نے ایک گائیڈ مہیا کردیا جو راستوں سے واقف تھا۔ فرار کے لیے اتوار کی نصف شب مقرر کی گئی۔ یہ وقت اور دن ایسا تھا کہ سرکاری اہل کار جو اس کی نگرانی پر مامور تھے تھیٹر دیکھنے میں مشغول ہوا کرتے تھے جو ایک بیرک میں بنایا گیا تھا۔

جب گرجے کے گھڑیال نے بارہ بجائے تو وہ اس کسان کے گھر پہنچ گیا۔ برف گاڑی اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ ٹراٹسکی اس کے پیندے میں اپنا فر کا کوٹ بچھا کر لیٹ گیا۔ کسان نے اس کے اوپر گھاس ڈال دی اور اسے رسی سے باندھ دیا اور چل پڑا۔ چند میل چلنے کے بعد گاڑی رک گئی۔ کسان نے اسے کھول دیا۔ وہ باہر نکل آیا۔ پھر اس نے سیٹی بجائی جس کا جواب فوراً آیا اور اس کے ساتھ ہی وہ گائیڈ کہیں سے نکل آیا جسے مقرر کیا گیا تھا۔ ٹراٹسکی کو اس کے ہلکے سامان کے ساتھ دوسری برف گاڑی میں منتقل کردیا گیا۔ اس کے پاس فر کے دو کوٹ، فر کی جرابیں، فر کے بوٹ، فر کی ٹوپی اور دستانے تھے یعنی سردیوں کا مکمل لباس، شراب کی چند بوتلیں بھی ساتھ تھیں۔

برف گاڑی کو ہرن چلا رہے تھے۔

برف اور جنگلوں سے گزرتے رہے۔ جب ضرورت ہوتی برف کو گرم کرکے پانی بناتے اور برف پر بیٹھ کر چائے پیتے۔ اس کا گائیڈ شراب کو ترجیح دیتا لیکن ٹراٹسکی اس پر نظر رکھتا کہ وہ زیادہ نہ پی جائے۔

آزادی ٹاور

Freedom Tower

11 ستمبر **2001**ء کو دہشت گردوں کے ہاتھوں ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی تباہی کے بعد امریکی حکومت نے بالکل اسی جگہ جولائی **2004**ء میں **1776** فٹ بلند آزادی ٹاور کا سنگِ بنیاد رکھا۔ اس موقع پر **11** ستمبر **2001**ء کے حملے میں ہلاک ہونے والے افراد کے اہلِ خانہ نے بھی شرکت کی۔ ماہرینِ تعمیرات نے دعویٰ کیا کہ یہ دنیا کی محفوظ ترین عمارت ہوگی اور اسے دنیا کی بلند ترین عمارت ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہوگا۔

آزادی ٹاور **2013**ء میں مکمل ہوا اور اس پر تقریباً **12** ارب ڈالر لاگت آئی۔ یہ **60** منزلہ ٹاور دو لاکھ **42** ہزار مربع میٹر رقبے پر ہے۔

مرسلہ: ناہید کاظمی۔ گجرات

بہ ظاہر محسوس نہیں ہوتا تھا لیکن راستہ برابر تبدیل ہو رہا تھا اور کمال یہ تھا کہ ہرن یہ جانتے تھے۔

یہ تکلیف دہ سفر ایک ہفتہ جاری رہا۔ آخر اس کے گائیڈ نے اسے چھوٹی لائن کے ایک ریلوے اسٹیشن پر چھوڑ دیا۔ یہاں وہ خود کو محفوظ نہیں سمجھ رہا تھا۔ خوف اس کی رگوں میں سرایت کرتا جارہا تھا کسی بھی وقت ابدورسک سے تار پر اطلاع آسکتی تھی کہ ایک جلاوطن قیدی فرار ہوگیا۔ اجنبی دکھائی دینے پر پولیس کے ہاتھوں بہ آسانی پکڑا جاسکتا تھا لیکن جب وہ اگلے اسٹیشن تک بہ آسانی پہنچ گیا اور اسے اس کے ہم صورت نظر آنے لگے تو اس کا خوف دور ہوگیا۔ اب اگر اطلاع آ بھی جاتی تو اتنے لوگوں میں اسے پہچاننا مشکل ہوتا۔

ایک قریبی ریلوے اسٹیشن سے اس نے اپنی بیوی کو تار بھیجا کہ وہ فلاں جنکشن پر اس کا انتظار کرے۔ اس کی بیوی کو یقیناً تار پڑھ کر تعجب ہوا ہوگا۔ اس کا فرار اور اتنی جلدی!

یہ تار غلط بھی نہیں ہوسکتا۔ وہ حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات لیے یقینی اور بے یقینی کی کیفیت میں ٹرین میں بیٹھ گئی اور اس جنکشن پر اتر گئی۔ دو گاڑیاں ایک ساتھ آکر

رکیں ایک اس کی ایک دوسری۔ وہ اپنی گاڑی سے اتر کر دوسری گاڑی کے ایک ایک ڈبے کو دیکھتی پھری۔ وہ کہیں بھی نہیں تھا مگر وہ تار؟ وہ مایوس ہو کر اتری ہی تھی کہ وہ اسے پلیٹ فارم پر مل گیا۔ وہ بھی اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔

سینٹ پیٹرزبرگ کے اسٹیشن پر اترتے ہی وہ سیدھا اپنے وفادار دوست ڈاکٹر لسکن کے پاس توپ خانے کے اسکول چلا گیا۔ یہ کنبہ اسے دیکھ کر جتنا حیران ہوا ایسی حیرانی اس نے کسی کے چہرے پر اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ وہ اس طرح اس کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے ان کے سامنے کوئی بھوت آگیا ہو۔ آخر انہیں یقین آگیا کہ یہ ٹراٹسکی ہی ہے۔ کچھ دیر کی گفتگو کے بعد اب یہ سوال سامنے کھڑا تھا کہ وہ خطروں میں گھرا ہوا ہے۔ ہیری زوف کے حکام نے یقیناً تار بھیج دیے ہوں گے۔ سینٹ پیٹرز برگ میں بہت سے لوگ اسے جانتے تھے۔ اس کی روپوشی زیادہ دیر چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ گرفتار کرلیا جاتا۔ اس نے اپنی بیوی اور نومولود بیٹے کے ساتھ فن لینڈ جانے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ فیصلہ اس لیے بھی مناسب تھا کہ لینن بھی ان دنوں فن لینڈ میں تھا۔ فن لینڈ پہنچ کر اس نے لینن سے ملاقات کی جو ایک دیہات میں رہ رہا تھا۔

بالشویک چپ تھے اور نئے انقلاب کی تیاری کر رہے تھے۔ اس وقت یہ بات واضح نہیں ہوئی تھی کہ انقلاب کی لہر قطعی طور پر دب گئی تھی یا یہ دوبارہ ابھرنے سے پہلے وقتی طور پر سست خرام ہوئی تھی۔ اس لیے ضروری تھا کہ تازہ انقلاب کے لیے کارکن تیار کیے جائیں۔

روس میں زار کی حکومت عوام سے ان کی انقلابی جدوجہد کا سخت انتقام لے رہی تھی۔ لاکھوں انقلابیوں کو بامشقت قید اور جلاوطنی کی سزا ملی تھی۔ ہزاروں پھانسی کے تختے پر چڑھائے گئے تھے۔ پولیس مزدوروں کی تنظیموں پر مسلسل چھاپے مار رہی تھی جس کے پیش نظر پارٹی میں بھی صورت حال ابتر ہو رہی تھی۔ اس کے ممبروں کی تعداد بہت کم ہوگئی تھی۔

اس صورت حال میں اس نے ٹرائسکی کو مشورہ دیا کہ وہ ہلسنگ فورس کے نواح میں اگلبو نامی ایک گاؤں میں رہائش اختیار کرے۔ اس نے بعض احباب کے پتے بھی دیے جنہوں نے اس کی مدد کی۔ کچھ عرصہ بعد لینن بھی وہاں قیام کرنے کے لیے آگیا۔ وہ یہاں چند ہفتے رہا۔ اس نے اپنی بیوی کو روس روانہ کردیا اور خود براستہ اسٹاک ہوم باہر چلا گیا۔

☆......☆

1907ء کی پارٹی کانگریس کا اجلاس لندن کے ایک مشہور سوشلسٹ چرچ میں منعقد ہوا۔ یہ ایک طویل پرہجوم مگر ابتری کی ماری ہوئی کانگریس تھی۔ انقلاب دب رہا تھا مگر برطانیہ کے سیاسی حلقوں میں ابھی تک دلچسپی کا باعث بنا ہوا تھا۔ پارٹی کے فنڈز میں کمی انقلاب کی لہر میں کمی کی نشاندہی کر رہی تھی۔ کانگریس کو چلانے کے لیے بھی رقم نہیں تھی۔ ہر چہرے پر ایک ہی تحریر لکھی تھی ”اب کیا ہوگا“ اچانک ایک دروازہ کھل گیا۔ ایک آزاد خیال انگریز روسی انقلاب کے لیے تین ہزار پاؤنڈ ادھار دینے کے لیے تیار ہوگیا۔ جنگ اور انقلاب کے دنوں میں پارٹی اتنی بڑی رقم کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔

یہ کانگریس چل ہی رہی تھی کہ ایک دن کلیسا کے دالان میں ایک دراز قد، گول چہرے اور متناسب جسم والے ایک آدمی نے جس نے گول ہیٹ پہن رکھا تھا ٹراٹسکی کو روک لیا۔

”میں تمہارا مداح ہوں۔“

”مداح؟ میں نے ایسا کون سا کارنامہ انجام دے دیا۔“

”آپ ایک شاندار ادیب ہیں۔ میں نے آپ کے وہ سیاسی پمفلٹ پڑھے ہیں جو آپ نے جیل میں لکھے تھے۔“

”یہ پمفلٹ پڑھنے کے لیے ہی تھے۔“

”میں ان پمفلٹوں کی ادبی اہمیت کو پرکھ سکتا ہوں کیونکہ میرا نام میکسم گورکی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کے لیے ہنسا تھا۔

”اب میرے لیے یہ کہنا بہت مشکل ہوگیا ہے کہ میں بھی آپ کا مداح ہوں۔“ اس مرتبہ ہنسنے کی باری ٹراٹسکی کی تھی۔ دونوں میں جلد دوستی ہوگئی۔ کئی دن ایک ساتھ گھومتے پھرتے گزر گئے۔

اس کی بیوی برلن میں تھی۔ وہ اس سے ملنے برلن چلا گیا۔ اس نے یہاں رہ کر اپنی کتاب ”روس انقلاب کی زد میں“ شائع کی پھر دونوں میاں بیوی سوئٹزرلینڈ کی آوارہ گردی پر نکل گئے۔

سوشلسٹ انٹرنیشنل کانگریس میں ابھی تک انقلابی طریقے کار سے مایوسی کا اظہار صاف محسوس ہو رہا تھا۔

برلن میں پولیس کی وجہ سے اس کا رہنا مشکل ہو گیا تو ویانا چلا گیا۔ اس کی بیوی بھی بیٹے کو لے کر وہاں آ گئی۔ انقلاب کی نئی لہر کے انتظار میں اس نے شہر کے مضافات میں ہلل ڈورف میں رہائش اختیار کر لی۔

اس نے ویانا سے روسی زبان میں ''پراودا'' (سچائی) کے نام سے اخبار نکالنا شروع کر دیا۔ یہ محنت کشوں کا اخبار تھا۔ یہ اخبار بحراسود اور سرحد کے ذریعے روس بھیجا جاتا تھا۔

انقلاب کا نظریہ رد کر دیا گیا تھا لیکن ٹراٹسکی اسے زندہ رکھنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ وہ مضامین پر مضامین لکھتا رہا۔ انقلابی تحریک میں سانسیں پھونکتا رہا۔ اس کے لیے طریقہ کار وضع کرتا رہا۔

کسان تحریک کو جو سب سے بڑی تاریخی بیماری ہے وہ اپنی جگہ نہ چھوڑنے کی بیماری ہے۔ وہ گاؤں میں رہ کر جاگیردار کی زمین پر قبضہ کرنے کی خاطر اسے لوٹنا چاہتا ہے مگر جب کوئی محنت کش اس کی طرف آتا ہے تو وہ فوجی وردی پہن کر جاگیردار کی زمین کی حفاظت پر اتر آتا ہے۔

شہروں اور دیہات میں اپنی تحریک کو زیادہ وسعت دینے کے لیے ہماری پارٹی کو کسانوں کے اندر اپنا اثر پھیلانے کی خاطر مزید کس قدر کام کی ضرورت ہے۔ یہ بات بھی پیش نظر رکھنی پڑے گی تاکہ سیاسی اقتدار کے لالچ میں ہم کہیں ہتھیار رکھ نہ دیں۔ انقلاب کی نئی لہر ابھرنے پر ایسا ہونے کے امکانات ہوتے ہیں۔ کسانوں کو نظر انداز کرنے یا زرعی سوال کے اوپر سے چھلانگ لگانے سے کیا نتائج برآمد ہوں گے۔ یہ بھی دیکھنا پڑے گا۔

ایسے مضامین کے ساتھ ساتھ وہ پُر اُمید بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے پراودا کی ایک اشاعت میں لکھا۔

''اس وقت جب رجعت پسندی کے سیاہ بادلوں نے ہمیں گھیرا ہوا ہے۔ ہمیں ایک نئے ظفر مند اکتوبر کا عکس دکھائی دے رہا ہے۔''

اس کے اس جملے کا مذاق اڑایا گیا۔ اب انقلاب خواب بن گیا تھا اور وہ اس خواب کو دوبارہ دکھا رہا تھا۔

اب اسے پارٹی نظریات کے برعکس اپنے طور پر کام کرنا تھا۔ لینن کی پروا کیے بغیر۔

ویانا میں کوپن ہیگن میں شمولیت کے لیے جاتے وقت ایک اسٹیشن پر اس کی ملاقات لینن سے ہو گئی۔ وہ پیرس سے آرہا تھا اور ٹراٹسکی کو گاڑی تبدیل کرنی تھی۔ دونوں کے پاس ایک گھنٹا تھا۔ دونوں میں پارٹی تنظیم کے متعلق گفتگو ہونے لگی۔

ٹراٹسکی کی دلیل یہ تھی کہ چیک ٹریڈ یونینوں کے الگ ہو جانے کا الزام اگر کسی پر دیا جاسکتا ہے تو سب سے پہلے وہ ویانا کے رہنما تھے جو بلند آوازوں میں دنیا کے مزدوروں کو جن میں چیک مزدور بھی شامل تھے متحد ہو کر لڑنے کی اپیل کرتے اور بعد میں پس پردہ مطلق العنانیت سے سودا کر کے بات ختم کر دیتے تھے۔

لینن اس کی باتیں توجہ سے سنتا رہا لیکن جب اس نے اپنے ایک مضمون کے بارے میں لینن کو بتایا تو اس میں کچھ ایسی باتیں تھیں کہ لینن بھڑک اٹھا۔

''تم ایسا بھی لکھ سکتے ہو۔'' لینن نے ملامتی انداز میں کہا اور پھر اسے حکم دیا۔ ''تار بھیج کر اس مضمون کی اشاعت رکوادو۔''

''نہیں۔'' ٹراٹسکی نے کہا۔ ''اس مضمون کو آج صبح کے شمارے میں شائع ہو جانا ہے۔ اب اسے رکوانے کا کوئی فائدہ نہیں۔''

ٹراٹسکی سمجھ رہا تھا کہ اس نے لینن کو مطمئن کر دیا ہے لیکن اس نے مطمئن نہیں کیا تھا۔ لینن نے کانگریس میں اس کے مضمون کی مذمت کرنے کے لیے کہا لیکن مندوبین کی اکثریت نے اس مضمون کی مذمت سے انکار کر دیا۔

وہ رد انقلاب اور پسپائی کے زمانے میں تجارت اور صنعت کے مسئلے پر عالمی اور قومی سطح پر مطالعہ کرتا رہا تھا۔ اس کا مشن یہ تھا کہ تجارت وصنعت اور انقلابی جدوجہد کے درمیان تعلق دریافت کرے۔

روس اس وقت جاپان سے جنگ کی وجہ سے اپنی بنیادوں تک ہلا ہوا تھا۔ پارٹی کی متفقہ رائے یہ تھی کہ یہ بحران انقلابی جدوجہد کو تیز کردے گا جب کہ ٹراٹسکی کا مؤقف یہ تھا کہ ایسے حالات مزدوروں کو سیاسی طور پر کمزور کر دیں گے۔ ان حالات میں صنعتی احیاء ہی محنت کشوں کو ایک دوسرے کے قریب لا کر ان کے اعتماد کو بحال کر سکتا ہے اور مزید جدوجہد کے قابل بنا سکتا ہے۔ اس کے اس تجزیے کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔

پارٹی کے معیشت دانوں نے بھی رد انقلاب کے زمانے میں صنعتی ابھار کو ناممکن قرار دیا۔ ٹراٹسکی کی دلیل یہ تھی کہ صنعتی احیا ضروری ہے۔ اس سے ہڑتالوں کی ایک نئی لہر اٹھے گی جس سے ایک نیا اقتصادی بحران پیدا ہوگا جو اپنے ساتھ انقلابی جدوجہد کا جذبہ لے کر آئے گا۔

اس کے یہ خیالات بعد میں حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئے۔ 1910ء میں ایک صنعتی ابھار آیا اور یہ اپنے ساتھ ہڑتالیں لایا۔ 1912ء میں سونے کی کانوں میں محنت کشوں پر گولی چلنے سے پورے ملک میں ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

اسے اب بھی اُمید تھی کہ نیا انقلاب پارٹی کے اس دھڑے کو انقلاب نہیں چاہتا، انقلاب کو رد کرتا رہا ہے۔ انقلابی راستہ اختیار کرے گا۔

اس نے تمام دھڑوں کے اتحاد کے لیے کوششیں شروع کردیں۔ اس نے ایک متحدہ کانفرنس بلانے کی کوشش کی لیکن لینن اس اتحاد کے خلاف تھا۔

1912ء میں ویانا کانفرنس بالشویکوں کے بغیر منعقد ہوئی۔

سوشل انقلابیوں اور جمہوری اصلاح پسندوں کا گہری داخلی مخالفت کی وجہ سے روزانہ ٹکراؤ ناگزیر تھا۔ اس کے خلاف یہ پروپیگنڈا کیا جانے لگا کہ وہ دونوں دھڑوں میں مصالحت نہیں چاہتا۔

☆......☆

ویانا میں پبلسٹی بورڈوں پر یہ نعرہ لکھا ہوا تھا۔ ''سربوں کی قسمت میں موت لکھی گئی ہے۔'' پھر یہ نعرہ لڑکے گلی گلی لے اڑے۔ کچھ لڑکے اس کے جواب میں سرب زندہ باد کے نعرے بھی لگا رہے تھے۔ ان مخالفانہ نعروں کے جواب میں مارکٹائی بھی ہورہی تھی۔

ٹراسکی ویانا کی مانوس سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ نیشن ایبل چوک لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ ایک ایسا ہجوم تھا جس کے اندر اُمیدیں جاگ اٹھی تھیں۔ یہ ویسا ہی اُمیدوں بھرا ہجوم تھا جو اس نے 1905ء کے انقلاب کے دنوں میں سینٹ پیٹرزبرگ میں دیکھا تھا۔ اس نے کسی جگہ لکھا تھا اور اب یاد آرہا تھا۔

''جنگ اکثر اوقات انقلاب کی ماں ثابت ہوتی ہے۔''

پھر وہ وقت آگیا کہ جرمن نے روس کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا۔ اس سے پہلے ہی روسیوں نے ویانا چھوڑنا شروع کردیا تھا۔ یہ امکان ظاہر کیا جارہا تھا کہ کل تک تمام روسی گرفتار کرلیے جائیں گے۔ وہ بھی ویانا میں گزارے ہوئے سات سال، تعلقات، کتابیں اور مکمل تحریریں چھوڑ کر بیوی بچوں کے ہمراہ زیورچ جانے والی ٹرین میں بیٹھ گیا۔

اسے یہ سن کر دکھ ہوا کہ جرمن سوشل ڈیموکریسی نے فوج کی اطاعت قبول کرلی تھی۔ وہ جرمن سوشلزم کا کچھ ایسا زیادہ پرستار نہیں تھا لیکن اس سے سوشلزم کی کمزوری ضرور ظاہر ہورہی تھی۔

سوئٹزر لینڈ چونکہ کمزور تھا لہٰذا اس نے غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ بھی سوئٹزر لینڈ میں پناہ گزیں ہوگیا۔

سوئس فوج بھی متحرک ہوگئی تھی۔ توپوں کی مشق کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ ٹراسکی جس قصبے میں پناہ لیے ہوئے تھا ایک بڑا انگلستان لگتا تھا جس کے چاروں طرف جنگ کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

روس کے جنوب میں کیف سکایا میل مارکسٹوں کا سب سے مقبول اخبار تھا۔ اس اخبار کے لیے وہ مختلف موضوعات پر مضامین لکھتا رہا تھا۔ اس اخبار نے جب اسے یہ پیشکش کی کہ وہ اس کا جنگی نمائندہ بن جائے تو اس نے یہ پیش کش بڑے شوق سے قبول کی کیونکہ اس طرح جنگ کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔

اس نے جنگی نمائندے کی حیثیت سے فرانس کی سرحد عبور کی۔ پیرس غم زدہ تھا۔ اس کی شامیں اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اس کے پہنچنے کے بعد جنگ اور زیادہ تیز ہوگئی تھی۔ تباہی پوری رفتار سے پنجے گاڑ رہی تھی۔

اس کے پہنچنے کے چند ماہ بعد اس کے بیوی بچے بھی آگئے اور ایک چھوٹے سے گھر میں رہائش پذیر ہوگئے جو ایک اطالوی آرٹسٹ نے اسے دیا تھا۔ فرانسیسی سوشلسٹ پارٹی مکمل طور پر بے دلی کی حالت میں تھی۔

ستمبر 1916ء میں اس کے ہاتھ میں ایک حکم نامہ تھا۔ تمہیں فرانس کی حدود سے بے دخل کیا جاتا ہے۔ تحقیق نے ذرا قدم بڑھائے تو معلوم ہوا یہ روس کی خفیہ پولیس کی کارستانی ہے۔ فرانسیسی حکومت کو یہ باور کرایا گیا تھا کہ ٹراسکی نام کا ایک صحافی جو اپنا اخبار ''ناشے سلووٗ'' نکالتا ہے فرانس کی سرزمین پر روسی سپاہیوں میں بغاوت کے بیج بو رہا ہے بڑی ترکیب سے روسی سپاہیوں کی جیبوں سے اس اخبار کی کاپیاں بھی برآمد کرلی گئیں۔

جنگ جاری تھی اور روس فرانس کا اتحادی تھا لہٰذا فرانس کو یہ گوارا نہیں ہوسکتا تھا کہ روسی سپاہیوں میں بغاوت کے بیج بوئے جائیں۔

پیرس کے ناظم نے اسے طلب کیا۔ ''برطانیہ اور اٹلی

آپ کی مہمان نوازی پر تیار نہیں۔ اب یہ فرمائیے کہ آپ کہاں تشریف لے جائیں گے تا کہ آپ کو وہاں بھیجنے کا بندوبست کیا جائے۔''

''میں فی الحال تو کچھ نہیں کر سکتا۔ کئی ملکوں میں میرے دوست ہیں ان سے رابطہ کر کے ہی کچھ بتا سکتا ہوں۔''

''اس کام میں تاخیر گوارا نہیں ہوگی۔ آپ وزارت داخلہ کو جلد از جلد آگاہ کریں کہ آپ کی منزل کیا ہے۔''

برطانیہ اور اٹلی انکار کر چکے تھے۔ اب سوئٹزر لینڈ ہی رہ گیا تھا لیکن اسے اس وقت تعجب ہوگیا جب سوئس سفارت خانے نے اسے ویزا دینے سے انکار کر دیا۔ اس نے اپنے سوئس دوستوں کو تار بھیجا۔ انہوں نے مدد کا وعدہ بھی کیا لیکن تاخیر ہوتی گئی۔

فرانس کے حکام اس پر زور دیتے رہے کہ وہ اسپین چلا جائے۔ اس نے انکار کر دیا۔ کئی ہفتوں یہ بحث چلتی رہی اور پھر اسے فرانس سے نکال دیا گیا۔

اسپین پہنچ کر وہ میڈرڈ کے ایک ہوٹل میں ٹھہر کر سوئٹزر لینڈ کی طرف سے جواب آنے کا انتظار کرتا رہا۔ ایک روز وہاں دو نوجوان آئے اور بڑے دوستانہ انداز میں اسے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ اس کا ارادہ مزاحمت کرنے کا تھا لیکن جب انہوں نے کہا کہ وہ اسے پولیس اسٹیشن لے جا رہے ہیں تو وہ تیار ہوگیا۔

''کیا میں خود کو زیرِ حراست سمجھوں؟''

''صرف گھنٹے دو گھنٹے کے لیے۔''

وہ پولیس اسٹیشن پہنچا دیا گیا۔ یہاں اسے دو چار گھنٹے نہیں پورے سات گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ بالآخر پولیس چیف کے سامنے اس کی پیشی ہوئی اور اسے بتایا گیا۔

''آپ کو یہاں اس لیے لایا گیا ہے کہ آپ سے فوری طور پر اسپین چھوڑنے کے لیے کہا جائے اور جب تک آپ یہاں ہیں آپ آزاد نہیں ہیں۔''

وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اسپین سے نکالنا ہی تھا تو نکال دیتے اسے قید خانے میں کیوں رکھا گیا ہے۔ ضرور کہیں سے مخبری ہوگئی ہے اور اس کی اصلیت کا پتا چل گیا ہے۔

میڈرڈ کے قید خانے میں رہتے ہوئے بارہ دن ہو گئے تھے کہ ایک پولیس والے نے اسے اطلاع دی کہ اسی شام اسے کاڈز کے لیے روانہ ہونا پڑے گا۔

یہ دوسری حیرانی تھی کہ اسے کاڈز کیوں لے جایا جا رہا ہے؟

اس نے نقشہ دیکھا جس میں کاڈز یورپ کے جنوب مغربی جزیرہ نما کی انتہا پر واقع ہے۔ وہاں پہنچنے کے لیے برف گاڑی کے ذریعے یورال اور پھر سینٹ پیٹرز برگ جانا پڑتا تھا۔ وہاں سے چکر کاٹ کر آسٹریا سے سوئٹزر لینڈ اور وہاں سے فرانس اور پھر کاڈز، وہاں برِاعظم ختم ہوکر سمندر شروع ہو جاتا تھا۔

''تم لوگوں کو میرا پتا کیسے چلا۔'' ٹرائسکی نے اپنے ساتھ آئے ہوئے پولیس والوں سے پوچھا۔

''بڑی آسانی سے۔ پیرس سے ہمیں تار آگیا تھا کہ ایک خطرناک انتشار پسند سان سطیان سرحد عبور کر چکا ہے۔ وہ میڈرڈ میں رہائش اختیار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔''

اس کے ساتھ عجیب آنکھ مچولی ہو رہی تھی۔ کاڈز کے ناظم نے اسے بتایا کہ اسے نیویارک بھیجا جائے گا۔ نیویارک سے اسٹیمر آنے تک اسے کاڈز کی جیل میں رکھا جائے گا۔

کاڈز کے اکلوتے اخبار میں جنگ کی کوئی خبر شائع نہیں ہوتی تھی جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ جیسے یہ جنگ اسپین اور فرانس کے پہاڑوں سے پرے کہیں لڑی جا رہی ہو۔

نیویارک کے لیے کشتی بارسلونا سے روانہ ہوئی۔ اطالوی اور سوئس سوشلسٹوں کے دباؤ کے تحت اسے سوئٹزر لینڈ جانے کی اجازت مل گئی مگر یہ اسی وقت ہوا جب وہ امریکا جانے والی کشتی میں سوار ہو چکا تھا۔

بارسلونا سے روانگی کے بعد اس پر یورپ کے دروازے بند ہوگئے۔

وہ نیویارک پہنچ گیا تھا۔ نیویارک جو شاعری، نثر اور سرمایہ دارانہ ریل پیل کا شہر تھا۔ اس کا اخلاقی فلسفہ ڈالر کا فلسفہ تھا۔ اس نے نیویارک پہنچنے کے دو دن بعد ایک روسی اخبار میں تحریر کیا۔

''میں یورپ کو خون میں لت پت چھوڑ کر آیا ہوں لیکن میں نے اسے آنے والے انقلاب کی مضبوط اُمید پر چھوڑا ہے۔ یہ ایک جمہوری سراب نہیں ہے جس نے مجھے اس دنیا میں آنے کی ترغیب دی۔''

وہ یہاں ایک سوشلسٹ انقلابی کی حیثیت سے آیا تھا۔ اسے کام کرنے کے لیے کسی قدر سکون کی ضرورت تھی۔ اس نے محنت کشوں کے علاقے میں ایک اپارٹمنٹ کرائے

پر لے لیا۔ یہاں ٹیلی فون بھی تھا۔ وہ اور اس کے اہلِ خانہ ویانا اور پیرس میں اس پُراسرار آلے سے آشنا نہیں ہوئے تھے۔

چند دن کی سیر و تفریح کے بعد وہ کام میں مشغول ہو گیا۔ مضمون لکھتا، ایک اخبار کی ادارت کرتا اور مزدوروں کے اجلاس سے خطاب کرتا رہتا۔ وہ ان دنوں گردن تک کام میں دھنسا رہتا۔ نیویارک کی ایک لائبریری میں بڑی جانفشانی اور محنت سے امریکا کی اقتصادی تاریخ کا مطالعہ کرتا۔

ان دنوں پر امریکا جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ جرمنی کے ساتھ روس کے سفارتی تعلقات منقطع ہو گئے۔

امریکا کی سوشلزم پارٹی نظریات کے اعتبار سے یورپ کے محبِ وطن سوشلزم سے بھی گئی گزری تھی۔ ان لوگوں سے پہلی ملاقات ہی میں وہ ان کی نفرت کا نشانہ بن گیا۔ اس کے خیالات اور جذبات ان کے خلاف تھے۔

امریکی محنت کشوں میں سوشلسٹ پارٹی اور خصوصاً انقلابی فریق کے اثرات بہت کم تھے۔ اس نے ایک سخت نظریات والا مارکسی ہفت روزہ نکالنے کا فیصلہ کیا۔

☆......☆

جنگ نے طول کھینچا تو اس سے پیدا ہونے والے نتائج نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ انسانی جانوں کی قربانی نے دنیا کی آنکھیں کھول دیں۔ دولت پانی کی طرح خرچ ہو رہی تھی۔ اخراجات کا تمام بوجھ مزدوروں اور کسانوں پر آپڑا۔ ان حالات میں رائے عامہ کا جنگ کے خلاف ہو جانا فطری تھا۔ انقلابی تحریکوں میں جان پڑ گئی۔ مظاہروں اور احتجاجوں میں تیزی آ گئی۔ اس جدوجہد میں روس کے انقلابی مزدور سب سے آگے تھے۔ جنگی محاذوں پر پسپائی نے جلتی پر تیل کا کام کیا ظاہر ہو گیا کہ زارشاہی فرسودہ ہو چکی ہے اور ملک کا انتظام کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ آبادی کے تمام حصوں میں زارشاہی کے خلاف نفرت پھیل گئی۔ سب سے پہلے پیٹرزبرگ کے مزدوروں نے بغاوت کی۔ مزدوروں نے جنگ کے خلاف مظاہرے کیے پھر اسی طرح کے مظاہرے ماسکو اور دوسرے شہروں میں ہوئے۔ دو لاکھ سے زیادہ مردوں اور عورتوں نے ایک عام سیاسی ہڑتال منظم کی۔ یہ ہڑتال بڑھ کر ایک زبردست سیاسی مظاہرہ بن گئی۔ زارشاہی کو گمان بھی نہ ہوگا کہ یہ مظاہرہ حکومت کا تختہ الٹنے کا بہانہ بن جائے گا۔

خیال یہی تھا کہ دوسرے دن کام شروع ہو جائے گا لیکن دوسرے دن بھی ہڑتال جاری رہی۔

مرکزی کمیٹی نے ایک اپیل شائع کی۔

''مطلق العنانی کا تختہ الٹ دو۔ عارضی انقلابی حکومت بناؤ، جمہوری ری پبلک قائم کرو۔ آٹھ گھنٹے کام کا دن رائج کرو۔ جاگیرداروں کی زمینیں ضبط ہوں اور جنگ بندی کی جائے۔''

زار کی حکومت نے طاقت کا پرانا حربہ استعمال کیا لیکن اب طاقت سے مظاہروں کو نہیں دبایا جا سکتا تھا۔ سرکاری اہل کار اور سپاہی مزدوروں کے ساتھ مل گئے تھے۔ پیٹرزبرگ میں ہر طرف آگ لگی ہوئی تھی۔ سرکاری عمارتوں کو نشانہ بنایا جا رہا تھا۔

حقیقی انقلابی مارکس پارٹی کی قیادت میں مزدوروں اور کسانوں کی فتح ہوئی۔ مطلق العنانی کا تختہ الٹ دیا گیا۔

یہ اقتدار ابھی ادھورا تھا۔ حکومت قائم ہوئی لیکن جاگیرداروں کی۔

ابھی جدوجہد ختم نہیں ہوئی تھی۔ لینن سوئٹزرلینڈ میں اور ٹراٹسکی نیویارک میں تھا۔

☆......☆

تارگھروں میں دو تین دن کی پُراسرار خاموشی کے بعد پیٹروگراڈ کی شورش کی مبہم سی اور غیر واضح رپورٹ آئی۔ نیویارک کے محنت کشوں میں ہیجان پھیل گیا۔ امریکی پریس پر بوکھلاہٹ طاری ہو گئی۔ امریکی صحافی تصدیق کے لیے روسی اخبار نومی سر کے دفتر کی طرف بھاگ رہے تھے۔ سوشلسٹ اخباروں اور تنظیموں سے دھڑا دھڑ ٹیلی فون آ رہے تھے۔ جگہ جگہ محنت کشوں کے غیر معمولی اجلاس منعقد ہونے لگے۔

اس خبر نے خوشی سے ہیجان پیدا کر دیا کہ ''سرمائی محل'' پر سرخ جھنڈا لہرانے لگا ہے۔ اسے جب خبروں کی تصدیق ہو گئی تو اس نے بیوی کو فون کیا اور اسے بتایا کہ پیٹروگراڈ میں انقلاب برپا ہو چکا ہے۔ اس نے اسے یہ بھی بتایا کہ ہمیں پہلی فرصت میں روس واپس جانا ہوگا۔ اس وقت انقلابیوں کو سربراہی کی سخت ضرورت ہوگی اور لینن وہاں نہیں ہے۔

وہ گھر پہنچا تو اس کا بیمار بیٹا بستر پر ناچ رہا تھا۔

''اسے کیا ہوا؟''

''آپ نے خبر ہی ایسی سنا دی کہ خوشی سے ناچ رہا

ہے۔"

"اسے کیا خبر انقلاب کیا ہوتا ہے اور آزادی کسے کہتے ہیں۔"

"یہ صرف نو سال کا ہے مگر بیٹا تو تمہارا ہے۔ انقلاب کا مطلب نہیں سمجھے گا؟"

"ارے ہاں، یہ تو بیمار تھا۔"

"دیکھ لیجیے آزادی کی خبر سنتے ہی اس کی ساری بیماری رفو چکر ہوگئی۔"

"خیر اسے یہ خوشی منانے کا حق ہے۔ تم سامان وغیرہ باندھو۔ میں ویزا وغیرہ کا انتظام کرتا ہوں۔" یہ کام وہ اب تک نہ جانے کتنی مرتبہ کر چکی تھی۔

وہ ایک مرتبہ پھر گھر سے نکل گیا۔ اسے ویزے کا انتظام کرنا تھا۔ وہ روسی قونصل جنرل کے دفتر میں گیا۔ ایک تبدیلی یہاں بھی نظر آرہی تھی۔ زار نکولاس کا پورٹریٹ وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا۔ اسے چند سوال و جواب کے بعد ویزا جاری کر دیا گیا۔ برطانوی قونصلیٹ میں بھی جب وہ ان کا سوال نامہ بھر رہا تھا اسے بتایا گیا کہ اگر وہ برطانیہ کے راستے روس جانا چاہے تو برطانوی حکومت کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔

اس اجازت اور ویزے کے ساتھ وہ اپنے دو بیٹوں اور بیوی کے ہمراہ جہاز پر سوار ہو گیا۔ روس کے ساتھ برطانیہ کا جنگ میں اتحاد تھا۔ اس کے باوجود برطانوی حکام کا روسیوں کے ساتھ رویہ درست نہیں تھا۔ ہالی فیکس کے مقام پر برطانوی نیوی نے جہاز کو گھیر لیا۔ ایک افسر جہاز میں آیا اور اسے اس کی فیملی سمیت جہاز سے اتار کر ایک کشتی میں ڈال دیا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ ہائی فیکس میں تفتیش ہوگی۔

پولیس نے اس کے بیوی بچوں کو ہائی فیکس میں رکھ لیا اور اسے ٹرین کے ذریعے ایمہرسٹ لے جایا گیا جو جرمن قیدیوں کا کیمپ تھا۔

"تم موجودہ روسی حکومت کے لیے خطرناک ہو۔"

"روسی قونصل خانے نے ہمیں باقاعدہ ویزے جاری کیے ہیں۔"

"تم لوگ اتحادیوں کے لیے بھی خطرناک ہو۔"

"اس کے باوجود ہمیں ذلیل کرنے کا تمہیں کوئی حق نہیں۔"

"تم سیاسی مہاجر ہو اور کسی معقول وجہ کے بغیر اپنا ملک چھوڑا ہے لہٰذا اب تمہارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس پر حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"زار کے جس وزیر نے ہمیں سیاسی مہاجر بنایا تھا وہ خود اب جیل کے اندر ہے۔" ٹراٹسکی نے اس افسر کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آرہی تھی۔

ایمہرسٹ کا فوجی قید خانہ ایک پرانی اور خستہ حال فونڈری میں واقع تھا۔ سونے کا انتظام ایک بڑے ہال میں اوپر نیچے تین تین بستروں کی شکل میں کیا گیا تھا۔ تقریباً آٹھ سو لوگوں کو وہاں رکھا گیا تھا۔

جب ٹراٹسکی کی گرفتاری کی خبر روسی انقلابی پریس میں شائع ہوئی تو پیٹروگراڈ میں برطانوی سفارت خانے نے پیٹروگراڈ کے اخبار میں یہ خبر شائع کرائی کہ وہ روسی جو کینیڈا میں گرفتار کیے گئے تھے۔ جرمن سفارت خانے کی مالی امداد سے سفر کر رہے تھے اور انہوں نے عبوری روسی حکومت کا تختہ الٹنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔

"پراودا" نے جو لینن کے زیر ادارت شائع ہوتا تھا اس کا جواب ان الفاظ میں دیا۔

"کیا اس بات کا ایک لمحے کے لیے بھی یقین کیا جا سکتا ہے کہ ٹراٹسکی جس نے اپنا سب کچھ انقلاب کی خاطر داؤ پر لگا دیا، جرمن حکومت کے کسی اس قسم کے منصوبے میں شامل ہوگا۔"

بالآخر کوئی ایک مہینے بعد اسے کیمپ سے رہا کر دیا گیا۔ غالباً یہ سمجھ لیا گیا ہوگا کہ اب روس میں عبوری حکومت کے قدم جم چکے ہوں گے۔

اسے کہاں جانا ہے یہ قطعی نہیں بتایا گیا تھا لیکن اب اس کی منزل پیٹروگراڈ تھی۔

☆......☆

انقلاب کا قطعی وقت آ پہنچا تھا۔ یہ انقلاب کا دوسرا مرحلہ تھا۔ پہلے مرحلے میں مطلق العنانیت کا خاتمہ ہو گیا تھا لیکن اقتدار پر جاگیرداروں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ اب اقتدار جاگیرداروں سے چھیننے کا مرحلہ تھا تاکہ اقتدار سوویتو کو منتقل ہو جائے، یہ مزدوروں کا اقتدار ہوگا۔

پارٹی کی کانگریس میں فیصلہ ہو چکا تھا کہ پُرامن طریقے سے اقتدار پر قبضہ کرنے کی کوئی اُمید نہیں لہٰذا بغاوت کے ذریعے انقلاب دشمن اقتدار کا تختہ الٹنے کی جدوجہد کی جائے۔

لینن کے خطوط برابر ان کی مدد کر رہے تھے۔ سمولنی (مجلس عاملہ کا دفتر) کو ایک قلعے میں تبدیل کیا جا رہا تھا۔ اس

کی چھتوں پر مشین گنیں نصب کردی گئی تھیں۔ سمولنی کا کمانڈر کیپٹن گریکوف ایک بہادر سپاہی تھا۔

اس رات کی صبح ہوئی نہیں تھی کہ خبر آئی حکومت نے پیٹروگراڈ سوویت اور پارٹی کا اخبار بند کردیا اور پرنٹنگ پریس کی عمارت سیل کردی ہے۔ اس نے سپاہیوں کی ایک بٹالین بھیجی اور سیل توڑ دی گئی۔ فوجی انقلابی کمیٹی نے فوری یہ حکم جاری کیا کہ انقلابی اخبار کی اشاعت کا کام جاری رہے۔

ٹیلی فون ایکس چینج پر بھی گڑبڑ ہوئی۔ زیر تربیت فوجی کیڈٹوں نے اس پر قبضہ کرلیا اور انہوں نے آپریٹروں کو ہمارے فون ملانے سے منع کردیا۔

فوجی انقلابی کمیٹی نے جہاز رانوں کی ایک کمپنی وہاں بھیج دی جس نے ایکس چینج کے دروازے پر دو چھوٹی توپیں نصب کردیں۔ ٹیلی فون سروس بحال ہوگئی۔ اس طرح انتظامیہ کے اداروں کو تحویل میں لینے کا کام شروع ہوگیا۔

سمولنی کی تیسری منزل کے ایک چھوٹے سے کمرے میں کمیٹی کا اجلاس جاری تھا۔ فوجوں کی نقل و حرکت، محنت کشوں اور سپاہیوں کا رویہ، بارکوں میں مظاہرہ، قتل عام کے منصوبہ سازوں کے ارادے، غیر ملکی سفارت کاروں کی سازشیں، سرمائی محل میں ہونے والے واقعات۔ یہ سب رپورٹیں اس چھوٹے سے کمرے میں آرہی تھیں۔

24 اکتوبر کی رات کو انقلابی کمیٹی کے ارکان مختلف علاقوں میں چلے گئے۔ وہ کمرے میں اکیلا تھا اور اندازہ ہی لگا سکتا تھا کہ پُراسرار سڑکوں پر کیا ہو رہا ہوگا۔ حکومت کی طرف سے یہ حکم جاری ہو چکا ہے کہ فساد برپا کرنے والوں کو دیکھتے ہی گولی سے اڑا دیا جائے۔

حکومت ہر قدم اٹھا رہی ہے مگر اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین سرک رہی ہے۔

☆......☆

پیٹرزبرگ کی سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ زارشاہی کے زمانے کے خونخوار فوجی پہرا دے رہے تھے۔ لوگ گھروں میں بند تھے۔ لینن نے فیصلہ کیا کہ بغاوت کے صدر مقام اسمولنی پہنچ کر براہِ راست بغاوت کی رہنمائی کرے گا۔

اس نے جان کا خطرہ مول لیا اور پیٹرزبرگ کی سنسان سڑکوں سے گزرتا ہوا اسمولنی پہنچ گیا۔ جہاں ٹرائسکی پہلے سے موجود تھا اور معاملات کی پوری طرح نگرانی کررہا تھا۔ وہ چاہتا ضرور تھا کہ خانہ جنگی نہ ہو لیکن ایسا نظر نہیں آرہا تھا۔

اسمولنی میں روشنیوں کا سیلاب تھا۔ کارخانوں کے نمائندے اور سرخ گارڈ ہدایات لینے پہنچ گئے۔ لینن نے اپنے منصوبے سے انہیں آگاہ کیا۔ کارخانوں، فیکٹریوں اور محلہ کمیٹیوں کو عمل شروع کرنے کے احکامات بھیجے گئے۔

رات کے اندھیرے میں سرخ گارڈ، بالٹک بیڑے کے ملاح اور انقلابی دستے آگے بڑھے اور صبح ہوتے ہی ٹیلی فون ایکس چینج، ریڈیو اسٹیشن، پلوں، ریلوے اسٹیشنوں اور دارالحکومت کے اہم اداروں پر باغی سپاہیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔

صبح کے دس بجے پیٹرزبرگ کی فوجی انقلابی کمیٹی نے لینن کی لکھی ہوئی اپیل روس کے شہریوں کے نام شائع کی۔ اس میں اعلان کیا گیا تھا کہ عبوری حکومت کا خاتمہ کردیا گیا ہے اور اقتدار مزدوروں کے ہاتھ میں آگیا ہے۔ جس مقصد کے لیے عوام لڑ رہے تھے وہ حاصل ہوگیا ہے۔

☆......☆

اگلی صبح پیٹروگراڈ کے شہری ایک نئی حکومت کی خبر کے تحت اپنی حیرت زدہ آنکھیں ملتے ہوئے بیدار ہوئے۔ سب کی زبانوں پر ایک ہی سوال تھا یہ کیسے ممکن ہوا کہ اقتدار بالشویکوں کے ہاتھ میں آگیا؟

راتوں رات بہت کچھ بدل گیا تھا۔ کل رات ہی حکومت نے انقلابی کمیٹی کے ارکان کی گرفتاری کے احکام جاری کیے تھے۔

ایک ہی رات میں لینن کی وہ غلط فہمی بھی دور ہوگئی جو ٹرائسکی کی طرف سے اس کے دل میں آگئی تھی۔ اس نے پیٹروگراڈ کمیٹی کے اجلاس میں ببانگ دہل کہا تھا۔

ٹرائسکی کو یہ یقین ہوتے ہی کہ "منشویکوں" سے اتحاد کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ اس سے بڑا کوئی بالشویک نہیں۔

یہ مشتعل انقلاب کا نظریہ نہیں تھا جس نے دونوں کے راستے الگ الگ کیے تھے بلکہ منشویکوں کی طرف رویوں کا چھوٹا موٹا انقلاب تھا۔

سرمائی محل میں حکومت کا اجلاس ابھی تک جاری تھا لیکن یہ مرنے والے کی آخری ہچکی کی طرح تھا۔ ٹرائسکی نے پیٹروگراڈ سوویت کے سامنے بیان دیا۔

میں اعلان کرتا ہوں کہ عبوری حکومت کا اب کوئی

وجود نہیں۔ اقتدار ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں چلا گیا ہے۔ ریلوے اسٹیشن، ڈاک خانہ، تار گھر، اسٹیٹ بینک سب پر ہمارا قبضہ ہو چکا ہے۔ سرمائی محل پر ابھی قبضہ نہیں ہوا۔ اس کی قسمت کا بھی چند منٹ میں فیصلہ ہو جائے گا۔

جو حال پیٹرز برگ کا تھا وہی حال پیٹروگراڈ کا تھا۔ فرق اتنا تھا کہ یہاں لینن بھی موجود تھا جو کئی ماہ کی غیر حاضری کے بعد لوگوں کے سامنے آیا تھا۔ اس وقت وہ دونوں ایک ہی کمرے میں موجود تھے۔ شاندار فتح حاصل ہوئی تھی اور بڑی محنت کے بعد حاصل ہوئی تھی لیکن فتح کی خوشی اب تفکر آمیز اندیشوں میں ڈھل رہی تھی۔ کیا اقتدار ملنے کے بعد کے حالات پر ہم قابو پالیں گے؟ ہم ضرور قابو پا لیں گے۔ دونوں نے ایک ساتھ کہا تھا۔ پھر اچانک لینن پریشان ہو گیا۔

”سرمائی محل کا کیا ہوگا۔ اس پر ابھی تک قبضہ نہیں ہوا۔ اس میں کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟“

ٹرانسکی فون پر حالات پوچھنے کے لیے اٹھا تھا لیکن لینن نے اسے روک دیا تھا۔ وہ زیادہ دیر اس کمرے میں نہیں رہ سکتے تھے کیونکہ اسی عمارت کے بڑے ہال میں سوویتوں کی کانفرنس شروع ہو چکی تھی اور دونوں کو اس میں شریک ہونا تھا۔

وہ کانفرنس میں پہنچے تو اتحاد کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ایک مقرر مطالبہ کر رہا تھا کہ سوشلسٹ اتحادیوں اور منشویکوں کو اتحاد کر لینا چاہیے۔

جو پارٹیاں کل تک اقتدار میں تھیں اور انقلابیوں کو جیل میں ڈال رہی تھیں اب اقتدار سے محروم ہو گئی تھیں تو اتحاد کا مطالبہ کر رہی تھیں۔

ٹرانسکی سے یہ مطالبہ برداشت نہ ہوا۔ اس نے دو ٹوک جواب دیا۔

”ایک شورش برپا ہوئی ہے۔ یہ کوئی سازش نہیں ہے۔ عوام کی بیداری کی کوئی منطق نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کا جواز تلاش کیا جاتا ہے۔ ہم محنت کشوں اور سپاہیوں کو مضبوط کر رہے تھے۔ ایک عوامی شورش کو ہم کھلم کھلا لوگوں کی رضا کے لیے آگے لے جا رہے تھے۔ ہماری شورش جیت گئی ہے۔ اب ہم سے کہا جا رہا ہے کہ ہم اپنی فتح کو بھول جائیں۔ اتحاد کر لیں مگر کس کے ساتھ؟ ٹوٹے ہوئے لوگوں کے ساتھ؟ دیوالیہ ہونے والے لوگوں کے ساتھ؟ نہیں ہرگز نہیں۔“

اس موقع پر اسٹالن سے اس کے شدید اختلافات ہو گئے جو منشویکوں اور بالشویکوں کے ادغام کے حق میں تھا۔ اسٹالن خاموش تھا لیکن اس بات کی کوشش ضرور ہو رہی تھی کہ لینن اور ٹرانسکی میں غلط فہمیاں پیدا کی جائیں۔ اس کے لیے بہترین راستہ یہ تھا کہ انقلاب میں کامیابی کا سہرا کسی ایک کے سر باندھ دیا جائے اور یہ تاثر دیا جائے کہ اس شخصیت نے انقلاب کا سہرا خود اپنے سر باندھ لیا ہے۔ اس کے لیے ٹرانسکی ازم اور لینن ازم کی اصطلاحات گھڑی گئیں اور یہ جیت ٹرانسکی ازم کی ہے۔ ٹرانسکی کو وضاحت کرنی پڑی۔

”لینن میرے نقطہ نظر کی طرف نہیں آیا تھا بلکہ اس نے یہ نقطہ نظر اپنے طور پر واقعات کے پیشِ نظر وضع کیا تھا۔ یہ الگ بات کہ دونوں نقطہ ہائے نظر میں مماثلت پیدا ہوگئی تھی۔“

☆......☆

لینن اور ٹرانسکی پیٹروگراڈ میں ہیں۔ انقلاب مکمل ہو

چکا ہے۔ سرمامحل پر قبضہ ہوتے ہی اقتدار سوشلسٹ انقلابیوں کے ہاتھوں میں آگیا ہے۔ لینن ابھی تک بے یقینی کی کیفیت میں ہے۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہیں لیکن ذہن جاگ رہا ہے۔ وہ ٹرائسکی سے کہتا ہے۔

''چھپتے پھرنے اور زیرزمین زندگی گزارنے سے ہم ایک دم اقتدار میں کیسے آگئے؟'' پھر وہ کہتا ہے چلو اگلا کام کریں۔

اب حکومت قائم کرنے کا مرحلہ ہے۔ مرکزی کمیٹی کے بعض ارکان موجود ہیں۔ کمرے کے ایک کونے میں ہنگامی اجلاس شروع ہوجاتا ہے۔

''ہمیں ان کا کیا نام رکھنا چاہیے۔'' لینن نے ارکان کی طرف دیکھتے ہوئے ٹرائسکی سے کہا۔ ''وزیروں کے علاوہ کوئی نام بتاؤ۔ یہ خبر اور مطلق العنانیت کی یادگار ہے۔''

''ہم انہیں کمسار کہہ سکتے ہیں۔'' ٹرائسکی نے کہا۔

''ہمارے پاس تو پہلے ہی بہت سے کمسار ہیں۔''

''سپریم کمسار کیسا رہے گا۔''

''سپریم اچھا نہیں لگتا۔ اس لفظ سے غرور اور انانیت کی بو آتی ہے۔ ہم سب ایک ہیں کوئی کسی سے برتر نہیں۔''

''عوامی کمسار ٹھیک رہے گا؟''

''ہاں اس سے کام چل جائے گا۔'' لینن نے کہا۔

''اور حکومت کا نام کیا رکھا جائے۔''

''سوویت۔ عوامی کمساروں کی سوویت۔'' ٹرائسکی نے نام دیا۔

''بہت خوب! یہ انقلابی نام لگتا ہے۔''

لینن نے اس پر بھروسا کرتے ہوئے اسے عوامی کمساروں کی سوویت کا چیئرمین چن لینے کی تجویز پیش کی۔ اس نے ہلکا سا احتجاج کیا۔

''اس میں کیا حرج ہے۔ تم پیٹروگراڈ سوویت کے چیئرمین تھے جس نے اقتدار پر قبضہ کیا ہے۔'' وہ اصرار کرتا رہا لیکن تجویز منظور ہوگئی۔

اقتدار پر قبضے کے بعد یہ سوال سامنے آیا کہ ٹرائسکی کو کون سا عہدہ دیا جائے۔ اس کی رائے بھی لی گئی۔ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے کبھی کسی سرکاری عہدے کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ اس نے تو جوانی ہی سے بلکہ بچپن سے ادیب بننے کا خواب دیکھا تھا۔ پھر اس نے اپنے ادبی کام کو انقلاب کے تابع کردیا۔ انقلابی حکومت کے پروگراموں کے بارے میں بہت کچھ لکھتا رہا لیکن اقتدار حاصل کرنے کے بعد مجھے کون سا عہدہ لینا ہے۔ یہ خیال کبھی آیا ہی نہیں تھا۔

''میں تو حکومت سے باہر رہنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ مجھے پریس کی نگرانی اور اسے ہدایات جاری رکھنے کی خدمات دے دی جائیں تاکہ پس منظر میں جا کر تھوڑی دیر کو آرام کرلوں۔''

لینن اس سے متفق نہیں ہوا۔ اس کا اصرار تھا کہ ٹرائسکی کو وزیر داخلہ ہونا چاہیے۔ ٹرائسکی کے لیے یہ سب سے مشکل کام تھا کیوں کہ اس میں رد انقلاب کے خلاف جنگ کرنی پڑتی۔ اس نے اپنی دانست میں نہایت معقول جواز پیش کیا۔

''میں یہودی ہوں اور دشمنوں کے ہاتھ میں یہ نیا ہتھیار نہیں دینا چاہتا۔''

''ہم نے ایک عظیم بین الاقوامی انقلاب برپا کیا ہے۔ اس میں ایسی چھوٹی باتوں کی کیا اہمیت ہے۔''

''بلاشبہ انقلاب برپا ہوگیا ہے مگر ابھی بہت سے احمقوں سے نمٹنا باقی ہے۔''

''ہمیں احمقوں کے ساتھ تو نہیں چلنا۔''

''پھر بھی احمقوں کو کچھ نہ کچھ رعایت تو دینی پڑتی ہے۔ ہمیں شروع سے ہی متنازع بننے کی کیا ضرورت ہے۔''

لینن اسے وزیر داخلہ بنانے پر بضد تھا لیکن ٹرائسکی نے مرکزی کمیٹی کے بعض ارکان کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ لینن اقلیت میں رہ گیا۔ ارکان نے فیصلہ کیا کہ ٹرائسکی کو خارجہ امور کا محکمہ دیا جائے۔ لینن اب مجبور تھا۔ ٹرائسکی نے بھی اتفاق کرلیا اور وہ خارجہ امور کا انچارج بن گیا۔ یہ عہدہ عارضی تھا۔ چچیرن لندن میں قید تھا۔ اس کی رہائی کے بعد یہ عہدہ اسے دینا تھا۔ تقریباً سال بھر بعد اسے رہائی مل گئی۔ اس کے آنے کے بعد ٹرائسکی نے وزارت خارجہ کا منصب بڑی خوشی سے اس کے حوالے کردیا۔

انقلاب کے مخالفین خاموش ہوگئے تھے غائب نہیں ہوئے تھے۔ اندر بیٹھے دشمنوں نے فوج تیار کر کے کئی محاذ کھول دیے تھے۔ لہٰذا لینن نے مشورہ دیا کہ وہ فوجی آپریشن کی کمان سنبھال لے۔ وہ فوجی حکمت عملی کا ہرگز ماہر نہیں تھا لیکن لینن کی ضد کے آگے اسے وزیر دفاع کا عہدہ قبول کرنا پڑا۔

کام کی تبدیلی کے ساتھ ہی حکومت کی جگہ بھی تبدیل

ہوگئی۔ حکومت کا ماسکو منتقل ہو جانا پیٹروگراڈ پر ایک بھاری ضرب تھی۔ اس نقل مکانی کی مخالفت سب سے زیادہ زینو شیف نے کی جو اس وقت پیٹروگراڈ سوویت کا چیئرمین تھا۔ اکثریت کو یہ خدشہ تھا کہ اس تبدیلی کا پیٹروگراڈ کے محنت کشوں پر برا اثر پڑے گا۔ یہ افواہیں بھی پھیلائی جارہی تھیں کہ پیٹروگراڈ قیصر ولیم کے حوالے کردیا جائے گا۔ اس کے برخلاف لینن اور ٹراٹسکی کی دلیل یہ تھی کہ حکومت ماسکو منتقل ہو جانے سے حکومت ہی نہیں، پیٹروگراڈ بھی محفوظ ہو جائے گا۔ انقلابی دارالحکومت اور اس کی حکومت کو ایک ہی حملے میں فتح کرلینے کی خواہش جرمنی کی بھی تھی اور اتحادیوں کی بھی۔ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی اس لیے یہ حکمتِ عملی نہایت درست تھی کہ حکومت اور انقلابی دارالحکومت کو الگ کردیا جائے۔ مرکزی کمیٹی کی منظوری کے بعد حکومت 12 مارچ 1918ء کو ماسکو چلی گئی۔

☆......☆

انتظامی محکموں کے قیام اور ان کی کارکردگی سے مطمئن ہونے کے بعد لینن کی تمام توجہ جنگ کے خاتمے کی طرف ہوگئی تھی۔ خستہ حال سپاہی اپنے گھروں کو لوٹنے کے لیے بے تاب تھے۔ خصوصاً ان حالات میں کہ ملک میں ان کی اپنی حکومت قائم ہوگئی تھی۔ اس نے ٹراٹسکی سے اس سلسلے میں کئی ملاقاتیں کیں۔ ٹراٹسکی بھی اس پر متفق تھا۔ انقلاب سے گزرا ہوا روس اب کسی جنگ کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔

لینن نے انگلینڈ، فرانس اور امریکا کی حکومتوں سے جرمنی سے صلح کے لیے رابطہ کیا لیکن بار بار کی اپیلوں کے باوجود انہوں نے جرمنی سے صلح کی بات چیت کرنے سے انکار کردیا۔ اب اس کے سامنے ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ تنہا جرمنی سے صلح کرلے۔ اپنے ملک کو بدحالی سے بچانے کا ایک یہی ذریعہ تھا۔ اس نے صلح کی کوششیں شروع کردیں۔

جرمن ذرائع صلح کے لیے تیار ہوگئے لیکن کچھ شرطوں کے ساتھ۔ یہ شرطیں بھی ایسی تھیں کہ ان پر عمل کرنا آسان نہ تھا۔ انہوں نے مطالبہ کیا تھا کہ انہیں سوویت علاقے کا ایک بڑا حصہ دیا جائے۔ یہ شرط ہی ایسی تھی کہ پارٹی میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ زیادہ تر ممبروں کا خیال تھا کہ ان شرم ناک شرطوں کو ماننے کی بجائے جنگ جاری رکھی جائے۔

ان اختلافات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جرمنی نے صلح کی گفتگو کرنے کی بجائے روس پر حملہ کردیا۔

لینن کی اپیل شائع ہوئی۔

روس کے مزدوروں اور کسانوں کا یہ مقدس فریضہ ہے کہ وہ جاں نثاری کے ساتھ جرمن فوج سے اپنے وطن کی حفاظت کریں۔

اب ٹراٹسکی کے امتحان کا وقت تھا۔ وہ ایک محاذ سے دوسرے محاذ کی طرف جارہا تھا۔ کون سا محاذ کمزور ہے کس محاذ پر کتنی فوج کی ضرورت ہے۔ لوگوں کو آمادۂ جنگ کرنے کے لیے جلسوں کو آراستہ کرنے اور ان میں تقریریں کرنا بھی اس کی ذمے داری میں شامل تھا۔ مزدور اور کسان اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہیں منظم کرنا، تربیت دینا اور محاذوں کی طرف روانہ کرنا بطور وزیر دفاع اس کے فرائض میں شامل تھا۔

یہ سب وہ لینن کی ہدایات کے مطابق کررہا تھا۔ اتنا مصروف وہ کبھی نہیں ہوا تھا جتنا اس جنگ میں ہوا تھا۔

ان منظم دستوں نے حملہ آور دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ بڑھتے ہوئے خطرے نے دم توڑ دیا۔ دشمن اس اتحاد کا مقابلہ نہ کرسکا اور اسے واپس لوٹنا پڑا۔

اس حملے کے بعد صلح کا سوال اور بھی زیادہ اہم ہوگیا تھا۔ اس موضوع پر ٹراٹسکی اور لینن کے مضامین برابر شائع ہورہے تھے۔ اس عرصے میں پارٹی کی ساتویں کانگریس منعقد ہوئی۔ اس کا واحد موضوع معاہدۂ امن تھا۔ اس کانفرنس میں بھی ٹراٹسکی اور لینن کی دھواں دھار تقاریر ہوئیں۔ معاہدۂ امن کو ثابت کیا گیا اور پارٹی کو معاہدۂ امن کی تجویز کثرت رائے سے منظور کرنی پڑی۔

3 مارچ 1918ء کو امن معاہدے پر دستخط ہوگئے۔

حریف ممالک کو یہ معاہدۂ امن ایک آنکھ نہیں بھایا۔ انہیں اندیشہ تھا کہ انقلاب کی یہ چنگاری شعلہ بن کر ان کے ملکوں میں بھی پھیل سکتی ہے۔ وہ اس پودے کو پروان چڑھنے سے پہلے کچل دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ پہلے انگلستان اور فرانس کی فوجوں نے اور بعد میں جاپان، انگلستان اور امریکا نے روس کے بعض حصے ہتھیا لیے۔

یہی نہیں بلکہ جو انقلاب دشمن روس میں موجود تھے ان کی مدد سے ملک کو خانہ جنگی کا شکار کردیا گیا۔

ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو غداری کے مرتکب ہورہے تھے۔ ان میں کھلے دشمن بھی تھے اور دوست نما دشمن بھی۔ اس پر جگہ جگہ حملے ہونے لگے۔

وہ محاذ پر تھا اور فوج کا معائنہ کر رہا تھا۔ ایک افسر اسے بریفنگ دے رہا تھا۔ اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر زرد تھا۔ وہ بار بار گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھتا تھا۔

''تم کچھ گھبرائے ہوئے لگ رہے ہو۔''

''حالات ہی ایسے ہیں۔''

''ایک فوجی کو باہمت ہونا چاہیے۔''

''مجھے اجازت دیجیے میں ابھی آیا۔'' فوجی افسر نے کہا۔

وہ فیلڈ ٹیلی فون پر کوئی آرڈر دینے لگا تھا۔ اس کے جاتے ہی جس جگہ ٹراٹسکی کھڑا تھا اس سے کچھ فاصلے پر دو بم گرے۔ اسے بہ مشکل زمین پر لیٹنے کا موقع مل سکا۔ وہ جس ٹرین سے آیا تھا بھاگتا ہوا ڈبے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ ہر طرف گولیاں چلنا شروع ہوگئیں۔ تین بم ٹرین کے قریب بھی گرے لیکن ٹرین کے اوپر چکر کاٹنے والے جہاز ٹرین کا نشانہ بنانے میں ناکام رہے۔ ٹرین کی چھت سے رائفلیں اور مشین گنیں جہاز کو نشانہ بنارہی تھیں اس لیے اسے بھاگنا پڑا۔

وہ اسے محض اتفاقی حادثہ سمجھا تھا لیکن دو سال بعد اسے یہ واقعہ یاد آیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہ رہ سکا کہ یہ ایک سازش تھی۔ اس افسر نے جو بریفنگ دے رہا تھا۔ دوستی کے پردے میں دشمنی کی تھی۔ فیلڈ ٹیلی فون کے ذریعے اس نے دشمن کو اطلاع کردی تھی کہ کہاں بم گرانا ہے۔

انقلاب کی صورت جس قدر مایوس کن تھی غداری کے امکانات اسی تناسب سے زیادہ تھے۔ خودکار پسپائی کے مرض پر جلد از جلد قابو پانے کی ضرورت تھی۔

ایسا ہی ایک واقعہ اس وقت پیش آیا جب وہ اسٹاف ہیڈ کوارٹر کا دورہ کر رہا تھا۔ اس نے اسٹاف روم سے ایک مانوس آواز سنی۔

''وہ یہ کھیل اس وقت تک کھیلتا رہے گا جب تک اسے قیدی نہیں بنا لیا جاتا۔ یاد رکھو وہ خود بھی تباہ ہوگا اور ہمیں بھی تباہ کردے گا۔''

وہ دہلیز پر رک گیا۔ اس کے سامنے جنرل اسٹاف کے دو نوجوان افسر میز پر ایک نقشے پر جھکے ہوئے تھے۔ بولنے والے نوجوان کی پشت اس کی طرف تھی اس لیے اس نے ٹراٹسکی کو نہیں دیکھا لیکن اس کے سامنے جو افسر تھا اس کی نظر ٹراٹسکی پر پڑی اور اس نے آنکھوں ہی آنکھوں سے کوئی اشارہ اپنے ساتھی کو کیا۔ اس نے پلٹ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ وہ بلاگوزرانوف تھا جو زار کی فوج میں لیفٹیننٹ تھا اور اب بالشویک تھا۔ اس کے چہرے پر شرمندگی بھی تھی اور خوف بھی۔ وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ ٹراٹسکی سوچ رہا تھا ایسے کتنے ہوں گے جو پکڑے نہیں گئے لیکن انقلاب کو ناکام بنانے کے لیے اپنے کام میں لگے رہے ہوں گے۔

''مہربانی کر کے مجھے ٹریبونل کے سامنے پیش نہ کریں۔'' اس کا بدن کانپ رہا تھا اور وہ گڑگڑا رہا تھا۔ ''اگر آپ نے مجھے واپس بھیج دیا تو میں قتل کردیا جاؤں گا۔''

ٹراٹسکی نے اسے معاف کردیا۔ یہی ٹراٹسکی کی غلطی تھی۔ بعد میں جب حکومت تبدیل ہوئی تو بھی افسر خفیہ پولیس سروس کا رکن بنا اور ٹراٹسکی کا سب سے بڑا دشمن ثابت ہوا۔

اندرونی سازش صرف ٹراٹسکی کو ہی راستے سے ہٹانے کے درپے نہیں تھی بلکہ لینن کے متعلق بھی یہ سوچ لیا گیا تھا کہ جب تک یہ شخص زندہ ہے کوئی سازش کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اسے راستے سے ہٹا دیا جائے چنانچہ اس پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ وہ ایک جلسے میں شرکت کرنے کے لیے گھر سے نکلا ہی تھا کہ ایک عورت نے اس پر ریوالور سے دو گولیاں چلائیں۔ نشانہ چوک گیا اور وہ محض زخمی ہوا۔ اس کی جان بچ گئی۔

وہ اسپتال سے گھر منتقل ہوا تو اسے یہ اندوہ ناک خبر ملی کہ متحدہ امریکا، انگلستان، فرانس اور جاپان نے متحد ہوکر روس کو گھیر لیا ہے۔

''مشرقی محاذ کی مدد کرو۔'' لینن نے نعرہ لگایا۔

کمیونسٹ پارٹی کی پکار پر بیس ہزار کمیونسٹ، کئی ہزار نوجوان اور ساٹھ ہزار سے زیادہ ٹریڈ یونینوں کے ممبر مزدور محاذِ جنگ کے لیے روانہ ہوگئے۔

ٹراٹسکی کی حکمتِ عملی ہر محاذ کی حفاظت کررہی تھی۔ ٹراٹسکی اور لینن میں برابر رابطے تھے۔ حزبِ اختلاف ہر کام میں روڑے اٹکا رہا تھا۔ انہیں کہیں کامیابی نہیں ہو رہی تھی محض اس لیے کہ ٹراٹسکی اور لینن مل کر کام کررہے تھے اور محنت کش ان کے ساتھ تھے لہٰذا مخالفین نے یہ سوچا کہ لینن کے دل میں ٹراٹسکی کی جانب سے بدگمانی پیدا کردی جائے۔

ایک روز ایک افسر اس کے پاس مختلف محکموں کی رپورٹ لے کر آیا۔ سرکاری کام سے نمٹنے کے بعد اس نے ٹراٹسکی سے پوچھا۔ ''کیا آپ کے علم میں ہے کہ اسٹالن

آپ کے خلاف ایک سازش تیار کرنے میں مصروف ہے؟
''کیا؟ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ سازش کرے گا اور وہ بھی ایک ایسے وقت میں جب ملک داؤ پر لگا ہوا ہے۔''
''وہ لینن کو یہ کہہ کر آپ کے خلاف بھڑکا رہے ہیں کہ آپ اپنے گرد ایسے لوگ جمع کر رہے ہیں جو لینن کے خلاف ہیں۔'' اس شخص نے یہ انکشاف کر کے ٹرائسکی کو بے چین کر دیا۔ اس کی تحقیق بڑی ضروری ہے۔ کم از کم لینن کے علم میں یہ بات ہونی چاہیے۔ وہ مختصر دورے پر ماسکو گیا تو لینن سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ بہت دیر تک محاذ کے بارے میں پوچھتا رہا۔ اسی گفتگو کے دوران ٹرائسکی نے اس گفتگو کے بارے میں بتایا جو اسٹالن کے حوالے سے ہوئی تھی۔
''سب بکواس ہے۔ سب بکواس ہے۔''
''وہ اپنے دل سے تو یہ باتیں نہیں بنا رہا ہوگا۔''
''میں نے کہا نا کہ یہ سب بکواس ہے تم یقین مت کرو۔''
''میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ لمحہ بھر کے لیے بھی سوچ سکتے ہیں کہ میں آپ کے مخالفوں کو اپنے گرد جمع کر رہا ہوں۔''
''یہ بھی بکواس ہے۔''
ٹرائسکی کو اطمینان ہو گیا کہ لینن کا دل اس کی طرف سے صاف ہے۔ اس نے بات آگے اس لیے نہیں بڑھائی کہ وہ اس موقع پر کسی تصادم یا کسی ذاتی جھگڑے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔
سازشیں کام کر رہی تھیں جو جنگی حکمت عملی میں اختلاف کی صورت میں سامنے آ رہی تھیں۔ ٹرائسکی کے خیال میں یہ سب اسٹالن اور اس کے ہم خیال لوگوں کی کارستانیاں تھیں۔

☆......☆

لینن بستر پر تھا۔ اسے دل کا دورہ پڑا تھا۔ بارہویں کانگریس کا دن قریب آ رہا تھا اور لینن کی شمولیت کی کوئی اُمید نہیں رہی تھی۔ مسئلہ یہ درپیش تھا کہ تعارفی سیاسی رپورٹ کون پیش کرے گا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ اسٹالن نے ٹرائسکی کا نام پیش کیا لیکن ٹرائسکی نے مخالفت کی۔
''ایک بیمار قائد کی جگہ لینا مجھے اچھا محسوس نہیں ہوتا۔ بہتر ہوگا کہ اس دفعہ تعارفی رپورٹ کے بغیر ہی کام چلایا جائے ایجنڈے کے مطابق جس نے جو کہنا ہے کہتا جائے اور پھر معاشی مسائل پر ہمارے درمیان اختلافات بھی موجود ہیں۔''
''مجھے کوئی اختلاف دکھائی نہیں دیتا۔'' اسٹالن نے کہا۔
''اسٹالن کا ایک ساتھی زینوشیف چھٹیاں گزارنے گیا ہوا تھا۔ اسے بلا لیا گیا۔
لینن کی حالت زیادہ خراب ہو گئی تھی اور اب کوئی اُمید نہیں تھی کہ وہ کانگریس میں شریک ہو سکے گا۔ اختلافی ٹولے نے پلٹا کھایا اور تعارفی رپورٹ پیش کرنے کے لیے ٹرائسکی کی بجائے زینوشیف نے رپورٹ پیش کی۔
اسٹالن نے اس موقع پر کہا۔ ''لینن کی غیر موجودگی میں مرکزی کمیٹی کے سب سے زیادہ بااثر اور مقبول رکن کو تعارفی رپورٹ پیش کرنی چاہیے۔''
زینوشیف کے رپورٹ پیش کرنے کا مطلب ہی یہ تھا کہ ٹرائسکی پیچھے چلا گیا۔
ایک ٹرائسکی پر ہی منحصر نہیں۔ نئے رہنماؤں کو آگے لانے اور پرانے لوگوں کو پیچھے ہٹانے کے لیے نئے منظر نامے کا جعلی تانا بانا تیار کیا گیا۔ لینن اور ٹرائسکی کے نام روز مرہ کی تقریروں وغیرہ میں اکٹھے دکھائی دیتے تھے مگر اب یہ دونوں نام ایک دوسرے سے جدا کرنے ضروری ہو گئے تھے تاکہ انہیں بعد میں سیاسی طور پر ایک دوسرے کے خلاف کھڑا کیا جاسکے۔
یہ خفیہ سلسلہ اور نہ جانے کب تک چلتا رہتا کہ لینن کی وفات ہو گئی۔

☆......☆

ٹرائسکی بیمار تھا۔ اس کی بیماری طول پکڑتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے اسے تخم لے جایا جائے۔ آخر یہی فیصلہ ہوا۔ فیصلہ بے حد طویل تھا۔ برفباری نے اسے مزید طویل کر دیا۔ ابھی وہ ایک مقام تفلس پہنچا تھا اور ٹرین کے ڈبے میں اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ یہ اس کا اسسٹنٹ تھا جو اجازت ملنے پر ڈبے میں داخل ہوا اور کاغذ کا ایک پرزہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس کاغذ پر لینن کی موت کی خبر لکھی تھی۔ اسے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ اسے اس خبر کا پہلے ہی انتظار تھا۔ اس نے ایک تار کے ذریعے کریملن (لینن کی رہائش گاہ) سے رابطہ کیا۔ وہاں سے

جواب آیا۔
"تجہیز و تکفین ہفتے کے دن ہوگی۔ آپ کا شامل ہونا مشکل ہوگا۔ بہتر ہوگا کہ آپ اپنا علاج جاری رکھیں۔"

وہ ہفتے تک ماسکو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس کے سامنے اب تخم پہنچنے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ تخم چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ تدفین ہفتے کو نہیں اتوار کو ہوئی۔ جنازے کی تاریخ کے متعلق اسے دھوکے میں رکھا گیا تھا۔ اتوار تک تو وہ بہ آسانی ماسکو پہنچ سکتا تھا۔ سازشیں اپنا کام کر رہی تھیں۔

21 جنوری 1924ء کو لینن کی موت واقع ہوئی تھی۔ 27 جنوری کو ٹرائسکی تخم میں تھا کہ خاموشی کو توپ کے گولوں نے چھلنی کر دیا۔ ماسکو میں دفن کیے جانے والے اپنے رہنما کو تخم اپنا الوداعی سلام پیش کر رہا تھا۔ ٹرائسکی کو لینن کی بیوی کا خیال آ رہا تھا جو اس وقت دنیا بھر سے تہنیت کے پیغام وصول کر رہی ہوگی۔ وہ سوچ رہا تھا اس کی بیوی کتنی تنہا ہوگئی ہوگی۔

وہ یہ سوچ رہا تھا اور اس کے مخالفین جن میں اسٹالن پیش پیش تھا لینن کی وفات سے پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ پارٹی میں ایسی تبدیلیاں لائی گئیں جو ٹرائسکی کی مخالفت میں کام آسکتی تھیں کیونکہ لینن کا جانشین وہی ہو سکتا تھا۔ جن لوگوں کی لینن نے مخالفت کی تھی انہی کو آگے لایا گیا۔ ڈزرز نسکی کو سپریم اقتصادی کونسل کا سربراہ بنا دیا گیا۔ یہ شخص لینن سے اختلاف کر کے اسٹالن سے مل گیا تھا اور اب اسے یہ عہدہ دیا گیا۔ دوسرے لفظوں میں تمام ریاستی صنعتیں اس کی تحویل میں دے دی گئیں۔ آروزنسکی جسے لینن پارٹی سے نکالنے پر تلا ہوا تھا۔ مرکزی کنٹرول کمیشن کا سربراہ بنا دیا گیا۔ اسٹالن جنرل سیکریٹری ہی رہا لیکن اسے لامحدود اختیارات دے دیے گئے۔

ٹرائسکی وزیر دفاع تھا لیکن اس کے علم میں لائے بغیر محکمہ جنگ میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں کر دی گئیں جو اس کی سخت توہین تھی۔

1925ء میں خود ٹرائسکی کو وزارت جنگ سے فارغ کر دیا گیا۔ اسٹالن اور اس کے ٹولے کو یہ خوف ہوگا کہ اس کا تعلق فوج میں رہنے کی وجہ سے کہیں خانہ جنگی نہ ہو جائے۔ اس کے عوض اسے تین مختلف ذمہ داریاں سونپ دی گئیں۔ تینوں عہدوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں تھا۔

یہ تقرریاں اسے پارٹی سے الگ کرنے، روزمرہ کے کام میں الجھانے اور اس پر نگاہ رکھنے کے لیے کی گئی تھیں۔ اس کے باوجود وہ نئی انتظامیہ کے ساتھ دیانت داری سے کام کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن فطری طور پر سیاست سے دور ہوگیا کیوں کہ ان عہدوں کی نوعیت ہی کچھ ایسی تھی۔

وہ تصفی کام میں مشغول ہوگیا لیکن یہاں بھی اسے کوئی نہ کوئی سازش دکھائی دینے لگی۔ اسٹالن کے آلۂ کار اس پر نظر رکھنے لگے۔

ٹرائسکی مسلسل بیمار رہنے لگا تھا۔ مسلسل بخار کی وجہ سے فرائض منصبی ادا کرنے میں بھی دقت ہو رہی تھی۔ ماسکو کے ڈاکٹروں نے اسے باہر جا کر طبی معائنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس کے باہر جانے میں بھی روڑے اٹکائے گئے۔ یہ خیال کیا جا رہا تھا کہ وہ اسٹالن کے مخالفوں کو مضبوط کرنے باہر جا رہا ہے۔ بہرحال وہ اپنی بیوی کے ہمراہ برلن چلا گیا۔

برلن میں کئی طبی معائنوں کے بعد آخر یہ تشخیص ہوا کہ مسلسل بخار کی وجہ گلے کے غدود ہیں۔ گلے کا آپریشن کیا گیا لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ یہ آپریشن بے کار ثابت ہوا۔ کچھ عرصے بعد اسے بخار نے پھر دبوچ لیا۔

وہ اسپتال سے رخصت ہونے ہی والا تھا کہ اس نے دو مشکوک افراد کو دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹروں نے اسے بتایا کہ اس کی جان کو خطرہ ہے۔ اتنی دیر میں پولیس بھی آگئی۔ اسے بھی اطلاع تھی کہ میری جان کو خطرہ ہے۔ اسے باحفاظت اسپتال سے نکال کر روسی سفارت خانے پہنچا دیا گیا۔

پارٹی کی جدوجہد میں اچانک شدت آگئی۔ سرکاری آلہ زیادہ تیزی سے جواب دینے پر اتر آیا۔ نظریاتی جنگ نے سرکاری جنگ کی شکل اختیار کر لی۔ حزب مخالف کی میٹنگوں اور جلسہ گاہوں کے سامنے ہارن اور ہر قسم کی نعرہ بازی اور شور شرابا کیا جانے لگا۔ حکمران ٹولا غنڈہ گردی اور دھمکیوں پر اتر آیا۔ پارٹی ارکان کو حزب مخالف کی بات سننے ہی نہیں دی جاتی تھی۔ ارکان بھی پارٹی میں پھوٹ کے خوف سے چپ رہتے۔ ٹرائسکی اور اس کے ساتھیوں نے اعلان جاری کیا کہ اگرچہ ہم پارٹی کے اندر رہ کر اپنے جائز حقوق کی جنگ کو ضروری سمجھتے ہیں لیکن ایسی حرکتوں کی مذمت کرتے ہیں جس سے پارٹی میں پھوٹ پڑ جائے۔ اس پر معاہدہ ہو جانے کے دوسرے ہی دن اسٹالن کے حواریوں نے اسے توڑ دیا۔

لینن گراڈ، ماسکو اور دوسرے صوبوں میں سیکڑوں کی

تعداد میں خفیہ کانفرنسوں کا بندوبست کیا گیا۔ان میں ہونے والی بحثوں کا نشانہ کوئی اور نہیں بلکہ صرف اس کی ذات تھی۔
ایک خاص اشارے پر اخبارات اس کے خلاف مضامین سے بھر گئے۔ بہتان تراشی کے کئی آتش فشاں ایک ساتھ پھٹ پڑے۔وہ بیمار تھا اور خاموش تھا۔اسے انقلاب دشمن کہا جا رہا تھا۔ حقائق کو جھٹلایا جا رہا تھا۔ الزام تراشیوں کا دھارا بہتا رہا اور عوام کے شعور میں دھنستا رہا۔ یہ ثابت کیا جاتا رہا کہ ٹرائسکی اور لینن کے تعلقات کشیدہ تھے۔ایسے خطوط پیش کیے گئے جو کسی زمانے میں لینن کے نظریات سے اختلاف میں لکھے گئے تھے۔ دو بڑوں کے درمیان اختلاف واتفاق کے نشیب وفراز آتے رہتے ہیں لیکن اب انہیں لینن دشمنی کے طور پر پیش کیا گیا حالانکہ یہ لینن کی زندگی میں لکھے گئے تھے اور لینن کو ان کا علم تھا۔ جملوں کو سیاق وسباق سے الگ کر کے پیش کیا گیا۔

نوکرشاہی کا تسلط تھا۔دوسرے لفظوں میں پارٹی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ ایسی ایذارسانی تھی جو ٹرائسکی کی بیماری میں اضافہ کرتی جا رہی تھی۔ اعصابی دباؤ کے سبب اس کا نمونیا جاری رہا۔

ان سیاسی بیانات کا سہارا لے کر اسے انقلاب دشمن کے جرم میں جلاوطن کر دیا گیا۔

اسٹالن اور اس کی نوکرشاہی نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اس کا اصل دشمن حزبِ مخالف کا وہ گروہ ہے جس کا تعلق ٹرائسکی سے ہے۔

پندرہویں کانگریس کے بعد پورے کا پورا حزب مخالف پارٹی سے نکال دیا گیا۔

☆......☆

حکومتی ایجنٹ اسے لینے کے لیے اس کے گھر پہنچ گئے۔ٹرائسکی ان کے ساتھ جانے کو تیار نہیں تھا۔وہ کمرے کا دروازہ بند کر کے بیٹھا ہوا تھا۔دروازہ توڑ دیا گیا۔ٹرائسکی کے پیروں میں چپل تھے۔ ایجنٹوں نے اس کے جوتے ڈھونڈ کر اسے پہنائے۔ پھر انہوں نے فرکوٹ اور ٹوپی پہنائی۔ وہ اب بھی مزاحمت کر رہا تھا۔وہ اسے بازوؤں میں اٹھا کر چل پڑے۔اس کی بیوی اور بیٹے بھی ساتھ چل پڑے سب کو ایک ہی گاڑی میں ٹھونس دیا گیا۔

گاڑی ماسکو کی سڑکوں پر چلتی رہی۔خون جما دینے والی سردی تھی۔کسی کے پاس دستانے تک نہیں تھے۔سفری بیگ یا دستی تھیلا بھی نہیں تھا۔ ہر طرف شور مچ گیا تھا۔یہ لوگ ٹرائسکی کو لے جا رہے ہیں۔لوگ گاڑی کے پیچھے دوڑنے لگے تھے۔ پولیس والے ان کی طرف بندوقیں تانے ہوئے تھے۔ٹرائسکی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ایک پولیس والے سے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ اسے ایک گم نام اسٹیشن پر لے جایا جا رہا ہے۔نام بتانا اس نے بھی مناسب نہ سمجھا کہ کہیں ٹرائسکی چیخ کر لوگوں کو بتا نہ دے۔وہ گم نام اسٹیشن آ گیا۔ٹرائسکی کی اور اس کی فیملی کو ایک ڈبے میں بٹھا دیا گیا اور سپاہیوں نے ڈبے کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔انجن اس ڈبے کو لے کر چل پڑا۔معلوم ہوا ایک دوسرے اسٹیشن پر اس ڈبے کو ماسکو سے قازان جانے والی ٹرین کے ساتھ جوڑ دیا جائے گا۔

اب تک یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ انہیں الماتا لے جایا جا رہا تھا۔

یہ نو دن کا سفر تھا اور اس حالت میں کہ نہ کپڑے بدل سکے نہ کوئی کتاب تھی جسے پڑھ کر وقت کٹ جاتا۔ لکھنے پڑھنے کا سامان بھی نہیں تھا۔ ایک لفظ بھی نہیں لکھا جا سکتا تھا۔انہیں بتایا گیا تھا کہ ان کا سامان دوسری ٹرین سے آ رہا ہے۔یہ اندیشے کھائے جاتے تھے کہ جلاوطنی کیسی ہو گی۔ حالات کیسے ہوں گے کیسے گزرے گی۔

ٹرین ہموار رفتار سے چلتی رہی۔ذہن اس کے ساتھ ساتھ دوڑتے رہے۔ساتھ چلنے والا عملہ برابر کے ڈبے میں تھا اس ڈبے میں صرف ایک وردی والا تھا جو پہرا دے رہا تھا اور ٹرائسکی کو یاد دلا رہا تھا کہ وہ قیدی ہے۔

سارا آ گیا تھا۔ایک ریسٹورنٹ سے کھانا بھی منگوا لیا گیا تھا۔ صابن، ٹوتھ پیسٹ وغیرہ بھی فراہم کر دیا گیا۔
ٹرین یہاں سے بھی روانہ ہوئی مگر رفتار سست تھی کیوں کہ برف باری ہو رہی تھی۔

نو دن کے بعد آخری اسٹیشن فرونزے پہنچ گئے۔
یہاں سے الماتا جانا تھا۔انہیں بس میں بٹھا دیا گیا۔ بڑے بوٹ اور بھیڑ کی کھال کی ٹوپیاں دے دی گئیں کہ یہاں سردی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ رات ایک ڈاک خانے میں گزارنے کے بعد سفر پھر شروع ہو گیا۔ حفاظتی عملہ اب بھی ساتھ تھا۔رات کے تین بجے ہوں گے کہ منزل آ گئی۔ یہ ایک ہوٹل نما عمارت تھی جہاں انہیں دو کمرے دے دیے گئے۔ملحقہ کمروں میں حفاظتی عملہ ٹھہر گیا۔
سامان پہنچ گیا مگر ادھورا۔ معلوم ہوا دو صندوق کہیں گم ہو گئے۔ لکھنے کا سارا سامان اور کپڑے انہی میں تھا۔

اس کا بڑا بیٹا باہر کا جائزہ لینے نکلا اور جلد ہی تار گھر دیکھ آیا۔ یہ بڑا ضروری تھا۔ اسی کے ذریعے الماتا سے باہر کی دنیا سے رابطہ رکھا جاسکتا تھا۔ اگلے دن اسٹیشنری کی دکان بھی دیکھ لی جہاں سے کاغذ، قلم اور لکھنے کا باقی سامان خریدا۔

رفتہ رفتہ زندگی اپنے راستے پر آنے لگی۔ وہ دوستوں کو خطوط لکھنے بیٹھ گیا۔ ایک لڑکی کو ٹائپسٹ رکھ لیا تھا جو اس کا ہاتھ بٹاتی رہتی تھی۔

دوستوں سے رابطہ کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ ماسکو سے اخبارات آنے لگے۔ ان اخبارات کے ذریعے وہ پارٹی اور اسٹالن پر پوری نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس جلاوطنی کے زمانے میں اس کی بیٹی کا ماسکو میں انتقال ہوگیا۔ اس کی موت کے 73 دن بعد اسے اطلاع ملی۔ وہ برسوں انقلاب کی صلیب اٹھائے پھرا تھا لیکن اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ ایک باپ کا دکھ کیا ہوتا ہے۔ پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ وہ جلاوطن ہے۔ اس کی بیٹی مرگئی اور وہ اس کے پاس نہیں تھا۔ اس نے دوستوں کو خطوط لکھ کر اپنا دکھ ہلکا کیا۔

وہ ماسکو سے برابر رابطے میں تھا اور پارٹی کے امور چلا رہا تھا۔ اپنے خاص لوگوں کو ہدایات بھیجتا رہتا تھا کہ اسٹالن کے کسی اقدام کی انہیں کس طرح مخالفت کرنا ہے۔ اس کی محنت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا تھا کہ صرف چھ ماہ کے عرصے میں اس نے آٹھ سو سیاسی خط ارسال کیے اور ساڑھے پانچ سو تار بھیجے۔

اس کی یہ سرگرمیاں اسٹالن حکومت کی آنکھوں میں کھٹک رہی تھیں۔ حکومت کی مخالفت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کا مورد الزام ٹرانسکی کو ٹھہرایا گیا۔ ماسکو سے اس کا رابطہ اچانک منقطع کردیا گیا۔ کوئی خط کوئی تار اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا اور نہ ہی اس کے خطوط ماسکو پہنچ رہے تھے۔ عزیز و اقارب سے بھی اس کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔

صرف اس پر اکتفا نہیں ہوا بلکہ حکومت کا ایک نمائندہ اس کے پاس آیا اور دھمکی آمیز لہجے میں اسے الٹی میٹم دیا۔

''آپ کے ہمدردوں کا سیاسی کام ملک بھر میں انقلاب دشمن کردار اختیار کرتا جارہا ہے۔ الماتا میں رہ کر آپ کو اس کام کے مواقع حاصل ہیں۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر آپ سے سیاسی سرگرمیاں قطعی طور پر ختم کرنے کا وعدہ مانگا جاتا ہے۔ ورنہ آپ کے حالات کو بدل کر آپ کو سیاسی زندگی سے مکمل طور پر الگ کردیا جائے گا۔ اس سلسلے میں آپ کی جائے رہائش کو تبدیل کرنے کا سوال بھی زیرِ بحث آسکتا ہے۔''

اس نے اس دھمکی کا منہ توڑ جواب دیا۔

''میری سیاسی سرگرمی کو وہ لوگ انقلاب دشمن کہہ رہے ہیں جو مارکس اور لینن کی تعلیمات کے بنیادی اصولوں کی خلاف ورزی کررہے ہیں۔ سیاسی سرگرمی سے علیحدہ ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ میں کمیونسٹ پارٹی کی موجودہ اندھی قیادت کے خلاف جدوجہد بند کردوں۔ ظاہری طاقت کے باوجود اسٹالن کی ناقابلِ علاج کمزوری یہ ہے کہ اسے معلوم ہی نہیں کہ اسے کرنا کیا ہے۔ یہ دشمن طبقات کے حکم بجالارہا ہے۔ کسی پارٹی پر اس سے بڑی تاریخی لعنت کیا ہوگی کہ وہ انقلاب کو کامیابی سے ہمکنار کرکے اس کی اہمیت سے بے خبر ہوجائے۔

میرے حالات تبدیل کردینا اور سیاسی پابندی مضحکہ خیز بات ہے۔ میں ماسکو سے چار ہزار کلومیٹر دور، چین سے ملحقہ مغربی صحرا کے کنارے ایک صوبے میں پڑا ہوں۔ اس سے زیادہ میرے حالات کیا تبدیل ہوں گے، یوں لگتا ہے کہ جیسے مجھے زندگی اور سیاسی سرگرمی سے کاٹنے کی اسٹالن ٹولے کی کچھ حسرتیں باقی ہیں۔''

اس نے ایک ایک کرکے وہ تمام مظالم بیان کردیے جو اس پر کیے گئے تھے۔ ان میں اس کی بیٹی کی الم ناک موت بھی تھی جس کی اطلاع میں اتنی تاخیر کی گئی کہ میں کہیں اس کے جنازے میں شریک نہ ہوجاؤں۔

اس دوٹوک جواب پر حکم نامہ یہ آیا۔

''ٹرانسکی ایف ڈووچ پر مجرمانہ کوڈ 58/10 کے خلاف ایک غیر قانونی سیاسی پارٹی قائم کرنے کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ اس پارٹی کی سرگرمیاں ریاست کے خلاف ہیں اور یہ مسلح جدوجہد سے حکومت کا تختہ الٹنا چاہتی ہے لہٰذا فیصلہ کیا جاتا ہے کہ ٹرانسکی کو سوویت روس کی حدود سے نکال دیا جائے۔''

سامان باندھنے کا مرحلہ پھر سامنے آگیا۔ کتابیں اور مسودے باندھے گئے۔

22 جنوری 1929ء کی صبح اس گمنام سفر کا آغاز ہو گیا۔ وہ اس کی بیوی اور بیٹا حفاظتی عملے کی نگرانی میں بس میں بیٹھ گئے۔ برفباری اتنی تھی کہ بس پوری طرح برف میں چھپی ہوئی تھی اور گرد کے پہاڑی سلسلے سے گزر رہی تھی۔ چوٹی پر پہنچے تو برف اور تیز ہوا نے ہڈیوں کو جما دیا۔ طاقت ور ٹریکٹر بس کو پیچھے سے دھکا لگا رہا تھا۔ ایک موقع وہ آیا کہ

ٹریکٹر خود برف میں دھنس گیا۔ بس کیا چلتی، انہیں برف پر پھسلنے والی گاڑیوں میں منتقل کر دیا گیا۔ ان گاڑیوں نے ساٹھ گھنٹے میں بڑی مشکل سے تیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا۔

پہاڑ کی دوسری طرف ایک گاڑی کھڑی تھی جس نے انہیں ریلوے اسٹیشن پہنچا دیا۔ ''اس ڈبے میں سوار ہو جاؤ'' وہ سوار ہو گئے۔ گاڑی چل دی۔ ابھی تک انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ ٹرین انہیں کہاں لے جائے گی۔ ٹراٹسکی پریشان تو نہیں تھا لیکن اسے غصہ ضرور آ رہا تھا کہ اسے یہ بتایا کیوں نہیں جا رہا کہ اس کی منزل کہاں ہے۔ وہ اپنا غصہ عملے کے لوگوں پر اتار رہا تھا لیکن پھر یہ سوچ کر صبر بھی کر لیتا تھا کہ ان بے چاروں کا کیا قصور۔

گاڑی نے بھاگتے بھاگتے اپنی رفتار کم کر لی پھر اس نے ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر پہنچ کر پٹری بدل لی۔ پھر ایک اور چھوٹا سا اسٹیشن آیا۔ یہ ٹرین پلیٹ فارم پر نہیں رکی بلکہ آگے جا کر لکڑی کے دو بڑے بلاکوں کے درمیان کھڑی ہو گئی۔

انجن ایک ڈبے کے ساتھ روانہ ہو گیا

''کیا انجن ہمیں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ کیا ہم یہیں اپنے ڈبے میں رہ جائیں گے۔ اس بیابان میں ٹراٹسکی نے اپنی بیوی سے سرگوشی میں کہا۔

''یہاں اور بھی تو ڈبے ہیں جن میں ہماری حفاظت کے لیے آیا ہوا عملہ سوار ہے۔''

''کیا خبر وہ کب ہمیں چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں رات پڑنے والی ہے۔ اسٹالن اور اس کے ٹولے نے ہمیں اس ویرانے میں مرنے کے لیے چھوڑنے کا پروگرام تو نہیں بنایا ہے۔''

اس کا بیٹا ڈبے سے اترنے کی ضد کر رہا تھا کہ دیکھیں تو سہی یہ کون سی جگہ ہے لیکن ٹراٹسکی نے اسے روک دیا۔

''روسی سپاہی یہ سمجھیں گے کہ تم فرار ہو رہے ہو۔''

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ انجن کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ معلوم ہوا انجن کسی بڑے اسٹیشن سے ان کے لیے کھانا اور اخبارات لے کر آیا تھا۔

ان کی غلط فہمیاں دور ہو گئیں لیکن یہ اندیشہ پختہ ہو گیا کہ رات اسی ویرانے میں گزارنی ہو گی۔ وہ پھر بھی مطمئن تھا کہ چلو ایک رات کی بات ہے۔ صبح ہوتے ہی یہ ٹرین ہمیں کہیں لے جائے گی۔

صبح ہو گئی۔ انجن گیا اور کھانا لے آیا۔ اخبارات بھی آ گئے۔ اسی طرح ایک ہی جگہ کھڑے ہوئے بارہ دن گزر گئے۔ انجن روز جاتا اور ان کے لیے کھانا لے کر آ جاتا۔

بارہویں دن حفاظتی عملے کا افسران کے پاس آیا۔

''ہماری حکومت کی تمام مساعی کے باوجود جرمن حکومت آپ کو جرمنی میں داخل ہونے کی اجازت دینے پر تیار نہیں۔ اب مجھے آخری حکم ملا ہے کہ میں آپ کو قسطنطنیہ پہنچا دوں۔''

''میں وہاں اپنی مرضی سے نہیں جاؤں گا اور ترکی کی سرحد پر یہ کہہ بھی دوں گا۔'' ٹراٹسکی نے کہا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ آپ کو ترکی کے اندر داخل کر دیا جائے گا۔''

''تم لوگوں نے ترکی پولیس سے کوئی ساز باز کی ہے؟''

''ہمیں حکم بجا لانے کے لیے کہا گیا۔'' اس نے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر ڈبے سے اتر کر اپنے ڈبے میں چلا گیا اور اس کے ساتھ ٹرین کو حرکت ہوئی۔

بارہ دن ایک ہی جگہ پر کھڑا رہنے کے بعد ٹرین نے پھر چلنا شروع کر دیا۔ یہ ٹرین پوری رفتار سے جنوب کی طرف جا رہی تھی۔

اخبارات سے معلوم ہو رہا تھا کہ ماسکو میں اس کے حق میں مظاہرے ہو رہے ہیں۔ اس کے ہمدردوں کو بڑے پیمانے پر گرفتار کیا جا رہا ہے۔ یہ جلدی اسی لیے تھی۔ اسے جلد سے جلد روس سے نکالنا تھا۔

یہ ٹرین اوڈیسہ پہنچی۔ اس نے اپنی اسکول کی زندگی کے سات سال یہیں گزارے تھے۔ بہت سی یادیں آئیں اور چلی گئیں یہاں سے انہیں اسٹیمر میں بٹھا دیا گیا۔ اس اسٹیمر میں کوئی اور مسافر سوار نہیں تھا۔ پانی جم چکا تھا۔ برف توڑ کر راستہ بنانے والا جہاز اسٹیمر کے آگے چل رہا تھا۔

اس نے جمہوریہ ترکی کے صدر مصطفیٰ کمال پاشا کے نام پیغام ارسال کیا۔

''جناب والا! قسطنطنیہ کے دروازے پر میں آپ کو یہ اطلاع دے رہا ہوں کہ میں ترکی کی سرحدوں پر اپنی مرضی سے نہیں آیا۔ مجھے زبردستی یہاں تک لایا گیا ہے۔''

اس پیغام کا کوئی اثر نہ ہوا اور اسٹیمر بندرگاہ میں داخل ہو گیا۔

اس کے قسطنطنیہ پہنچتے ہی اخبارات افواہوں سے بھر گئے۔ یہاں تک لکھا گیا کہ ٹراٹسکی قسطنطنیہ اسٹالن کی ملی

بھگت سے مشرق قریب کے ممالک کو فتح کرنے کا کوئی فوجی منصوبہ تیار کرنے کی غرض سے آیا ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ اسٹالن سے ٹرائسکی کی لڑائی محض ڈراما تھی۔ اسے افسوس ہوا کہ اس کی چھ سالہ جدوجہد کو ڈراما قرار دیا جارہا ہے۔

انہی دنوں برلن کے ایک اخبار کی قومی اسمبلی کی دسویں سال گرہ کے موقع پر قومی اسمبلی کے صدر لوبے کی ایک تقریر شائع ہوئی۔ تقریر کے آخری الفاظ یہ تھے۔

''ممکن ہے کہ ہم کبھی مسٹر ٹرائسکی کو سیاسی پناہ کا جمہوری حق دے دیں۔'' اسے یاد آیا کہ سوویت ایجنٹوں نے اس کے برخلاف بات کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا جرمنی نے اسے پناہ دینے سے انکار کردیا ہے اس لیے اسے قسطنطنیہ لے جایا جارہا ہے۔ اس کا مطلب ہے غلط بیانی کی گئی تھی۔ لوبے نے یہ تقریر چھ فروری کو کی تھی جب کہ وہ دس فروری کو ترکی کے لیے روانہ ہوا تھا۔ اس وقت تک ماسکو میں لوبے کی تقریر پہنچ چکی ہوگی۔

اس نے جرمن قونصلیٹ میں ویزے کے لیے درخواست جمع کرادی اور لوبے کو تار ارسال کردیا۔ اس کے تار کا کوئی جواب نہ آیا۔ چندروز انتظار کرنے کے بعد اس نے دوبارہ برلن تار بھیجا۔

''کیا میں جواب نہ آنے کو انکار سمجھوں؟''

اس کے بھی دو ماہ بعد جواب آیا۔ جرمن حکومت نے اسے ویزا دینے سے انکار کردیا تھا۔ اس نے قومی اسمبلی کے صدر لوبے کو تار بھیجا۔

''سیاسی پناہ کے جمہوری حق میں افسوس کے لیے کہیں جگہ نہیں بنتی۔''

اس تگ و دو کا حاصل یہ ہوا کہ اخبارات نے خبر لگائی۔ ''انقلابی آمریت پر یقین رکھنے والا شخص ایک جمہوری ملک میں سیاسی پناہ ڈھونڈ رہا ہے۔''

وہ کہتا رہ گیا۔ ''جمہوری حقوق کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ سیاسی پناہ فقط ان لوگوں کو دی جائے جو پناہ دینے والے ملک کے سیاسی نقطۂ نظر سے متفق ہوتے ہیں۔ ترکی نے ایسا نہیں کیا۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ جس حکومت نے کسی کو جلاوطن کیا ہوتا ہے اس سے پوچھ کر کوئی ملک اس جلاوطن کو سیاسی پناہ دے، کوئی حکومت اپنے مخالفین کو بھی پناہ دے سکتی ہے بشرطیکہ وہ اس ملک کے قوانین کا احترام کریں۔''

اسے سیاسی پناہ کا حق نہ مل سکا۔

اسٹالن نے ایک مرتبہ پھر تجویز بھجوائی کہ وہ سیاسی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہوجائے۔

اس کے دوستوں نے چاہا کہ وہ ناروے چلا جائے لیکن وہاں عجیب منطق پیش کی گئی۔ ناروے کے وزیر انصاف نے پارلیمان کو بتایا کہ ٹرائسکی کی حفاظت پر جس قدر رقم خرچ ہوگی ناروے کا بجٹ اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

فرانسیسی حکومت سب سے چالاک ثابت ہوئی۔ اس نے اطلاع دی کہ اس کے وزیر داخلہ مالوں نے فرانس سے اس کے نکالے جانے کے سلسلے میں بہت عرصہ پہلے جو حکم جاری کیا تھا وہ ابھی تک منسوخ نہیں ہوا۔

سیاسی پناہ کے راستے میں اس سے بڑی رکاوٹ اور کیا ہوسکتی تھی۔

ٹرائسکی اور بالشویک لینن اسٹ حزبِ اختلاف کی جدوجہد جاری تھی۔ ٹرائسکی دربدر ٹھوکریں کھاتا پھر رہا تھا۔ اسٹالن اور اس کی افسرشاہی نے لاکھوں بالشویکوں کو قید و بند کی صعوبتوں اور سائبیریا کی اذیت گاہوں میں ڈالا۔ یہاں تک کہ اکتوبر انقلاب برپا کرنے والی پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے 24 مستقل ارکان میں سے سوویت اقتدار میں صرف ایک رہ گیا اور وہ اسٹالن خود تھا یا ٹرائسکی خود تھا جو اپنی جان بچاتا پھر رہا تھا لیکن جہاں جاتا تھا اسٹالن کے بدلتے ہوئے نظریات پر تنقیدیں کرتا تھا۔ انقلاب کی اہمیت سے دنیا کو واقف کررہا تھا۔ اسٹالن کو خدشہ ہوچلا تھا کہ سوویت عوام اس کے قائل ہوکر کہیں ایک اور انقلاب برپا نہ کردیں وہ ٹرائسکی کے ذہن پر پہرے... نہیں بٹھا سکتا تھا۔ اسے خریدنے یا مرعوب کرنے کی تمام کوششیں بھی ضائع چلی گئی تھیں۔

اب ایک ہی راستہ رہ گیا تھا۔

اسٹالن نے سیکرٹ پولیس کے ایجنٹ رامون مرکیڈور کی خدمات حاصل کیں۔

ٹرائسکی ان دنوں میکسیکو میں تھا اور اپنے دفاع میں مضامین لکھ رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے اسٹڈی روم میں تھا کہ کچھ لوگ اندر داخل ہوئے اور اس پر گولیاں چلادیں۔ وہ زخمی ہوا تھا۔ اسے اسپتال لے جایا گیا جہاں وہ اگلے دن 21 اگست 1940ء کو دم توڑ گیا۔

ماخذ

میری زندگی، لیون ٹرائسکی
مترجم جاوید شاہین
لینن، مترجم ڈاکٹر ظ. انصاری



عیار ساحرہ

سباس اعوان

سلطنتِ عثمانیہ کے ٹوٹ کر بکھرنے میں سازشوں کا ایک وسیع جال بُنا گیا تھا۔ ایک کونے میں لارنس آف عربیہ تو دوسرے کونے میں جرٹروڈ بیل۔ یہاں سے وہاں تک پورے خطۂ عرب میں یورپی سازش کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے جو بساط بچھائی گئی تھی اس کی ایک مہرہ جرٹروڈ بیل بھی تھی۔ جو ایک اعلیٰ پایہ کی شاعرہ بھی تھی۔ انگلینڈ سے آکر عرب کے ریگزاروں میں اس نے اپنی حکمتِ عملی سے قبائل کے سرداروں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔

ملکۂ صحرا کے لقب سے خطۂ عرب میں پہچانی جانے والی انگریز شاعرہ کا تذکرہ

اسے عراقی عوام نے The woman who made Iraq یعنی بانی عراق جیسا ٹائٹل دیا تھا۔ صحرائی بدو اور علاقائی شیخ اسے کوئین آف دی ڈیزرٹ کہتے تھے۔ Shaper of the nations اور فی میل لارنس آف عریبیا کا خطاب اتحادی فوجوں کا عطا کردہ تھا۔ وہ کنگ میکر تھی۔ اسے بے تاج ملکہ بھی کہا جاتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ میں تو اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ کہیں ایک آدھ بار رسی سا پڑھا ہوگا تو وہ میرے

حافظے میں کہیں نہیں تھا۔

پہلا تعارف بڑے برے تاثر کا حامل تھا۔ دمشق جاتے ہوئے جہاز میں ساتھ کی سیٹ پر ٹکی ہوئی چھوٹی، جٹی منیار، کنارا سے مین نقش والی دمشق یونیورسٹی میں جغرافیہ کی استاد نے شام کے بارے میں باتیں کرتے کرتے اچانک کہا۔ ''یہ کمبخت مارے ذلیل انگریز اور فرانسیسی انیسویں صدی کے اواخر سے ہی فاحشاؤں جیسے کردار لیے مشرق وسطیٰ پر رالیں ٹپکاتے پھرتے تھے۔ اس منحوس ماری جرٹروڈ بیل Gertude Bell کو کیا کہوں۔ نا ہنجار کہیں کی، کیسے اس نے میرے اتنے خوبصورت ملک کی شکل و صورت بگاڑ دی۔ کیا مرد مار عورت تھی؟ بصرے کو بغداد سے ملایا، موصل اس میں شامل کیا۔ کویت کو علیحدہ کر دیا۔ اردن کا ٹوٹا الگ کیا۔''

میں نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ مجھے احساس تھا۔ یقیناً میری آنکھوں میں لاعلمی کے رنگ ہوں گے اور میری پلکوں پر سایہ کرتے ناواقفیت کے عکس اور کہیں یہ خفت بھرا احساس بھی کہ چلی ہے شام اور عراق کی سیاحت اور ان پر لکھنے کو اور حقائق جانتی ہی نہیں۔

اس کے لہجے میں جاندار قسم کی تلخی تھی۔ ''برٹش گورنمنٹ کی ایجنٹ، اس کی منتظم اعلیٰ، اس کی بادشاہت کے ستونوں کو مشرق وسطیٰ میں گہرے گاڑنے میں برٹش عزائم کی معاون، لارنس آف عریبیا اور ونسٹن چرچل کی ساتھی اور پورے جزیرہ نما عرب کے صحراؤں، میدانوں اور شہروں کے چپے چپے کو اپنے پیروں تلے روندنے اور علاقے کے شیخوں اور صحرائی قبائل کے سرداروں کو جاننے اور تعلق والی جو مشرق وسطیٰ پر ایک اتھارٹی کی سی حیثیت رکھتی تھی مگر اسے عراق سے محبت تھی۔ وہ بغداد کی دیوانی تھی۔ وہ دفن بھی یہیں ہے۔''

جرٹروڈ بیل میرے اندر اتری ضرور پر اگلے بہت سارے دنوں میں شام کے شہروں کی سیاحت اور بغداد کی سرزمین پر قدم دھرنے کے بعد تک وہ ذرا دل سے اوجھل سی رہی۔ پر جب میں عراق آرکیالوجی میوزیم میں داخل ہوئی اور گھومتے گھومتے میوزیم کے دائیں حصے میں جا گھسی تو ٹھٹک گئی۔ وہاں جرٹروڈ بیل کانسی کے مجسموں اور آرٹسٹوں کے کمال فن کی صورت میں یہاں وہاں بکھری ہوئی تھی۔ اس کی لکھی گئی ڈھیروں ڈھیر کتابیں، اس کے استعمال کی اشیاء۔ سبھوں کو میں نے دیکھا۔ اس پورشن میں سب سے خوبصورت وہ لفظ تھے جو اسے خراج پیش کرتے تھے۔ میں نے انہیں پڑھا اور جی جان سے سراہا۔

This window is in remembrance of Gertrude Bell versed in learning of the East and of the West, writer, Poet, Historian, Antiquary, gardner, mountaineer, explorer, lover of nature of flowers and of animals incomparable friend, sister and daughter.

مجھے پتا چلا تھا کہ اس شاندار میوزیم کو بنانے میں اس کی انتہا درجے کی دلچسپی، آثار قدیمہ اور خاص طور پر میسوپوٹیمیا کی سرزمین پر بکھرے ہزاروں سال تاریخی ورثے سے اس کی بے پناہ محبت اور لگن نے یہ عظیم کارنامہ اس سے کروایا۔

افلاق کے پاس اس سے متعلق کافی معلوماتی ذخیرہ تھا۔

''چلو میوزیم کے ریسٹورنٹ میں بیٹھتے ہوئے میں نے اپنے آپ سے کہا تھا جو یہ بتائے اسے تو سنوں۔ پھر کسی اور کو بھی ڈھونڈوں گی۔''

پتا نہیں میرے وجدان نے مجھے سگنل دیا تھا کہ اس تاریخ ساز شخصیت کے پیچھے بہت دلچسپ کہانیاں ہوں گی۔

ہم دونوں نے قہوے سے بھری ''گلاسیاں'' اٹھائیں۔ سپ لیے اور میں نے آنکھیں چہرے پر اور کان آواز پر لگا دیے۔

1868ء پیدائش کا سال اور جگہ انگلینڈ کی کاؤنٹی درہم Durham۔ خاندان اسٹیل steel کا بیوپاری۔ دولت کا کچھ یہ حال کہ آج کے بل گیٹس سے ملایا جا سکتا ہے۔ ذہانت بھی بہت، دلیری بھی اور اعتماد بھی انتہا کا۔ سوتیلی ماں فلورنس نے محسوس کرتے ہوئے تربیت سازی کی، کیوں کہ اپنی ماں ماریا تو اس کی کمسنی میں ہی فوت ہو گئی تھی۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں ماڈرن ہسٹری میں ایم اے میں ٹاپ کرنے والی وہ پہلی طالبہ تھی۔

''مجھے مشرق کا سحر، اس کے صحراؤں کا طلسم، اس کے لوگ اور ان کے کلچر کی رومانیت بہت ''ہانٹ'' کرتی ہے۔ پہاڑوں کی دنیا کی ہیبت اور انہیں سر کرنا میرا جنون ہے۔'' ایسی باتوں کا اظہار اکثر اس کے ہاں ہوتا۔

''مجھے ایران جانا ہے۔ انکل فرینک کے پاس۔''

فارسی زبان سیکھنے کا آغاز کرتے ہوئے اس کا گویا ایک اعلان تھا۔
چھ ماہ بعد تہران کی ایک بہت خوبصورت سی شام کو سفارت خانے کے ہال میں استقبالیہ پر کھڑے خوبرو نوجوان لیجشن سیکریٹری ہنری کاڈوگن نے ایک دل کش لڑکی کو قیمتی فرلوں سے سجے فراک میں برطانوی سفارت کار سر فرنیک اور لیڈی فرنیک کے ساتھ اندر داخل ہوتے دیکھا۔ ہال کی کھڑکیوں سے آتی شام کی کرنوں میں اس کے تیز سرخی مائل بال یوں چمکے تھے جیسے ان میں آگ لگی ہوئی ہو۔ اس کی ابھری ہڈیوں والے رخساروں پر چمکتی نیلگوں سبزی مائل آنکھیں کانچ کی طرح چمکتی تھیں۔ اس کے دلکش خدوخال اور اس کے گلے میں پہنے قیمتی موتیوں کا ہار اس کی گردن میں لپٹا بہت قیمتی نظر آتا تھا۔
ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے اس نے پذیرائی کی اور وقت رخصت وہ ذرا سا اس کی دائنی جانب جھکا اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ”ایک چھوٹی سی خواہش، ایک چھوٹی سی درخواست اسے پذیرائی دینا۔ تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“
جرٹروڈ نے رخ پھیرا اور اسے بغور دیکھا۔ ایک دلکش نوجوان شوق و اشتیاق کی لو سے دمکتی آنکھیں اس پر جمائے پوری طرح متوجہ تھا۔
جرٹروڈ کو بھی ہنری پسند آیا تھا۔ اب ملاقاتیں شروع ہوئیں۔ پکنک پارٹیاں، رائیڈنگ، لمبی لمبی سیریں، شاموں کی کافی پارٹیاں اور طویل باتوں کے سلسلوں میں جہاں وہ اپنے بارے میں اسے بتاتی کہ اسے کوہ پیمائی سے لے کر صحراؤں میں گھومنے پھرنے۔ آثار قدیمہ، نئی نئی زبانوں کو سیکھنے، دنیا کو دیکھنے، دنیا کی مختلف قوموں، گروہوں، فرقوں کے لوگوں سے ملنے ان کے کلچروں سے آشنا ہونے کا کتنا شوق ہے؟
ہنری اسے رشک سے دیکھتے ہوئے سوچتا اور دھیرے سے کہتا ”جرٹروڈ تمہارے اور میرے شوق کتنے ملتے ہیں اور ہمارے خیالات میں کتنی ہم آہنگی ہے؟ اور زبانیں تو تم ابھی بھی چھ سات روانی سے بول سکتی ہو۔“
تب وہ کھلکھلا کر ہنستی اور کہتی۔ ”نہیں ہنری یہ تو کچھ بھی نہیں۔ بیس تو کم از کم آنی چاہیں۔ ابھی تو میری فارسی بھی اتنی اچھی نہیں۔ مزید مہارت کی ضرورت ہے۔ یوں مجھے یہ زبان بہت پسند آئی ہے۔ میٹھی اور اپنی پشت پر بھاری اثاثہ لیے۔ ویسے ہنری مجھے مڈل ایسٹ بہت فسینیٹ کرتا ہے۔ اب اس کی

جامع التواریخ

ایلخانی دور کی تصنیف۔ اس کا مولف رشید الدین فضل اللہ ہمدانی (1227ء۔1318ء) اباقا، غازان اور الجائتو منگول بادشاہوں کا وزیر تھا یہ تاریخ وقائع عالم اور خاص کر مغلوں کی سلطنت اور غازان کی بادشاہت کے تفصیلی حالات پر مشتمل ہے۔ 1310ء میں مکمل ہوئی۔

مرسلہ: اکبر درانی، حب (بلوچستان)

سیاحت کرنی ہے۔“
ہنری اس کی خوبصورتی سے کہیں زیادہ اس کے دماغ سے متاثر ہوا تھا۔ وہ ذہانت کی انتہاؤں پر تھی۔
ایسی ہی ایک ملاقات میں ہنری نے کہا تھا۔ ”جرٹروڈ مجھے لگتا ہے تمہیں کوئی عظیم کام کرنا ہے۔ تم بہت خاص اور انوکھی ہو۔ میں تمہیں بہت پیار کرنے لگا ہوں۔ تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“
اس نے چچا اور چچی کو آمادہ کیا اور منگنی کرلی۔ مگر جب اس نے اپنے باپ کو اس کے بارے میں لکھا۔ ہگ بل کا جواب بہت دل شکنی والا تھا۔ ”میں نے اسے قطعی پسند نہیں کیا۔ ہنری بہت عام سے خاندان کا لڑکا ہے۔ معاشی طور پر بھی فیملی مضبوط نہیں۔ اور خود ہنری کی تنخواہ بہت تھوڑی ہے۔ اتنی کم تنخواہ میں میری بیٹی کا گزارہ نہیں ہوگا۔ یوں بھی وہ جوئے کا دلدادہ ہی نہیں بلکہ عادی کھیلنے والا ہے۔ تم خود سوچو جرٹروڈ میں تمہیں کسی جواری کے ساتھ تو نہیں بیاہ سکتا۔ ہمارا خاندان اعلیٰ وکٹورین اقدار کا حامل ہے۔“
خط ہاتھوں میں تھامے اور اسے پڑھتے ہوئے جرٹروڈ نے خود سے کہا تھا۔ ”اف کاش مجھے اپنے باپ سے اتنی محبت نہ ہوتی اور میرا خاندان وکٹورین اخلاقیات اور روایات کا ایسا اسیر نہ ہوتا۔“
تاہم اس نے ردعمل کے طور پر کچھ نہیں کہا۔ منگنی توڑی اور واپس انگلینڈ چلی گئی۔
پر وہ بہت غمزدہ تھی۔ دل شکستہ سی۔ فلورنس سوتیلی ماں جانتی تھی کہ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک لڑکی ہے۔ وہ خود بھی پلے رائٹر تھی۔ شائد اسی لیے اس نے کہا۔ ”تمہارا باپ تمہارے لیے ہیرا سے لڑکے کا متمنی ہے۔ اس ڈپریشن سے باہر نکلو اور لکھو۔ تم نے ایران کا چپہ چپہ دیکھا ہے۔ یہ سب لوگوں کو دکھاؤ۔

آہستہ آہستہ اس نے خود کو آمادہ کیا اور Persian pictures لکھی۔ پہلی کتاب ہی نے اسے بطور لکھاری مستند کر دیا تھا کہ اس کے اندازِ بیان میں جذب کرنے کی فراوانی تھی۔ فارس مغرب کے لیے اتنا زیادہ مانوس نہ تھا۔ اس کی تحریر ایران کے شاندار ماضی کی اساطیری کہانیوں کے پیچ و خم سے گزرتی قاری کو اس کی عظمتوں سے مرعوب کرتی اس کے موجودہ زوال اور اسباب سے آشنا کراتی تھی۔ ایران کے چہرے پر نمایاں اس کی سیاسی تہیں، اس کا اسرار، اس کا طرزِ تمدن، خواتین کے رویے، ان کی بودوباش، ان کا حسن جمال۔ زمین کا قدرتی اور اس پر انسانی ہاتھوں کا دیا گیا حسن، محرم اور رمضان کی رونقوں کی تفصیلات، دلچسپی سے معمور پڑھنے والے کو قید کرتی تھیں۔

مذہبی تہواروں کی تفصیلات میں اسلام اور عیسائیت کے تقابلی جائزے میں دونوں مذاہب کے فرق اور مماثلتوں کی تفصیلات حیران کن تھیں۔

یہ ایک ایسا سفر نامہ تھا جس میں مشرق کی دنیا اپنی چھوٹی چھوٹی تفصیلات اور رازوں سے سامنے آئی تھی۔ اس کی دوسری تخلیق Poems from Diwan Hafiz 1897ء میں شائع ہوئی۔ جو اس کی فنی مہارت کا ثبوت تھی۔

باقاعدہ ترجمے سے پہلے پیش لفظ میں اس نے حافظ کی زندگی کے نمایاں پہلو اور ان کے کام کا تنقیدی جائزہ لیا۔ نظموں کے ساتھ ساتھ لکھے گئے اس کے نوٹس میں حافظ کے ہم عصر شعرا کے تقابلی جائزوں میں اس کے اندر کے علم کی وسعت اور گہرائی کھل کر سامنے آئی۔ کہیں وہ اس کا موازنہ دانتے سے کرتی ہے۔ کہیں وہ اسے گوئٹے سے جوڑتی ہے، اور کہیں ویلن سے۔ کہیں خیالات کی رو میں اسے احساس کی وہ جھلک نظر آتی ہے جو مغرب کی مشرق سے انسپاریشن سے جڑتی ہے۔

اس کی موت کے بعد بیسویں صدی کی وسطی دہائی میں ایک پبلشنگ ادارے نے اس کی اس کاوش کو حافظ ایک عظیم صوفی شاعر، حافظ کی تعلیمات، حافظ کے حالاتِ زندگی وغیرہ مختلف عنوانات کے تحت اسّی نوے صفحات پر مشتمل خوبصورت فارسی خوشخطی کے ساتھ کتابیں شائع کیں جو بہت پسند کی گئیں۔

وہ حافظ شیرازی کی مداح تھی۔ حافظ کے بارے میں اس کا اپنے والد کو ایران سے لکھا گیا ایک خط شاعر کی عظمت اور اس کے کمالِ فن کا ثبوت ہے۔

لکھتی ہے۔ ”میں جیسے جیسے حافظ کو پڑھ رہی ہوں حیرتوں میں گم ہوتی جا رہی ہوں۔ ہم کیسے لوگ ہیں جو اس کے مقام سے ہی آگاہ نہیں۔ اس کی نظموں میں موسیقیت کا ایسا رچاؤ ہے کہ آپ کا جی انہیں بے اختیار گنگناتے رہنے کو چاہتا ہے۔ دنیا کا مقبول ترین اور محبوب ترین جسے شاعروں کا شاعر اور Tongue of the invisible کہتے ہیں۔ میں اس کے دیوان کا ترجمہ کروں گی تاکہ مغرب اسے جان سکے۔“

جب وہ دیوانِ حافظ کا ترجمہ کرنے میں مصروف تھی اسے معلوم ہوا تھا کہ ہنری نمونیے سے فوت ہو گیا ہے۔

چند لمحوں کے لیے اسے ماحول اور اپنا وجود یکسر ساکت محسوس ہوا تھا پھر جیسے اس کے لبوں نے خود سے سرگوشی کی تھی۔

”دیکھو ابھی تو سال ہی گزرا تھا اور وہ دنیا سے بھی چلا گیا۔“

بہت دنوں وہ حافظ کے شعروں کو پڑھتی رہی خاص طور پر اس کے ان اشعار کو زیرِ لب گنگناتی رہی۔ غم زدہ ہوتی رہی۔

بلبل کے دل سے نکلے خون کے قطروں نے
سرخ گلاب کو زندگی دی
اسے توانائی دی
اے موت کی ہواؤں
تم تو میری اُمیدیں بھی لے اڑیں

پھر پہاڑ اور ان کی مہم جوئی نے توجہ کھینچ لی۔ پہلے فرنچ الپس کی Meije چوٹی سر کی تو حوصلہ بڑھا بعد میں سوئز الپس نگاہوں میں آ گئے۔

اس نے بہت سی چوٹیاں سر کیں۔ ایک کو تو اس کا نام بھی دیا گیا۔ Gertrudspitze

اکتیس سال کی عمر میں اس نے مشرق کا رخ کیا۔ یروشلم اور دمشق میں اس کی سہیلیوں نے اسے لکھا تھا۔ ”تم آؤ یہاں۔ بہت حیران کن تجربات سے ملوگی۔“

اب وہ نئی زبانیں سیکھنے میں جت گئی۔ اس نے ٹرکش سیکھی، عبرانی اور عربی میں مہارت حاصل کی اور یروشلم آ گئی۔

مڈل ایسٹ اس کے لیے تحیرات کی سرزمین تھی۔ شہروں کی سیاحت کے بعد وہ صحراؤں کی طرف نکل پڑی۔

☆......☆

افلاق نے کافی کا آرڈر دیتے ہوئے مجھ سے کہا۔ تاریخ کا باریک بینی سے مطالعہ کرنے پر بھی ایسی عورت نہیں

ملتی۔ مشرق وسطٰی کے صحراؤں کی سردی اور گرمی دونوں انتہاؤں پر۔ وجود کو جلانے اور منجمد کرنے والی موسمی شدتیں۔ کیا شیر دل عورت تھی گھوڑوں، خچروں، باورچی، گائیڈ، خیمے، کتابیں نقشے اور دیگر سیاحتی لوازمات کے ساتھ نکل پڑتی۔

سر پر دھرے ہیٹ کے ساتھ کفایہ سے سر ڈھانپتی۔ لمبے اسکرٹ پہنتی۔ چہرے پر جالی دار نقاب ڈالتی اور صحراؤں میں سے گزرتے ہوئے مقامی قبائلی سرداروں اور شیخوں سے ملتی۔ ہمیشہ پروٹوکول کا دھیان رکھتی کہ اسے شیخوں کے سامنے کیسے پیش ہونا ہے اور انہیں کیسے عزت و تکریم دینی ہے؟ وہ زیادہ وقت مقامی لوگوں کے ساتھ گزارتی۔ فراٹے سے عربی بولتی۔ جگہوں کے بارے جانکاری حاصل کرتی۔ ان کے خیموں میں، ان کے گھروں میں، ان کے سے انداز میں چوکڑی مار کر بیٹھتی۔ ان کی تاریخ، ان کے رسم و رواج سے آگاہی حاصل کرتی گاڑھے اور کسیلے قہوے کے گلاس پر گلاس پیتی۔ بڑی سی سینی میں روسٹ بکرا اور چاول جنہیں وہ ان کے ساتھ ہی ہاتھوں سے کھاتی اور انگلیاں چاٹتی۔

مدہنف (مہمان گھر جو نرسلوں اور جیوٹ کے ریشوں سے بنایا جاتا ہے) میں ٹھہرنا اسے بہت پسند تھا۔ جب بھی ایسا موقع آتا وہ اپنے میزبانوں سے stuffed بکرے کی فرمائش کرتی جو اس کی دم اس کے منہ میں ڈال کر اس کی آنکھیں نکالے بغیر روسٹ کیا جاتا تھا۔ سگریٹ پیتی اور حقے کے کش بھرتی۔ اکثر بون فائر میں ان کے ساتھ ڈانس کرتی، گانے گاتی۔ وقت رخصت انہیں قیمتی تحائف اور قیمتی بندوقوں سے نوازتی۔

وہ حیرت سے اسے دیکھتے۔ ایک اکیلی نوجوان خوبصورت عورت تن تنہا اتنے شدید موسم میں کیسے سفر کرتی ہے؟ بل تو اب یہ بھی جان گئی تھی کہ گھڑ سواری کے دوران گھوڑے کی پشت پر بیٹھے بیٹھے اونگھ کیسے لی جاتی ہے؟ کوئین اف دی ڈیزٹ کا خطاب اسے ان ہی قبائلی سرداروں اور شیخوں نے دیا تھا۔

The Desert and the Sown بھی اس کا ایک بے مثل تاریخی شاہکار ہے۔ جو تاریخ نویسی کے ساتھ ساتھ تقریباً ڈیڑھ سو انتہائی اعلیٰ درجے کی تصویروں سے مزین ہے۔

وہ ایک نڈر، دلیر، جی دار اور وسائل رکھنے والی سیاح بھی۔ اس کا بڑا مقصد کرداروں کا مطالعہ، جگہوں کا مشاہدہ اور رسم و رواج سے آگاہی تھی۔

جگہوں کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ اس کا زیادہ فوکس لوگوں پر رہا۔ ان کے اطوار و کردار پر اس کی گہری نظر اور عورت ہونے کے ناطے عائلی زندگی کے بہت سے پہلو جنہیں پردہ دار روایتی اسلامی معاشرے میں صرف ایک عورت ہی دیکھ سکتی ہے۔ اس نے انہیں دیکھا اور پوری تفصیل سے زیر تحریر لائی۔ ان قبائلی معاشروں کی یہ وہ حقیقی تصویر تھی جس نے اسے باقی سیاحوں سے منفرد کیا کہ تہذیبی اور تمدنی زندگی کا ایک اہم پہلو گھریلو معاشرت ہوتی ہے۔ دیواروں کے اندر کی زندگی کیسے

سانس لیتی ہے اور اسے کیسے بسر کرتی ہے۔ عورت ہونے کے ناطے جرٹروڈ نے عرب قبائلی زندگی کو اس کے پورے رنگوں سے دیکھا اور اسے بیان کیا۔

قدرت نے اسے ایک خاص نوع کی حس مزاح سے نوازا تھا۔ پہاڑوں اور صحراؤں کے لوگوں سے اپنے اسفار کے دوران ملاقاتوں میں وہ اپنے مخاطب سے لفظوں کا ایک ایسا ڈرامائی کھیل کھیلتی کہ ان کی شخصیت کھل کر سامنے آجاتی۔ کسی منظر کا بیان ہو۔ کسی شخص سے گفتگو ہو۔ آثار قدیمہ کے کسی حصے کی رو داد ہو۔ منظر آنکھوں کے سامنے مجسم ہوتے تھے۔

Amurath to Amurath اس کا ایک اور شاہکار سفرنامہ ہے جو حلب سے شروع ہو کر دریائے فرات کے ساتھ ساتھ چلتا دیار بکر سے قونیہ تک جاتا ہے۔

The Thousands and one churches جیسی کتاب ولیم ایم ریمزے اور اس کی مشترکہ کاوش سے لکھی گئی۔ اس کی تصاویر اور تفصیلات ایسی معلومات فراہم کرتی ہیں جو بہت قیمتی ہیں۔ آغاز کے بازنطینی اور عیسائیوں کے اناطولیہ کے ریجن میں پوسٹ کلاسیکل یادگاریں جن میں بہت سی اب ناپید ہیں اور جو ہیں ان کے نئے نام ہو گئے ہیں۔

پھر یوں ہوا کہ ان علاقوں سے، بغداد اور عراق سے محبت کرتے کرتے اسے ایک جیالے سے محبت ہو گئی۔ یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ وہ برٹش تھا۔ اس کی چوڑی چھاتی تمغوں سے سجی ہوئی تھی۔ بڑا بہادر، جیالا، دلیر اور دلبر سا مشرق وسطیٰ میں برٹش آرمی کا میجر چارلس ڈوگی ولی Doughty Whlie۔

دونوں مقناطیس کی طرح ایک دوسرے کی طرف بڑھے تھے۔ دونوں کی دلچسپیاں اور شوق ملتے تھے۔ جرٹروڈ کو اپنے اندر بہت ہیجان بھری کیفیات کے مدّ و جزر کا احساس ہوا تھا۔ چارلس میں وہ سب کچھ تھا جس کے خواب جرٹروڈ جیسی خاتون دیکھتی تھی۔ ایک آئیڈیل مرد۔ مگر وہ شادی شدہ تھا اس کے اندر سے ہوک سی اٹھی تھی۔ تاہم پھر بھی وہ خود کو اس کی محبت میں گرفتار ہونے سے روک نہ سکی۔ دونوں ایک دوسرے سے دور ہوتے تو لمبے لمبے خط لکھتے۔

جرٹروڈ کے خطوط ایسے شاہکار ہوتے کہ جنہیں وہ بار بار پڑھتا اور اس کا جی نہ بھرتا۔ پندرہ ہزار خط جو اس نے اپنے والد، والدہ، سہیلیوں اور چارلس کو لکھے۔ یہ وہ آئینہ تھا جس میں اس زمانے کے سارے عکس موجود تھے۔ برطانیہ اور اس کے حواریوں کی چالیں، ریشہ دوانیاں، لارنس آف عریبیا اور چرچل کے کردار۔ مقامی آبادی۔ مذہبی رہنماؤں کے باہمی اختلافات، کمیونسٹ عناصر کا اثر و نفوذ۔ بغداد اور دمشق کے شب و روز۔ یہ خط نہیں تاریخ تھے۔ اس کے علاوہ سولہ ڈائریاں۔ خطوط کو پانچ چھ والیوم کی صورت میں چھاپا گیا۔ اور یہی صورت ڈائریوں کی ہوئیں۔ مغرب کا عام قاری تو انگشت بدنداں تھا۔ اس کے تحریری شہ پاروں نے مشرق کو اس کے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا۔ جنگی جرنیلوں اور سیاسی مہروں کے لیے اس میں جاننے اور سمجھنے کے لیے بہت کچھ تھا۔

یہی وہ دن تھے جب پہلی جنگِ عظیم شروع ہوئی اور جرٹروڈ نے سوچا اس کے مادر وطن کو اس وقت اس کی ضرورت ہے۔ وہ فرانس پہنچی۔ ریڈ کراس میں زخمیوں اور گم شدہ سپاہیوں کے اندراج کی ڈیوٹی دینے لگی۔

ایسے ہی دنوں میں اسے چارلس کا خط ملا۔ اس نے لکھا تھا میں تمہیں مس کر رہا ہوں۔ ملنا چاہتا ہوں۔ اگلے چند دنوں تک مجھے گیلی پولی کے فرنٹ محاذ پر جانا ہے۔

چار دن انہوں نے لندن کی گلیوں، سڑکوں پر گھومنے پھرنے، ڈھیروں ڈھیر باتیں کرتے ریسٹورنٹوں میں کھانا کھانے میں گزارے اور پھر جدا ہوئے۔

مئی کے پہلے ہفتے کے آخری دنوں میں جرٹروڈ لندن آئی تھی۔ خوبصورت موسم کا سارا حسن جنگ کے بادلوں میں گم ہوا پڑا تھا۔ لندن ریڈ کراس آفس میں جب وہ فائلیں دیکھ رہی تھی۔ دفعتاً آفس کی انچارج نے باتیں کرتے کرتے جزیرہ نما گیلی پولی کے محاصرے میں ان برٹش سینئر آرمی افسروں کی ہلاکت کا ذکر کیا تھا جن کے بارے میں اطلاعات کل شام موصول ہوئی تھیں۔ بریگیڈیئر جنرل اور بریگیڈیئر میجر کے مرنے کے بعد کمان لیفٹیننٹ کرنل چارلس ڈوگی نے سنبھالی تھی۔ تاہم اپنی تمام تر دلیری کے باوجود وہ اور اس کے ساتھی مارے گئے۔ وہ ساکت بیٹھی اس کے لبوں کو ہلتے دیکھتی رہ گئی تھی۔ اندر اٹھتے طوفان کے جھکڑوں کی شدت کے کسی ہلکے سے عکس کو اس نے چہرے پر پھیلنے نہیں دیا۔

اور جب روز مرہ کے اس کوفت بھرے تھکا دینے والے ڈیسک ورک کو نمٹا کر وہ اٹھی۔ اس نے لمبی آہ بھر کر خود سے کہا تھا۔ ”محبت میرے نصیب میں نہیں۔“

جیسے اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا اور وہ بغداد آگئی۔

”یہ کیسی حیرت انگیز سی بات ہے۔ مشرق نے میرے دل کو گھائل کر دیا ہے۔ مجھے ہمیشہ اس کی خوبصورتی اور سحر جکڑ

لیتا ہے۔ گھر تو وہاں ہے جہاں تمہارا دل ہے۔ میں خود سے پوچھتی ہوں۔ میرا دل کہاں ہے؟'' بغداد میں۔ مجھے بغداد سے اتنی محبت ہے کہ بغدادیوں کو بھی نہیں ہوگی۔ کوئی بغدادی اس کے حسن کو ان نظروں سے نہیں دیکھتا جن سے میں اسے دیکھتی ہوں۔ دریا کی خوبصورتی، پام کے باغوں کا حسن کھجور کے درختوں کا بانکپن، صحرا کی دل آویزی۔

یہ اپنے والد کو اس کا لکھا ہوا ایک خط تھا۔

اور یہ 1916ء کے دن تھے۔ برٹش آرمی بصرہ پر قابض ہو چکی تھی۔ مگر اسے بغداد آنے میں بہت دشواریاں نظر آ رہی تھیں۔ ہائی کمان اس کی صلاحیتوں سے آگاہ تھی۔ ان علاقوں میں اس کی ہردل عزیزی سے واقف تھی۔ مقامی بااثر لوگوں سے اس کے رابطوں کو جانتی تھی۔

''ہمیں محفوظ راستے بتاؤ۔ بغداد تک پہنچنے میں تمہاری رہنمائی چاہیے۔'' جنرل کلیٹن کا پیغام اسے ملا تھا۔

اس نے نقشے اور ڈائریاں اٹھائیں اور بصرہ پہنچ گئی۔ برٹش آرمی کم سے کم جانی و مالی نقصان اور مزاحمت کے بعد بغداد پر قابض ہو گئی تھی۔ برطانیہ کی ہائی کمان نے اسے باقاعدہ اورینٹل سیکریٹری کا درجہ دیا۔

برطانیہ انٹیلی جینس سروس کو اس کی صلاحیتوں کا بہت اچھی طرح علم ہو گیا تھا کہ عربوں سے ڈیل کرنے میں انہیں اس کی کتنی شدید ضرورت ہے۔ اس کا زبان پر عبور اور صحرائی قبائل کے بارے علم منفرد تھا۔ عراق کے ساتھ اور ہاشمی خاندان کے ساتھ بہرحال اس کی ہمدردیاں تھیں۔ شریف مکہ کے بیٹوں فیصل اور عبداللہ کو عراق اور اردن کے بادشاہ بنانے میں اس کا بنیادی کردار تھا۔

برطانوی مینڈیٹ کو پس پردہ قائم رکھنے اور عراقیوں کو فرنٹ لائن پر رکھنے کا اسے اصرار تھا۔ قاہرہ کی کانفرنس میں وہ واحد خاتون عورت تھی جس کی نئے ملکوں کو بنانے اور مستقبل کی صورت پر دوٹوک حتمی اور قابلِ عمل رائے تھی۔ میسوپوٹیمیا کا چیف پرسی کوکس اور ونسٹن چرچل اس سے متفق تھے۔

کنگ میکنگ جیسے مشکل مرحلوں سے گزرنے، اختیارات عراقیوں کو منتقل کرنے میں اس کی حیثیت لازماً کلیدی رہی تھی۔ الخاتون الخاتون کہتے عراقیوں اور ام المومنین کہتے کہتے شامیوں کی زبانیں خشک ہوتی تھیں۔ بے تاج ملکہ جیسی حیثیت تھی۔

پر ان مرحلوں کے بعد تلاطم خیز زندگی میں تھوڑا سا ٹھہراؤ آ گیا۔ ڈپریشن کا شکار ہوئی مگر اس نے اپنی دلچسپیاں

آرکیالوجی میوزیم بنانے میں ڈھونڈ لیں۔ ایک بہت بڑے کام کی تکمیل ہو چکی تھی۔ اور یہ سال 1926ء تھا۔ اور وقت بہت بدل گیا تھا۔ بادشاہ کو اس کی ضرورت کم کم محسوس ہوتی تھی۔ اس نے خواب آور گولیاں زیادہ کھالی تھیں۔ جو جان لیوا ثابت ہوئیں۔ اور وہ دنیا سے رخصت ہوگئی۔ یہیں بغداد میں برٹش قبرستان میں دفن ہے۔

مگر کہانی ختم کرنے سے قبل افلاق نے کہا تھا۔ ''ایک عجیب سی بات ہے کہ پچاس سال کی عمر میں وہ تیسری محبت میں مبتلا ہوئی۔''

افلاق نے کہانی ختم کردی تھی پر میں ساکت بیٹھی تھی۔ تیسری محبت، یہ ایک اور حیرت انگیز انکشاف تھا۔ یوں بھی عورت ہونے کے ناطے اس کی زندگی کے کچھ خاص حصوں کے بارے میں میں بہت متجسس تھی۔ ان کی تشفی نہیں ہوئی تھی۔

دفعتاً میرے ذہن میں برق سی کوندی۔ بغداد کی ایلیٹ فیملی کی عورتیں جن کے ہاں بیسویں صدی کی دوسری تیسری دہائی میں اس کا آنا جانا اور میل ملاقات تھی انہیں ڈھونڈا جائے۔ گو 1920ء اور 2007ء درمیان کا بہت سا وقت۔ بغداد کے پلوں کے نیچے تو ڈھیروں ڈھیر پانی گزر چکا ہے۔ کھوج کروں گی بھی تو اس کی کوئی ساتھی ملنی ناممکن۔ مگر شاید کہیں ایک نسل سے دوسری اور تیسری تک کسی تعلق، کسی واسطے، کسی فخریہ اعزاز کے ساتھ کوئی اہم، کوئی خاص واقعہ، خاندان میں گردش کرتا رہا ہو اور کوئی راوی کچھ رازوں سے پردہ اٹھادے۔

''اب اس کی قبر دیکھنی تو بہت ضروری ہوگئی ہے۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔

''وہ کون سا مسئلہ ہے۔ آرمینین چرچ کے پاس ہی باب شور جا کے نزدیک ہے۔ شام کو کسی بھی وقت چلے چلیں گے۔''

وہ دن بھر میرے ساتھ رہی تھی۔ میں نے طے کیا تھا کہ جیسے میں پرانے دمشق اور حلب کے گلی کوچوں میں عالیشان گھروں کے کھلے دروازوں سے اندر داخل ہو جاتی تھی۔ رہتل، وسیب کے سارے نظاروں کے مزے لوٹتی تھی۔ اکثر کھانا بھی ان کے دسترخوان پر کھاتی تھی۔ یہ طریقہ یہاں بھی آزماؤں۔ مگر دو قباحتیں سامنے تھیں۔ موسم کی شدت اور بغداد کے نازک حالات۔ پاکستان کا سن کر کہیں دہشت گردوں کی ساتھی جان کر ہی نہ دھتکار دی جاؤں۔ بہتر ہے کہ افلاق کی مدد لوں۔

میرا مسئلہ شاید افلاق کی سمجھ سے باہر تھا۔ بیٹے جیسے لڑکے سے میں کیا کھل کر بات کرتی کہ میرے اندر کون سا نسوانی اسرار جاگا ہوا ہے۔

میں ہوٹل آئی۔ اتفاق ہی تھا کہ مروان سیٹ پر تھا۔ میں نے اسے آج کی کارگزاری سے مطلع کرتے ہوئے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

میری بات کا جواب دینے سے پہلے اس نے ستائشی انداز میں کہا تھا۔ ''کیا عورت تھی۔ اپنے وقت کی ذہین ترین اور چالاک ترین۔ جس کا دماغ جینئس مرد کا تھا۔ وہ اس علاقے کے چپے چپے کو جانتی تھی۔ ایک بار ہمارے میسوپوٹیمیا کے ایک ممتاز شیخ سے اس کے علاقے کی جغرافیائی حدود کے متعلق پوچھا گیا۔ اس نے کہا تھا۔ جرٹروڈ بیل سے پوچھو۔ ڈوب مرنے کی بات تھی نا شیخوں کے لیے۔

میری خواہش کا سن کر اس نے کہا تھا۔ ''مشکل لگتا ہے۔ دراصل ہمیں اس کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات اس لیے بھی ہیں کہ ہم سیاحتی پیشے سے منسلک ہیں۔ وگرنہ عام لوگ نہیں جانتے ہیں۔ یوں عراق کے ممتاز احمد شیلابی خاندان کی بزرگ بی بی جو صدام سے پہلے کے بغداد کی معتبر اور امیر ترین عورت شمار ہوتی تھیں اور اعظمیہ کے ڈیرپلیس میں کسی ملکہ کی طرح رہتی تھیں۔ ان کے ہاں اس کا بہت آنا جانا تھا۔ اس خاندان کی لڑکی تمارہ بھی بہت سرگرم ہے۔ ممکن ہے وہ کچھ جانتی ہو۔

میری بے تابی اور شتابی کا کچھ یہ عالم تھا کہ بس نہ چلتا تھا ابھی اٹھ کر منصور سٹی چلی جاؤں جہاں ان کا محل نما گھر ہے۔ مروان مزید بتا رہا تھا۔

''گزشتہ سال اس نے گورا قبرستان میں جرٹروڈ کی قبر کے آس پاس یاسمین کے پودے اور کھجور کے بیشمار درخت لگوائے تھے۔''

منصور ڈسٹرکٹ گرین زون سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ بغداد کی ہائی کلاس سماجی زندگی کا ایک اہم حصہ یہاں رہائش پذیر تھا۔ یہ ڈپلومیٹ، بزنس کلاس اور اعلیٰ درجے کے ہنرمندوں کا بھی گھر تھا مگر بموں کے دھماکوں، اغوا اور تشدد پسندوں نے اسے غیر محفوظ بنادیا ہے۔

منصور میں تمارہ شیلابی سے تو ملاقات نہ ہوئی کہ وہ استنبول گئی ہوئی تھی۔ ہاں البتہ اس کے محل نما گھر کے سیکورٹی گارڈوں اور اسلحہ بردار محافظوں سے ضرور ملاقات ہوئی

جنہوں نے مجھے پاکستانی جان کر مسکراہٹیں بکھیریں اور افسوس بھی کیا کہ وہ اپنے پاکستانی مہمان کی خدمت سے قاصر رہے۔

تاہم بغداد پریس کلب میں حسین السیدی جیسے صاحب علم لکھاری اور صحافی سے باتیں ہوئیں۔ حالاتِ حاضرہ سے متعلق بہت سی باتوں کے بعد جب میں نے جرٹروڈ بیل کے تیسرے عشق والے موضوع کو چھیڑا اور مروان وافلاق کی گفتگو سے حاصل کردہ ابن سعود بن عبدالعزیز اور شریف مکہ کے بیٹے امیر فیصل کے نام ان کے سامنے رکھے۔

''ابن سعود''

ان کے گول مول سے چہرے پر نفی کے بھرپور تاثرات بکھر گئے۔

ابن سعود کے بارے میں تو بہت اونچی رائے رکھتی تھی وہ۔ اس کا اعتراف تھا کہ اپنے ہم عصر لیڈروں میں منفرد تھا۔ کہیں وہ۔ اس کی شاندار قامت اور وجود کے بارے میں وہ بہت رطب اللسان بھی۔ اور کہیں اس کے بھاری پپوٹوں کے نیچے اس کی سنجیدہ اور ذہین آنکھوں، سپاہیانہ دلیری وشجاعت اور سیاسی بصیرت کے گن گاتی تھی۔

''تو اس کا مطلب ہے۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ''بس محبت میں گرفتار ہوگئی۔ بھئی وہ ایک عظیم لکھاری بھی تھی۔ کرداروں کو حسن وخوبی سے بیان کرنا جانتی تھی۔ یوں بھی ابن سعود اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کی تیز اور تیکھی آواز سے اسے کوفت ہوتی تھی۔'' جب وہ بے تکلفی سے اسے کہتی۔

''عبدالعزیز۔ عبدالعزیز دیکھو اسے۔ اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟'' ابن سعود کوفت بھرے انداز میں بات کو ٹال جاتا تھا۔

ہاں فیصل کے سلسلے میں کہا جاسکتا ہے مگر میں اسے قربت رفاقت کے تعلق کا نام دیتا ہوں اس کی چند وجوہات بھی ہیں۔

پہلی جنگِ عظیم میں ان فاتح اتحادیوں کی بندر بانٹ میں شام پر مسلط فرانسیسیوں نے تو فیصل کو دمشق سے سال بھر کے اندر ہی دھکا دے کر نکال دیا تھا۔ برطانیہ نے تھوڑی سی شرم وحیا کی۔ جرٹروڈ بیل نے اسے تین صوبوں پر مشتمل اس نئے ملک جس کی حدود کی لائنیں خود اس نے کھینچی تھیں پر بٹھایا۔ مقامی اشرافیہ اس کی کچھ خاص حامی نہ تھی۔ مگر درمیان میں جرٹروڈ بیل تھی جس پر عرب شیخ بھی اعتماد کرتے تھے اور برٹش کیبنٹ بھی۔

عراقی جھنڈے کی ڈیزائن کاری دونوں نے مل کر کی تھی۔ بغداد کے ماضی سے اس کی پوری جانکاری تھی۔ کالے تی عباسی دور، سبز پٹی امیہ اور سفید فاطمیوں کی نمائندہ بنی۔ اونچ نیچ، توڑ جوڑ کے سبق وہ سب اس نے اسے پڑھائے تھے۔ برطانیہ کی پشت پناہی بھی فیصل کو سو فیصد حاصل تھی۔ اور جس صبح فیصل کی رسم تاجپوشی تھی اس نے تقریب کے اختتام پر کہا تھا۔ "یہ کنگ میکنگ تو نرا عذاب ہے۔ اس کھینچا تانی نے مجھے تھکا دیا ہے۔"

ابھی اس بیاہ کا ہنی مون پریڈ ہی چل رہا تھا کہ جب شیعہ سنی عوام متحد ہو کر اس سامراجی غلبے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ سارے میسوپوٹیمیا کے شہروں میں محمد البعیدی کی شاعری گونج رہی تھی۔

اے عراقیوں اٹھ جاؤ اب
آگ لگا دو
خون سے ذلت کے دھبے دھو دو
ہم غلام ہیں؟
جو گردنوں میں طوق پہنیں
ہم قیدی ہیں جو پاؤں میں بیڑیاں پہنیں
ہم کیا عورتیں ہیں؟
جو آنسوؤں کو ہتھیار سمجھتی ہیں
ہم یتیم ہیں؟
کہ ہمیں عراق کے لیے مینڈیٹ چاہیے۔

جب ہوا اور فضا ایسی ہوں تو ظاہر ہے انحصار بڑھ جاتا ہے ہمہ وقت مشورے رائے۔ یوں بھی فیصل عرب خوبصورتی کا شاہکار نمونہ تھا۔ ایسے میں محبت تو ہو جاتی ہے نا۔

"بڑے المناک انجام سے دوچار ہوئی۔" میرے لہجے میں گلے گلے تک تاسف تھا۔

"ایسا ہی ہوتا ہے۔ بڑا نارمل سا لہجہ تھا۔ ان کا بہت اونچے جا کر جب بندہ زمین پر آتا ہے تو ذہنی توازن بگڑ جاتا ہے۔ ڈپریشن کے دورے پڑنے لگتے ہیں۔ فیصل کو اس کے مشوروں کی ضرورت اب کم کم ہوتی تھی۔ برٹش ہائی کمیشن آفس میں نئے نئے لوگ آ گئے تھے۔ آرکیالوجی میوزیم اس کا ایک بڑا کام مکمل ہو گیا تھا۔ وہ بیمار رہنے لگی تھی۔ چین اسموکر تھی۔ پھیپھڑے متاثر ہو گئے تھے۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہم جیسے لاکھوں بغدادیوں سے زیادہ بغداد کی تھی۔"

☆......☆

پاکستان آ کر بھی وہ مجھے اکثر یاد آتی۔ میں تنہائی میں ایک سوال ضرور اپنے آپ سے کرتی۔ زندگی سے بھری ہوئی، آزاد معاشرے کی ایک مکمل عورت کیسے ممکن ہے کہ اس کے اندر مرد کی قربت کی تمنا نہ مچلی ہو اور اس نے اس کی تکمیل نہ کی ہو۔

پھر ایسا ہوا کہ مجھے جم خانہ لائبریری سے جار جینا ہو ول کی کتاب The Queen of the Desert ملی۔

اپنے کزن کی ممبر شپ پر میں نے اسے ایشو کروایا۔

پڑھنا شروع کیا۔ پڑھتی گئی پڑھتی گئی۔ پھر رکی۔ ایک بار، دو بار، تین بار پڑھا۔ چوتھی بار اور پانچویں بار کا پڑھا ہوا آپ بھی پڑھیے۔

یہ ذکر ہے اس شام کا جو بادلوں سے بھری ہوئی تھی۔ جرٹروڈ چارلس سے مل کر لندن میں اپنے ذاتی اپارٹمنٹ میں کوئی گھنٹا بھر پہلے آئی تھی۔ چارلس ڈوگی کو آج رات دس بجے کی ٹرین سے محاذ پر جانا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اسٹول پر بیٹھی وہ اپنے بالوں میں لگی پنیں نکال رہی تھی جب اس نے ایک نرم اور دھیمی سی دستک سنی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ چارلس مسکراتے ہوئے اندر آیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ چپ چاپ۔

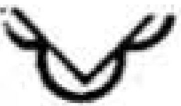
جرٹروڈ سے کہا ہی نہیں گیا کہ ابھی تو میں تمہیں رخصت کر کے آ رہی ہوں۔ لباس بھی تبدیل نہیں کیا۔ پھر چارلس کے توانا بازوؤں نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اس کے بالوں پر بوسہ دیتے ہوئے اس نے کہا۔

"جرٹروڈ پتا نہیں کیوں لگتا ہے تمہیں شائد پھر نہ دیکھ سکوں۔ تین گھنٹے کا مارجن تھا۔ جی چاہ رہا تھا یہ وقت بھی تمہارے ساتھ گزاروں۔"

اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھ گیا اور بازوؤں کے ہالے میں سمیٹتے ہوئے اس نے اسے بھی ساتھ ہی بیٹھا لیا۔ تب اس کے بازوؤں میں گھرے اس کی محبت کی گرمی میں پگھلنے اور ڈوبنے کے بجائے اس نے دھیرے سے سرگوشی میں کہا تھا۔

"نہیں۔ چارلس نہیں۔ ہرگز نہیں۔"

پھر اس نے اس کے والہانہ بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو آہستگی سے پیچھے ہٹاتے اپنے جسم کو اکڑاتے، اس کی گرفت میں سے نکلتے اور کھڑے ہوتے ہوئے کہا تھا۔ "چارلس میں ورجن ہوں۔"



داستانِ کرب

دانیہ صدیقی / کشمالہ حسن

شانِ کج کلاہی مظلوموں کے خون میں تر بہ تر ہوتی ہے۔ تخت و تاج کے زعم میں شاہان کس طرح مظلوموں کی زندگی سے کھیلا کرتے تھے۔ کس طرح اذیت دے دے کر خوش ہوتے تھے اس کی ایک جھلک۔ ان اذیت رساں آلات کا تذکرہ جسے دیکھ کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ماضی کے ظالمین اور ان کے آلاتِ کرب کا تذکرہ

اس بات سے تو ہم اچھی طرح واقف ہیں کہ زمین سب سے پہلے ہابیل کے خون سے رنگین ہوئی لیکن کیا ہم یہ جانتے ہیں کہ ابنِ آدم میں تشدد کرنے اور سزا دینے کا رواج کب سے عام ہوا اور اس کے پیچھے کیا محرک تھا؟ آخر وہ کیا وجہ تھی کہ انسان اپنے ہی ہم نفسوں پر تشدد کر کے تسکین حاصل کرنے لگا؟ آج تک کی طویل انسانی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو تشدد بہت سے بدقسمت لوگوں کے لیے ایک ناقابلِ یقین مگر کڑوی سچائی کے روپ میں بن کے ابھرا ہے۔ ایک حیرت انگیز حقیقت یہ ہے کہ انسانی تشدد کے پیچھے نہ صرف سزا کا محرک پوشیدہ تھا بلکہ حضرت انسان نت نئے طریقوں کے تشدد ایجاد کر کے اپنی اذیت پسندی پر مائل فطرت کی تسکین بھی کرتا رہا ہے۔ مثلاً ہم جب چنگیز خان کی تعمیر کردہ کھوپڑیوں کے مینار کے بارے میں پڑھتے ہیں تو دیر تک انسانی بے حسی اور تشدد پسندی کے بارے میں سوچتے رہ جاتے ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران جرمنی میں قائم کردہ عقوبت خانوں کے بارے میں جان کر انسانی بربریت کی ایک اور بھیانک مثال سامنے آ جاتی ہے۔ اسی طرح مغل بادشاہ قیدیوں کو شیر کے پنجرے میں ڈلوا کر یا ہاتھی کے پیروں سے کچلوا کر اپنی تسکین کیا کرتے تھے۔ میں چونکہ بہت بے رحمی سے یہ سب کچھ لکھ رہی ہوں اس لیے میری درخواست ہے کہ کمزور دل حضرات اس مضمون کو نہ پڑھیں۔

بے رحم کردار تو انفرادی طور پر بے رحم ہوتے ہیں۔ یعنی بے رحمی ان کا ذاتی کردار ہوا کرتا ہے لیکن بے رحم سزاؤں میں تو پورا معاشرہ انوالو ہو جاتا ہے۔

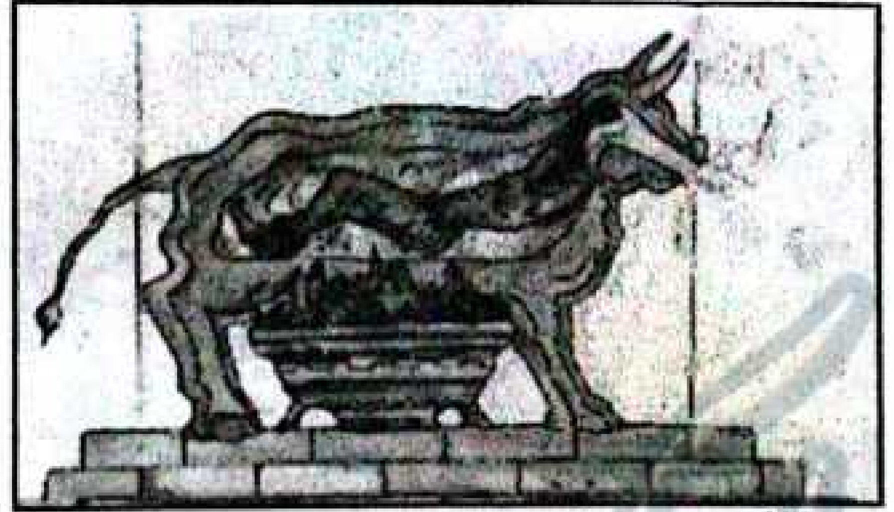
یہ سزائیں رسوم و رواج اور قانون کے نام پر مجرموں، غلاموں، جنگی قیدیوں کو دی جاتی تھیں اور تماشا دیکھنے والے چاروں طرف جمع ہو کر لطف اندوز ہوتے۔

غرضیکہ قدیم رومنوں کا عہد ہو یا موجودہ زمانے کا اقوام متحدہ کی تمام امن شقوں کی نفی کرتا گوانتو ناموبے کا جزیرہ! تاریخ انسانی ایسے موذی اور جان لیوا سزاؤں سے بھری پڑی ہے کہ جن کے بارے میں صرف سن کر بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اچنبھے کی بات تو یہ ہے کہ یہ تمام تشدد اس دور کے لوگوں میں نہ صرف بہت پسند کیے جاتے تھے بلکہ یہ ان کی بھرپور تفریح کا بھی ذریعہ تھے۔ آیئے ہم آپ کو اسی طرح کی چند ہیبت ناک اور سنگدلی سے بھرپور سزاؤں کا مختصر سا احوال بتاتے ہیں۔

پیتل کا بیل

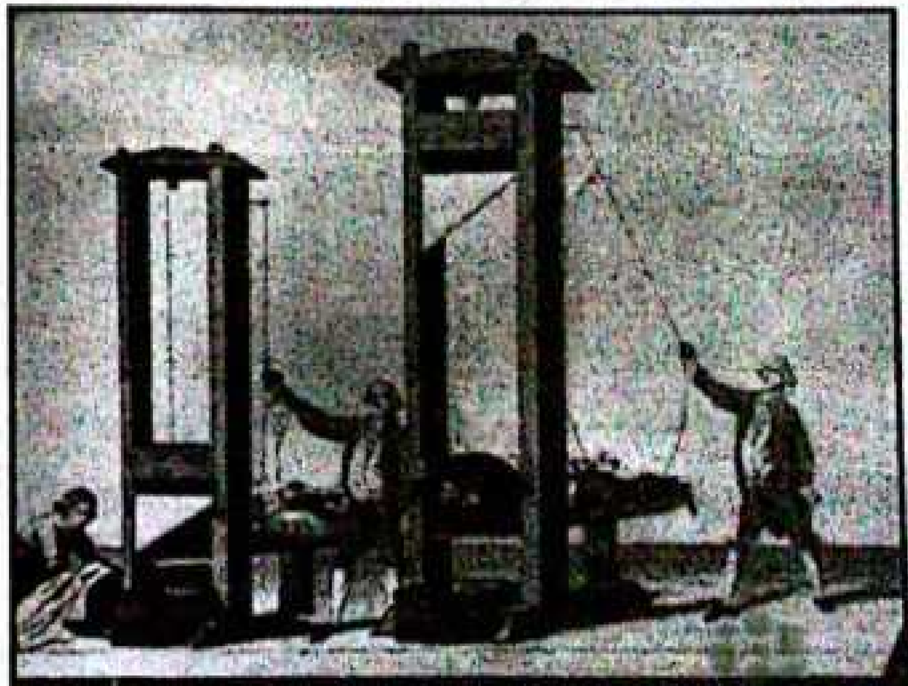
جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے کہ اس طریقے میں پیتل سے بنے بیل کا استعمال ہوتا تھا۔ قدیم رومن دور میں مجرموں کو سزا دینے کا یہ سب سے پسندیدہ طریقہ تھا۔ اس



طریقے میں سزا یافتہ شخص کو پیتل کی دھات سے تیار کردہ ایک بیل کے مجسمے کے اندر ڈال دیا جاتا تھا جو اندر سے کھوکھلا ہوتا تھا، پھر اس مجسمے کے نیچے تیز آگ بھڑکا دی جاتی تھی جس سے کچھ ہی دیر میں دھات گرم ہو کر دہکنے لگتی تھی اور اندر موجود شخص جھلتی ہوئی گرمی اور دھوئیں کی تاب نہ لا کر تڑپ تڑپ کر مر جاتا تھا۔ اس بات کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا کہ جب تک وہ شخص دم نہیں توڑ دیتا تب تک اس بیل کے منہ والے سرے سے اس کی درد بھری آہیں اور دلوں کو شق کر دینے والی چیخیں مجمع کو سنائی دیتی رہتیں۔

تیز دھار آری

یہ سزا کا پسندیدہ اور تیر بہدف طریقہ سمجھا جاتا تھا۔ تیز دھار آریوں کو مضبوط رسیوں سے منسلک کر دیا جاتا تھا جو لکڑی کے اونچے اونچے تختوں پر بندھی ہوتی تھیں۔ ملزم کے ہاتھ پیر باندھ کر اس کا سر آری کے عین نیچے رکھ دیا جاتا تھا اور وقت مقررہ پر رسی ڈھیلی کر دی جاتی تھی جس کے نتیجے میں



تیز دھار آری ایک ہی جھٹکے میں ملزم کا سر تن سے جدا کر دیتی تھی۔ کیونکہ اس طریقے میں ملزم کو کسی تکلیف اور اذیت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا اسی لیے اس کو تاریخ میں سب سے 'انسانی اور مہذب' سزا ہونے کا شرف حاصل ہے۔

موت کا شکنجہ

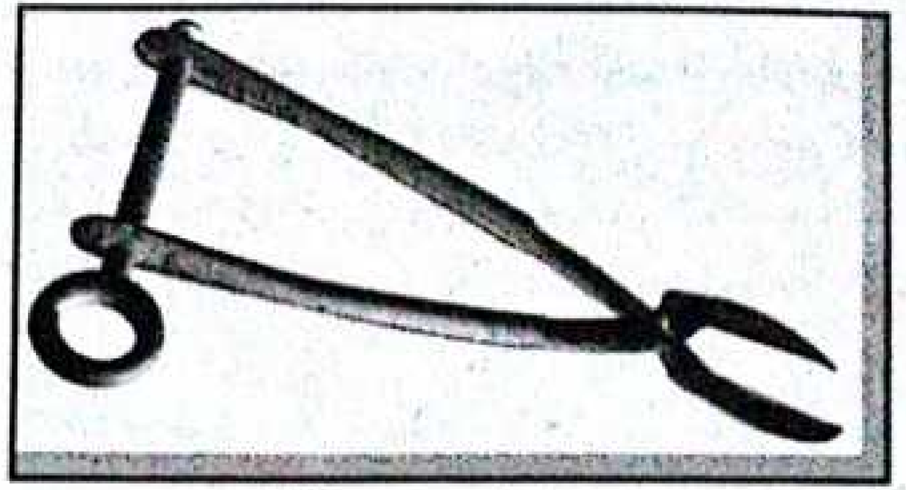
اس طریقۂ تشدد میں ملزم کو لکڑی کے ایک تختے پر لٹا کر باندھ دیا جاتا تھا جس کی رسیاں ایک چرخی سے منسلک ہوتی تھیں۔ اس تشدد کا شکار ملزم بے انتہا اذیت میں مبتلا ہو کر بالآخر سسک سسک کر مر جاتا تھا۔ ملزم کے دونوں ہاتھوں کو اوپر والی رسی کی مدد سے کس دیا جاتا تھا اور پیروں کو نیچے موجود رسیوں سے باندھ دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد سزا دینے پر متعین اہلکار آہستہ آہستہ چرخی کو حرکت دیتے تھے جس سے



اس کے ہاتھ اور پیر دو مخالف سمتوں میں کھنچنا شروع ہو جاتے تھے اور ملزم کا جسم کسی کمان کی طرح تن جاتا تھا۔ اہلکار حرکت جاری رکھتے یہاں تک کہ اس کے جسم کے جوڑ شدید کھنچاوٹ کے نتیجے میں کڑاکے کی آواز کے ساتھ ٹوٹ کر علیحدہ ہو جاتے مگر اپنی تسلی کے لیے اہلکار اس وقت تک چرخی گھماتے رہتے جب تک کہ اس بدقسمت ملزم کے جسمانی اعضاء ٹوٹ کر اس کے جسم سے مکمل طور پر جدا نہ ہو جاتے تھے۔

شق لسانی

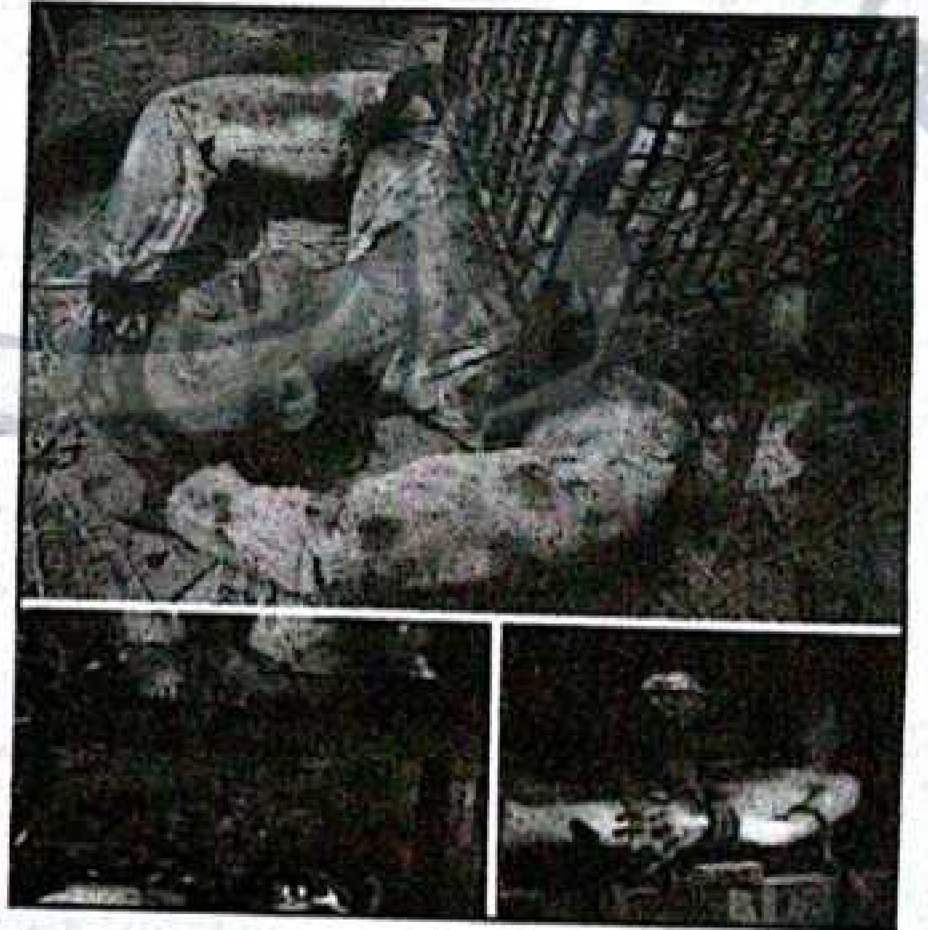
ایک بڑی سی قینچی کی مانند نظر آنے والا یہ آلہ مجرموں کے لیے کسی بُرے خواب سے کم نہ تھا۔ اس کی مدد سے مجرموں کو زندگی بھر کے لیے بولنے کی صلاحیت سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ سب سے پہلے اس کے سرے پر موجود نوکدار کندوں کی مدد سے زبردستی منہ کھلوایا جاتا تھا اور پھر



شکنجے کے بیچوں بیچ موجود میخ کس دی جاتی تھی جس کے نتیجے میں منٹوں میں مجرم کی زبان کٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی تھی۔

مرگِ موش

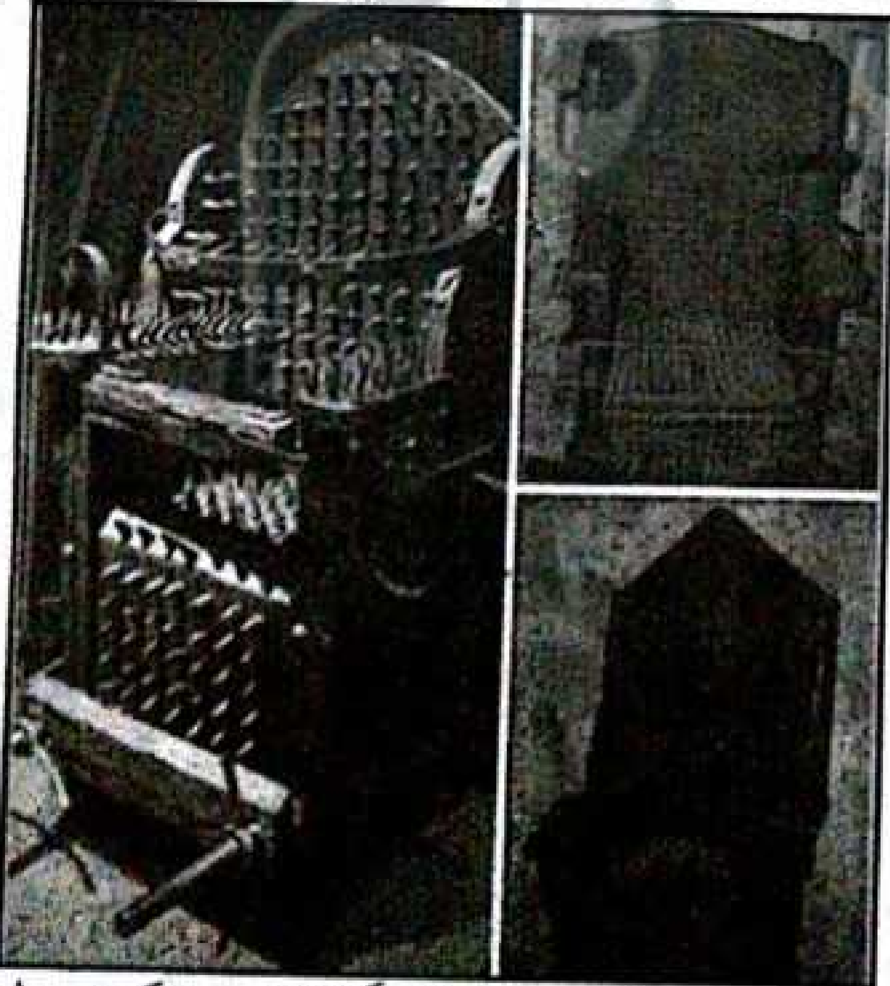
سننے میں یہ طریقہ تشدد اتنا غیر انسانی اور ظالمانہ نہیں لگتا لیکن جب آپ اس کی تفصیل پڑھیں گے تو ہمارا دعویٰ ہے کہ آپ کئی راتوں تک ٹھیک سے سو بھی نہیں سکیں گے۔ چوہوں کی مدد سے ملزموں پر کیا جانے والا یہ جان لیوا ٹارچر دراصل قدیم چینیوں کی ایجاد ہے۔ اس طریقے میں سب



سے پہلے تو ملزم کے ہاتھ پیر باندھ کر اسے بے بس کر دیا جاتا تھا پھر اس کے برہنہ پیٹ پر خون آشام چوہوں سے بھرا ایک پنجرہ کس دیا جاتا تھا۔ پنجرے میں ایک جانب تو چوہے ہوتے تھے اور اس کے دوسری جانب ایک چھوٹا سا خانہ ہوتا تھا جو خالی رکھا جاتا تھا۔ جب یہ پنجرہ ملزم کے پیٹ پر اچھی طرح باندھ دیا جاتا تھا تو اس خانے میں دہکتے ہوئے انگارے ڈالنے کا کام شروع ہو جاتا تھا۔ جیسے جیسے انگاروں [illegible] ہوتا جاتا ویسے ویسے گرمی اور تپش سے گھبرائے ہوئے چوہے کوئی اور راہ فرار نہ پا کر اپنے نوکیلے دانتوں اور تیز پنجوں کی مدد سے ملزم کا پیٹ ادھیڑنا شروع کر دیتے تھے تاکہ پنجرے سے نکل کر اس گرمی سے نجات حاصل کر سکیں۔ ظلم و جبر کا یہ مکروہ کھیل گھنٹوں تک جاری رہتا تھا اور لوگ ملزم کی بیچارگی اور دلخراش چیخوں سے حظ اٹھاتے تھے۔ یہاں تک کہ ملزم انتہائی کرب اور تکلیف میں مبتلا ہو کر سسک سسک کر اپنی جان دے دیتا۔

کرسیِ اجل

یورپی پولیس مجرموں کو سزا دینے کے لیے اس انوکھے آلے کا استعمال انیسویں صدی تک کرتی رہی ہے۔ قیدیوں سے اعترافِ جرم کروانے کے لیے اس طریقے کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ تفتیش سے پہلے مجرموں کو ایک بار اس کرسی کا محض دیدار کروا دیا جاتا تھا جو ان کی زبان کھلوانے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ کبھی کبھار انہیں دوسرے مجرموں کو اس کرسی پر سزا پاتے بھی دکھا دیا جاتا تھا، ان کی دل دہلا دینے والی چیخوں اور کرب و اذیت سے بھری آہوں سے گھبرا کر عادی سے عادی مجرم بھی اس کربناک انجام سے بچنے کے لیے اپنی زبان کھول دیتا تھا۔ جو مجرم ذرا ڈھیٹ واقع ہوتا تھا اس کو اس پانچ سو سے ڈیڑھ ہزار



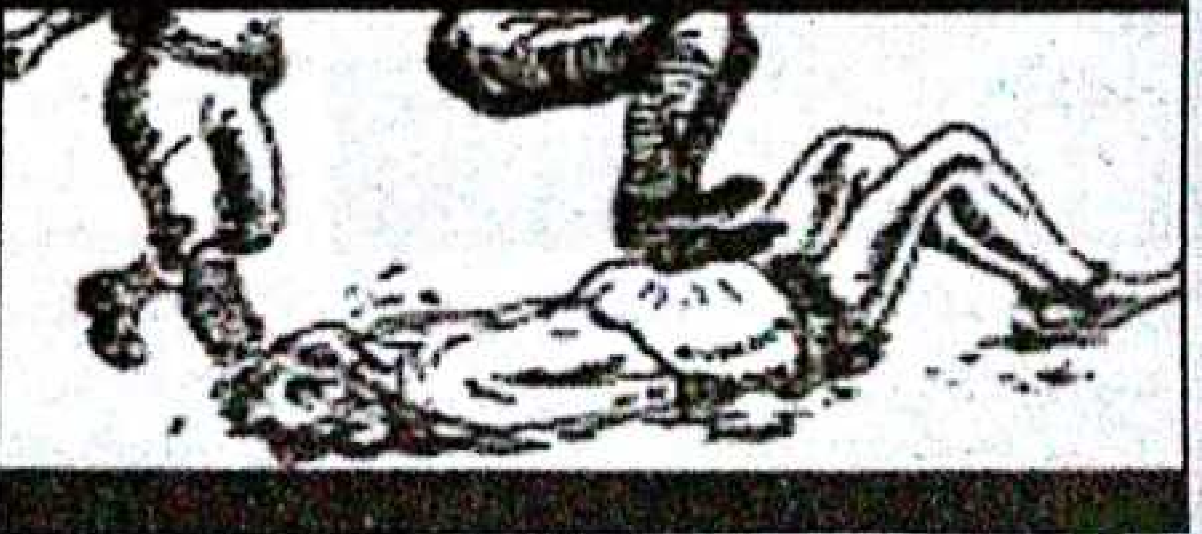
تک کی تعداد رکھنے والی انتہائی نوکیلی میخوں والی کرسی پر بٹھا کر اس کے ہاتھوں اور پیروں کو کرسی سے متصل چمڑے کی بیلٹ سے کس دیا جاتا تھا پھر وقفے وقفے سے اس کرسی میں میخوں کی جانب سے گرم گرم بھاپ بھی چھوڑی جاتی تھی۔

مجرم جو ویسے ہی ان میخوں پر بیٹھ کر درد سے بلبلانے لگتا تھا اس دہری اذیت کی تاب نہ لاتے ہوئے بالآخر اپنا جرم قبول کرلیتا تھا مگر کئی دنوں تک وہ چلنے پھرنے اور اٹھنے بیٹھنے کے قابل نہ رہتا۔ اکثر قیدی بعد میں زخم خراب ہوجانے کے باعث زندگی بھر کے لیے معذور ہو جاتے یا پھر جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔

آبِ مرگ

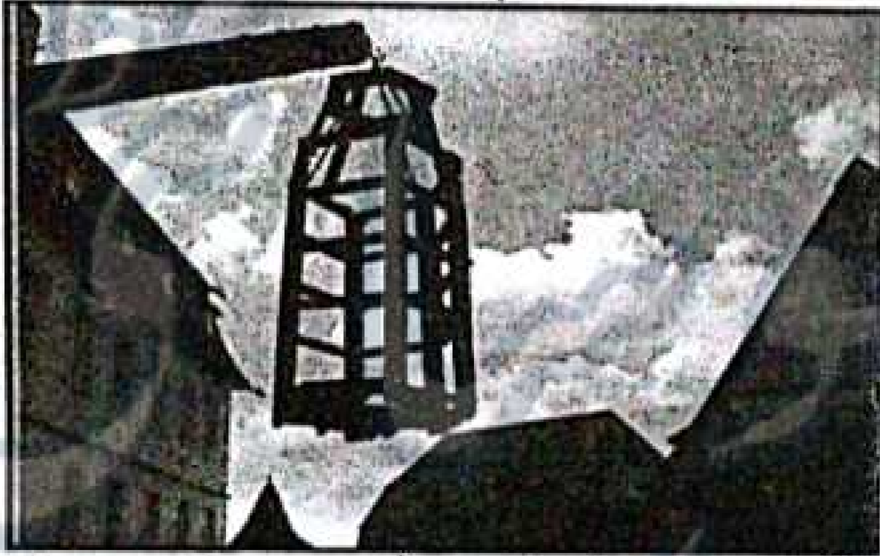
اگر آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ اس طریقے میں مجرموں کو پانی میں ڈبو کر مارا جاتا ہوگا تو ہم آپ کو بتا دیں کہ آپ کی سوچ بالکل غلط ہے۔ اس سزا کی ابتداء دوسری جنگِ عظیم کے دوران جاپانی افواج نے کی۔ یہ لوگ قیدی کے ہاتھ اور پیر خاردار تاروں سے باندھ کر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیتے تھے پھر ایک سپاہی اس کی ناک کے راستے ایک تیز دھار والی پانی کی نلکی اس کے پیٹ تک پہنچاتا تھا۔ اس کے بعد بدقسمت قیدی کرب و اذیت کی اتھاہ وادیوں میں غرق ہوجاتا تھا اور منہ بندھا ہونے کے باعث صرف آنکھوں سے فریاد کرنے کے قابل ہوتا تھا۔ ظالم جاپانی فوجی اس کا تمسخر اڑاتے اور اس کے تڑپنے سے پوری طرح لطف اندوز ہوتے۔ جب اس بدنصیب کا پیٹ لگاتار پانی بھرنے کی وجہ سے پھول کر غبارے جیسا ہوجاتا تو اس سزا کے دوسرے حصے پر عملدرآمد کرنے کا وقت آجاتا۔ ایک تنومند جاپانی فوجی آگے بڑھتا اور بیدردی سے اس کے پھولے ہوئے پیٹ پر زور زور سے لاتیں مارتا اور اچھلتا، یہاں تک کہ اس قیدی کا پیٹ ایک زوردار آواز کے ساتھ پھٹ جاتا اور بھیانک درد اور کرب کا شکار قیدی آخر کار لقمۂ اجل بن جاتا۔





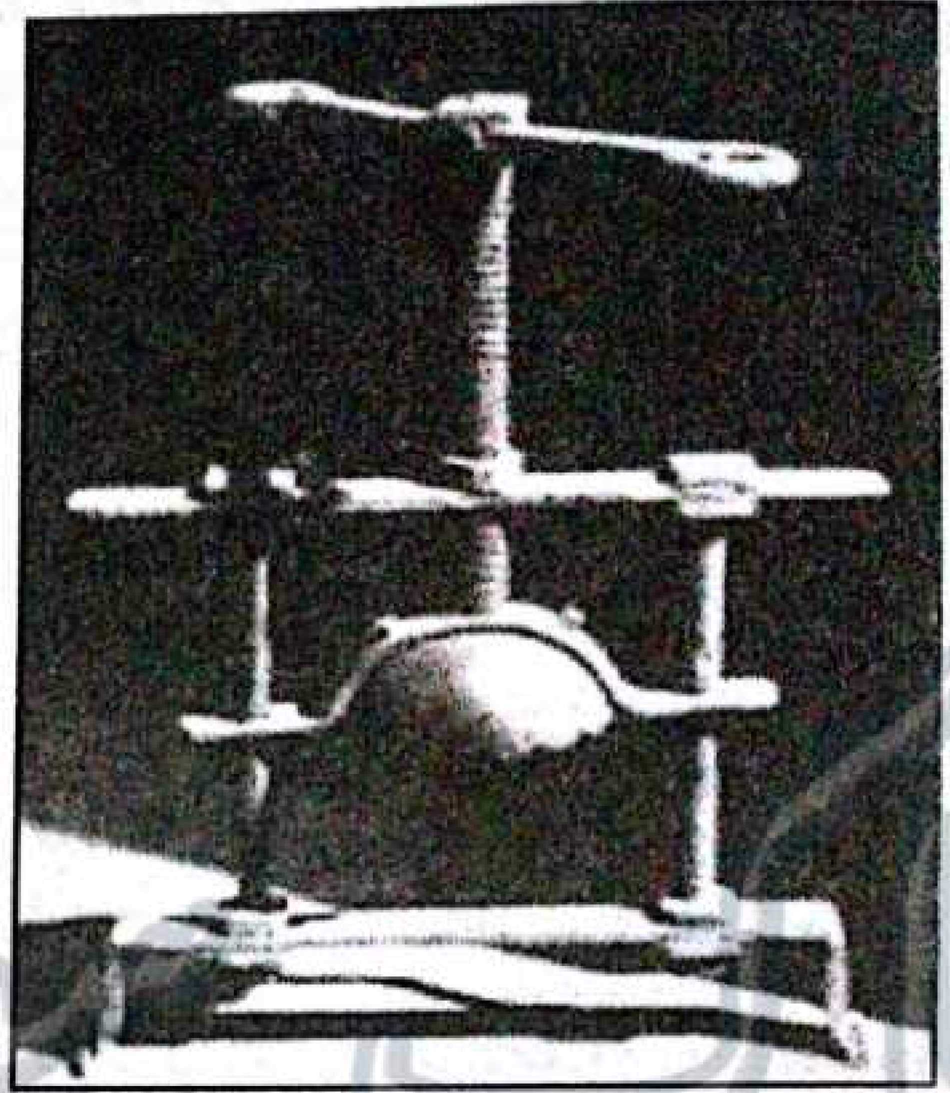
زندانی مقفس

انسانوں نے اپنے ہی جیسے انسانوں پر تشدد اور سزا



کے جو نئے نئے طریقے ایجاد کیے ہیں ان کے بارے میں جان کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اب یہی طریقہ دیکھ لیں کہ اونچائی پر لٹکتے ہوئے پنجرے میں گنہگار مرد یا عورت کو بناء کسی تخصیص کے برہنہ حالت میں بھوکا پیاسا قید کردیا جاتا تھا۔ عموماً یہ پنجرے ایک نارمل انسان کے قد کے مقابلے میں کافی چھوٹے ہوتے تھے۔ چنانچہ قیدی اس میں ٹھیک سے کھڑا ہونا تو دور کی بات ٹھیک سے بیٹھ بھی نہ پاتا تھا۔ اسی کسمپرسی کی حالت میں کئی کئی دن بلکہ کئی کئی ہفتوں تک قید رہنے کے بعد وہ بھوک، پیاس اور موسم کی شدت سے بالآخر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے پر مجبور ہوجاتا۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ مرنے کے بعد بھی اس کی لاش کو پنجرے میں ہی چیل کوؤں کی خوراک بننے کے لیے چھوڑ دی جاتی تھی۔ ان پنجروں کو یورپ میں The hanging coffins کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

قوت سے چور چور ہو جاتا پھر دونوں طرف سے پڑنے والے شدید دباؤ کی وجہ سے آنکھیں اپنے حلقے سے پوری طرح باہر ابل پڑتیں اور بالآخر ایک بھیانک آواز کے ساتھ اس ادھ مرے آدمی کی کھوپڑی چٹخ جاتی اور وہ موت کو گلے لگا کر اس دردناک تکلیف سے نجات پالیتا۔



موت بالعسل

ملزم کو ایک کھلے میدان میں بڑے سے ٹب میں اس طرح بٹھا دیا جاتا کہ صرف اس کا چہرہ ٹب سے باہر ہوتا اور باقی جسم بندھی ہوئی حالت میں چادر سے مکمل طور پر ڈھکا ہوا ہوتا۔ ملزم کے چہرے اور بالوں پر اچھی طرح سے شہد مل کر اس کو اسی حالت میں بیٹھا چھوڑ دیا جاتا۔ کچھ ہی دیر میں میٹھی چیز کی طرف راغب ہونے والے بہت سے کیڑے جیسے ننھی ننھی چیونٹیاں، مکوڑے، شہد کی مکھیاں اور یہاں تک کہ بھڑیں تک اس کے چہرے پر دھاوا بول دیتیں اور اس کے بعد وہ جس کربناک موت سے دوچار ہوتا اس کا اندازہ آپ خود بھی لگا سکتے ہیں۔

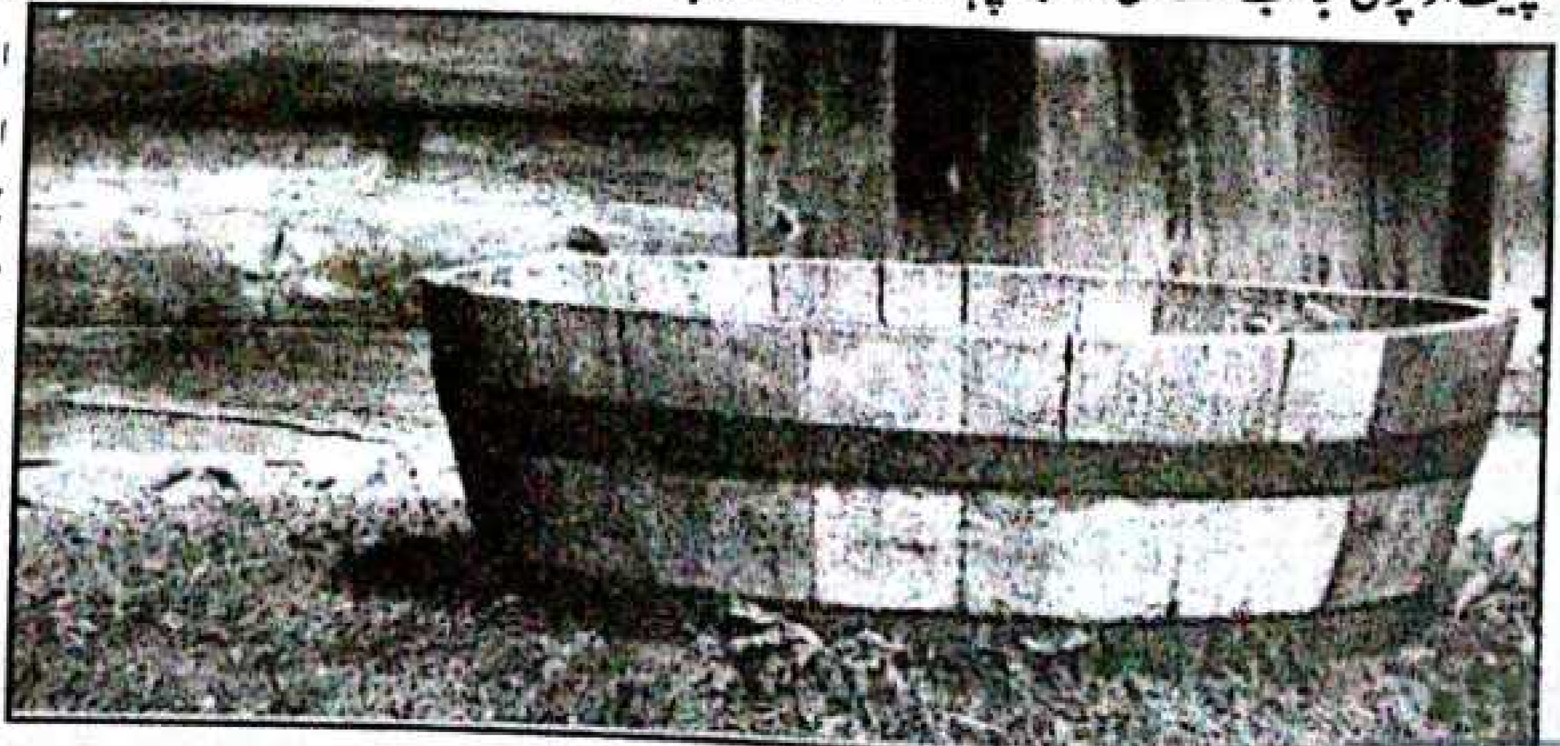
ابھی تک تو ہم نے آپ کو عہدِ ماضی کی صرف ان سزاؤں کے بارے میں آگاہ کیا ہے جن کی تفصیل آپ بھی گھبرائے بغیر پڑھ سکیں جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ تاریخِ انسانی ایسی سنگدلانہ اور درندگی سے بھرپور سزاؤں سے بھری پڑی ہے کہ جن کا ذکر ہم ان کی وحشت ناکی کے باعث سرگزشت کے صفحات پر کرنے سے قاصر ہیں۔ البتہ جاتے جاتے دورِ جدید کے چند ٹارچرز کا مختصر سا جائزہ لینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

کاسۂ عبرت

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی ابتداء تک لوہے کے ایک بھاری بھرکم اوزار کے ذریعے مجرم کی کھوپڑی چٹخا کر اسے موت سے ہمکنار کرنا ایک معمولی سی سزا سمجھی جاتی تھی۔ اس پر عملدرآمد کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ مطلوبہ مجرم کے سر پر ایک لوہے کا خول بٹھا دیا جاتا تھا جس کا نچلا حصہ لوہے کی ایک وزنی پلیٹ سے منسلک ہوتا جو اس مجرم کے جبڑے پر اچھی طرح فکس ہو جاتی۔ جب یہ کام انجام دے لیا جاتا تو اگلے مرحلے میں خول کے اوپر لگے ہینڈل کو دھیمے دھیمے کسنا شروع کر دیا جاتا تھا جس کے نتیجے میں سر پر جما خول نیچے کی جانب جبکہ جبڑوں پر کسی لوہے کی پلیٹ اوپر کی جانب کھسکنے لگتی۔ نتیجتاً پہلے اس شخص کا جبڑا پوری

شکنجۂ سفید

اس سزا کی ابتداء تو ایران سے ہوئی مگر امریکا اور یورپی ممالک میں بھی یہ طریقہ بہت مقبول ہے۔ ملزم کو رنگوں سے مکمل طور پر عاری ایک بے انتہا سرد اور بالکل سفید کمرے میں نامعلوم مدت کے لیے قید کر دیا جاتا ہے



جہاں کوئی اس سے بات چیت کرنے کے لیے موجود نہیں ہوتا۔ کمرے میں کوئی کھڑکی یا دروازہ تک موجود نہیں ہوتا قیدی کا لباس بھی مکمل سفید ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس کو دیا جانے والا کھانا بھی صرف سفید غذا جیسے چاول، دودھ یا لسی پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس قید تنہائی کے نتیجے میں ملزم نہ صرف بیمار ہو جاتا ہے بلکہ نفسیاتی اور جذباتی طور پر مکمل طور پر اس قدر ٹوٹ جاتا ہے کہ موت کی خواہش کرنے لگتا ہے۔

برفانی قید

سی آئی اے اس طریقے کو اپنے مجرموں پر استعمال



کرتی ہے۔ مجرم کو گھنٹوں، دنوں، مہینوں اور بھی کبھار سالوں کے لیے پوری رفتار سے چلتے ایک دیوہیکل ایئر کنڈیشنر کے سامنے بٹھا دیا جاتا ہے۔ یہ سزا تب تک جاری رہتی ہے جب تک مجرم اعترافِ جرم نہیں کرلیتا۔ اس سزا کی شدت کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ ویتنام جنگ کے دوران پکڑے جانے والے ایک انتہائی مطلوبہ ویتنامی فوجی افسر کو سی آئی اے نے لگاتار چار سالوں تک اسی طرح کے ایئر کنڈیشنر کے سامنے دن رات بٹھائے رکھا تھا۔

ان سزاؤں کے علاوہ زیرِ تفتیش مجرموں کے ماتھے پر بوند بوند کر کے پانی ٹپکانے کی سزا بھی بہت مقبول ہے، نیز جسم کے نازک حصوں پر بجلی کے جھٹکے دینا، کانٹے دار لکڑی کی مدد سے تلوؤں پر شدید ضرب لگانے اور دوسرے بہت سے نا قابلِ ذکر قسم کے طریقے بھی عام ہیں۔ زیادہ تر گرفتار شدہ غیر ملکی جاسوسوں کے منہ کھلوانے کے لیے فوج ایسے اور دیگر

کئی قسم کے راستے اختیار کرتی ہے۔

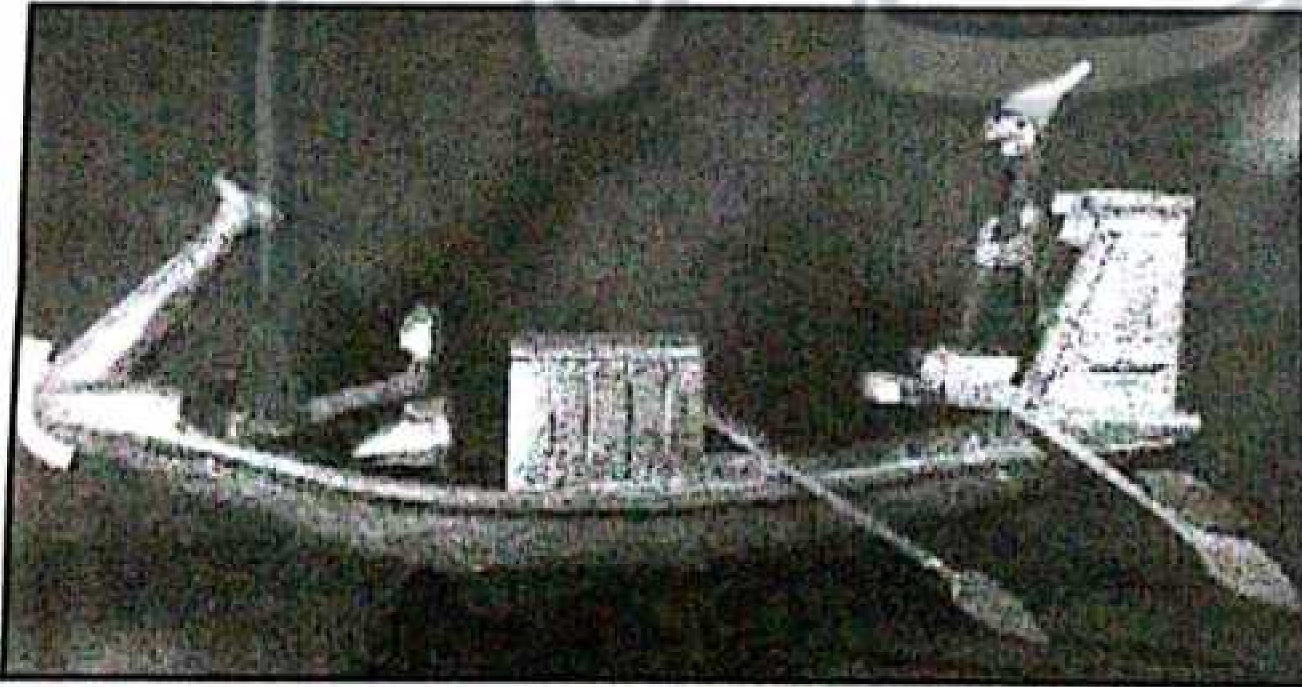
موت کی کشتی

موت دینے کا یہ طریقہ قدیم فارس میں رائج تھا۔

جس کو سزا دینی ہوا سے زبردستی بہت سا دودھ پلایا جاتا۔ اس کے بعد اسے شہد کھلایا جاتا اور وہ بھی اتنا کہ وہ مرنے کے قریب ہو جاتا۔ اس کے بعد سزا پانے والے کو الٹیاں شروع ہو جاتیں (ڈائریا) تو اسے موت کی کشتی (بڑے سے نار) میں لٹا دیا جاتا۔ جو اسی قسم کی غلاظت سے بھری ہوئی ہوتی۔

اس کشتی میں زہریلے کیڑے مکوڑے بھی ہوتے۔ قیدی کشتی میں لیٹ جانے کے بعد بھی الٹیاں کیے جاتا۔ اسے موشن ہونے لگتے۔ جس کی وجہ سے ڈھیروں کیڑے مکوڑے اور مکھیاں اس سے چمٹ جاتیں۔ وہ اتنا کمزور ہو جاتا کہ اپنے ہاتھ بھی نہیں ہلا پاتا تھا۔ وہ پانی کی کمی کا شکار ہو جاتا (ڈی ہائیڈریشن) وہ تڑپتا رہتا۔ الٹیاں کرتا رہتا، کیڑے اسے کاٹتے رہتے اور اسی عالم میں اس کی موت ہو جاتی۔ انتہائی بے چارگی اور بے بسی کی موت۔ مرنے کے بعد اس کی لاش جلا کر اس کی راکھ بکھیر دی جاتی۔ یہ ایسی سزا تھی کہ لوگ اس سزا کے خوف سے ہی مرنے لگتے تھے۔

کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج کا انسان زیادہ درندہ



اور بے رحم ہے یا کل کے لوگ بھی ایسے ہوا کرتے تھے۔

فلان

یہ بھی کسی کو سزا دینے کا بے رحم ترین طریقہ تھا۔ یہ سزا میکسیکو میں رائج تھی اور بہت ہی وحشیانہ۔

جس کو سزا دینی ہوتی۔ اس بے چارے کو کسی تختہ میں جکڑ دیا جاتا اور وہ بھی اس طرح کہ وہ جنبش بھی نہیں کر پاتا

تھا۔

اب اس کے جسم کے دونوں طرف دو جلاد تیز دھار چاقو لے کر کھڑے ہو جاتے اور آہستہ آہستہ اس کی کھال اتارنے لگتے تھے۔

زندہ انسان کی کھال اتار دی جاتی تھی۔ آپ اندازہ لگا لیں کہ یہ کتنا بھیانک اور بے رحم عمل ہوتا ہوگا کہ کسی زندہ انسان کی کھال اتار دی جائے۔

عام طور پر یہ عمل اس بے چارے کی آنکھوں سے شروع ہو کر اوپر تک آتا تھا اور کبھی کبھی قانون کے فیصلے کے مطابق چہرے سے ابتدا کرتے ہوئے نیچے تک جاتے۔

خدا جانے کھال اتارنے والے کس جگرے کے لوگ ہوتے ہوں گے۔ بہرحال ثابت یہ ہوا کہ آپ جس مخلوق کو انسان کہتے ہیں وہ درندوں سے بڑھ کر درندہ ہے۔

بانس کے ذریعے موت

یہ بھی حد سے زیادہ تکلیف دہ موت تھی۔ اس میں مرنے والا لمحہ لمحہ اپنی موت کے قریب ہوتا رہتا۔

رات کے وقت سزا پانے والے کو بانس کے پودے پر لٹا کر اس کے ہاتھ پیر چار سمت میں گاڑی ہوئی میخوں سے اس طرح باندھ دیتے کہ وہ ذرا سی بھی جنبش نہ کر سکتا اور بانس پورا جو تیز نوکیلا اور انتہائی سخت ہوتا ہے اس کی پیٹھ میں سوراخ کرتا ہوا سینے سے باہر آ جاتا۔ بانس کا پودا انتہائی تیزی سے بڑھتا ہے اور ایک رات میں تقریباً ایک ہاتھ لمبا ہو جاتا ہے۔ اس طرح صبح تک سزا پانے والا انسان تڑپ تڑپ کر مر جاتا۔



بے رحمانہ موت درکار ہوتی تھی۔ اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے۔ اس طرح وہ بے پناہ سکون محسوس کرتے تھے۔

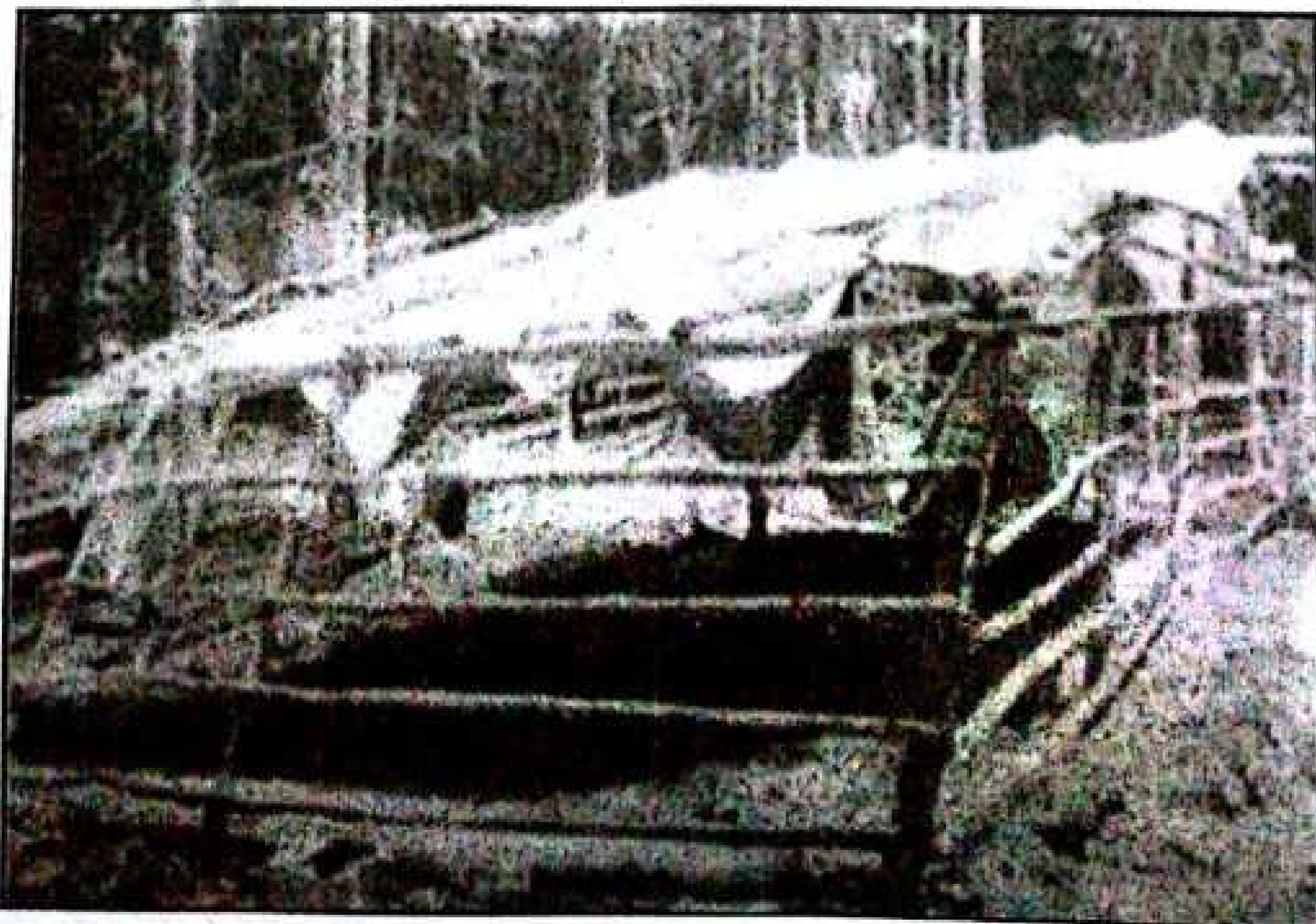
میرا خیال ہے کہ اس قسم کی سزائیں مجرموں سے زیادہ تماشائیوں کی دل چسپی کے لیے ہوا کرتی ہوں گی۔ یہ سزا یورپ میں عہدِ وسطیٰ میں دی جاتی تھی۔

ایک پہلو یہ بھی تھا کہ دیکھنے والے اگر تفریح حاصل کرتے تو بہت سوں کو عبرت بھی ہوتی ہوگی اور وہ یہ خواہش اور دعائیں کرتے ہوں گے کہ خدا انہیں ایسی موت سے محفوظ رکھے۔

موت کا غسل

انتہائی بھیانک اور تکلیف دہ موت کا عمل یا سزا۔

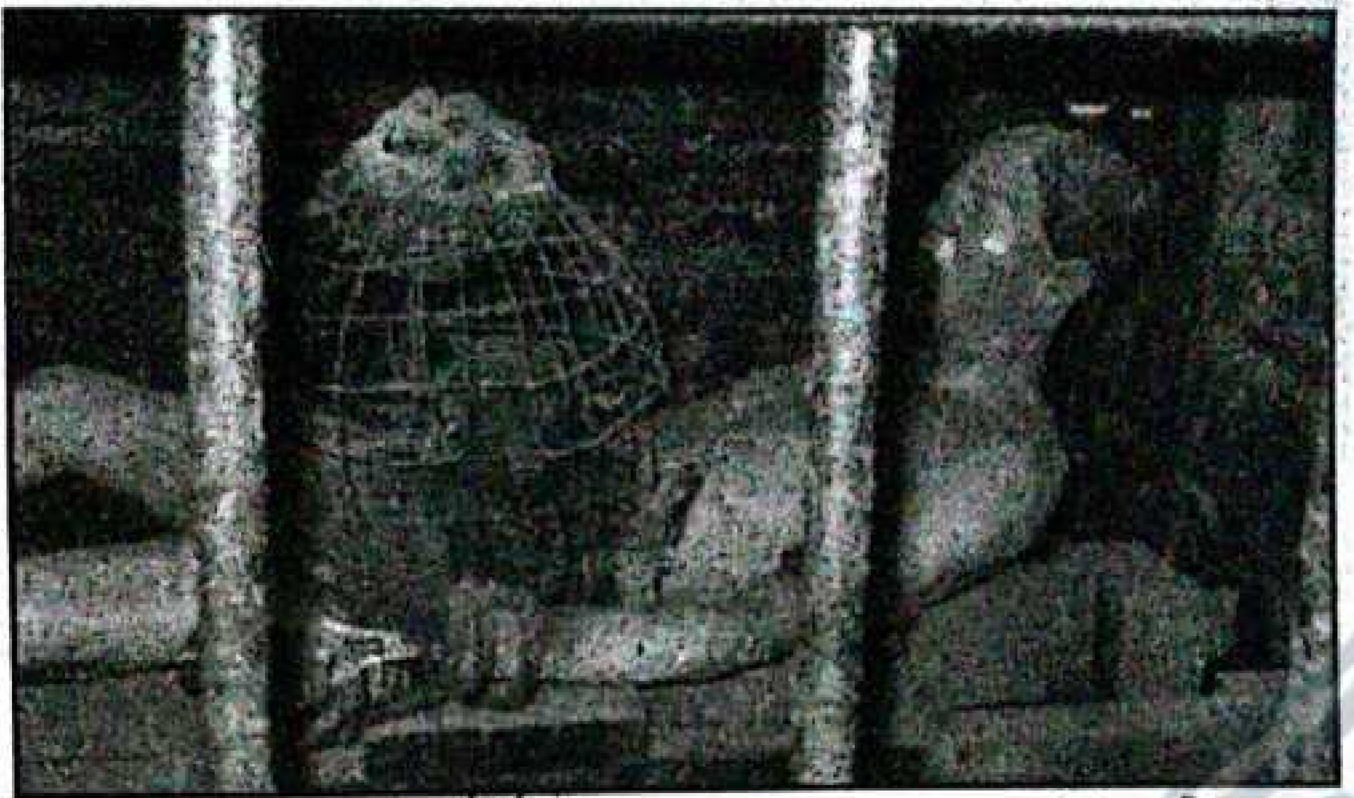
یہ سزا یورپ اور ایشیا کے بہت سے ممالک میں دی جاتی۔ ہنری ہشتم کے زمانے میں یہ سزا بہت عام تھی۔



انسانی وحشت کی یہ انتہا تھی۔ چلیں مان لیا کہ اس زمانے میں گولیاں اور برقی کرسیاں وغیرہ نہیں ہوتی تھیں لیکن خطرناک قسم کے زہر تو ہوتے تھے۔

اس بدنصیب کو مہلک زہر دے کر بھی مارا جا سکتا تھا لیکن اس طرح تماشا دیکھنے والوں اور حکمرانوں کی تفریح کہاں سے ہوتی۔ انہیں تو زیادہ سے زیادہ وحشیانہ اور

آغوش میں پہنچ جاتا۔
عیسائی حضرات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تصویروں اور مجسموں میں اس قسم کی مصلوب پوزیشن میں دکھاتے ہیں۔



آرے کی موت

انتہائی تکلیف دہ اور بے رحم طریقہ۔
اس میں یہ کرتے تھے کہ سزا یافتہ کو الٹا لٹکا کر اس کی دونوں ٹانگیں الگ الگ سمتوں میں ستونوں سے باندھ دی جاتیں۔
اس طرح اس کے جسم کے دوسرے حصوں کو بھی باندھ کر اسے بے بس کر دیا جاتا۔ اس کے بعد اس کی پھیلی ہوئی ٹانگوں کے درمیان سے کسی آرے کی مدد سے اس کے بدن کو چیرنا شروع کرتے اور اوپر تک آتے۔ اس طرح وہ بے چارہ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔



اگر سزا میں نرمی برتنی ہو تو پھر سر کے اوپر سے آرے کے ذریعے چیرا لگاتے تا کہ اس کی موت فوری طور پر واقع ہو جائے اور وہ اپنی موت کی زیادہ تکلیف محسوس نہ کر سکے۔

پتھروں کا ایک بڑا سا ٹب ہوتا۔ اس ٹب میں پانی یا کوئی محلول بھر دیا جاتا اور اس کے نیچے آگ لگا دی جاتی۔ اتنی تیز کہ وہ پانی بری طرح ابلنے لگتا تھا۔ اس کے بعد جس کو سزا دینی ہوتی اس کے سارے کپڑے اتار کر اسے اس ٹب میں پھینک دیا جاتا۔ اس سزا میں جان کنی کا صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے کہ ذرا سی دیر میں اس بدنصیب کا پورا جسم گندھ کر رہ جاتا تھا اور ایک بھیانک موت اس کا مقدر بن جاتی۔

ہزار زخم

یہ قدیم چین کی سزا تھی۔ اس سزا کو چنگ چی کہا جاتا تھا۔ اس میں یہ کرتے کہ سزا یافتہ کو کسی کھمبے سے باندھ دیتے تھے۔ اس کے بعد اس کے جسم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کیے جاتے۔ یعنی اس کے جسم کے ہر حصے سے گوشت اتارا جاتا۔ اس لیے اس طریقے کو ہزار زخموں والا طریقہ کہا جاتا تھا۔
تو ایسی ہوتی تھیں سزائیں اور ایسے ہوتے تھے حضرت انسان۔ جو اذیتیں دے کر خوشیاں محسوس کرتے۔

مصلوب

یہ سزا غلاموں، مجرموں اور دشمن ملک کے فوجیوں کے لیے ہوا کرتی۔
آپ میں سے بہت سوں نے مصلوب کی کیفیت میں مجسمے یا تصویریں دیکھی ہوں گی۔ ایک کراس کی شکل میں۔ سزا یافتہ کو اس کراس سے باندھ دیا جاتا۔ اس کی دونوں ہتھیلیوں میں میخیں ٹھونک دی جاتیں جس سے وہ اس تختے سے جڑ کر رہ جاتا تھا۔ پھر دوسری میخیں اس کے پیروں میں ٹھونک دی جاتیں اور اسے یوں ہی چھوڑ دیا جاتا۔ وہ بے چارہ خون کے بہاؤ کی وجہ سے دھیرے دھیرے موت کی

سخنور

محمد ایاز راہی

زبان کو نظم کے قاعدے میں ڈھال کر انسانی جذبوں کی عکاسی سے ایک جہانِ دیگر کی تشکیل کرنا شاعری کہلاتا ہے جو جذبوں کے اظہار کی خوب صورت تمثیل ہے، الفاظ کا جادو ہے جو ہر دل کو مسحور کرلیتا ہے۔ اس فن کی چند باکمال ہستیوں کا مختصر مختصر تذکرہ

ادب کے شائقین کے لیے ایک تحفۂ خاص



محترم سلیم احمد کی اک مختصر آزاد نظم ہے

مرے فن کی یہ کاوش ہے
کہ گونگے تجربے
جن کی خموشی اک اذیت ہے
لبِ اظہار پاجائیں

اظہار ایک فطری جذبہ ہے جو قدرت نے ہر جاندار کو عطا کیا ہے۔ سبزے کی نمو، پودوں کا اُگنا، کلیوں کا چٹکنا، جانوروں کی حرکات، بھاگ دوڑ اور گونا گوں

آوازیں۔ یہ سب اظہار کی ہی مختلف صورتیں ہیں۔ اشرف المخلوقات انسان کو قدرت نے چوں کہ عقل و دانش کی انمول نعمت سے بھی نواز رکھا ہے۔ لہٰذا انسان نے اظہار کے مختلف پیرائے خود ایجاد کیے۔ تقریر، تحریر اور کنایہ (اشارہ) کے علاوہ دیگر ذرائع بھی اختیار کیے جنہیں مجموعی طور پر فنونِ لطیفہ کا نام دیا گیا۔ یعنی شاعری، رقص، موسیقی، مصوری اور مجسمہ سازی۔ یہ پانچوں چیزیں باقاعدہ علم کا درجہ رکھتی ہیں۔ جن کے اصول وضوابط مقرر ہیں۔ (انسان بھی تو حواس خمسہ کا ہی مرکب ہے) تمام فنون، انسانوں کو قدرت خام مال یا اَن گھڑ شکل میں عطا کرتی ہے جن کی تراش خراش اور واضح صورت بنانا محنت سے اسے کمال تک پہنچانا۔ سیکھنا سکھانا انسان پر منحصر ہوتا ہے۔ اظہار کے حوالے سے ایک خوبصورت بات یاد آگئی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی (1929-06-20عیسوی) اپنی کتاب۔ نئی تنقید۔ میں رقم طراز ہیں کہ ''اظہار کا لفظ کروچے (1866-02-25تا1952-11-20عیسوی، اٹلی) کے ہاں ویسا ہی کلیدی لفظ ہے جیسے ارسطو (384تا322 قبل از مسیح) کے ہاں ''نقل''۔ کولرج (1772-10-21تا1834-07-25عیسوی، جرمنی) کے ہاں ''تخیل''۔ آرنلڈ (1822-12-24 تا 1888-04-15 عیسوی، برطانیہ) کے ہاں۔ ''تنقیدِ حیات''۔ ٹالسٹائی .... (1828-09-09تا1910-11-20عیسوی، روس) کے ہاں ''ابلاغ'' اور مولانا الطاف حسین حالی (1837تا1914عیسوی، پانی پت) کے ہاں افادہ (یعنی فائدہ دینا تعلیم دینا) کا لفظ ہے'' یہ تو خیر جملہ معترضہ تھا۔ آمدم برسرِ مطلب۔ کچھ لوگ مختلف فنون میں انتہائی بلندیوں پہ پہنچ کے امام بنتے اور دیگر انسانوں کے لیے تقلید کا نمونہ قرار پاتے ہیں اور پھر اکثر لوگ ان کی بہتر سے بہتر تقلید کر کے خود کو امر کر لیتے ہیں۔ بہ ہر حال یہ سلسلہ صدیوں سے جاری ہے اور رہے گا۔ یقیناً کہ انسان، آدمی، جانور اور جان دار اس دنیا میں علم وعمل کے رنگ بکھیرتے رہیں گے۔ اس مشاہدے کے لیے صاحب دل و نظر ہونا شرط ہے۔ نظر کی گہرائی اور گیرائی لازم ہے۔ بہ قول میر تقی میر (1722تا1810عیسوی)

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

کسی بھی جذبے کا اظہار جب محنت اور لگن کے بعد باقاعدہ فن کی صورت میں ہوتا ہے تو وہ اک جادو سا لگتا ہے۔ جو ہر خاص و عام کے سر چڑھ کے بولتا ہے۔ فنونِ لطیفہ میں شاعری کی اہمیت اک مسلمہ امر ہے۔ زبان کو نظم یا قاعدے میں ڈھالنا اس طور کہ انسانی جذبے ابھر نکھر کے سامنے آجائیں۔ فن شاعری ہے، اردو اک نئی نویلی کم سن زبان ہے جس کی عمر ابھی چند صدیوں کی ہی ہے۔ جیسے کوئی نونہال عمر کے اکائی درجے میں ہو مگر ''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات'' اس نوعمری میں ہی اسے میر، غالب اور اقبال جیسے خدایانِ سخن میسر آگئے جنہوں نے نوخیز اردو کے دونوں ہاتھ تھامے، سہارا دیا اور اسے قدیم بڑی زبانوں کی صف اوّل میں لا کھڑا کیا۔ ان بزرگوں نے قدرت کے عطا کردہ تخلیقی جوہر کو اپنی محنت ولگن سے بام عروج بخشا اس طرح کہ کم سن ہونے کے باوجود اردو کا قد، قامت طوبیٰ کے مماثل ہو گیا۔ آج اردو زبان شاعری میں میر، غالب اور اقبال۔ نثر میں، منٹو، بیدی اور عصمت چغتائی جیسے دمکتے لعل و گہر سے مالا مال ہے۔ میر تقی میر نے اپنی فنی اظہار کا یوں اعلان کیا

مستند ہے میرا فرمایا ہوا
سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا

غالب کی ذہنی سطح اس بلندی پہ تھی کہ

چاہتا ہوں داد اس سے کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگرچہ میرا ہم زبان نہیں

اور اقبال نے اپنے ہنر کی یوں نقاب کشائی کی کہ:

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں و اللہ نہیں ہے

یہ تینوں نابغہ روزگار ہستیاں اردو زبان کی آبرو ہیں۔ انہی کے دم سے اردو دوام پا چکی ہے۔ اردو نے فارسی کی گود میں آنکھ کھولی فارسی کا ہی دودھ پیا مگر ساتھ ساتھ اسے عربی ہندی اور ترکی وغیرہ کے ہاتھ کی گھٹی بھی ملتی رہی جس نے اسے رنگا رنگ حسن کے ہم راہ کامل صحت سے بھی ہم کنار رکھا۔ فارسی نے اسے خط نستعلیق کا دل کش لباس بھی پہنایا۔ فارسی ہزاروں برس کی منجھی ہوئی زبان ہے جسے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ قدیم دری یا پہلوی فارسی اور جدید آج کی فارسی۔ اردو کی طرح فارسی کے بھی تین خدایان سخن اس کا طرۂ فخر و امتیاز ہیں۔ ابوالقاسم حسن فردوسی (940 تا 1020عیسوی) اوحدالدین انوری (1126تا 1189 عیسوی) اور شیخ مصلح الدین سعدی (1210 تا 1291عیسوی) یہ تین عبقری شعراء فارسی زبان پر چھائے ہوئے ہیں۔ شیخ سعدی کی گلستان بوستان نامی کتابیں اور

فردوسی کا مشہور عالم۔ شاہ نامہ۔ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ فردوسی کی عظمت کا لوہا غالب خستہ حال بھی مانتے اور سراہتے ہیں۔ شیخ سعدی کی کتابیں گلستان بوستان صدیوں تک پڑھی اور پڑھائی جاتی رہیں جب کہ انوری ہجو کا بادشاہ قرار پاتا ہے۔ یہ قول علامہ شبلی نعمانی مرحوم (1857-06-03 تا 1914-11-18 عیسوی) کہ۔"
اگر ہجو گوئی کی کوئی شریعت ہوتی تو انوری اس کا پیغمبر ہوتا۔"
انہی شعراء کی فنی و تخلیقی برتری کو یوں بھی مانا گیا اور خراجِ تحسین پیش کیا گیا کہ:

در شعر سہ کس پیمبرانند
ہر چند کہ لانبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را
فردوسی و انوری و سعدی

دوسری طرف انوری اپنے بزرگ سخن ور، فردوسی سے یوں عقیدت کا اظہار کرتا ہے کہ:

آفریں بر روانِ فردوسی
آں ہمایوں نثراد و فرخندہ
او نہ استاد بود و ما شاگرد
او خداوند بود و ما بندہ

الغرض یہ تینوں شعراء فارسی کے سہ پیمبران کہلاتے ہیں۔ میر، غالب اور اقبال کی طرح فردوسی، انوری اور سعدی بھی زمان و مکان سے بالاتر اور مستثنیٰ ہنر مند ہیں۔ اردو اور فارسی سے پہلے عربوں نے اپنے فنی عظمت و اظہار کا بالکل انوکھا اور نرالا پرچار کیا، قطعی فیصلہ کن انداز میں بہ بانگ دہل دعویٰ کیا کہ ہم عرب (بولنے والے) ہیں اور باقی ساری کی ساری دنیا عجم (گونگی) ہے۔ یہ خدائی دعوائے اظہار اور زبان دانی جب فخر و غرور کی انتہائی حدوں کو چھو چکا تو کلام الٰہی (قرآن پاک) نے آگے بڑھ کر عربوں کو کلی طور پر عاجز کر ڈالا، عہد جاہلیت کی عربی گنگ، گم صم اور ذہن حیرت سے ماؤف ہو گئے۔ سر توڑ کوشش کے باوجود بھی عرب خدایان سخن آیات قرآنی جیسا ایک جملہ یا مصرع تک نہ بنا سکے۔ سورہ کوثر کو جب اس مبارزت کے ساتھ در کعبہ پر آویزاں کیا گیا کہ کوئی ہے جو ان تین مصرع کے ساتھ چوتھے مصرع کا اضافہ کر سکے یا لگا، سکے عرصہ گزر گیا تو عرب صرف اتنا ہی کہہ پائے کہ "لاہذا کلام البشر۔" (یہ کسی انسان کا کلام ہرگز نہیں ہے) یوں کلام اللہ (قرآن پاک) قیامت تک کے لیے زندۂ جاوید معجزہ قرار پایا۔

قرآن پاک کے اس معجزے کو جاننے، سمجھنے کے لیے عرب کے عہد جاہلیت کے شعراء پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ عہد جاہلیت میں سات بڑے عربی شعراء عربی شاعری کے خدایان سخن تھے۔ (۱) امرؤ القیس (۲) النابغہ الذبیانی (۳) زہیر بن ابی سلمٰی (۴) الاعشیٰ قیس (۵) عنترۃ بن شداد العبسی (۶) طرفتہ بن العبد (۷) عمرو بن کلثوم، ان شعراء کے درمیان فنی مسابقت کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ ہوتا یوں تھا کہ جب کوئی شاعر اپنی بہترین نظم یا غزل تخلیق کرتا تو اسے لکھ کے کعبہ کے دروازے پہ لٹکا دیتا جو دیگر شعراء کے لیے دعوت فکر و سخن کے ساتھ ساتھ اک للکا بھی ہوتی کہ:
ہے کوئی ہم سا۔ ہم سا ہو تو سامنے آئے آس کہ کوئی دوسرا شاعر اس سے بہتر کلام تخلیق کرتا اور پہلے کلام کو ہٹا کر اپنا نیا کلام اس جگہ پہ لٹکا دیتا اسی لیے ان سات شعراء کو سبعہ معلقہ (سات معلق شعراء) کہا جاتا ہے۔ انہی سات بڑے شعراء کے سات اعلیٰ ترین منتخب طویل قصائد کو سبعہ طوال یا سبعہ معلقات کہا گیا۔ جن میں فخر و مباہات کا اظہار بڑے گھمنڈ سے کیا گیا ہے۔ معلقات کے بارے میں علمائے ادب اور مؤرخین کا خاصا اختلاف ہے مگر زیادہ تر اتفاق اسی پر ہے کہ یہ وہ لمبے قصیدے ہیں جنھیں عربوں نے اتنا پسند کیا کہ انہیں سونے کے پانی سے قباطی (کتان کا کپڑا) پر لکھوا کر خانہ کعبہ میں لٹکا دیا تھا۔ ان سات منتخب قصائد کو مذہبہ یعنی سونے کے پانی سے لکھا ہوا بھی کہا گیا عرب اپنے اجتماعی اور عوامی فیصلوں کا اعلان لکھ کر خانہ کعبہ میں لگا دیتے تھے۔ بنی ہاشم (حضور اکرمؐ .... اور ان کے خاندان) کا قریش نے جب مقاطعہ کیا اور بنی ہاشم شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے تو اس فیصلے کو لکھ کر خانہ کعبہ میں لٹکا دیا گیا تاکہ سب آگاہ رہیں اور فیصلہ سند رہے سبعہ معلقہ شعراء کے سات قصیدے عکاظ کے مشہور سالانہ میلے میں سنائے گئے۔ اس کی تفصیل ابن عبدربہ کی کتاب العقد الفرید۔ ابن رشیق کی کتاب العمدہ اور تاریخ ابن خلدون میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اور اب ان سات شعراء کا فرداً فرداً ذکر ہوگا۔

امرؤ القیس (500 تا 560 عیسوی)

امرؤ القیس کا پورا نام ابوالحارث حندج بن حجر الکندی تھا۔ نسلاً قحطانی یمنی اور تمام جاہلی شعراء میں سب سے زیادہ ممتاز، نام ور، مرگو اور امام فن قرار پاتا ہے۔ اس نے شاعری میں بعض ایسے اصناف ایجاد کیے اور ایسے مضامین باندھے کہ جنھیں اس سے پہلے کسی جاہلی شاعر نے نہیں باندھا تھا اور نہ

ہی ان پر طبع آزمائی کی تھی۔اس شاعر کو الملک الضلیل یعنی گمراہ
بادشاہ یا وہ بادشاہ جس کے حالات معلوم نہ ہوں اور ذوالقروح
(زخموں والا) بھی کہتے ہیں۔اس کی کنیت ابو وہب اور لقب
امرؤالقیس تھا۔ ماں اور باپ دونوں طرف سے بادشاہوں
کے خاندان کا نہ صرف فرد تھا بلکہ شہزادہ بھی تھا کیوں کہ اس
کا باپ حجر، بنواسد کا آخری بادشاہ تھا اور اس کے آباؤاجداد
قبیلہ کندہ کے شریف ترین اور نامور بزرگ تھے۔اس کی ماں
فاطمہ ربیعہ۔سردار کی لڑکی اور قبیلہ تغلب کے نامور شاعر
وشہسوار مہلہل اور کلیب کی بہن تھی۔امرؤالقیس نجد میں
پلا بڑھا، جوان ہوا تو کلی طور پر گمراہ نوجوان ثابت ہوا۔
شراب، شباب اور کباب میں دن رات گزرنے لگے۔آوارہ
دوستوں کے ہمراہ کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔صبح کہیں اور شام
کہیں۔فحش گوئی اور ناچ گانا مقصد ٹھہرا۔تنگ آکر باپ نے
گھر سے نکال دیا تو یہ اور بھی کھل کھیلا۔سارے یار دوست
پانچوں شرعی برائیوں (چوری۔جوا۔زنا۔نشہ اور جھوٹ) کے
عادی تھے۔یہی شب و روز تھے کہ باپ حجر اپنی بے جا سختیوں
کی عادت پر قبیلہ بنواسد کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ چناں چہ
امرؤالقیس نے باپ کا بدلہ لینے کی ٹھانی اور عرب قبائل
میں گھوم پھر کر مدد مانگنے لگا۔کچھ قبائل نے ہامی بھری کچھ نے
انکار کر دیا آخر اپنے ساتھیوں اور قبائل بکر و تغلب کے رشتہ
داروں کو لے کر بنواسد پر حملہ کر دیا بہت سوں کو قتل کر ڈالا۔پھر
بھی دل کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی تو مزید آدمی اکٹھے کرنے لگا۔
حیرہ کا بادشاہ منذر، امرؤالقیس کے خاندان کا دیرینہ دشمن تھا
اس نے بعض عرب قبائل (ایاد، بہراء اور تنوخ وغیرہ) کو امرؤ
القیس کے خلاف بھڑکا دیا۔ادھر ایرانی شہنشاہ نوشیرواں بن
قباد عرب بادشاہ منذر کا دوست تھا اس نے بھی ایک بھاری
لشکر امرؤالقیس کے خلاف عرب قبائل کے ساتھ کر دیا ایسے
میں سب ساتھی بھاگ گئے اور امرؤالقیس تنہا رہ گیا۔پھر سے
قبائل میں مدد مانگنے کے لیے سرگرداں ہو گیا مگر اس بار ناکام
رہا۔گھومتے پھرتے وہ سموال بن عادیا کے پاس پہنچا اور اس
سے پناہ مانگی۔اپنی زرہیں، ہتھیار اور بیٹی کو اس کی امانت میں
رکھا۔کہا کہ شام کے بادشاہ حارث بن شمر الغسانی کو تعارفی خط
لکھ دو کہ وہ مجھے قیصر روم کے پاس پہنچا دے اور مدد کی
سفارش کر دے، چنانچہ بادشاہ حارث نے امرؤالقیس کو
قیصر روم تک پہنچایا۔امرؤالقیس نے قیصر روم کی شان میں
زوردار مدحیہ قصیدہ پڑھا اور اپنے دشمنوں کے خلاف مدد مانگی۔
قیصر روم منذر بادشاہ سے اس لیے جلتا تھا کہ وہ لوگ ایرانیوں
کے ماتحت تھے جو رومیوں کے دشمن تھے سو قیصر روم نے ایک
بڑی فوج امرؤالقیس کے ہمراہ کر دی مگر اس فوج کو لے
کر امرؤالقیس تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ قیصر روم نے سب
کو واپس بلالیا کیوں کہ اس دوران بنواسد کے ایک شخص
الطماح الاسدی نے قیصر روم سے یہ شکایت کر دی تھی کہ
امراؤالقیس تو آپ کو گالیاں دیتا پھرتا تھا بعض راویوں کا کہنا
ہے کہ خود امرؤالقیس کے ساتھیوں میں سے بعض نے قیصر روم
حیلہ بہا بوستیانوس سے کہا کہ امرؤالقیس نے اپنی قوم کو فخریہ
آگاہی دی کہ وہ قیصر روم کی لڑکی سے خط کتابت کرتا ہے اس
پر قیصر روم غضب ناک ہو گیا اور حیلے بہانے سے امرؤالقیس
کو ختم کرنے کی ٹھان لی۔قیصر روم نے امرؤالقیس کو ایک
خلعت (کپڑوں کا شاہی جوڑا) انعام میں دی جو زہر میں بجھی
ہوئی تھی۔جب امرؤالقیس اسے پہن کر چلا تو سارے جسم پر
چھالے پڑ گئے اور کھال اتر گئی اس لیے اسے ذوالقروح
(زخموں والا) بھی کہتے ہیں، قسطنطنیہ سے واپس ہوتے ہوئے
انقرہ (ترکی) کے قریب راہی ملک عدم ہو گیا۔اس کا اعلیٰ
ترین طویل قصیدہ (معلقہ) کا سبب کچھ یوں ہے کہ اسے اپنی
چچازاد عنیزہ بنت شرجیل سے محبت تھی۔خاندان کے لوگ ملنے
ملانے میں رکاوٹ تھے کہ وہ عنیزہ کا نام لے کر شعر و شاعری نہ
شروع کر دے جو بدوی معاشرے میں بری بات تھی، چناں
چہ وہ چوری چھپے عنیزہ سے ملا کرتا تھا۔ایک بار جب قبیلے نے
کوچ کیا تو امرؤالقیس چپکے سے مردوں سے الگ ہو گیا۔
قاعدہ یہ تھا کہ مرد قافلے کے آگے اور عورتیں پیچھے ہوتی تھیں۔
راستے میں ایک تالاب دارۃ جلجل کے نام سے تھا۔
امرؤالقیس نظریں بچا کر عورتوں سے پہلے وہاں پہنچ گیا اور
ایک جھاڑی میں چھپ کر بیٹھ گیا جب عورتیں تالاب پر پہنچیں
تو انہوں نے کپڑے اتار کر تالاب میں نہانا شروع کر دیا۔ان
میں عنیزہ بھی تھی، ادھر امرؤالقیس عورتوں کے سب کپڑے جمع
کر کے ان پہ بیٹھ گیا اور عورتوں سے کہا کہ جب تک ننگی میرے
سامنے نکل کر نہیں آؤ گی کپڑے نہیں دوں گا، عورتوں نے بہت
منت سماجت اور خوشامد کی مگر وہ نہ مانا بہت دیر ہو گئی تو مجبور
ایک ایک کر کے ننگی نکلتی گئیں اور وہ سب کو کپڑے باری باری
دیتا گیا۔عنیزہ نے نکلنے میں بہت حیل وحجت اور کافی
خوشامد درآمد کی لیکن امرؤالقیس نے ایک نہ سنی آخر وہ بھی ننگی
باہر نکلی اور کپڑے لے کر پہنے۔ان اٹکھیلیوں میں خاصی
دیر ہو گئی، لڑکیوں نے اسے کوسنا شروع کر دیا کہ خدا تجھے
غارت کرے، تو نے اتنی دیر کرا دی قافلہ کہاں کا کہاں نکل گیا

ہوگا اب ہمیں بھوک بھی لگ رہی ہے۔ امرؤالقیس نے فوراً اپنی اونٹنی ذبح کی لڑکیوں نے گوشت بھونا، خوب کھایا پیا، جب چلنے لگے تو سب لڑکیوں نے امرؤالقیس کا سامان بانٹ کر اپنے اپنے اونٹوں پر لادلیا۔ امرؤالقیس نے اپنی محبوبہ عنیزہ سے کہا کہ تم مجھے اپنے اونٹ پر بٹھالو۔ سب لڑکیاں بھی عنیزہ کے پیچھے پڑ گئیں مجبوراً عنیزہ نے امرؤالقیس کو اپنے اونٹ کے اگلے حصہ پر بٹھالیا۔ یوں عروسان بیاباں کا قافلہ حسینان لالہ رویاں کو لے کر چل پڑا۔ راستے میں امرؤالقیس اپنی ہم سفر محبوبہ عنیزہ کے محمل میں سر ڈال کے اس سے پیار محبت کی باتیں کرتا رہا۔ بعد میں اسی خواب ناک سفر کے نتیجے میں اس نے مشہور زمانہ طویل قصیدہ یعنی معلقہ لکھا جس میں اس دل نشیں واقعہ کو بنیاد بنا کر مختلف موضوعات، مناظر اور مضامین کو اعلیٰ شاعری کا لباس فاخرہ پہنایا امرؤالقیس جاہلی زمانے کا وہ پہلا شاعر ہے جس نے سب سے پہلے دوستوں سے محبوبہ کے اجڑے دیار پر ٹھہرنے اور تھوڑی دیر بیتے دنوں کی یادوں پر رونے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اس نے سب سے پہلے عورتوں کو ہرنیوں، نیل گائیوں اور گورے رنگ کو شتر مرغ کے انڈے کے رنگ سے تشبیہ دی۔ مذکورہ معلقہ نہ صرف امرؤالقیس کی زندگی کا آئینہ دار ہے بلکہ اس کے کمال فن کا بھی شاندار مظہر ہے جس میں ہجر۔ وصل۔ عیاشی۔ بے بسی۔ مناظر۔ سبھی رنگ ہیں۔

النابغہ الذبیانی (وفات 604 عیسوی)

نابغہ قبیلہ مضر کی شاخ ذبیان کا مشہور اور پُرگو شاعر تھا۔ پورا نام زیاد بن معاویہ، کنیت ابوامامہ اور لقب نابغہ ہے۔ دور جاہلی کے طبقہ اوّل شعراء میں سے ہے۔ اسے ''معذرت خواہی'' کے رنگ و انداز میں اوّلیت حاصل ہے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ شاعروں میں سب سے بڑا شاعر امرؤالقیس ہے جب وہ سوار ہو اور نابغہ ہے جب وہ ڈر جائے یعنی ڈر کر معذرت کرے۔ یہ بڑا شاعر عجیب وغریب شخصیت کا مالک تھا نابغہ کی زندگی کا انوکھا واقعہ یہ ہے کہ شعر کہنے کی کوشش میں اس نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ صرف کر دیا، جوانی گزر گئی، بڑھاپا آ گیا مگر زمام شعر قابو نہ آیا۔ نہ استاد نہ ہی کوئی موزوں طبع محسن و سرپرست۔ لیکن نابغہ دھن کا پکا، اس کا عشق سچا اور خالص تھا۔ مشق نہ چھوڑی۔ آخر کار عمر ڈھلے اس کی طبیعت یک بہ یک موزوں ہوگئی اور اشعار خود بہ خود اس کی زبان سے چشمے کی طرح پھوٹ کر نکلنے لگے ایسی بے پناہ آمد ہوگئی کہ دنیا حیرت زدہ رہ گئی۔ کلام اتنا حسین، دل آویز، معیاری اور بلند تھا کہ ہر طرف اس کا چرچا پھیل گیا۔ کلام ہر بزم طرب میں جان محفل بن گیا۔ اسی وجہ سے لوگوں نے اس کا لقب نابغہ (چشمہ کی طرح پھوٹ نکلنے والا) رکھ دیا۔ نابغہ اپنے قبیلہ ذبیان میں بڑا محترم، معزز اور محبوب تھا۔ نابغہ ذبیانی کی جلالت، قدر اور فن شاعری میں اس کے استادانہ کمال کا وہ درجہ تھا کہ عکاظ کے سالانہ میلے میں جب شعروشاعری کا مقابلہ ہوتا تھا تو اسی کو حکم (منصف، فیصلہ کرنے والا) بنایا جاتا تھا اس کے لیے الگ چمڑے کا خیمہ لگایا جاتا جہاں شعری مقابلہ کی محفل سجائی جاتی۔ شعراء اپنا کلام پڑھتے اور جس کلام کے حق میں نابغہ فیصلہ دے دیتا اس کا سارے جزیرہ عرب میں شہرہ ہوجاتا۔ ہر خاص و عام کی زبان پر شاعر کا نام اور اس کے اشعار چڑھ جاتے۔ حیرہ کا بادشاہ ابوقابوس نعمان بن منذر جس نے 580 عیسوی سے 602 عیسوی تک حکومت کی نابغہ کا بڑا قدر دان بلکہ پرستار تھا۔ نعمان بڑا باذوق اور شاعر نواز بادشاہ تھا۔ سو، نابغہ نے بھی اس کی شان میں بڑھ چڑھ کے قصیدے کہے۔ حضرت حسان بن ثابتؓ بھی نعمان کے دربار میں اسلام سے پہلے آیا جایا کرتے تھے۔ مگر نعمان کو نابغہ سے جو دلی لگاؤ پیدا ہوگیا تھا۔ وہ حسان یا کسی اور شاعر سے نہ ہوسکا۔ یہ قول حضرت حسان بن ثابتؓ کہ باوجود میری کوشش کے نابغہ کے مقابلہ میں میری رسائی نعمان بادشاہ کے دربار میں نہ ہو پائی۔ نعمان بادشاہ کی قدردانی اتنی بڑھی کہ نابغہ سونے چاندی کے برتنوں میں کھاتا پیتا تھا نتیجہ یہ کہ اس کے خلاف حسد اور کینے کا ازلی سلسلہ چل پڑا، غسانی بادشاہ عمرو بن الحارث الغسانی کے حامیوں نے اپنی طرف سے نعمان بادشاہ کے خلاف ہجویہ قصیدے لکھے اور انہیں نابغہ ذبیانی سے منسوب کر دیا۔ جس سے نعمان بادشاہ بددل اور بدغضب ہوگیا یوں نابغہ ڈر کر غسانی بادشاہ عمرو بن حارث کے پاس چلا گیا۔ غسانی نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مگر نعمان جیسی قدردانی نہ کرسکا جس پر نابغہ ملول اور پشیمان رہنے لگا اس نے کئی معذرتی قصیدے کہہ لکھ کر نعمان بادشاہ کو راضی اور خوش کرنے کی کوشش کی سو اس کے کلام میں معذرت خواہی کا رنگ ابھرتا چلا گیا۔ نابغہ کو اک زمانے تک شام ہی میں رہنا پڑا۔ تا آں کہ غسانی بادشاہ عمر و بن حارث کا انتقال ہوگیا۔ ادھر نعمان بادشاہ نے بھی نابغہ کی مسلسل معذرت خواہی، قلبی لگاؤ اور دیرینہ تعلق، ہم نشینی و ہم دمی کے سبب اسے معاف کر دیا اور واپس اپنے پاس بلالیا، نابغہ پھر سے عیش و عشرت کا جھولا جھولنے لگا۔ عربی شاعری

میں نابغہ سے پہلے اتنی موثر معذرت خواہی کبھی نہیں پائی گئی۔ معذرت خواہی کو صحیح معنوں میں ایک صنف کا درجہ دینے میں نابغہ کے کلام کو بڑا دخل ہے، اس نے اس صنف میں ایسی طرح اور ریت ڈالی کہ اس کے معذرتی قصیدوں کے اچھوتے انداز کی وجہ سے اس کے کلام کا نام ہی۔ "اعتذاریات نابغہ۔" پڑ گیا اعتذاریات کے علاوہ نابغہ کے کلام کا بہترین نمونہ اس کے اس قصیدہ میں بھی ملتا ہے، جس کی وجہ سے بعض نقادوں نے اسے اصحاب المعلقات کے زمرہ میں شامل کیا ہے، اس معلقہ میں ساٹھ اشعار ہیں اور ان میں مختلف مضامین باندھے گئے ہیں۔ مثلاً شروع میں وہ اپنی محبوبہ نعم کا اور اس کے دیار کا ذکر کرتا ہے پھر اس کے حسن و جمال کی تعریف کرتا ہے اس کے بعد سیر وشکار کا بیان ہوتا ہے۔ آخر میں اپنی قوم کی بہادری پر فخر کے ساتھ معلقہ ختم کرتا ہے اسی قصیدے کو معلقہ ء نابغہ قرار دیا جاتا ہے۔ نابغہ کے بعض اشعار اتنے معنی خیز اور اچھوتے ہیں کہ ان کو بہت سے شعراء نے اپنایا ہے۔ عورت کا سراپا کھینچنے میں بھی نابغہ نے وہ کمال فن دکھایا ہے جو کسی جاہلی شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔ معذرت خواہی نابغہ کا خاص فن ہے۔ کبھی کبھی وہ ممدوح کی تعریف ایک چیز سے کرتا ہے اور پھر اسی چیز کی ضد سے بھی اس کی تعریف کا پہلو نکال لیتا ہے۔ دوسرے جاہلی شعراء کے مقابلہ میں نابغہ کا کلام زیادہ گایا گیا اس لیے کہ اس کے الفاظ بہت سبک اور خوبصورت۔ بندش بہت چست۔ معانی ومطالب صاف اور واضح، نیز اسلوب بیان بہت دل کش اور مؤثر ہے۔ نابغہ کے ہاں تکلف یا آورد نام کو نہیں اسی وجہ سے جریر جیسے استاد زمانہ شاعر نے اسے تمام جاہلی شعراء میں سب سے بڑا اور ممتاز شاعر مانا ہے۔ رات کی ہولناکی کا منظر کھینچنے۔ معذرت میں موثر اور دل لگتی بات کہنے اور اپنے ممدوح کی مبالغہ یا کذب بیانی (جھوٹ) سے پاک تعریف کرنے میں نابغہ کو فوقیت حاصل ہے۔ اپنے کلام میں احساسات وجذبات کو پوری وضاحت سے بیان کرنے اور اپنی بات سننے والے کے دل میں اتار دینے میں اسے ملکہ حاصل ہے۔ عکاظ کے میلے میں شعراء کے درمیان حکم (منصف) بننا بہت بڑی عزت سمجھی جاتی تھی اور یہ عزت نابغہ کو حاصل ہوئی اس سے اس کی مسلم حیثیت، عربوں میں اس کی قدر ومنزلت اور دنیائے شاعری میں اس کے امتیاز وتفوق کا بہ خوبی اندازہ ہو جاتا ہے، نابغہ ذبیانی نے طویل عمر پائی اور ہجرت نبویؐ سے اٹھارہ برس پہلے (604عیسوی) وفات پائی۔ اس سلسلے میں کوئی بھی مستند روایت یا تحریری ثبوت ناپید ہے کہ درست دن اور مہ وسال لکھا جاسکے۔

زہیر بن ابی سلمٰی (وفات 611عیسوی)

زہیر کا پورا نام زہیر بن ابی سلمٰی ربیعہ بن ریاح المزنی ہے۔ یہ دور جاہلی کے ان تین ممتاز شعراء (امرؤالقیس اور نابغہ کے ساتھ) میں شمار کیا جاتا ہے جنھیں طبقہ اوّل میں گنا جاتا ہے۔ مگر اپنے ہم طبقہ دونوں شعراء کے مقابلے میں بڑا پاک باز اور پاک گفتار شاعر ہے کلام میں اختصار پسندی۔ حکمت وفلسفہ کی گہرائی اور اپنے اشعار کو مستقل طور سے کاٹ چھانٹ، اصلاح وترمیم نیز نظر ثانی کر کے صرف عمدہ معیاری اشعار کو باقی رکھنے میں اپنے دونوں ساتھیوں (امرؤالقیس اور نابغہ) پر فوقیت رکھتا ہے۔ زہیر قبیلہ مزینہ سے تعلق رکھتا تھا جو قبیلہ مضر کی ایک شاخ ہے۔ زہیر، اس کے ماں باپ اور خاندان کے لوگ نجد میں غطفان کے علاقے میں رہتے تھے، زہیر کی نشوونما ایسے گھرانے میں ہوئی جس کے تمام افراد مرد اور عورت سب شاعر تھے۔ چنانچہ اس کا باپ۔ خالو۔ بہن (سلمٰی اور خنساء) نیز زہیر کے دونوں لڑکے کعب اور بجیر بھی شاعر تھے۔ ان کے علاوہ زہیر کے باپ کا خالو بشامہ بن الغدیر بھی اپنے زمانے کا سب سے بڑا شاعر۔ فلسفی۔ دانا اور مال دار آدمی تھا۔ قبیلہ غطفان میں بشامہ بن الغدیر کی ذہانت، سوجھ بوجھ اور دور اندیشی کا ایسا شہرہ تھا کہ مشکل اور پیچیدہ مسائل کی گتھیاں سلجھانے کے لیے لوگ بشامہ کے پاس آتے تھے، اپنے معاملات میں مشورہ لیتے تھے اور اس کے کہنے کے مطابق چلتے تھے۔ اس کی عزت اور قدر ومنزلت کا یہ عالم تھا کہ مال غنیمت میں سب سے پہلے اس کا حصہ نکال کر رکھ دیتے تھے، زہیر نے اسی بشامہ بن الغدیر کے سایۂ عاطفت میں تربیت وپرورش پائی اور اس کے کلام، حکمت وفلسفہ اور طرز فکر ونظر سے بہت متاثر ہوا جس کی جھلک زہیر کے کلام میں بھی نظر آتی ہے۔ بشامہ بن الغدیر کے علاوہ زہیر نے اپنے سوتیلے باپ اوس بن حجر سے بھی استفادہ کیا جو اپنے زمانے میں مضر قبیلے کا شاعر تھا، اس کے اشعار کی روایت کی مگر بالآخر سوتیلے باپ سے بھی بازی لے گیا۔ جس شخص کو ایسا شعری ماحول اور ایسے بلند پایہ شاعر میسر آجائیں تو اس کے کلام میں سحر آفرینی کیوں نہ پیدا ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ زہیر بن ابی سلمٰی جاہلی عہد میں آسمان شعروادب پر روشن ستارہ بن کر چمکا جس کی دعوت حسن وخیر کی روشنی سے کل جزیرہ عرب جگمگا اٹھا قبیلہ غطفان کا یہ علاقہ وہی سرزمین ہے جہاں عرب کے دو قبیلوں

عبس اور ذبیان میں ایک لمبے عرصے تک وہ خونی معرکے ہوتے رہے جنہیں تاریخ میں حرب داعس وغبراء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان جنگوں میں جہاں ایک طرف بیسیوں لوگوں کی جانیں گئیں بے شمار بچے یتیم اور متعدد عورتیں بیوہ ہوئیں وہاں ان جنگوں کی بہ دولت دور جاہلی میں عربی شعروادب کے بہت سے نئے اصناف بھی پیدا ہوئے چناں شاعری کے ان نئے اصناف میں فخر، ہجو، حماسہ اور ثار یعنی خون کا بدلہ لینے کا جذبہ انہی جنگوں کے نتیجے میں پیدا ہوا، اسی طرح ان معرکوں، ان سے متعلق قصوں اور واقعات کو ایک حد تک منظوم کر کے محفوظ رکھنے کا طریقہ بھی اکثر انہی لڑائیوں کی دین ہے۔ سب سے بڑا فائدہ ان ہولناک جنگوں کا یہ ہوا کہ پہلی دفعہ جزیرہ نمائے عرب میں صلح و آشتی، امن و چین سے رہنے کی دعوت اور جنگ وجدال، لڑائی جھگڑوں سے نفرت کا نعرہ اسی سرزمین سے بلند ہوا۔ یہ نعرہ لگانے والا زہیر بن ابی سلمٰی ہی تھا جس نے عرب کے اس صحرائے بے آب وگیاہ میں سب سے پہلے صلح و آشتی۔ محبت اور میل جول کے لافانی گیت اپنے اشعار میں گائے۔ عبس اور ذبیان کے قبیلے داحس وغبراء کی جنگ میں لڑ لڑ کے کٹے مرے جا رہے تھے۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ کہتے ہیں کہ چالیس برس تک کشت وخون ہونے کے بعد بھی اس کی ہولناکی کا سلسلہ ختم ہوتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ آخر قبیلہ ذبیان کے دوسرداروں ہرم بن سنان اور الحارث بن عوف کے دل میں رحم آیا اور انہوں نے کوشش کر کے آپس میں صلح کرائی۔ مقتولین کے خون بہا کے طور پر اپنے پاس سے تین ہزار اونٹ دیے اس طرح اس منحوس لڑائی کا سلسلہ ختم ہوا اور دونوں قبیلوں کو چین سے سونا نصیب ہوا۔ زہیر بن ابی سلمٰی فطرتاً بہت صلح جو، نیک اور اخلاق فاضلہ کا مالک انسان تھا۔ سو اس واقعہ کا اس پر بڑا گہرا اثر ہوا اور دونوں سرداروں ہرم بن سنان، الحارث بن عوف کی عزت وقدر بہت بڑھ گئی۔ چنانچہ اس نے دونوں سرداروں کی شان میں ایک شاندار مدحیہ قصیدہ کہا جس میں دل کھول کر ان کے اس نیک کام کی تعریف کی۔ جنگ وجدال کے ہولناک انجام بد سے ڈرایا اور صلح صفائی سے رہنے کی ترغیب دی۔ یہ سب اتنے حسین انداز دل کش پیرایہ انداز وبیاں اور عبرت وواعظ کے اس موثر رنگ میں کہا کہ بات دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔ یہی مدحیہ قصیدہ اس کا معلقہ ہے جس میں انسٹھ اشعار ہیں۔ پہلے شعر سے لے کر پندرھویں شعر تک اپنی بیوی ام اوفیٰ سے جاہلی دور کے طریقے کے مطابق اظہار عشق ہے۔ ام اوفیٰ کی کسی بات پر خفا ہو کر زہیر نے اسے طلاق دے دی تھی مگر جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو اسے واپس بلانے کی کوشش کی لیکن ام اوفیٰ نے انکار کر دیا جس کا زہیر کے دل پر بہت اثر ہوا۔ وہ بیوی اور اس کے دیار کو یاد کر کے رو دیا اس میں حسن وعشق اور ہجر ووصال کے سارے رنگ ہیں۔ سولھویں شعر سے تشبیب گریز اور مطلب پر آکر پچیسویں شعر تک دونوں سرداروں ہرم بن سنان اور الحارث بن عوف کی تعریف کر کے امن کے لیے ان کی تگ ودو کو سراہتا ہے پھر انیسویں شعر سے تینتیسویں شعر تک سارے عرب کو مخاطب کر کے جنگ کی ہولناکی کا نقشہ کھینچتا ہے آخر میں سینتالیسویں شعر سے معلقہ کے آخر تک حکمت وفلسفہ کی باتیں کرتا ہے۔ اپنی لمبی زندگی کے تجربات کا نچوڑ پیش کرتا ہے۔ زہیر جاہلی شعراء میں پہلا شاعر ہے جو اپنے کام پر خوب غوروخوض کر کے تراش خراش کے بعد ہی مشتہر کرتا ہے، چاہے اس میں ہفتے، مہینے یا سال ہی کیوں نہ لگ جائے اسی لیے زہیر کے قصیدوں کو حولیات یعنی جن پر سال گزر چکا ہو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ زہیر نے ایک سو آٹھ برس کی عمر پائی اور اعلان نبوت سے ایک سال پہلے۔ ہجرت نبویؐ سے گیارہ برس پہلے 611 عیسوی میں آخرت کی راہ لی۔ دونوں لڑکوں کعب اور بجیر نے اسلام قبول کیا۔ زہیر کا دیوان دستیاب ہے۔ روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے سردار ہرم بن سنان کے کسی لڑکے سے کہا کہ زہیر نے تمہارے باپ کی تعریف میں جو اشعار کہے ہیں کچھ مجھے بھی سناؤ۔ لڑکے نے چند شعر گوش گزار کر دیئے، آپؓ نے فرمایا کہ وہ واقعی تم لوگوں کے بارے میں بہت عمدہ شعر کہتا تھا۔ اس پر لڑکے نے جواب دیا۔ "خدا کی قسم۔ ہم لوگ بھی تو خوب دل کھول کر انعام اور صلہ دیا کرتے تھے۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "بالکل مگر جو کچھ تم نے اس کو دیا تھا وہ تو اب ختم ہو چکا لیکن زہیر نے جو کچھ تم کو دیا ہے وہ اب تک باقی ہے۔" اسی طرح آپؓ نے ایک دفعہ زہیر کے لڑکے سے کہا کہ تمہارے باپ کو سردار ہرم بن سنان نے جو خلعتیں (قیمتی لباس) پہنائی تھیں ان کا کیا حشر ہوا؟" لڑکے نے جواب دیا کہ امیر المومنین انہیں تو زمانہ نے خستہ وخراب کر دیا۔" آپؓ نے فرمایا۔ "لیکن تمہارے باپ زہیر نے جو جوڑے ہرم بن سنان کو پہنائے تھے انہیں زمانہ پرانا اور خراب نہ کر سکا۔" یہی فن کا کمال ہے۔

عنترۃ بن شداد العبسی (وفات 615 عیسوی)

عنترہ نام کنیت ابوالمغلس تھی وہ قبیلہ عبس کے شخص

شداد العبسی کا لونڈی زادہ تھا۔ ماں کا نام زبیبہ تھا جو حبشی لونڈی تھی جسے شداد نے کسی جنگ میں گرفتار کر کے اپنی لونڈی بنایا تھا اور بعد میں اس کے پیٹ سے عنترہ پیدا ہوا۔ جاہلی عربوں کا قاعدہ تھا کہ لونڈی کے بطن سے جو اولاد پیدا ہوتی تھی اسے بھی غلام بنا لیتے تھے اور اس سے بھی وہی کام لیتے، اسی طرح کا سلوک کرتے تھے جو دیگر غلاموں کے ساتھ ان دنوں کیا جاتا تھا، چناں چہ اس رواج کے مطابق عنترہ بھی اپنے باپ کے خاندان میں اچھوت کی طرح رہتا تھا۔ غلاموں کے دوسرے کاموں کے علاوہ اس کے ذمّہ سب سے بڑا کام اونٹوں اور گھوڑوں کی گلہ بانی کرنا تھا۔ عنترہ دن بھر اپنے باپ کے جانور چراتا اور شام کو انہیں ان کے باڑے میں کر کے دودھ وغیرہ دوہتا، رکھوالی کرتا عنترہ کی رگوں میں چوں کہ خالص عربی خون دوڑ رہا تھا اس لیے اسے یہ برتاؤ اور اپنی یہ حیثیت ایک آنکھ نہ بھاتی تھی مگر رواج اور قانون کی بنا پر بے بس تھا اس کے باوجود اس نے اپنے آپ کو کبھی دیگر غلاموں کی طرح گرنے نہیں دیا اور نہ وہ غلامانہ ذہنیت پیدا ہونے دی جو عام طور پر ایسے حالات میں پیدا ہو جاتی ہے بلکہ اس نے اپنی عزتِ نفس، خودداری اور خودنگری کو قائم رکھا۔ دوسرے غلاموں کے برخلاف شہسواری اور فنونِ جنگ میں بڑی مہارت پیدا کی یہاں تک کہ قبیلہ میں شاہ سوار اولوالعزم اور باہمت نوجوان کی طرح اس کی شہرت ہوگئی۔ انہی دنوں قبیلہ طے کے بعض لوگوں نے عنترہ کے قبیلہ عبس پر ہلّہ بول دیا اور ان کے اونٹ گھوڑے لے بھاگے۔ بنوعبس نے ان کا مقابلہ کیا لیکن ناکام رہے۔ مجبوراً باپ نے عنترہ کی طرف دیکھا اور کہا کہ عنترہ تم حملہ کرو مگر عنترہ بولا۔ ”غلام حملہ کرنا کیا جانے؟ اسے تو صرف دودھ دوہنے اور اونٹنیوں کے تھنوں کو پچوسانے کا کام آتا ہے“۔ اس چبھتے جملہ کو باپ سمجھ گیا۔ کہا، اچھا حملہ کرو، تم آزاد ہو۔ یہ سنتے ہی عنترہ دشمنوں پر ٹوٹ پڑا کچھ اس بہادری اور بے جگری سے لڑا کہ دشمنوں کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ اونٹ گھوڑے چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ عنترہ اپنے جانور ان سے واپس چھین لایا۔ اس کارنامے کے بعد باپ نے اسے اپنے نسب میں شامل کر لیا۔ اب عنترہ عام عبسیوں کے برابر ہو گیا اور قبائل عرب میں عبس کے شاہ سوار و سردار کی حیثیت سے اس کی شہرت پھیل گئی پھر عنترہ اپنے باپ شداد کے نسب میں شامل ہو جانے کے بعد قبیلہ عبس کے تمام معرکوں خصوصاً داحس اور غبراء کی لڑائیوں میں برابر شریک رہا۔ اپنی بہادری، بے خوفی اور فنِ سپاہ گری کی یہ دولت قبیلے کی آنکھ کا تارا بن گیا۔ لوگ بڑی قدر کرتے اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ عنترہ کو عزت و ناموس کا محافظ، جان و مال کا بچانے والا، شریف اور غیور سردار سمجھتے تھے۔ رفتہ رفتہ عنترہ اپنے کارناموں کی یہ دولت دلیری اور اخلاق میں عرب بھر میں ضرب المثل بن گیا۔ عنترہ اپنی حبشن ماں کی طرح کالا تھا اس لیے اسے اغربۃ العرب یعنی عربوں کے کوؤں میں شمار کیا جاتا تھا۔ زمانہ جاہلیت میں چار عرب کوے ہوئے ہیں۔ عنترہ، خفاف بن ندبہ، ابوعمیر بن الحباب اور سلیک بن سلکہ جو صعالیک العرب یعنی خانماں برباد نوجوانوں میں شمار ہوتا تھا۔ عنترہ کو بھی اپنی کالی جلد اور حبشی ہونے کا شدید احساس تھا اور اسی کے ردِعمل میں اس نے بہادری اور فن سپاہ گری میں امتیاز حاصل کیا تھا۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ اسے اپنی چچا زاد عبلہ سے محبت ہو گئی تھی بڑی کوشش کی کہ عبلہ سے شادی ہو جائے لیکن چچا نے صرف اس وجہ سے یہ رشتہ نامنظور کر دیا کہ وہ (عنترہ) غلام تھا۔ اس ناکامی کا ردِعمل یہ ہوا کہ ایک طرف تو اس نے ان فضائل اور اوصاف کی طرف اپنی توجہ مبذول کر دی تو دوسری طرف اس ناکامی نے اس کے جذبات شاعری کو برانگیختہ کر دیا بالآخر دونوں میدانوں میں اس نے وہ نام اور کمال پیدا کیا کہ اپنے زمانے میں اس کا کوئی ہم سر نہ تھا آخر میں جب اس کے باپ نے اسے آزاد کر کے اپنے نسب میں شامل کر لیا تو عبلہ سے اس کی شادی ہو گئی۔ عنترہ جب تک غلام رہا بجھا بجھا سا اور جذبات شاعری دبے دبے سے رہے کیوں کہ اس زمانے میں سوائے دو تین اشعار کے کوئی قابلِ ذکر قصیدہ یا غزل کا ذکر نہیں ملتا البتہ جب وہ آزاد ہو گیا اور جنگ و جدل میں بہادری، مہارت کے جوہر کھلے تو جذبہ شاعری بھی بھڑک اٹھا۔ عنترہ کی یادگار اس کا وہ معلقہ ہے جو عربی ادب میں فخر و حماسہ میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس معلقہ کے کہنے کا سبب یہ ہوا کہ قبیلہ عبس کے ایک شخص نے عنترہ کو اس کے کالے رنگ اور حبشی نژاد ماں کا طعنہ دیا۔ بڑی بری گالی بھی دی۔ اس پر عنترہ نے کہا کہ تم بے چارے میرا کیا مقابلہ کر سکتے ہو میں تو جنگوں میں بے دھڑک کود پڑتا ہوں۔ مال غنیمت پورا پورا بانٹتا ہوں اور دست سوال دراز کرنے سے پرہیز کرتا ہوں لیکن اپنے مال میں سے بے دریغ سخاوت کرتا ہوں۔ عبسی نے کہا مگر شعر تجھ سے اچھے میں کہہ لیتا ہوں، اس پر عنترہ نے کہا کہ اچھا تم کو یہ بعد میں معلوم ہوگا کہ کون اچھے شعر کہتا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد اس نے وہ مشہور معلقہ کہا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسے سونے کے

پانی سے لکھا گیا۔ عنترہ نے بڑی لمبی عمر پائی بڑھاپے کی وجہ سے بہت ضعیف اور کمزور ہو گیا تھا۔ اتنا دم نہیں رہا تھا کہ ڈٹ کر مقابلہ کر سکے چنانچہ قبیلہ طے سے لڑتے ہوئے گرفتار ہوا اور دشمن کی قید میں آ گیا بالآخر قتل کر دیا گیا۔ مصر کے ڈاکٹر طٰہٰ حسین (5-11-1889 تا 28-10-1973 عیسوی) لکھتے ہیں
"شاعر لبید کے قصیدے کا لطف نوجوان طبقہ اسی وقت لے سکتا ہے جب اس کا ترجمہ اور صاف تشریح کر دی جائے لیکن عنترہ کا یہ قصیدہ (معلقہ) اگر تم انہی نوجوانوں کے سامنے پڑھو تو وہ بغیر ترجمہ و تشریح کے اس کے اکثر حصّہ کو خوب اچھی طرح سمجھ لیں گے کیوں کہ عنترہ کا یہ قصیدہ واضح اور صاف ہے۔ اس کے الفاظ آسان، معانی و مطالب عام فہم ہیں اور بعض جگہ باوجود غرابت الفاظ و معانی کے بات بغیر پردے کے دل میں اتر جاتی ہے۔ جب میں یہ قصیدہ پڑھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قصیدہ کیا ہے بلکہ نغمہ و موسیقی کی مختلف دھنوں کو ایک ساتھ ملا کر ایک ایسا راگ ایجاد کیا گیا ہے جس میں مرکزی حیثیت صرف ایک ہی دھن کو حاصل ہے جو شروع قصیدے سے آخر تک جاری و ساری رہتی ہے یعنی دل کی وہ بات جو شاعر (عنترہ) اپنی محبوبہ سے کرتا ہے اور دل ربا محبوبہ کا سراپا جو شاعر ابتدائے قصیدہ سے آخر قصیدہ تک اپنی جنت نگاہ بنائے رکھتا ہے۔ یہ دھن قصیدہ میں کہیں بہت واضح طریقے سے ظاہر ہوتی ہے اور کبھی ایسے دھیمے سُروں میں کہ صرف تم محسوس کر سکتے ہو مگر کبھی اتنی مخفی کہ قوت سامعہ کو بھی دھوکا دے جائے۔ شاعر لبید اور عنترہ کے قصیدوں میں مرکزی خیال ایک ہی ہے مگر عنترہ کے قصیدے میں یہ خیال اتنا شیریں اور لطیف ہے کہ دل و دماغ کی گہرائیوں سے ہوتا ہوا روح میں تحلیل ہو جاتا ہے اس کے مقابلہ میں لبید کے قصیدہ میں یہ خیال نسبتاً بہت گمبھیر ہے کہ اس میں بدویانہ تندخوئی اور درشتی پوری طرح نمایاں ہے چنانچہ لبید اپنی محبوبہ کا ذکر ابتدا اور درمیان میں بھی کرتا ہے اسے کہیں نہیں بھولتا لیکن وہ محبوبہ پر جان نثار نہیں کرتا نہ محبوبہ کے روٹھنے پر بے چین ہوتا ہے بلکہ محبوبہ سے مقابلتاً منفی اور مثبت ردِعمل اپناتا ہے"۔

اعشیٰ قیس (وفات 629 عیسوی)

پورا نام میمون بن قیس بن جندل تھا، کنیت ابو بصیر اور لقب اعشیٰ تھا۔ اعشیٰ اس لیے کہ پیدائشی یا بعد میں رتوندھے (دن یا رات کو نظر نہ آنا) کے مرض کا شکار تھا یا ہو گیا تھا۔ اسے عربوں کی جھانجھ بھی کہتے ہیں کیوں کہ یہ پہلا عربی شاعر ہے جس کا کلام گا کر پڑھا گیا۔ ادب کی کتابوں میں اسے اعشیٰ قیس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے تاکہ دوسرے ہم نام شعراء سے اسے ممتاز رکھا جا سکے۔ اعشیٰ قیس زمانہ جاہلیت کے آخری دور کا شاعر ہے اور طبقہ جاہلی کے مشہور شعراء میں چوتھا شاعر سمجھا جاتا ہے مرؤالقیس۔ نابغہ ذبیانی اور زہیر بن ابی سلمٰی کے بعد اسی کو فن شاعری میں استاد کامل اور قوت بیان میں عدیم المثال گردانا جاتا ہے۔ تمام جاہلی شعراء میں اعشیٰ کو مدح سرائی، شراب کی تعریف، اشعار میں گہرائی اور تنوع پیدا کرنے میں امتیاز حاصل ہے اسی طرح شاید کہ یہ پہلا شاعر ہے۔ جس کے لمبے قصیدے جو اکثر مدحیہ ہوتے تھے نوک پلک سے پوری طرح درست ہوتے تھے۔ اعشیٰ یمامہ کے ایک گاؤں منفوحہ کا رہنے والا تھا لیکن اس نے پورے جزیرہ عرب کا سفر کیا تھا۔ مختلف بادشاہوں اور امراء کی شان میں مدحیہ قصیدے کہے تھے۔ اپنی ابتدائی زندگی میں اعشیٰ اپنے خالو المسیب بن علس کے اشعار کا راوی اور منادی تھا۔ اس کے شعروں کی خوب تعریف و توصیف کر کے لوگوں کو سناتا تھا۔ خود بھی اسی کے انداز میں مشق سخن کرتا تھا جب کلام میں پختگی آ گئی اور لوگوں میں شہرت پھیل گئی تو اس نے بادشاہوں کے درباروں اور امیروں کے کاشانوں کا رخ کیا دور دراز کے سفر کیے قصیدے کہے اور انعامات حاصل کیے۔ غالباً اعشیٰ صرف جاہلی شعراء میں ہی نہیں بلکہ شاید تمام عربی شعراء میں پہلا شاعر ہے جس نے اپنے ممدوحوں سے منہ پھوڑ کر صلہ مانگا ہے اسی لیے عربوں میں اس کی وقعت بہت کم ہو گئی تھی۔ عرب حکمرانوں سے خوب انعام و اکرام پانے کے بعد بھی جب اعشیٰ قیس کی نیت نہ بھری تو اس نے کسریٰ نوشیرواں کے دربار کا رخ کیا اور اس کی شان میں ایک لمبا قصیدہ سنایا۔۔۔۔۔۔ ایرانی حکمرانوں کے لیے ایک عرب نژاد کی یہ تعریف منہ مانگی مراد تھی چنانچہ کسریٰ نے دل کھول کر اعشیٰ قیس کو انعام و اکرام سے نوازا گو کہ فارسی ترجمہ کی خرابی کی بنا پر کسریٰ کو یہ قصیدہ زیادہ پسند نہیں آیا۔ اعشیٰ قیس اپنے کلام میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے فارسی کے بعض الفاظ اور ایرانی سازوسامان کا بھی ذکر کرتا ہے۔ پھولوں میں گل یاسمین اور بعض دیگر سازوں کا ذکر اس کے کلام میں ملتا ہے۔ اعشیٰ قیس اس قسم کے شعر محض تفنن طبع کے طور پر نہیں کہتا تھا بلکہ یہ بھی دکھانا چاہتا تھا کہ اس نے بیرونی ملکوں کا سفر کیا ہے ان کے بادشاہوں اور ممتاز لوگوں سے گھلا ملا ہے ان کے ساتھ اٹھا بیٹھا ہے اسی لیے وہ ان چیزوں کو جانتا سمجھتا ہے۔ اعشیٰ قیس کی جلالت قدر کا اندازہ

اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ عکاظ کے سالانہ میلے میں نابغہ ذبیانی کی طرح اس کے لیے بھی الگ چمڑے کا ایک خیمہ لگایا جاتا تھا جس میں شعراء آکر اسے اپنا کلام سناتے تھے، رائے لیتے تھے اور جس کے حق میں جو فیصلہ کر دیتا سب لوگ اسے مان لیتے تھے۔ اعشیٰ قیس کو بھی اکثر نقادوں نے اصحاب المعلقات میں شمار کیا ہے۔ وہ قصیدہ معلقہ قرار پاتا ہے جس میں اعشیٰ قیس بادشاہ نعمان منذر کے بھائی شاہ الاسود الکندی کی مدح کرتا ہے۔ اس معلقہ میں زوزنی کی روایت کے مطابق اٹھانوے اشعار ہیں۔ دستور کے مطابق اعشیٰ قیس اپنا قصیدہ تشبیب سے شروع کرتا ہے اور یہ سلسلہ چھتیسویں شعر تک ہے جس میں غزل کے بعد سفر اور اونٹنی کی تعریف ہے سینتیسویں شعر سے گریز کیا ہے اور اپنے ممدوح اسود الکندی کی تعریف کا آغاز کیا ہے۔ اس کے صفات گنا تا ہے۔ خاندان اور حسب نسب کے گن گاتا ہے۔ کارناموں کا ذکر کرتا ہے پھر دوبارہ غزل کی طرف آتا ہے اور اس کے بعد شکار اور اس کا منظر کھینچتا ہے اور اسی پر قصیدے کا خاتمہ بالخیر کرتا ہے ایک دفعہ یونس حبیب نحوی سے پوچھا گیا کہ آپ کے خیال میں سب سے بڑا شاعر کون ہے؟ تو اس نے کہا کہ اس سلسلے میں کسی خاص شاعر کا نام تو میں نہیں لے سکتا البتہ یوں ہے کہ سب سے بڑا شاعر امرؤ القیس ہے جب وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو۔ نابغہ ذبیانی اس وقت جب وہ ڈرا ہوا ہو۔ زہیر سلمیٰ اس وقت جب اسے انعام و کرام کا لالچ ہو اور اعشیٰ قیس اس وقت جب وہ مست ہو جائے۔ مستی و ترنگ میں بہترین شعر کہنے کی مثال اعشیٰ قیس کا وہ مدحیہ قصیدہ ہے جس میں اس نے محلق نامی بدو کی تعریف کی ہے۔ یہ قصیدہ طرز بیان اور جدت میں اپنی مثال آپ سمجھا جاتا ہے۔ محلق ایک غریب، گمنام۔ اور عیالدار بدو تھا۔ آٹھ لڑکیاں گھر میں بیٹھی تھیں۔ غربت کی وجہ سے کوئی ادھر جاتا نہ باپ انہیں بیاہ پاتا۔ اعشیٰ قیس نے ان سے متعلق یہ مدحیہ قصیدہ عکاظ کے سالانہ میلے میں پڑھا تو اگلے برس تک محلق غریب کی تمام بیٹیاں بڑے بڑے امراء کے محلات کی زینت بن گئیں۔ اعشیٰ قیس کے کلام کا یہ عالم اور اثر تھا کہ قبائل عرب میں جس کو چاہتا اپنے مدحیہ کلام سے اسے اونچا اٹھا دیتا جسے چاہتا ہجو کر کے بدنامی اور پستی میں گرا دیتا۔ اعشیٰ قیس نے بڑی لمبی عمر پائی آخری عمر میں جب اسلام کا ظہور ہوا اور حضور اکرمؐ ...... کی تعلیمات کامیابی سے عرب قبائل میں پھیلنے لگیں تو اعشیٰ قیس نے آپؐ کی شان میں ایک بہت ہی خوب صورت، پُرشکوہ مدحیہ قصیدہ کہا اور اس نیت سے حجاز کی طرف روانہ ہوا کہ قصیدہ خدمت نبویؐ میں پیش کر کے مسلمان ہو جائے۔ یہ فتح مکہ سے پہلے کی بات ہے۔ ادھر قریش کے لوگوں کو اس کی بھنک پڑ گئی اور انہوں نے سوچا کہ اگر اعشیٰ قیس نے اپنا مدحیہ قصیدہ پیش کر دیا تو سارے عرب میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دھوم مچ جائے گی۔ چاہے اعشیٰ قیس خود مسلمان ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ راستے میں ہی یہ لوگ اعشیٰ قیس سے ملے اور ابوسفیان نے اس سے کہا۔ ”ہمارے اور اس (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے درمیان اس وقت لڑائی بند ہے اس لیے تم ایک سو اونٹ لے لو اور اس سال واپس اپنے وطن چلے جاؤ۔ انتظار کرو کہ ہمارے اور اس کے درمیان کیا فیصلہ ہوتا ہے اگر وہ ہم پر غالب آجائے تو تم بے شک اس کے پاس آجانا۔“ اعشیٰ قیس نے مکہ والوں سے سو اونٹ لے لیے اور واپس یمامہ کی طرف چل پڑا۔ جب یمامہ سے تھوڑی دور رہ گیا تو وہ اتفاقاً اپنی اونٹنی سے گر گیا جس کی وجہ سے اس کی گردن ٹوٹ گئی اور وہ وہیں مر گیا۔ اپنے گاؤں منفوحہ میں دفن کیا گیا۔ یہ سات ہجری کا واقعہ ہے روایت ہے کہ جب حضور اکرمؐ .... کو اس واقعہ کی اطلاع دی گئی تو آپؐ نے فرمایا کہ ”وہ نجات پاتے پاتے رہ گیا۔“ علماء کا اس امر میں اتفاق ہے کہ اعشیٰ کا سب سے اچھا قصیدہ وہ ہے جو اس نے حضور اکرمؐ ...... کی تعریف میں کہا تھا اور جسے اہل قریش کے سازش کی وجہ سے آپؐ کو سنا نہ سکا۔ اعشیٰ قیس کو اس کی امتیازی خصوصیات کی وجہ سے فحل یعنی سب سے بڑا نر کہتے تھے اور عربوں کا دستور تھا کہ شعراء میں سے فحل اس شاعر کو کہتے تھے جس کے کسی شعر میں کوئی حکمت کی بات ہو۔ اعشیٰ قیس نے اپنی طویل عمر میں اکثر اصناف شعر میں طبع آزمائی کی ہے۔ عربوں میں مشہور تھا کہ اعشیٰ قیس کی مثال اس باز کی طرح ہے جو چھوٹے بڑے سب پرندوں پر جھپٹتا ہے۔ شراب کی تعریف میں تو کوئی شاعر مشکل ہی سے اعشیٰ قیس کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ مشہور تھا کہ اعشیٰ قیس جب پی کر مست ہو جائے تو سب سے بڑا شاعر ہوتا ہے۔ ہر صنف میں نت نئی باتیں پیدا کرنے میں اسے کمال حاصل تھا۔

طرفہ بن العبد (وفات 552 عیسوی)

طرفہ بن العبد کا پورا نام عمرو طرفہ بن العبد ہے۔ اس کا سلسلہ نسب قبیلہ بکر بن وائل سے ملتا ہے جو قبیلہ ربیعہ کی ایک شاخ تھی یوں طرفہ ربیعی شاعر ہے طرفہ مشہور جاہلی شاعر جریر بن عبدالمسیح کا بھانجا تھا۔ جریر بن عبدالمسیح المتلمس کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک اور مشہور جاہلی شاعر

الرقش الاصغر، طرفہ کا چچا تھا طرفہ اپنی قوم قبیلے کے ساتھ بحرین (خلیج فارس) میں رہا کرتا تھا بچپن ہی سے باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ چچاؤں نے بڑا ناروا سلوک کیا۔ طرفہ کی ماں وردہ کی جایداد وغیرہ بھی غصب کرلی۔ طرفہ نے تلملا کے زوردار ہجو کہہ ڈالی۔ اپنے چچا اور خاندان سے بگاڑنے کے بعد طرفہ گھر سے نکل پڑا۔ شراب و کباب اور رندی و مستی میں شب و روز گزرنے لگے۔ بے دریغ پیسا خرچ کر ڈالا۔ رقم ختم ہوئی تو گھر واپس آکر اپنے بھائی سے مدد مانگی۔ بھائی نے کچھ پیسے دیے تو وہ بھی عیش و عشرت میں اڑا ڈالے۔ اب گھر جانے کا یارا بالکل نہ تھا۔ چنانچہ طرفہ نے حیرہ کے بادشاہ عمرو بن عبد کے دربار کا رخ کیا۔ کہتے ہیں اس سفر میں اس کا ماموں متلمس بھی ساتھ تھا۔ بادشاہ عمرو بن عبد اپنے زمانے کا بہت بڑا شاعر نواز اور علم و ادب کا بڑا قدر دان ہو گزرا ہے۔ بادشاہ نے ماموں بھانجا دونوں شعراء کی خوب آؤ بھگت کی اور اپنے بھائی قابوس کے حاشیہ نشینوں میں انہیں شامل کر دیا۔ قابوس بہت خوش باش، زندہ دل اور شکار کا رسیا نوجوان تھا طرفہ اس کے سیر و شکار کے گروہ کا ساتھی اور محفل شراب و کباب کا شریک بن گیا مگر اس مصاحبت و یگانگت کے باوجود جتنی اپنائیت اور مراعات کی طرفہ توقع رکھتا تھا اسے نہ مل سکی کیوں کہ اسے اب بھی حسب سابق شاہی محل کے دروازے پر مدت تک کھڑا رہنے کے بعد اندر آنے کی اجازت ملتی تھی۔ بات چیت اور برتاؤ میں حفظ مراتب کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ عرب کی آزاد فضاؤں میں آزادی سے پلے بڑھے عرب نسل نوجوان شاعر پر اس رویے کا بہت برا اثر پڑا اور جوں جوں دن گزرتے گئے تعلقات میں اونچ نیچ، برتاؤ میں بھید بھاؤ کا احساس بڑھتا گیا، طرفہ اس بجھی بجھی سی زندگی سے اوب گیا اور اس کے دل میں عمرو بن عبد بادشاہ، اس کے بھائی قابوس کی طرف سے گرہ پڑ گئی آخر اس نے عمرو اور قابوس کی ہجو کہہ ڈالی۔ عمرو کو اس کا علم ہوا تو اس نے بات دل میں رکھ لی اور موقع کی تلاش میں رہا کچھ دنوں کے بعد عمرو نے کہا کہ شاید اب تم دونوں ماموں بھانجا اپنے وطن کو واپس جانا چاہتے ہو گے؟ متلمس اور طرفہ نے آمادگی کا اظہار کیا تو بادشاہ نے اپنے بحرین اور ہجر کے حاکم ربیعہ یا معکبر کے نام ان دونوں کو ایک ایک خط دیا یہ ظاہر کیا کہ ان خطوط میں انعام و اکرام دینے کا حکم ہے دونوں ماموں بھانجا خطوط لے کر نکل کھڑے ہوئے جب نجف یا حیرہ کے قریب پہنچے تو متلمس کے جی میں آیا کہ وہ اس خط کو کسی سے پڑھوا کر تو دیکھے کہ کیا لکھا ہے؟ اس نے ایک لڑکے سے خط پڑھوایا اس میں لکھا تھا کہ جب حامل خط تمہارے پاس پہنچے تو اس کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کٹوا کر زندہ زمین میں دفن کر دینا۔ متلمس نے جب یہ متن سنا تو خط کو ایک دریا میں پھینک دیا دریا کا نام کافر تھا۔ متلمس نے فی البدیہہ شعر کہا کہ "میں نے اس خط کو دریائے کافر میں ڈال دیا اور میں اس قسم کے گمراہ کرنے والے خط کا یہی حشر کرتا ہوں" پھر وہ اپنے بھانجے طرفہ کو خبردار کرنے کے لیے لپکا مگر اسے نہ پا سکا متلمس بھاگ کر شاہان شام غسانیوں کے پاس چلا گیا بعض روایات میں ہے کہ طرفہ اسے مل گیا اور جب متلمس نے اسے کہا کہ بھانجے! تم بھی اپنے خط کا مضمون معلوم کرلو شاید اس میں بھی یہی حکم ہو تو طرفہ نے ماموں کا مذاق اڑایا کہ میرے بارے میں ایسا حکم دینے کی ہمت عمرو نہیں کرسکتا۔ طرفہ کو اپنے قبیلے کا مان تھا وہ اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہا جو دراصل اس کی موت کی منزل تھی۔ طرفہ نے بحرین کے حاکم کو خط دے دیا۔ حاکم نے خط پڑھ کر حسب ہدایت طرفہ کو قتل کرا دیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حاکم نے طرفہ کے قبیلے کے ڈر سے اسے قتل نہ کیا تو بادشاہ عمرو نے قبیلہ بنو تغلب کے ایک شخص عبد ہند کو حاکم بنا کر بھیجا اس نے طرفہ کو قتل کرا دیا اور ہجر میں دفن کرا دیا۔ ابن قتیبہ نے الشعر والشعراء میں طرفہ کے قتل کا سبب یہ بتایا ہے کہ طرفہ جن دنوں عمرو کی مصاحبت میں تھا تو ایک دن عمرو کی بہن نے اوپر سے نیچے کی طرف جھانک کر دیکھا تو اس کا عکس اس پیالہ میں پڑا جس میں طرفہ شراب پی رہا تھا چنانچہ اس نے اس کے حسن برق پاش کو دیکھ کے مستی بھرے رندانہ اشعار کہے۔ عمرو موجود تھا اسے طرفہ کی یہ جسارت بہت بری لگی بات دل میں رکھ لی کچھ دنوں بعد خط دے کر حاکم بحرین سے قتل کروایا۔

طرفہ نے انگریز شاعر جان کیٹس (۳۱ اکتوبر ۱۷۹۵ تا ۲۳ فروری ۱۸۲۱ عیسوی) کی مانند صرف پچیس چھبیس برس عمر پائی۔ طرفہ کی بہن نے بھائی کا مرثیہ کہا، طرفہ کی مختصر سی زندگی سے پتا چلتا ہے کہ اسے قدرت نے بلا کی ذہانت اور شاعری کا اعلیٰ فطری ذوق بخشا تھا طرفہ کی شاعری سے متعلق جتنا ذخیرہ سامنے آسکا ہے اس میں سب سے زیادہ صحیح، قابلِ اعتبار اور اس کی فنی مہارت کا آئینہ دار اس کا معلقہ ہے جو اس نے گھر چھوڑ کر آزادانہ شب و روز کے ابتدائی دنوں میں کہا تھا۔

ہوا کچھ یوں کہ اس کے بھائی معبد کے کچھ اونٹ گم ہو گئے اور بہت تلاش و جستجو کے بعد بھی نہ ملے تو خیال ہوا کہ شاید کوئی قبیلہ اونٹ ہنکا لے گیا ہے۔ طرفہ اپنے چچازاد بھائی مالک کے پاس گیا کہ اونٹوں کی تلاش اور واپس لانے میں اس

کے بھائی معبد کی مدد کرے مگر چچازاد مالک نے اسے بری طرح جھڑک دیا اور یہ کہہ کر بھگا دیا کہ ”پہلے تو تم نے اونٹوں کی طرف سے بے پروائی برتی جب سب کھو گئے تو اب ان کی تلاش وجستجو میں پریشان ہو کر تنگ کرنے کے لیے آگئے ہو“ طرفہ بھنا اٹھا جذبات میں ہیجان برپا ہو گیا جس کا مآل معلقہ بنا۔ معلقہ کا موضوع اس کی اپنی ذات اور زندگی سے متعلق اس کا نقطۂ نظر ہے نیکی۔ بدی اور لذت کوشی کے بارے میں اس کا فلسفہ ہے، نہ کسی کی تعریف نہ غزل بہ حیثیت فن۔ شروع میں جو غزلیہ اشعار ہیں وہ دستور کے مطابق محض تشبیب ہے ورنہ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ محبوبہ۔ اس کی اونٹنی کے بعد اپنی اونٹنی کی تعریف کرتا ہے اس قدر لمبی تفصیل کے ساتھ کہ اونٹنی کے ہر ہر عضو کی تشریح کرتا ہے۔ اٹھائیس اشعار اونٹنی کے بیان میں صرف کرتا ہے پھر اصل مطلب کی طرف آتا ہے اپنی ذات اور صفات پر فخر کرتا ہے زندگی سے متعلق اپنا نظریہ اور فلسفہ پیش کرتا ہے پھر شراب، ساقی، مطربہ اور ہم مشرب دوستوں کا ذکر کرتا ہے بے دریغ پیسا لٹانے۔ زندگی سے لطف اندوز ہونے کا بیان کرتا ہے کہ زندگی ایک بار کی ہے لہٰذا جی بھر کے عیش کرلو۔

بابر! بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

کہتا ہے کہ میری زندگی کے تین ہی مقاصد ہیں، ایک شراب پینا دوسرا کمزور و بے کس اور ڈرے ہوئے آدمی کی حفاظت و مدد کرنا۔ تیسرا یہ کہ جب پانی برس رہا ہو، موسم سہانا اور خوشگوار ہو تو پھر کسی شہ ناز ولالہ رخ کے کاشانہ میں جا ٹھہرنا۔ اس کے بعد بڑے دکھ درد سے عزیز و اقارب کے ظلم وزیادتیوں کا تذکرہ کرتا ہے کہ اپنوں کی دی ہوئی تکلیف تیز تلوار کی ضرب کاری سے بھی زیادہ سخت ہوتی ہے۔ طرفہ بھی زہیر ابی سلمٰی کی طرح اپنے معلقہ کا خاتمہ حکمت اور فلسفے کی باتوں پر کرتا ہے۔ طرفہ کو عربی ادب میں ابن العشرین یعنی بیس سال کی عمر کا نوجوان کہا جاتا ہے جس نے اپنے کمال فن کا لوہا بڑے بڑے شعراء سے منوایا حتیٰ کہ سبعہ معلقہ میں شامل ہوا۔ طرفہ ہجرت نبوی سے ستر برس پہلے فوت ہوا۔

عمرو بن کلثوم التغلبی (وفات 570 عیسوی)

عمرو نام، کنیت ابوالاسود، باپ کا نام کلثوم بن مالک تھا۔ عمرو بن کلثوم قبیلہ تغلب کا شاعر، بہادر اور نام ور شہسوار تھا۔ عرب قبائل پر اس کی ہیبت اور رعب کا یہ عالم تھا کہ اسے، فاتک العرب، یعنی عرب کا شیر کہتے تھے۔ باپ بھی قوم کا سردار، قیادت وسیادت اور شان وشوکت میں ضرب المثل تھا۔ اسی طرح اس کی ماں لیلیٰ بھی بڑے باپ مہلہل بن ربیعہ کی بیٹی تھی۔ یہ مہلہل وہی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے شاعری کی ابتدا کی تھی۔ اسی طرح عمرو کی ماں لیلیٰ عربوں میں سب سے معزز۔ پُر ہیبت اور باوقار سردار کلیب بن وائل کی بھتیجی تھی۔ غرض کہ عمرو بن کلثوم ماں اور باپ دونوں طرف سے عرب کے ممتاز، مشہور طاقتور اور بااثر قبیلے کا فرد تھا۔ قبیلہ تغلب جزیرہ عرب میں رہتا تھا۔ عرب قبائل میں اپنی طاقت وسطوت۔ شان وشوکت اور عزت وسیادت میں نہ صرف ممتاز ومشہور تھا بلکہ سارے قبائل پر اس کی اتنی دھاک جمی ہوئی تھی کہ لوگ یہی کہتے تھے کہ اگر اسلام آنے میں ذرا اور دیر کر دیتا تو قبیلہ تغلب لوگوں کو ہڑپ کر جاتے یعنی سب پر چھا جاتے۔ عمرو بن کلثوم نے اسی شاہانہ ماحول میں پرورش پائی۔ بہادری، اولوالعزمی اور علم وفضل میں وہ کمال حاصل کیا کہ پندرہ برس کی عمر میں ہی اپنے قبیلے کا سردار چن لیا گیا۔ مختلف جنگوں میں اپنے قبیلہ کی قیادت کر کے مشکل ترین معرکوں کو سر کیا اور اپنے قبیلہ کا سکہ سارے عرب پر بٹھا دیا ساتھ ہی قدرت نے اسے ایسی قادر الکلامی، ذہن رسا اور طبع موزوں عطا کی کہ اپنے زمانہ کا نام ور خطیب و مقرر بنا نیز صرف ایک قصیدہ کی بہ دولت فخریہ شاعری کا امام بن کر چمکا۔ قبیلہ تغلب اور بکر بن وائل کے درمیان مدتوں سے لڑائی جاری تھی دونوں طرف سے سینکڑوں لوگ قتل ہو چکے تھے آخر میں حیرہ کے بادشاہ المنذر بن السماء کی کوششوں سے دونوں قبائل میں صلح ہو گئی۔ المنذر نے دونوں قبیلوں میں سے کچھ غلام بہ طور ضمانت اپنے پاس رکھ لیے تھے کہ اگر کسی قبیلے نے معاہدہ توڑا تو اس کے غلام دوسرے قبیلے کو تاوان میں دے دیے جائیں گے۔ المنذر کے بعد اس کا بیٹا عمرو بن المنذر بادشاہ بنا اس نے ایک بار دونوں قبائل کے غلاموں کو کسی کام سے قبیلہ طیٔ کے پہاڑوں میں بھیجا وہاں بنی بکر کے غلاموں نے دوسرے غلاموں کو مار پیٹ کے بھگا دیا۔ یہ بے چارے صحرا میں پیاسے مر گئے اس پر بنو تغلب میں آگ لگ گئی۔ انہوں نے خون بہا کا مطالبہ کیا۔ بات بڑھ گئی معاملہ عمرو بن عبد بادشاہ کے سامنے پیش ہوا چنانچہ بنو تغلب سے عمرو بن کلثوم اور بنو بکر سے ان کا مشہور شاعر الحارث بن حلوہ الیشکری نمائندہ بن کر گئے اس موقع پر الحارث نے فی البدیہہ اپنا فخریہ قصیدہ کہا۔ روایت ہے کہ الحارث برص (پھل بہری) کا مریض تھا عرب مبروص

آدمی کا دیکھنا یا اپنے پاس بٹھانا برا اور نقصان دہ سمجھتے تھے۔ سو الحارث کو عمرو بادشاہ نے دور سات پردوں کے پیچھے بٹھا دیا حارث نے قصیدہ شروع کیا جوں جوں قصیدہ بڑھتا، آگے بڑھتا گیا۔ بادشاہ متاثر ہو کر پردے ہٹواتا گیا آخر حارث کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ ساری ہمدردی بنو بکر کی طرف ہو گئی۔ حالانکہ پہلے بادشاہ ہمیشہ بنی تغلب کی طرف ہی جھکا رہتا تھا۔ یہ بات عمرو کو بہت بری لگی اور وہاں سے واپس آ کر اس نے اپنا طویل قصیدہ (معلقہ) لکھا بعض نقادوں اور تذکرہ نگاروں نے اس معلقہ کا سبب یہ لکھا ہے کہ حیرہ سے عمرو بن کلثوم غصے میں بھرا واپس آیا تو بادشاہ عمرو بن عبد نے اپنے ہم نشینوں سے پوچھا کہ عرب میں وہ کون شخص ہے جس کی ماں میری ماں کی خدمت سے انکار کر دے گی۔ درباریوں نے کہا ہمیں اس کا تو علم نہیں، البتہ عمرو بن کلثوم کی ماں لیلیٰ وہ عورت ضرور ہے جو آپ کی ماں کی خدمت کرنے سے ضرور انکار کر دے گی کیوں کہ اس کا باپ مہلہل بن ربیعہ اور چچا کلیب بن وائل ہے جو عرب کی معزز ترین شخصیات تھیں پھر اس کا شوہر عرب کا مشہور شہسوار کلثوم بن عتاب تھا اور اب اس کا بیٹا عمرو بن کلثوم ہے جو اپنی قوم کا سردار ہے۔ اس پر بادشاہ عمرو بن ہند نے عمرو بن کلثوم کو پیغام بھیجا کہ ایک دن میری ضیافت قبول کرو اور اپنی ماں کو میری ماں سے ملانے ساتھ لے آؤ۔ عمرو بن کلثوم نے حیرہ کے بادشاہ کی یہ دعوت قبول کر لی اور اپنا لاؤ لشکر لے کر اپنی ماں کی معیت میں بادشاہ سے ملنے کے لیے روانہ ہوا۔

ادھر عمرو بن عبد بادشاہ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے عمرو بن کلثوم کے اعزاز و کرام کی خاطر حیرہ سے فرات تک زنانہ اور مردانہ خیمے لگوا دیے اور شاہانہ تکلفات سے انہیں سجا دیا استقبال کے لیے امراء ورؤسا، آس پاس کے شیوخ اور سرداروں کو جمع کر لیا ادھر اپنی ماں سے کہہ دیا کہ اندر جب دسترخوان لگ جائے تو نوکروں کو اشارے سے ہٹا دینا اور پھر عمرو بن کلثوم کی ماں سے کسی کام کی فرمائش کرنا۔ جب مہمان سارے آن پہنچے تو بادشاہ کی ماں، عمرو بن کلثوم کی ماں لیلیٰ کو اپنے زنانہ خیمہ میں لے گئی اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد کھانا چن دیا گیا اور تمام خدمت گار دائیں بائیں غائب ہو گئے۔ بادشاہ کی ماں نے لیلیٰ بن مہلہل سے کہا کہ بہن! ذرا وہ رکابی اٹھا کے مجھے دینا۔ لیلیٰ نے کہا کہ جسے ضرورت ہے وہ خود ہی اٹھا لے لیکن جب بادشاہ کی ماں نے رعب اور سختی سے طشتری اٹھا کر دینے کا کہا تو لیلیٰ برداشت نہ کر سکی۔ زور سے چلائی،

ہائے یہ ذلت۔ کہاں ہو، اے تغلبیو! یہ آواز جب عمرو بن کلثوم کے کانوں میں پڑی تو غصے سے اس کا منہ لال ہو گیا۔ عمرو بن عبد نے موقع کی نزاکتوں کو تاڑ لیا مگر وہ سوچتا ہی رہ گیا عمرو بن کلثوم نے وہیں خیمہ میں ننگی عمرو بن ہند کی تلوار لی اور اسی سے بادشاہ کی گردن اڑا دی۔ اپنے لشکر کو حکم دیا کہ سب کچھ لوٹ لو۔ لشکر نے سارا قیمتی ساز وسامان لوٹ لیا اور فتح و خوشی کی شادیانے بجاتے اپنے جزیرہ کو واپس آ گئے۔ وطن واپس آ کر عمرو بن کلثوم نے اپنا لازوال طویل قصیدہ (معلقہ) کہا جسے عکاظ کے سالانہ میلے میں اس نے سنایا تو معلقہ سال کا حاصل شاعری قصیدہ قرار دیا گیا۔ بنو تغلب نے اس قصیدے کو زبانی یاد کر لیا اور قومی ترانے کی طرح گلی کوچوں میں گاتے پھرتے تھے۔ دشمن قبیلہ بنو بکر کے ایک شاعر نے چڑ کر اشعار کہے کہ "بنو تغلب کو عمرو بن کلثوم کے قصیدے نے اتنا مگن کر دیا ہے کہ اب وہ سارے کام کاج چھوڑ کر اسی کے ہو کر رہ گئے ہیں ہر وقت اس قصیدے کی بہ دولت اب وہ اپنے بڑھوں پر فخر کرتے رہتے ہیں، ذرا لوگو! دیکھنا اس قصیدے کو۔ کہ جس سے جی ہی نہیں اکتاتا" عمرو بن کلثوم کے معلقہ میں ایک سو چھ اشعار ہیں اس کا موضوع اپنے بزرگوں اور اپنے کارناموں پر فخر کرنا ہی ہے عمرو بن کلثوم نے قصیدے کو دور جاہلی کے شعراء کی عادت اور رواج کے خلاف تشبیب کی بجائے ساغر و ساقی کے ذکر سے شروع کیا ہے اس کے بعد اپنی محبوبہ کا سراپا اس طرح کھینچتا ہے کہ انگ انگ کی تصویر اتار کے رکھ دیتا ہے پھر معلقہ کے اصل موضوع یعنی فخر و مباہات کی طرف آتا ہے۔ آگے اپنے اور بزرگوں کے کارنامے گنتا ہے قبیلہ کی مہمان نوازی، سخاوت اور شان و شوکت کا بیان ہے۔ معلقہ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عمرو بن کلثوم کو موقع و محل کے لحاظ سے مناسب الفاظ منتخب کر کے نظم کرنے میں ملکہ تامہ حاصل تھا کہ معنی صاف اور واضح طریقے سے ذہن میں آ جائیں اسلوب بیان بڑا پیارا اور طرز ادا بہت پراثر دل نشیں ہے۔ صرف ایک ہی قصیدے (معلقہ) سے اسے شہرت دوام حاصل ہو گئی۔ عمرو بن کلثوم نے بڑی لمبی عمر پائی تقریباً سو برس سے کچھ زیادہ عرصہ تک جیا۔ مرنے سے پہلے تمام بیٹوں کو بلایا۔ زندگی بھر کے تجربات بیان کیے اور بڑے مفید، قیمتی مشورے دیے اور نصیحتیں کیں۔



نومبر کی شخصیات

صائمہ اقبال

شمسی کلینڈر کے اس گیارہویں مہینے سے جڑی ان اہم شخصیات کا مختصر تذکرہ جنہوں نے کارہائے نمایاں انجام دے کر اپنی اہمیت کا احساس دلایا، جنہیں ہم بھول نہیں سکتے۔ ان کا ذکر برابر کرتے رہنا چاہیے تاکہ معلومات حاصل کرنے کے شائقین اپنی پیاس بجھا سکیں۔

☆ شاہ لطیف

گرج چمک اور جھوم کے آئے بدرا اب کی بار
چم چم چمکے، گھن گھن گرجے، برسے میگھ ملھار

سندھ شاہ لطیف کی دھرتی ہے۔ کونے کونے میں شاہ کے لازوال گیت سنائی دیتے ہیں، مگر شاہ عبداللطیف بھٹائی کو کسی ایک علاقے، ایک زبان تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کے اشعار نے احکامات خداوندی کو عام فہم مگر پُراثر انداز میں یوں لوگوں تک پہنچایا کہ وہ اُن کے دلوں میں گھر کر گئے۔ عشقِ رسول ﷺ جزوِ زندگی بن گیا۔ انہوں نے سندھ کی زبان، ادب و ثقافت، رومانوی داستانوں کو اسلامی رنگ میں رنگ دیا۔ ان کی کافیاں دراصل اللہ کی واحدنیت کا شاعرانہ اظہار ہیں۔

''شاہ جو رسالو'' ایک شاہکار ہے۔ ان کا صوفیانہ کلام خدا کے عشق سے لبریز تھا۔ سندھ میں قرآن اور حدیث کے بعد شاہ جو رسالو ہی سب سے معتبر تصنیف ہے۔ کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔

شاہ لطیف نے 18 نومبر 1689ء کو ہالا میں سادات گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد سید حبیب شاہ کا شمار علاقے کی برگزیدہ ہستیوں میں ہوتا تھا۔ وہ اپنی والدہ سے دوسری اولاد تھے۔ ان کے اجداد امیر تیمور کے زمانے میں ہرات سے ہندوستان آئے تھے۔ یہ میر علی کا خاندان تھا، جس میں شاہ لطیف کے علاوہ شاہ عبدالکریم بلڑی، سید ہاشم اور سید جلال جیسی شخصیات گزریں۔



شاہ لطیف کی پیدائش کے کچھ عرصے بعد ان کا خاندان کوٹری آ بسا۔ وہاں وہ آخوند نور محمد کی درس گاہ میں تحصیل علم کے واسطے بھیجے گئے۔ روایت ہے کہ انہوں نے الف کے سوا کچھ اور پڑھنے سے انکار کر دیا۔ جب تذکرہ اس واقعے کا ان کے والد سے کیا گیا، تو وہ مسکرا دیے۔ صوفی تھے، علم رکھتے تھے۔ ان کی بعد کی تعلیم سے متعلق واضح تفصیلات نہیں ملتیں مگر ان کی شاعری سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ قرآن و حدیث کا وسیع علم رکھتے تھے۔ عربی اور فارسی کے علاوہ مقامی زبانوں سے بھی خوب واقف

تھے۔

مؤرخین کے مطابق کئی مزارات پر حاضری دی۔ جھوک بھی گئے۔ انہوں نے سندھ کے طول و عرض میں خاصا سفر کیا۔ مختلف علاقوں میں بسنے والوں کی ثقافت اور رسم و رواج کا ذکر اُن کے کلام میں ملتا ہے۔

موسیقی سے انہیں گہرا شغف تھا۔ اس کے اسرار و رموز سمجھتے تھے۔ سندھی لوک ساز اکیتارا کو ان ہی کی ایجاد قرار دیا جاتا ہے۔ یہ سماع ہی تھی، جس کے وسیلے اُن کا کلام بھٹ شاہ سے پورے سندھ میں پھیل گیا۔

شاہ لطیف نے 1752ء میں 63 سال کی عمر میں جہان فانی سے کوچ کیا۔ انتقال کو ڈھائی سو سال بیت چکے ہیں، مگر ان کا پیغام آج بھی زندہ ہے۔

سندھ میں انہیں روحانی پیشوا کا درجہ حاصل ہے۔ کچھ حلقوں کے نزدیک وہ ایک مصلح تھے، جس نے مغل سلطنت کا زوال دیکھا، احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں دلی تاراج ہوا، سندھ پر کابل کا اقتدار قائم ہوا، ایسٹ انڈیا کمپنی کی صورت سندھ میں نوآبادیاتی طاقت کے پاؤں جمنے لگے، تو انتشار کے اس دور میں انہوں نے اپنے کلام سے عوام کو اندرون کی سمت، روح کی سمت متوجہ کیا۔ اسلام کی آفاقیت کا پرچار کیا۔

☆ علامہ اقبال

پاکستان علامہ اقبال ہی کے خواب کی تعبیر ہے۔ اس عظیم تخلیق کار نے امت مسلمہ میں نئی روح پھونکی۔ وہ فقط ایک فلسفی اور قانون داں نہیں تھے، بلکہ ایسے صوفی تھے، جس نے ترک دنیا کو رد کیا اور اسلام کی عملی روایات سے استفادہ کیا۔ 1930ء میں الہ آباد میں مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے جو خطبہ دیا، اسے نظریۂ پاکستان کی پہلی اینٹ قرار دیا جاتا ہے۔

علامہ اقبال 9 نومبر 1877ء کو سیالکوٹ میں شیخ نور محمد کے گھر پیدا ہوئے (محققین کے مابین علامہ کی تاریخ ولادت پر اختلاف ہے) اجداد کا تعلق کشمیر سے۔ والد دین دار آدمی تھے۔ بیٹے نے شعور کی آنکھ کھولی، تو وہ انہیں مولانا غلام حسن کے پاس لے گئے۔ پھر وہ شہر کے نامور عالم مولانا سید میر حسن کی شاگردی میں آگئے۔ اردو، فارسی اور عربی پڑھی۔ سید میر حسن اسکاچ مشن اسکول میں پڑھاتے تھے، اُنہوں نے اقبال کا وہاں داخلہ کروادیا۔

سولہ برس کی عمر میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اسکاچ



مشن اسکول ہی سے انٹرمیڈیٹ کا مرحلہ طے کیا۔ شاعری کا باقاعدہ آغاز تب ہی ہوا۔ جلد ہی شعر گوئی روح کا تقاضا بن گئی۔ اس وقت داغ کا ڈنکا بجا کرتا تھا۔ ان کی شاگردی اختیار کرنے کی خواہش تھی، مگر اصلاح کا سلسلہ مختصر رہا۔

گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجویشن کرنے کے بعد 1899ء میں فلسفے کے مضمون میں ایم اے کیا۔ اسی زمانے میں پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ کی سرپرستی میسر آئی۔ شاعری کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ حکیم امین الدین کے مکان پر ہونے والی محفل میں جو سکہ بند اساتذہ نے اُنہیں سنا، تو خوب داد دی۔ وہیں سے شہرت کا آغاز ہوا۔ انجمن حمایتِ اسلام سے تعلق پیدا ہوا جو آخر تک قائم رہا۔ اقبال انجمن حمایت اسلام کے اعزازی صدر بھی رہے۔

مدرس کی حیثیت سے چار برس اورینٹل کالج سے وابستہ رہے۔ ترجمے کا سلسلہ شروع ہوا۔ پھر گورنمنٹ کالج میں انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر ہوگئے۔ 1905ء میں یورپ کا رخ کیا۔ کیمبرج یونیورسٹی ٹرنٹی کالج میں داخلہ لے لیا۔ بیرسٹری کے لیے لنکنز ان کا رخ کیا۔ میونخ یونیورسٹی سے فلسفے میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ "ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقاء" کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھا۔ جب وہ کتابی شکل میں شائع ہوا تو انتساب ان کے استاد آرنلڈ کے نام تھا۔ اس زمانے میں یورپ کی کئی علمی و ادبی شخصیات سے تعلق پیدا ہوا۔ انہوں نے عالمی تناظر میں امتِ مسلمہ کے عروج کی بازیافت کے لیے ایک وسیع دائرے میں سوچنا شروع کیا۔

مئی 1908ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی برٹش کمیٹی کی مجلسِ عاملہ کا رکن نامزد کیا گیا۔ وطن لوٹ کر وکالت کا پیشہ اپنایا۔ البتہ تدریس سے بھی جڑے رہے۔ اس زمانے میں مسلمان سیاسی طور پر اتنے متحرک نہیں تھے مگر تقسیم بنگال کی منسوخی کے جھٹکے نے مسلم قائدین کی آنکھیں کھول دیں۔ مولانا شبلی نے تقسیم بنگال کی تنسیخ مسلمانوں کے چہرے پر تھپڑ مارنے کے مترادف ٹھہرایا تھا۔

مسلم قومیت کا اصول اقبال کے سامنے واضح ہو رہا تھا۔
تقسیم بنگال کی منسوخی کے بعد موچی دروازہ لاہور میں مسلمانوں نے ایک احتجاجی جلسہ منعقد کیا جس میں اقبال بھی شریک ہوئے۔ آہستہ آہستہ مسلمانوں میں بیداری کے آثار پیدا ہونے لگے۔ آنے والے برسوں میں جلیانوالہ باغ اور خلافت کانفرنس کی تشکیل جیسے واقعات ہوئے۔ اپریل 1922ء میں انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے میں اقبال نے اپنی طویل نظم ''خضرِ راہ'' سنائی، جسے ایک شاہ کار کا درجہ حاصل ہے۔ 1923ء میں انہیں سر کا خطاب ملا مگر حکومت انگلشیہ کا یہ اعزاز کسی بھی سطح پر آزادئ اظہار میں رکاوٹ نہیں بنا۔

مسلم لیگ پنجاب کے سیکریٹری بننے کے بعد انہوں نے صحیح معنوں میں عملی سیاست میں قدم رکھا۔ عالمی مسائل پر ان کے تجزیے اور آراء کی اہمیت بڑھنے لگی۔ ان کے پیغام کو برصغیر کے مسلمان اہمیت دینے لگے۔ الٰہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں وہ تاریخی خطبہ دیا جو خطبۂ الٰہ آباد کے نام سے مشہور ہوا۔ پہلی مرتبہ ہندوستان کے اندر ایک آزاد مسلم ریاست کا ٹھوس خاکہ پیش کیا گیا۔ انتقال سے قبل وہ مسلم لیگ، پنجاب کے صدر رہے۔

وہ دوسری گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے مگر بددل ہو کر علیحدہ ہو گئے۔ تیسری گول میز کانفرنس میں بھی لگ بھگ یہی صورتِ حال رہی۔ اقبال ہی کی کوششوں کے طفیل قائداعظم ہندوستان لوٹے اور مسلم لیگ کے تن مردہ میں جان پڑی۔

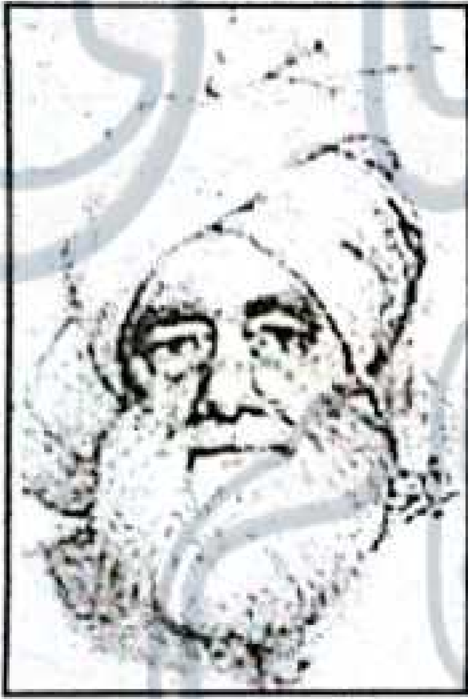
ان کی شاعری زندہ شاعری ہے جو برصغیر کے مسلمانوں کے لیے مشعل راہ بنی۔ انہوں نے نئی نسل میں انقلابی روح پھونکی۔ ان کی کئی کتب کے انگریزی، جرمنی، فرانسیسی، چینی، جاپانی اور دوسری زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ علامہ اقبال مولانا رومی کو اپنا روحانی استاد مانتے تھے اور انہیں پیرِ رومی کے نام سے یاد کرتے تھے۔

انہیں پاکستان میں قومی شاعر کا درجہ حاصل ہے۔ ان کے فارسی کلام نے ایران پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔

☆سید سلیمان ندوی

برصغیر کی کلیدی علمی و ادبی شخصیات کی فہرست مرتب کرنے والے کے لیے سید سلیمان ندوی کو نظرانداز کرنا لگ بھگ ناممکن ہے۔ وہ اردو زبان کے نامور و معتبر سیرت نگاروں میں سے ایک ہیں۔ جید عالم، سنجیدہ مؤرخ۔ کتنی ہی قابلِ قدر کتب ان کے قلم سے نکلیں جنہوں نے جویانِ علم کے سینوں کو علم کی روشنی سے منور کیا۔ کتنی ہی شخصیات نے ان سے اکتساب فیض کیا۔ جب ان کے استاد علامہ شبلی نعمانی سیرت النبی کی پہلی دو جلدیں لکھ کر 18 نومبر 1914ء کو انتقال کر گیے، تو باقی چار جلدیں سید سلیمان ندوی نے مکمل کیں۔ اپنے شفیق استاد کی وصیت پر دارالمصنفین، اعظم گڑھ قائم کیا اور ایک ماہنامہ معارف جاری کیا۔

سید سلیمان ندوی صوبہ بہار کے ضلع پٹنہ کے قصبے دیسنہ میں 22 نومبر 1884ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم سید ابوالحسن علاقے کی جانی مانی ہستی تھے۔ رجحان ان کا تصوف کی جانب تھا۔ اوائل میں خلیفہ انور علی اور مولوی مقصود علی کے شاگرد رہے۔ اپنے بڑے بھائی حکیم سید ابو حبیب سے بھی اکتساب فیض کیا۔



1899ء میں قصبہ بہار شریف ضلع نالندہ پٹنہ پھر پھلواری شریف ضلع پٹنہ کا رخ کیا۔ مؤرخین کے مطابق وہاں وہ خانقاہ مجیبیہ کے مولانا محی الدین اور شاہ سلیمان پھلواری کے زیرِ سایہ رہے۔ طبیعت نے حصول علم پر مزید اکسایا، تو دربھنگہ (بہار) چلے گئے۔ ادھر مدرسہ امدادیہ میں بھی کچھ ماہ گزرے۔

1901ء میں دارالعلوم ندوہ، لکھنؤ کا حصہ بنے۔ ادھر آٹھ برس بیتے۔ 1913ء میں وہ دکن کالج میں معلم ہو گئے۔ 1940ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی سند عطا کی۔

تقسیم ہند کے بعد جون 1950ء میں ساری املاک ہندوستان میں چھوڑ کر پاکستان آ گئے اور کراچی میں سکونت اختیار کی۔ یہاں علمی مشاغل جاری رکھے۔ حکومتِ پاکستان کی طرف سے تعلیمات اسلامی بورڈ کے صدر مقرر ہوئے۔

کراچی ہی میں 69 برس کی عمر میں 22 نومبر 1953ء کو اس جید عالم کا انتقال ہوا۔

ان کی کتب عرب و ہند کے تعلقات، حیات شبلی، رحمت عالم، حیات امام مالک، یادِ رفتگاں، خطبات مدارس اور ارض

القرآن آج بھی بڑے ذوق وشوق اور توجہ سے پڑھی جاتی ہیں۔

☆ مشتاق محمد

پاکستانی کرکٹ پر سب سے زیادہ اثرات محمد برادران نے مرتب کیے، اس کا سبب سفارش یا سیاست نہیں۔ محمد برادران کے لیے کرکٹ عشق کا معاملہ رہا۔ یہ کھیل ان کے خون میں تھا۔ سابق ٹیسٹ کپتان مشتاق محمد کا تعلق اسی خاندان سے تھا۔ کچھ تجزیہ کار انہیں پاکستان کا پہلا آل راؤنڈر قرار دیتے ہیں۔ وہ سیدھے ہاتھ کے بلے باز اور لیگ اسپنر تھے۔ مشتاق محمد پاکستان کے اکلوتے کھلاڑی ہیں جس نے ٹیسٹ میچ میں سنچری کرنے اور پانچ وکٹیں لینے کا کارنامہ دو بار انجام دیا۔ انہیں ریورس سوئپ کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔ 1959ء سے 1979ء کے دوران انہوں نے 57 ٹیسٹ میچز میں 3643 رنز اسکور کیے اور 79 وکٹیں لیں۔ دس ون ڈے میچز بھی کھیلے۔



وہ 22 نومبر 1943ء کو صوبہ گجرات (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ تعلق ایک متمول گھرانے سے تھا، جو اسپورٹس میں خصوصی دلچسپی رکھتا تھا۔ تقسیم کے بعد یہ خاندان کراچی آ گیا۔ یہاں وہ چرچ مشن اسکول میں زیر تعلیم رہے۔

تیرہ برس کی عمر میں انہوں نے فرسٹ کلاس کیریر کا آغاز کیا اور پہلے ہی میچ سے اپنی آمد کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے کراچی اور اور پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز کی نمائندگی کی۔ عمدہ کارکردگی انہیں کاؤنٹی کرکٹ میں لے گئی، جہاں ان کی صلاحیتیں اپنے جوبن پر نظر آئیں۔ ادھر انہوں نے کئی ریکارڈز بنائے۔ وہ پہلے پاکستانی کھلاڑی ہیں، جس نے اپنے فرسٹ کلاس کیریر میں پچیس ہزار رنز اسکور کیے۔

اگر ٹیسٹ کرکٹ کی بات کی جائے، تو انہوں نے ویسٹ انڈیز کے خلاف مارچ 1959ء میں اپنے کیریر کا آغاز کیا۔ اس سے قبل ان کے بھائی وزیر محمد اور حنیف محمد ٹیسٹ کیپ حاصل کر چکے تھے۔ اس وقت مشتاق محمد کی عمر فقط پندرہ برس تھی۔ وہ اپنے زمانے کے کم عمر ترین کھلاڑی تھے۔ فیروز شاہ میں انہوں نے انڈیا کے خلاف شان دار سنچری جڑی۔ وہ سنچری اسکور کرنے والے کم عمر ترین کرکٹر قرار پائے۔ یہ ریکارڈ 40 سال نا قابلِ شکست رہا۔

انہوں نے 19 میچز میں پاکستان کی کپتانی کی۔ 79-1978ء میں جب انڈیا اور پاکستان ایک طویل وقفے کے بعد مدمقابل آئے، تو مشتاق محمد ہی کپتان تھے۔ وہ ٹیسٹ سیریز دو۔ صفر سے پاکستان کے نام رہی۔ 1999ء میں جس ٹیم نے ورلڈ کپ کے فائنل تک رسائی حاصل کی، مشتاق محمد اس کے کوچ تھے۔ انہیں ایک نفیس شخص، مگر انتہائی خطرناک کھلاڑی کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔

☆ فیض احمد فیض

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

اردو شاعری کا ایک عہد غالب سے منسوب، تو دوسرا اقبال سے۔ اقبال کے بعد جوش اور راشد سمیت کتنے ہی بڑے شاعر گزرے، مگر جس نے نسلوں کو متاثر کیا، وہ 13 فروری 1911ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہونے والے فیض احمد فیض ہی تھے، جن کے اشعار زبان زد خاص وعام ہوئے، گیتوں میں ڈھل گئے، مظلوم کی پکار بن گئے۔ کچھ ناقدین کے مطابق اس عظمت کی ایک وجہ ان کی سیاسی جدوجہد اور جیل یاترا بھی تھی۔ وہ پکے کمیونسٹ تھے۔ کمیونسٹ پارٹی کے اہم اور فعال ترین رکن۔ یہ ان کے اشعار ہی تھے جو ترقی پسندوں کا منشور ٹھہرے۔ ان کی کلیات "نسخہ ہائے وفا" کا شمار اردو میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتب میں ہوتا ہے۔ اقبال بانو کی ملک گیر شہرت میں کچھ کمال فیض کی شاعری کا بھی ہے۔ "ہم دیکھیں گے" کا طلسماتی اثر درحقیقت فیض ہی کے لحن کی دین تھا۔



فیض نے ایک علمی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد ایک علم دوست آدمی تھے۔ ابتدائی تعلیم مولوی محمد ابراہیم

میر سیالکوٹی سے حاصل کی۔ 1921ء میں انہوں اسکاچ مشن اسکول سیالکوٹ میں داخلہ لیا۔ میٹرک وہیں سے کیا۔ اسکول ہی کے زمانے میں فارسی اور عربی سیکھی۔ ایف اے کا مرحلہ مرے کالج سیالکوٹ سے طے ہوا۔ میر مولوی شمس الحق بھی ان کے اساتذہ میں شامل تھے جو مؤرخین کے مطابق شاعرِ مشرق کے بھی استاد رہے۔

انگریزی میں ماسٹرز کا مرحلہ گورنمنٹ کالج لاہور سے طے کیا۔ اورینٹل کالج لاہور سے عربی میں ایم اے کیا۔ اوائل میں تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ ایم اے او کالج امرتسر میں لیکچرر رہے۔ لاہور کے ایک کالج میں ذمے داری نبھائی۔ 1942 میں فوج میں کیپٹن ہوگئے۔ محکمۂ تعلقات عامہ میں کام کیا۔ 1943ء میں میجر اور 1944ء میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی پائی۔ 1947ء میں فوج سے مستعفی ہوکر واپس لاہور آگئے۔ 1959ء میں پاکستان آرٹس کونسل میں سیکریٹری تعینات ہوئے، تین برس وہاں گزارے۔ 1964ء میں لندن سے واپسی پر آپ عبداللہ ہارون کالج کراچی میں پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1947ء تا 1958ء وہ مدیر ادب لطیف اور مدیر لوٹس رہے۔

ان پر کئی مقدمے بنے۔ نمایاں ترین ''راولپنڈی سازش کیس'' ٹھہرا۔ 9 مارچ 1951ء کو انہیں اس سازش میں معاونت کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا۔ چار سال سرگودھا، ساہیوال، حیدر آباد اور کراچی کے جیلوں میں گزارے۔ اپریل 1955ء میں رہائی نصیب ہوئی۔ ان کے مجموعے زنداں نامہ کی بیشتر نظمیں اُسی عرصہ میں لکھی گئیں۔

انہوں نے سماجی مسائل کو مختلف احساسات سے جوڑتے ہوئے یادگار رومانوی گیتوں کا حصہ بنا دیا۔ ترقی پسند تحریک کے مخالف حلقوں کے لیے بھی وہ قابلِ احترام ٹھہرے۔ ان کے استعارے، الفاظ اور شاعرانہ تلازمے آج بھی اپنی تازگی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے مجموعے نقشِ فریادی، دست صبا، زنداں نامہ، دست تہ سنگ، سر وادی سینا، شام شہر یاراں، مرے دل مرے مسافر، کے زیرِ عنوان منظر عام پر آئے۔ انہیں بین الاقوامی شہرت ملی۔ لینن ایوارڈ سمیت کئی اہم اعزازات سے نوازے گئے۔ مغرب میں انہیں ''نیرودا آف اردو پوئٹری'' کہا جاتا تھا۔ تجزیہ کاروں کے مطابق پابلو نیرودا اور فیض کو لگ بھگ یکساں حالات کا سامنا رہا۔

1930ء میں ایلس فیض سے شادی ہوئی۔ ان کی بیگم بھی اہم سماجی شخصیت تھیں۔ 20 نومبر 1984ء کو ان کا لاہور میں انتقال ہوا۔

☆ چوہدری رحمت علی

چودھری رحمت علی کو تحریک پاکستان کا خاموش سپاہی کہا جاسکتا ہے۔ ان کے حالاتِ زندگی میں واقعات اور تاریخوں سے متعلق مؤرخین میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے، کچھ لوگ اس پر متفق ہیں کہ سب سے پہلے انہوں نے لفظ پاکستان استعمال کیا۔

وہ 16 نومبر 1897ء کو مشرقی پنجاب کے ضلع ہوشیار پور کے ایک زمین دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اینگلو سنسکرت ہائی اسکول جالندھر سے میٹرک کیا۔ 1914ء میں مزید تعلیم کے لیے لاہور کا رخ کیا۔ وہ اسلامیہ کالج لاہور میں زیرِ تعلیم رہے۔

مولانا شبلی سے بہت متاثر تھے۔ 1915ء میں اسلامیہ کالج ہی میں بزم شبلی کی بنیاد رکھی۔ کچھ محققین کے مطابق اسی پلیٹ فورم سے انہوں نے پہلے پہل (1915ء میں) ہندوستان کی تقسیم کا نظریہ پیش کیا۔ 1918ء میں گریجویشن کرنے کے بعد اخبار کشمیر گزٹ میں اسسٹنٹ ایڈیٹر ہوگئے۔



1928ء میں ایچی سن کالج میں اتالیق مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد برطانیہ کا رخ کیا۔ کیمبرج اور ڈبلن یونیورسٹیوں سے قانون اور سیاست میں اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں۔

1933ء میں انہوں نے برصغیر کے طلبا پر مشتمل ایک تنظیم قائم کی۔ اسی سال دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر اپنا مشہور کتابچہ Now or Never (اب یا کبھی نہیں) شائع کیا، جس میں لفظ پاکستان استعمال کیا گیا۔ انہوں نے پاکستان، بنگلستان اور عثمانستان کے نام سے تین ممالک کا نقشہ پیش کیا۔ ان کے پیش کردہ نقشے میں کشمیر، پنجاب، سرحد، بلوچستان اور سندھ کے ساتھ دہلی بھی پاکستان ہی کا حصہ تھا۔ ریاست دکن کو عثمانستان کا نام دیا گیا۔ 1935ء میں انہوں نے کیمبرج سے جو ہفت روزہ نکالا، اس کا

نام پاکستان ہی تھا۔

وہ 23 مارچ کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں شرکت کرنا چاہتے تھے لیکن چند روز قبل ہونے والے پُرتشدد واقعات کی وجہ سے ان کے پنجاب میں داخلے پر پابندی عائد کردی گئی۔ 1947ء میں انہوں نے اقوام متحدہ میں کشمیر پر اپنا مؤقف پیش کیا۔ 6 اپریل 1948ء کو پاکستان آئے تھے مگر پاکستانی بیوروکریسی ان کی راہ میں رکاوٹ بن گئی۔

29 جنوری 1951ء کو ان پر نمونیے کا حملہ ہوا۔ 3 فروری 1951ء کو برطانیہ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ انہیں کیمبرج کے قبرستان میں امانتاً دفن کیا گیا۔ مختلف اوقات میں ان کے جسد خاکی کو پاکستان لانے کے اعلانات کیے گئے مگر وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہوجائے۔ (لفظ پاکستان کا خالق کون، اس سلسلے میں اگست 2015 کا سرگزشت ملاحظہ کریں)

☆ احمد ندیم قاسمی

اردو فکشن میں جو مقام کرشن، منٹو اور بیدی کو ملا، وہی ان کے حصے میں آیا۔ پنجاب کی دیہی زندگی کو یوں منظر کیا کہ لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔ کتب کی تعداد پچاس سے زائد ہے۔ شاعری مجموعوں کی تعداد آٹھ ہے۔ تنقید کے ساتھ بچوں کے لیے بھی جم کر لکھا۔ ادبی جرائد کے ذریعے فروغ ادب میں بھی کلیدی کردار ادا کیا۔ پکے ترقی پسند تھے۔ نظریات کے باعث زیر عتاب آئے۔

ہمہ جہت انسان تھے۔ 20 نومبر 1916ء کو ضلع خوشاب کے ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اصل نام احمد شاہ تھا۔ ندیم تخلص کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں سے حاصل کی۔ 1923ء میں والد کے انتقال کے بعد اپنے چچا کے پاس کیمبل پور چلے گئے۔ وہاں علمی اور ادبی ماحول میسر آیا۔ مطالعے کی لت پڑی۔ 1930ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول شیخو پورہ سے میٹرک کیا۔ 1935ء صادق ایجرٹن کالج بہاولپور سے گریجویشن کیا۔

1936ء میں ریفارمز کمشنر لاہور کے دفتر میں محرر ہوگئے۔ کچھ برس ایکسائز سب انسپکٹر کے طور پر بھی کام کیا۔ شاعری کی ابتدا 1931ء میں کی۔ مولانا محمد علی جوہر کے انتقال پر نظم کہی جو "سیاست" لاہور کے سرورق پر شائع ہوئی۔ آنے والے برسوں میں کئی نظمیں روزنامہ "انقلاب" اور "زمیندار" میں چھپیں، جنہوں نے انہیں غیر معمولی شہرت بخشی۔

عملی زندگی میں کتنے ہی مسائل کا سامنا کیا۔ بالخصوص لاہور کے ابتدائی ایام خاصے دشوار تھے۔ لاہور میں ممتاز شاعر اختر شیرانی کی صحبت میسر آئی۔ یہ تعلق اختر شیرانی کے آخری برسوں تک رہا۔

وہ امتیاز علی تاج کے رسالے "پھول" کے مدیر رہے۔



اس زمانے میں بچوں کے لیے نظمیں لکھیں، جو بہت پسند کی گئیں۔ "تہذیب نسواں" کی ادارت سنبھالی۔ ادب لطیف کے ایڈیٹر رہے۔ تقسیم کے بعد ڈیڑھ سال ریڈیو پشاور میں ملازم رہے۔

آنے والے برسوں میں جہاں سویرا، سحر اور فنون جیسے ادبی جرائد کی ادارت سنبھالی وہیں اخبارات، بالخصوص روزنامہ امروز سے بھی طویل وابستگی رہی۔ فنون مدتوں ان کی ادارت میں نکلتا رہا، جس نے دو نسلوں کے ادبی ذوق کی آب یاری کی۔

یوں تو کئی اصناف میں طبع آزمائی کی۔ شاعری بھی مقبول ہوئی، مگر اصل شہرت فکشن کو ملی۔ ان کے افسانوں میں زمین اور انسانوں سے ان کی محبت کھل کر سامنے آتی ہے۔ ان کا تخیل پنجاب کی فضاؤں میں چپے چپے سے روشناس تھا۔

پہلا افسانوی مجموعہ "چوپال" 1939ء میں شائع ہوا۔ مسلسل لکھتے رہے۔ 1995ء میں شائع ہونے والا "کوہ پیما" آخری مجموعہ تھا۔ 1936ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے بعد قاسمی صاحب اس سے وابستہ ہوگئے۔ انجمن کے سیکریٹری بھی رہے، لیکن آگے چل کر اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ انہیں تین آدم جی ایوارڈ ملے۔ 1968ء میں پرائڈ آف پرفارمنس ان کے حصے میں آیا۔

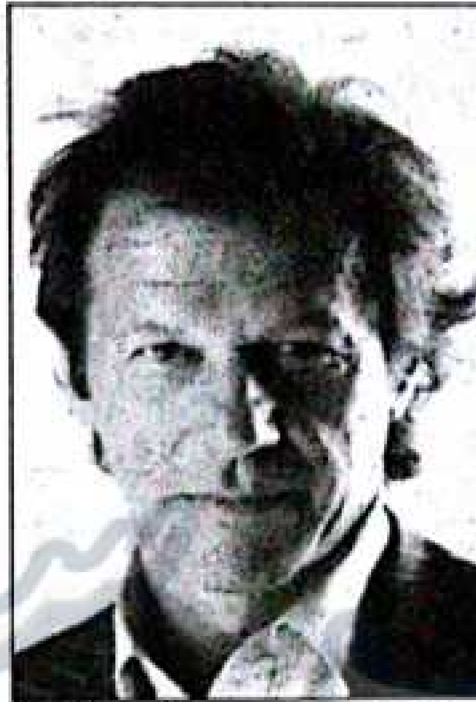
10 جولائی 2006ء کو مختصر علالت کے بعد حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کرگئے۔ ان کی عمر 90 برس تھی۔

☆ عمران خان

پاکستان کی حالیہ تاریخ میں شاید ہی عمران خان جیسی اثر انگیز شخصیت گزری ہو۔ پہلے کرکٹر کی حیثیت سے پاکستان کو ورلڈ کپ جتایا، فلاحی سرگرمیاں شروع کیں تو شوکت خانم جیسا

اسپتال بنا ڈالا۔ سیاست میں قدم رکھ کر ایک ایسی جماعت کی بنیاد ڈالی جسے آج ملک میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

عمران خان 25 نومبر 1952ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ تعلق پشتونوں کے مشہور قبیلے نیازی سے ہے۔ والدین کی اکلوتی نرینہ اولاد ہیں۔ ابتدائی تعلیم کیتھیڈرل اسکول اور



ایچیسن کالج، لاہور سے حاصل کی۔ پھر برطانیہ کا رخ کیا۔ وہاں رائل گرائمر اسکول اور اوکسفرڈ یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم رہے۔ اوکسفرڈ یونیورسٹی کرکٹ ٹیم کے کپتان بھی رہے۔

فرسٹ کلاس کرکٹ کا آغاز 1969ء-1970ء میں لاہور کی طرف سے سرگودھا کے خلاف کھیلتے ہوئے کیا۔ 1971ء میں انگلینڈ کے خلاف ٹیسٹ ڈیبیو کیا۔ انہوں نے 88 ٹیسٹ میچ کھیل کر 362 وکٹیں حاصل کیں۔ 1981ء میں لاہور میں سری لنکا کے خلاف ایک اننگز میں 8 کھلاڑی آؤٹ کرنا بہترین کارکردگی رہی۔ 23 مرتبہ ایک اننگز میں 5 وکٹیں حاصل کیں۔ بہترین آل راؤنڈر تھے۔ ٹیسٹ کیریر میں 36.69 کی اوسط سے 3807 رنز بنائے، جن میں سے پانچ سنچریاں بھی شامل ہیں۔

ان کا شمار پاکستان کرکٹ کے کامیاب ترین کپتانوں میں ہوتا ہے۔ پہلے کپتان تھے، جن کی قیادت میں پاکستانی ٹیم نے بھارت اور انگلینڈ کو ان کے ہوم گراؤنڈ پر ہرایا۔ 48 ٹیسٹ میچز میں کپتانی کی۔ 14 میں فتح حاصل کی۔

انہوں نے 175 ون ڈے مقابلوں میں 182 وکٹیں حاصل کیں اور 3709 رنز اسکور کیے۔ 139 میچز میں قیادت کی، جن میں سے 77 میں فتح حاصل کی۔ انہوں نے پانچ عالمی مقابلوں میں حصہ لیا۔ 1992ء میں وہ اپنے اوج پر نظر آئے۔ ان ہی کی قیادت میں پاکستان نے ورلڈ کپ جیتا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد سماجی خدمت کے شعبے میں قدم رکھا۔ اپنی والدہ سے موسوم شوکت خانم میموریل اسپتال بنایا جسے کچھ تجربہ کار ایشیا میں سب سے بڑا کینسر اسپتال کہتے ہیں۔ انہیں حکومتِ پاکستان کی جانب سے صدارتی ایوارڈ، انسانی حقوق کا ایشیا ایوارڈ اور ہلال امتیاز جیسے اعزازات سے نوازا گیا۔

25 اپریل 1996ء کو تحریک انصاف قائم کر کے سیاسی میدان میں قدم رکھا۔ ابتدا میں انہیں ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ ایک وقت پر لگتا تھا جیسے تحریک انصاف بکھر جائے گی، کئی اتار چڑھاؤ آئے۔ ایک زمانے میں وہ مشرف کے نزدیک تصور کیے جاتے تھے مگر 3 نومبر 2007ء کو ایمرجنسی کے بعد وہ زیرِ عتاب آئے۔ دہشت گردی ایکٹ کے تحت ان کے خلاف مقدمہ بنا۔ ان کی اصول پسندی اور صاف گوئی نے 2013ء کے انتخابات سے قبل انہیں ایک بڑی قوت بنا دیا۔ پی ٹی آئی ابھر کر سامنے آئی۔ ملک کے نوجوانوں کو اس نے ایک پلیٹ فورم پر اکٹھا کر دیا۔

واضح رہے کہ انتخابی مہم کے دوران 7 مئی 2013ء کو فورک لفٹ سے گرنے کے بعد عمران خان شدید زخمی ہو گئے تھے، اس سانحے کی وجہ سے پاکستان تحریک انصاف کے جلسے منسوخ کر دیے گئے۔ الیکشن کے بعد انہوں نے حکومتی جماعت پر دھاندلی کے الزامات لگائے جن کی بنیاد پر چار مہینے پر مشتمل دھرنا دیا گیا۔ یہ دھرنا سانحہ پشاور کے بعد ختم کیا گیا۔

وہ انتہائی جاذب نظر نوجوان تھے پھر مقبول بھی تو کئی اسکینڈلز بنے۔ ان کا نام کئی خواتین کے ساتھ لیا گیا۔ طرح طرح کے الزامات لگے۔ 1995ء میں یہ تمام قصے تمام ہوئے، جب انہوں نے برطانوی ارب پتی جیمز گولڈ اسمتھ کی بیٹی سے شادی کی، جو اسلام قبول کرنے کے بعد جمائما خان ہو گئیں۔ شادی کی یہ تقریب عالمی میڈیا کی توجہ کا مرکز بنی۔ جون 2004ء میں ان میں طلاق ہو گئی۔ 8 جنوری 2015ء کو عمران خان نے ریحام خان سے شادی کر لی۔

عمران خان کی شخصیت ڈاکومنٹریز اور فلموں کا موضوع بنی۔ ان کی لکھی کتب بیسٹ سیلر ثابت ہوئیں۔

☆ اسکندر مرزا

کس قدر عجیب معاملہ ہے، پاکستان کے پہلے صدر بننے والے شخص کو آج یوں یاد کیا جاتا ہے کہ وہ میر جعفر کے پڑپوتے تھے۔ وہی میر جعفر جنہوں نے نواب سراج الدولہ سے غداری کر کے انگریزوں کی جیت کا راستہ ہموار کیا۔ شاید اس تاثر کا سبب یہ ہو کہ اسکندر مرزا نے ملک کو آمریت کی طرف دھکیلنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ مگر آمریت انہیں بھی راس نہ آئی۔ ان کے قریب سمجھے جانے والوں ہی نے انہیں چلتا کیا۔ کچھ حلقوں کے مطابق اسکندر مرزا کے منفی تاثر کو قوی



کرنے میں ان ہی لوگوں کا ہاتھ ہے جنہوں نے انہیں معزول کر کے خود اقتدار سنبھال لیا۔ ہمارے ہاں یہی ریت ہے، آنے والے کو کاندھے پر بٹھایا جاتا ہے، جانے والے کو صلواتیں سنائی جاتی ہیں۔

وہ 13 نومبر 1899ء کو بنگال کے علاقے مرشد آباد میں پیدا ہوئے۔ وہ الفنسٹن کالج بمبئی میں زیرِ تعلیم رہے۔ پھر برطانیہ کا رخ کیا اور رائل ملٹری کالج سینڈ ہرسٹ میں داخلہ لے لیا۔ 1919ء میں ہندوستان لوٹ آئے۔ 1921ء میں کوہاٹ کے مقام پر دوسری اسکاٹش رائفل رجمنٹ میں شریک ہوئے اور خداداد خیل کی لڑائی میں حصہ لیا۔ 1924ء میں وزیرستان کی لڑائی میں شریک ہوئے۔ 1922ء سے 1924ء تک وہ پونا ہارس رجمنٹ میں رہے۔

صلاحیتوں کے بل بوتے پر انہوں نے تیزی سے ترقی کی۔ 1926ء اسکندر مرزا انڈین پولیٹیکل سروس کے لیے منتخب ہوئے۔ انہوں نے ایبٹ آباد، بنوں، نوشہرہ اور ٹانک میں بطور اسسٹنٹ کمشنر کام کیا۔ 1931ء تا 1936ء ہزارہ اور مردان میں ڈپٹی کمشنر رہے۔ 1938ء میں وہ خیبر میں پولیٹیکل ایجنٹ مامور ہوئے۔ انتظامی قابلیت اور قبائلی امور میں تجربے کے باعث 1940ء میں پشاور کے ڈپٹی کمشنر مقرر ہوئے۔ پانچ برس اس عہدے پر رہے۔ پھر تبادلہ اڑیسہ کر دیا گیا۔

تقسیم سے قبل وہ حکومت ہند کی وزارتِ دفاع میں کچھ وقت گزار چکے تھے، اسی تجربے کے پیشِ نظر قیامِ پاکستان کے بعد حکومت نے انہیں پاکستان کی وزارتِ دفاع کا پہلا سیکریٹری نامزد کیا۔ 1954ء میں مشرقی پاکستان کا گورنر بنایا جانا ایک بڑی کامیابی تھی۔ وزیرِ داخلہ جیسا اہم قلم دان ان کے پاس رہا۔ ریاستوں اور قبائلی علاقوں کے محکمے بھی ان کے سپرد کیے گئے۔

قسمت کی دیوی نے مہربانیاں نچھاور کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ملک غلام محمد کی گرتی صحت کے باعث وہ 6 اگست 1955ء کو قائم مقام گورنر بن گئے۔ اس زمانے میں بیوروکریسی میں سازشیں عروج پر تھیں۔ 5 مارچ 1956ء کو پاکستان کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ سیاسی بحران کی وجہ سے 1958ء میں ملک میں پہلا مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ تجزیہ کار اس کا ذمے دار اسکندر مرزا کو ٹھہراتے ہیں، جن کی پالیسیوں نے ایوب خان کی طاقت میں اضافہ کیا۔ وہ ملک چھوڑ کر اپنی بیگم کے ہمراہ لندن چلے گئے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ انہیں جلا وطن کر دیا گیا۔ وہاں وہ ایک ہوٹل میں ملازمت کرتے رہے۔ 13 نومبر 1969ء کو وفات پائی۔ (ان کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات یکساں ہے) وصیت کے مطابق ایران کے شہر مشہد مقدس میں دفن ہوئے۔

☆ وحید مراد



یوں تو پاکستان کی فلمی صنعت میں کتنے ہی ستارے گزرے، مگر پہلا سپر اسٹار کہلانے کا حق فقط وحید مراد کو حاصل ہے، جن کی شہرت پاکستان سے نکل کر پورے جنوبی ایشیا میں پھیل گئی۔ وحید مراد نے لاکھوں افراد کو گرویدہ بنا لیا۔ وہ رول ماڈل تھے۔

اس چاکلیٹی ہیرو کی کہانی کا پریشان کن پہلو یہ ہے کہ بے پناہ شہرت اور کامیابی کے باوجود اس کا انجام کرب ناک ہوا۔ کچھ لوگوں نے ان کی موت کو خودکشی قرار دیا تو کچھ نے قتل۔ وجہ جو بھی رہی ہو، اختلافات اور گروہ بندیوں نے ایک ایسا ستارہ چھین لیا، جس کی چمک ابھی ماند نہیں پڑی تھی۔ انہوں نے فقط دو درجن فلمیں کیں، مگر عزت وہ ملی، جو شاید دو سو فلمیں کرنے والوں کو بھی نہ ملی ہو۔

وحید مراد 2 اکتوبر 1938ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ وہ فلم ڈسٹری بیوٹر نثار مراد کے بیٹے تھے۔ کراچی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ایس ایم آرٹس سے گریجویشن کیا، کراچی یونیورسٹی سے انگریزی میں ماسٹرز کیا۔ کیریر کا آغاز بطور پروڈیوسر کیا تھا۔ "انسان بدلتا ہے" پہلی فلم تھی۔ دوستوں کے اصرار پر "اولاد" سے فنی سفر کا آغاز کیا۔ "ہیرا اور پتھر" میں پہلی بار بطور ہیرو نظر آئے۔ فلم "ارمان" کو پاکستانی انڈسٹری میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ان ہی کی پروڈکشن

میں تیار ہوئی۔ اس نے باکس آفس کے تمام ریکارڈ توڑ ڈالے۔ اس کے گیت آج بھی فلمی شائقین میں بے حد مقبول ہیں۔

انہیں ہیرا اور پتھر، ارمان، عندلیب اور مستانہ ماہی پر نگار ایوارڈ ملا، ان کی فلم ''دیور بھابی'' کو بھی شاہکار کا درجہ حاصل ہے۔ 60 کی دہائی کے آخر میں ان کی پروڈکشن کمپنی تنازعات کا شکار ہوگئی۔ پرویز ملک الگ ہوگئے۔ مخالف لابی سازشوں کے جال بننے لگی۔ ممتاز اداکاراؤں کے شوہر حضرات نے، جن میں کچھ تو اداکار تھے اور کچھ ہدایت کار، انہیں وحید کے ساتھ کام کرنے سے منع کر دیا۔ ایک جانب چوٹی کی اداکارائیں دور ہوگئیں، دوسری جانب کچھ ہدایت کار جان بوجھ کر انہیں کمزور کرداروں کی پیش کش کرنے لگے۔ ان کی شہرت دھندلائی اور ندیم کا ستارہ چمکا۔ 80ء میں ان کا ایکسیڈنٹ ہوگیا، جس کے بعد اس خوددار شخص کو مایوسیوں نے گھیر لیا۔ وحید مراد 23 نومبر 1983ء کی صبح انتقال کر گئے۔

''ہیرو'' ان کی آخری فلم تھی، جو 1985ء میں ریلیز ہوئی۔ موت کے بعد انہیں ستارۂ امتیاز سے نوازا گیا۔

☆ سجاد ظہیر

سجاد ظہیر المعروف بنّے بھائی کو پاکستان میں طبقاتی جدوجہد کا استعارہ اور کمیونسٹ تحریک کا بانی کہا جاسکتا ہے۔ ان کے نظریات نے کتنوں ہی کے علمی اور فکری ذوق کی آب یاری کی۔ ادب میں بھی وہ اپنی مثال آپ تھے۔

وہ 5 نومبر 1905ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سر وزیر خان ریاست اودھ کے چیف جسٹس تھے۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے تعلیم پائی، پھر آکسفورڈ کا رخ کیا۔ بیرسٹری کی۔ قانون کے ساتھ ساتھ سیاست اور ادب کے میدان میں خاصے فعال رہے۔ اس زمانے میں سرخ نظریات کا چرچا تھا۔ سوویت یونین کی صورت ایک مضبوط مرکز موجود تھا۔ انہوں نے طبقاتی جدوجہد کا راستہ چنا۔ ان کا شمار کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے بانی ارکان میں ہوتا ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین میں بھی ان کا کردار اہم رہا۔ 1932ء میں شائع ہونے والے افسانوی مجموعہ ''انگارے'' نے ہندوستان کے ادبی حلقوں میں کھلبلی مچادی۔ اوروں کے علاوہ اس میں سجاد ظہیر کے افسانے بھی شامل تھے۔

تقسیم کے بعد پارٹی کے فیصلے کے مطابق پاکستان چلے آئے۔ 1948ء میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی بنیاد رکھی۔



انہوں نے طبقاتی جدوجہد کرنے والے تمام گروہوں کو اکٹھا کیا۔ ان سرگرمیوں کے باعث حکومت انہیں خطرہ تصور کرتی تھی۔ پھر راولپنڈی سازش کیس کا واقعہ ہوا۔ فوجی افسران کے علاوہ فیض اور سجاد ظہیر بھی اس کیس میں گرفتار ہوئے۔ 1954ء میں انہیں جلاوطن کر دیا گیا۔ ملک سے دور رہتے تھے، مگر فکری محاذ سنبھالے رکھا۔ ایشیا کی کئی اہم طبقاتی تنظیموں کے بانیوں میں ان کا شمار کیا جاتا ہے۔ وہ باکمال مترجم تھے۔ شیکسپیر، ٹیگور اور خلیل جبران کی کتب کا ترجمہ کیا۔ حافظ پر بھی کام کیا۔ ناقدین ان کے فکشن کے معترف ہیں۔ ''لندن کی ایک رات'' کو اہم ناول تصور کیا جاتا ہے۔ ''پگھلا نیلم'' ان کا شعری مجموعہ تھا جسے کچھ ناقدین اردو میں نثری نظم کی ابتدائی شکل قرار دیتے ہیں۔

سجاد ظہیر نے 13 ستمبر 1973ء کو وفات پائی۔

☆ حمید گل

70 کی دہائی کے بعد جن فوجی افسران نے ملکی سیاست پر گہرے اثرات چھوڑے، ان میں ایک نام جنرل حمید گل کا بھی ہے۔ 20 نومبر 1936ء کو سرگودھا میں پیدا ہونے والے حمید گل آئی ایس آئی کے انتہائی فعال سربراہ رہے۔ وہ سوات کے یوسف زئی پشتون تھے۔ وہ مذہبی مزاج کے حامل ایک محب الوطن شخص تصور کیے جاتے ہیں، جن کی چند پالیسیوں کے نتائج توقع کے برعکس نکلے۔

تجزیہ کار انہیں جنرل ضیاالحق کے نظریاتی ورثا میں شمار کرتے ہیں۔ جب جنرل ضیا اقتدار میں آئے، اس وقت حمید گل بریگیڈیئر تھے۔ 1980ء میں انہیں ملتان میں قائم سیکنڈ اسٹرائیک کور میں آرمرڈ ڈویژن کا کمانڈر مقرر کیا گیا۔ ہیڈ کوارٹر میں ملٹری آپریشنز کے نگراں بھی رہے۔

88ء میں جب جنرل اختر عبدالرحمان کو آئی ایس آئی کی سربراہی کے بعد چیئرمین جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کمیٹی کے عہدے پر ترقی دی گئی تو جنرل حمید گل کو آئی ایس آئی کا ڈائریکٹر جنرل مقرر کیا گیا۔ یہ افغان جنگ کا آخری زمانہ

تھا۔ سوویت یونین افغانستان سے انخلا کی تیاری کر رہا تھا۔



وہ سمجھتے تھے کہ اگر امریکا کی افغانستان میں دلچسپی ختم ہوجائے، تب بھی وہ اور اُن کے ساتھی افغانستان میں پاکستان کے اسٹریٹیجک مفادات کا مناسب خیال رکھ سکتے ہیں۔ سو وہ بیک وقت کئی محاذوں پر مصروف رہے۔

17 اگست 88ء کو ضیاالحق سمیت کئی اہم افسران کی ہلاکت کے بعد غلام اسحاق خان، نئے آرمی چیف جنرل اسلم بیگ اور آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل حمید گل طاقت کا مرکز ٹھہرے۔ گیارہ برس کے انتظار کے بعد جماعتی بنیادوں پر ہونے والے پہلے انتخابات میں بے نظیر بھٹو کو محدود کرنے کے لیے ان کے مخالفین کو مضبوط کیا گیا۔ جنرل حمید گل نے متعدد بار کہا کہ نواز شریف کی قیادت میں اسلامی جمہوری اتحاد (آئی جے آئی) کی تشکیل میں ان کا کردار تھا۔ اس پولیٹیکل انجینئرنگ کے باعث مقتدرہ حلقوں پر کئی سوالات اٹھائے گئے۔

افغانستان سے سوویت یونین کے انخلا کے بعد نجیب اللہ کی حکومت قائم ہوئی۔ جنرل حمید گل اور ان کے ساتھی پاکستان سے قربت رکھنے والے گروہوں کو اقتدار میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اس ضمن میں ہونے والی کوششوں کے زیادہ مثبت نتائج نہیں نکلے۔ جنرل حمید گل سے آئی ایس آئی کا چارج لے کر انہیں ملتان کا کور کمانڈر بنادیا گیا۔ کچھ برس بعد وہ ڈائریکٹر جنرل ہیوی انڈسٹریز ٹیکسلا نامزد ہوئے مگر انہوں نے چارج سنبھالنے کی بجائے ریٹائرمنٹ لے لی۔

بعد کے برسوں میں عالمی جہاد کی حمایت کرتے نظر آئے۔ افغان مجاہدین ان کی توجہ کا محور رہے۔ وہ 9/11 کو امریکی سازش قرار دیتے تھے۔ امریکا کا ساتھ دینے پر جنرل پرویز مشرف کے مخالف تھے۔ انہوں نے عدلیہ بحالی تحریک میں حصہ لیا۔ شدت پسند مذہبی تنظیموں کے ساتھ کھڑے نظر آئے۔ بے نظیر بھٹو نے 2007ء میں خود پر ہونے والے حملے کا ذمے داری ضیاء کی باقیات کو ٹھہرایا، تو اس میں حمید گل کا نام بھی شامل تھا۔

حمید گل آخری دن تک چاق و چوبند رہے۔ 15 اگست 2015ء کو مری میں ان کا انتقال ہوا۔

☆ وقار یونس

بورے والا ایکسپریس کے نام سے معروف وقار یونس کا شمار کرکٹ کی تاریخ کے عظیم ترین فاسٹ بولرز میں ہوتا ہے۔ پاکستان کے اس سپوت نے کامیابیوں کی کتنی ہی داستانیں رقم کیں۔ نہ صرف خطرناک ترین فاسٹ بولر ٹھہرائے گئے، بلکہ کپتانی کے حق دار بھی قرار پائے۔ وہ پاکستان کے کم عمر ترین کپتان ہیں، مجموعی طور پر دنیا کے ان تین کم عمر ترین کھلاڑیوں میں شامل جنہیں کپتانی کا منصب سونپا گیا۔



87ء میں انہوں نے اپنا فرسٹ کلاس کیریر شروع کیا۔ جب قومی ٹیم کے کیمپ سے بلاوا آیا اس وقت تک فقط چھ فرسٹ کلاس میچز کھیلے تھے۔ یہ عمران خان تھے جنہوں نے اس نوجوان کی صلاحیتوں کو شناخت کیا اور انہیں کرکٹ میں لائے۔ ان کا فیصلہ درست ثابت ہوا۔ نومبر 1989ء میں انہوں نے انڈیا کے خلاف ٹیسٹ ڈیبیو کیا۔ اگلے ماہ ویسٹ انڈیز کے خلاف اپنا پہلا ون ڈے میچ کھیلا۔ سانپ کی طرح بل کھاتی گیند ان کا ہتھیار تھی۔ وہ ریورس سوئنگ کے بادشاہ تھے۔ ان کی اور وسیم اکرم کی جوڑی مخالفین بیٹنگ لائن کے پرخچے اڑا دیا کرتی تھی۔

وقار یونس نے 87 میچز میں 373 وکٹیں اپنے نام کیں۔ 22 بار اننگز میں پانچ وکٹیں لینے کا کارنامہ انجام دیا۔ 262 ون ڈے میچز میں انہوں نے 416 بلے بازوں کو پویلین کا منہ دکھایا۔ 36 رنز کے عوض 7 وکٹیں ان کی بہترین کارکردگی رہی۔

دوران کیریر وہ کئی تنازعات کا شکار رہے۔ وہ بورڈ اور کپتان کی پسند ناپسند کی بھینٹ چڑھے۔ 2000ء کے بعد ان کی کارکردگی میں گراوٹ آنی شروع ہوئی۔ 2003ء میں انہیں کپتانی سونپی گئی مگر وہ عالمی مقابلہ پاکستان کے لیے ڈراؤنا خواب ثابت ہوا۔ پچھلی بار فائنل کھیلنے والی ٹیم پہلے ہی راؤنڈ

میں باہر ہو گئی۔ انہیں کپتانی اور ٹیم میں اپنی جگہ، دونوں ہی سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اگلے برس انہوں نے پرنم آنکھوں کے ساتھ کرکٹ سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا۔

2006ء میں پاکستان کے بولنگ کوچ مقرر ہوئے۔ 2010ء میں انہوں نے کوچ کا عہدہ سنبھالا، مگر شاہد آفریدی سے مبینہ اختلافات کی وجہ سے انہوں نے اگلے برس کے وسط میں استعفیٰ دے دیا۔ وہ کچھ عرصے آئی پی ایل میں حیدر آباد دکن رائزرز کی ٹیم سے جڑے رہے۔ 2014ء میں ان کی پاکستان کرکٹ میں بہ طور کوچ واپسی ہوئی۔

☆شکیب جلالی

آ کے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے
جتنے اس پیڑ کے پھل تھے پسِ دیوار گرے

یوں تو شاعری ہی انہیں زندہ رکھنے کے لیے کافی تھی، مگر ان کی الم ناک، بلکہ پُراسرار موت کے باعث شکیب کا نام عرصے تک موضوعِ بحث بنا رہا۔



ان کا اصل نام سید حسن رضوی تھا۔ یکم اکتوبر 1934ء کو علی گڑھ کے قصبے سیدانہ جلال میں آنکھ کھولی۔ بعد کا زمانہ بدایوں میں گزرا۔ اسی زمانے میں والدہ کی موت کا واقعہ پیش آیا۔ ان کی موت ٹرین کی پٹری پر واقع ہوئی۔ کچھ نے حادثہ قرار دیا، کچھ نے خودکشی، تو کچھ نے قتل۔ حقیقت جو بھی ہو، اس واقعے نے شکیب پر گہرے اثرات چھوڑے۔ لڑکپن میں شاعری کا آغاز ہوا، اشعار میں بڑی تپش تھی، جسے لے کے پہلے راولپنڈی پہنچے، وہاں سے لاہور آ گئے۔ ایک پرچہ ''جاوید'' نکالا تھا، مگر چند ہی شمارے نکل سکے۔ پھر ''مغربی پاکستان'' نامی ایک حکومتی پرچے سے منسلک ہو گئے۔ کچھ عرصے صحافت بھی کی۔

تعلقاتِ عامہ کے محکمے میں انہیں ملازمت مل گئی تھی لیکن بے چینی پیچھا نہیں چھوڑتی تھی۔ ان کی شاعری انفرادیت کی حامل تھی۔ احساسات کی ایسی تپش کہ قاری انگشت بدنداں رہ جائے۔ یہ تپش اس آتش کدہ کی دین تھی جو اندرون کو سلگا رہا تھا۔ بالآخر انہوں نے سپر ڈال دی۔ 32 سال کی عمر میں 12 نومبر 1966ء کو سرگودھا اسٹیشن پر خود کو ریل کی پٹری کے حوالے کر دیا۔ زندگی تمام ہوئی۔ ان کی جیب میں ایک رقعہ تھا، جس پر یہ شعر ملا:

تو نے کہا نہ تھا کہ میں کشتی پہ بوجھ ہوں
آنکھوں کو اب نہ ڈھانپ مجھے ڈوبتے بھی دیکھ

محققین کے مطابق شکیب کے والد ذہنی مریض تھے۔ تنگ آ کر ان کی والدہ نے خودکشی کر لی۔ دس سالہ شکیب نے اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ یہ منظر دیکھا تھا۔ اور اِس منظر نے ساری زندگی تعاقب کیا۔

معروف شاعر احمد شہزاد نے شکیب پر ایک طویل مضمون لکھا، جس میں ان سے جڑے اسرار کو حل کرنے کے ساتھ اس ضمن میں برتی جانے والی بے حسی کا بھی تذکرہ کیا۔

☆حسن ناصر

سرخ سویرا کے داعی حلقوں میں حسن ناصر کو اساطیری شہرت حاصل ہے۔ ایوب دور میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے والے اس شخص کی شہرت کا موازنہ فقط نذیر عباسی سے کیا جا سکتا ہے، جسے 80 کی دہائی میں قتل کیا گیا۔

حسن ناصر کا شمار پاکستان کے بائیں بازو کے نامور انقلابی رہنماؤں میں ہوتا ہے، وہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے جنرل سیکریٹری تھے جو پابندی عائد ہونے کے بعد زیرِ زمین کام کر رہی تھی۔

وہ 1928ء میں ریاست حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ نواب محسن الملک کے نواسے تھے۔ دکن میں معروف انقلابی رہنما اور شاعر مخدوم محی الدین کے ساتھ کسانوں کی بغاوت میں حصہ لیا۔



1946ء تا 1951 جاری رہنے والی اس بغاوت کی قیادت کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کر رہی تھی۔ بعد میں وہ اپنی جائیداد ہاریوں میں تقسیم کر کے پاکستان آ گئے۔ مقصد پاکستان میں کمیونسٹوں کو منظم کرنا تھا۔ انہوں نے انقلابی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا۔ ان کے

ویژن اور اثر پذیری کو ریاست اپنے لیے خطرہ تصور کرتی تھی۔ ایوب دور میں کمیونسٹوں کے خلاف بھرپور کارروائی شروع ہوئی۔ حسن ناصر کو گرفتار کر کے شاہی قلعہ، لاہور میں رکھا گیا۔ اس بدنام زمانہ عقوبت خانے کو انگریز دور میں انقلابیوں اور حریت پسندوں کے حوصلوں کو شکست دینے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ گرفتاری کے بعد بھگت سنگھ کو بھی یہاں رکھا گیا تھا۔

حسن ناصر کو بھی شدید اذیتیں دی گئیں۔ تشدد نے بالآخر 13 نومبر 1960ء کو 32 سالہ حسن ناصر کی جان لے لی۔

محنت کش طبقے کی جانب سے شدید ردِعمل کے پیش نظر لاش جلد از جلد دفنا دی گئی۔ اسے خودکشی قرار دینے کی بھی کوشش کی گئی۔ آخری رسومات کے موقع پر ان کی والدہ خصوصی طور پر بھارت سے آئیں۔ انہوں نے انتہائی پُرجوش تقریر کی اور کہا: ''میں جانتی ہوں کہ میرے ایسے بے شمار بیٹے ہیں، جو اس جنگ کو جاری رکھیں گے کہ جس کے لیے حسن ناصر نے اپنی جان دی۔''

اس اساطیری کردار کو سبط حسن نے ''شہر نگاراں'' اور میجر اسحاق محمد خان نے ''حسن ناصر کی شہادت'' کے زیرِ عنوان کتابی صورت دی۔

حسن ناصر بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کے ساتھیوں کا الزام ہے کہ حکومت نے گرفتاری کے بعد ان کے کلام کا بڑا حصہ تلف کر دیا۔ یوں تو حسن ناصر کو جدوجہد کا استعارہ تصور کیا جاتا ہے، مگر کچھ کمیونسٹ قائدین ایسے بھی ہیں، جن کا موقف ہے کہ سجاد ظہیر اور حسن ناصر سمیت ہندوستان سے آنے والے کمیونسٹوں کو یہاں کے معروضی حالات کا ادراک نہیں تھا، ان کا انتہائی طرزِ عمل پارٹی اور جدوجہد کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا۔

☆پرویز ملک

60 اور 70 کی دہائی میں جن ہدایت کاروں کا ڈنکا بجا کرتا تھا، ان میں پرویز ملک کا نام بھی شامل ہے۔ گو انہوں نے فقط نصف درجن فلمیں ڈائریکٹ کیں، مگر وہ بلاک بسٹر ثابت ہیں۔ شائقین کے ساتھ اُنہوں نے ناقدین سے بھی خوب داد بٹوری۔ ہیرا اور پتھر، ارمان، احسان، پہچان، تلاش، پاکیزہ، انتخاب، ہم دونوں، قربانی اور غریبوں کا بادشاہ جیسی فلمیں ان کی پہچان بنیں۔



پرویز ملک 1937 میں کراچی میں پیدا ہوئے۔ گو خاندانی فوجی پس منظر رکھتا تھا، مگر پرویز ملک کو اپنے وقت کے معروف ڈسٹری بیوٹر اور فلم آرٹس کے مالک ناصر مراد نے متوجہ کیا۔ ناصر مراد کے بیٹے وحید مراد سے جلد ان کی خوب نبھنے لگی۔ دونوں نے پہلے ناصر مراد سے سیکھا، پھر امریکا سے فلم سازی کی تربیت حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا، مگر وحید مراد اکلوتے تھے، انھیں باہر جانے کی اجازت نہیں ملی۔ پرویز ملک اکیلے امریکا چلے گئے۔ وہ جنوبی کیلی فورنیا میں زیرِ تعلیم رہے۔ 1963ء میں پاکستان لوٹے تو پاکستانی سنیما کو بدلنے کے لیے تیار تھے۔

اوائل میں وہ انگریزی میگزین ایسٹرن فلم میں اسسٹنٹ ایڈیٹر رہے۔ وحید مراد اپنے والد کا اسٹوڈیو سنبھال چکے تھے اور اس کے تحت دو فلمیں بھی بنا چکے تھے۔ پرویز ملک کی فلم آرٹس میں شمولیت نے نئے رجحانات متعارف کروائے۔ انہوں نے وہاں رہتے ہوئے ہیرا اور پتھر اور احسان جیسی کامیاب فلمیں بنائیں۔ ارمان کے ہدایت کار بھی وہی تھے جنھوں نے تمام پرانے ریکارڈ توڑ ڈالے۔ کچھ برس بعد وحید مراد کے ساتھ اختلافات کی وجہ سے وہ فلم آرٹس سے علیحدہ ہوگئے۔ بعد میں انہوں نے ندیم اور محمد علی کے ساتھ فلمیں بنائیں۔ انہوں نے جنرل ضیاء کے دور میں انتخاب نامی ایک بولڈ فلم بنائی۔

انڈسٹری کے زوال کے بعد وہ دھیرے دھیرے اس سے دور ہوتے گئے۔ انھیں تمغۂ حسن کارکردگی سے نوازا گیا۔ انہوں نے طویل عمر پائی۔ 18 نومبر 2008ء کو ان کا انتقال ہوا۔

☆شباب کیرانوی

شباب کیرانوی کے بغیر پاکستانی فلمی صنعت کی تاریخ نامکمل ہے۔ سماجی موضوعات پر فلمیں بنانے میں انھیں ملکہ حاصل تھا۔ موسیقی پر وہ خصوصی توجہ دیتے۔ شباب کیرانوی نے 75 کے قریب فلمیں پروڈیوس کیں۔ نصف درجن فلموں کی

ہدایت کاری کا فریضہ انجام دینے والے اس تخلیق کار کو کتنے ہی ایوارڈز ملے۔

وہ 1925ء میں اتر پردیش کے ضلع مظفر نگر کے علاقے کیرانہ میں پیدا ہوئے۔ اصل نام حافظ نذیر احمد تھا۔ بنیادی طور پر صحافی تھے۔ صحافت کا آغاز فلمی جریدے ''ڈائریکٹر'' سے کیا۔ ''جلن'' ان کی پروڈیوس کردہ پہلی فلم تھی۔ ''ثریا'' سے بطور ہدایت کار اپنا سفر شروع کیا۔ ان کی فلم ''مہتاب'' بلاک بسٹر ثابت ہوئی جس کے بعد انہوں نے اپنے دوست اے احمد کے ساتھ اپنا پروڈکشن ہاؤس بنایا۔ اس کے تحت فلم ''انسانیت'' بنائی۔ آنے والے برسوں میں سنگدل، دامن اور چنگاری، میرا نام ہے محبت، سہیلی، نوکر، آئینہ جیسی کامیاب فلمیں دیں۔



وہ طبقاتی تفریق کے خلاف تھے۔ انہوں نے مشرقی عورت کو پردے پر پیش کیا۔ اقدار کی اہمیت اجاگر کی۔ ان کی ہدایت کاری میں ننھا، علی اعجاز، رنگیلا اور منور ظریف کی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آئیں۔ ''انسان اور آدمی'' اور ''انصاف اور قانون'' میں محمد علی نے اپنی زندگی کے یادگار کردار نبھائے، تو ایک سبب شباب صاحب جیسا منجھا ہوا ہدایت کار بھی تھا۔ عام طور سے ایم اشرف ان کی فلموں میں موسیقی دیا کرتے تھے۔ یہ جوڑی کامیابی کی علامت تھی۔

شہرت اسکینڈلز بھی ساتھ لاتی ہے۔ ان پر بھارتی فلمیں چربہ کرنے کا الزام عائد کیا جاتا تھا۔ اس الزام میں ایک حد تک صداقت بھی تھی۔ البتہ انہیں یہ کریڈٹ جاتا ہے کہ انہوں نے انڈسٹری کو نئے چہرے دیے۔ وہ ایک ایسے پروڈیوسر تھے جو تکنیکی اسٹاف کا بالخصوص خیال رکھتا۔ معاوضے بروقت ادا کرتا۔ انہیں اچھے انسان کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔

شاعری سے انہیں گہرا شغف تھا۔ خود بھی شعر کہتے۔ احسان دانش کے شاگرد تھے۔ ''موج شباب'' اور ''بازار صدا'' کے نام سے شعری مجموعے شائع ہوئے۔ ناول بھی خوب لکھے۔ 5 نومبر 1982ء کو ان کا انتقال ہوا۔

☆ غلام مصطفیٰ جتوئی

سندھ کی سیاست میں بہت کم شخصیات نے وہ کامیابیاں سمیٹی ہوں گی، جو غلام مصطفیٰ جتوئی کے حصے میں آئیں۔ بٹوارے سے پہلے ہی ان کے خاندان کو سندھ کی سیاست میں اہم مقام حاصل تھا۔ انہوں نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا۔ پیپلز پارٹی کے پلیٹ فورم سے متحرک رہے۔ نیشنل پیپلز پارٹی قائم کی۔ نگراں وزیراعظم رہے۔ بعد میں ان کے بیٹوں نے سیاست میں قدم رکھا اور اہم عہدوں پر فائز ہوئے۔



غلام مصطفیٰ جتوئی 14 اگست 1931ء کو سندھ کے ضلع نواب شاہ کے علاقے نیو جتوئی میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا خان بہادر امام بخش خان جتوئی تقسیم سے قبل تین بار بمبئی قانون ساز اسمبلی کے ممبر رہے۔ قیام پاکستان کے بعد ان کے گھرانے کو علاقائی سیاست میں خصوصی اہمیت حاصل رہی۔ کراچی گرامر اسکول میں زیر تعلیم رہے۔ 1952ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ چلے گئے، تاہم گھریلو مسائل کی وجہ سے ایک برس بعد ہی لوٹنا پڑا۔

اسی زمانے میں سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔ نوابشاہ کے ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیئرمین بنے۔ وہ اس عہدے پر فائز ہونے والے سب سے کم عمر شخص تھے۔ 1958ء میں مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ 1965ء میں بھی الیکشن میں کامیابی حاصل کی۔ 1969ء میں پیپلز پارٹی کا حصہ بن گئے۔ بھٹو کی کابینہ میں سیاسی امور، پورٹ اینڈ شپنگ، کمیونی کیشن، قدرتی وسائل، ریلوے اور ٹیلی کمیونی کیشن کی وزارتیں سنبھالیں۔

1973ء میں وزیراعلیٰ سندھ کا عہدہ سنبھالا۔ 1977ء تک اس عہدے پر رہے۔ مارشل لا لگنے کے بعد انہوں نے ایم آر ڈی کی تحریک میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اسی دوران گرفتار ہوئے، قید و بند کی صعوبتیں سہیں۔ بعد ازاں انہوں نے نیشنل پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی۔ کئی بڑے لیڈروں نے اس جماعت میں شمولیت اختیار کی۔

1988ء میں اسلامی جمہوری اتحاد کے بانی بنے۔ رکن قومی اسمبلی منتخب ہونے کے بعد اپوزیشن لیڈر کے روپ میں نظر آئے۔ بے نظیر بھٹو کی پہلی حکومت برطرف کیے جانے کے بعد ملک کے نگران وزیراعظم بنے۔ بعد میں پی پی ہی کی قیادت میں نواز شریف کے خلاف شروع ہونے والی تحریک میں حصہ لیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ انہیں بیماریوں نے گھیر لیا۔ طویل علالت کے بعد 78 سال کی عمر میں وہ 20 نومبر 2009ء کو لندن میں انتقال کر گئے۔

☆ شفیع محمد شاہ

شاہ جی کے نام سے معروف پاکستانی فلم اور ٹی وی کے ممتاز فن کار شفیع محمد شاہ 1949ء کو کنڈیارو، سندھ میں پیدا ہوئے۔

انہوں نے ریڈیو حیدرآباد سے بہ طور صدا کار اپنے کیریر کا آغاز کیا۔ 60 کی دہائی میں ریڈیو سے نشر ہونے والے ڈراموں میں ان کے اندر چھپے اداکار کے جوہر ظاہر ہوئے۔ اسی زمانے میں جام شورو سے گریجویشن کی سند حاصل کی۔ فنی میدان میں کیریر بنانے کے لیے کراچی کا رخ کیا۔

پی ٹی وی کے پروڈیوسر شہزاد خلیل کے ڈرامے ”تیسرا



کنارہ“ کا حصہ بننے کے بعد انہیں ملک گیر شناخت ملی۔ آنے والے برسوں میں انہوں نے چاند گرہن، دائرے، آنچ، بند گلاب اور محبت خواب کی صورت جیسے مقبول ڈراموں میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھا کر لاکھوں شائقین کو گرویدہ بنا لیا۔ ایک زمانے میں ہر ہدایت کار خواہش کرتا تھا کہ شفیع محمد شاہ اس کے ڈرامے میں کام کریں۔ خود کو فقط سنجیدہ کرداروں تک محدود نہیں رکھا۔ ان کے کام میں تنوع تھا۔ ٹی وی کے ساتھ انہوں نے فلمیں بھی کیں۔ اپنے تیس سالہ کیریر میں انہوں نے اردو اور سندھی کے 50 ڈرامے سیریل اور سو سے زاید ٹی وی پلے میں جلوہ گر ہوئے۔ 1985ء میں انہوں نے پاکستان ٹیلی وژن کی جانب سے بہترین اداکار کا ایوارڈ اپنے نام کیا۔

انہوں نے سیاست میں بھی حصہ لیا۔ پیپلز پارٹی کے متحرک کارکن تھے۔ 2002ء کے انتخابات میں کراچی کے حلقے این اے 253 سے میدان میں اترے، مگر انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ بعد ازاں وہ پارٹی کی کلچرل کمیٹی کا حصہ رہے۔ سماجی سطح پر بھی فعال تھے۔ اقوام متحدہ کی ذیلی تنظیموں سے وابستگی رہی۔

اُن کی شخصیات میں ایک خاص نوع کا ٹھہراؤ تھا۔ ان کی صحبت میں لوگ اطمینان محسوس کرتے۔ انہوں نے کتنے ہی فن کاروں کی رہنمائی کی۔ 17 نومبر 2007ء کو اس مایہ ناز فن کار کا کراچی میں انتقال ہوا۔

☆ بانو قدسیہ

اردو فکشن کی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو خواتین قلم کاروں کے اثرات واضح ہیں۔ عصمت چغتائی، قرۃ العین



حیدر، خدیجہ مستور سمیت کتنے ہی نام ہیں۔ تقسیم کے بعد جن خواتین فکشن نگاروں نے اوج کو چھوا، ان میں پہلا نام بانو قدسیہ کا آتا ہے۔ وہ اپنے پیشوروں سے یکسر مختلف تھیں۔ پہلے کی فکشن نگار خواتین بے باک اور آزاد خیال تصور کی جاتی تھیں، مگر بانو نے روایتی مشرقی عورت کا طرز زندگی اختیار کیا، جو شوہر کو مجازی خدا تصور کرتی۔ ان کی شخصیت پر اُن کے شوہر اشفاق احمد کے گہرے اثرات ہیں، جن کا شمار ممتاز فکشن اور ڈراما نگاروں میں ہوتا ہے۔ تصوف کی جانب جھکاؤ رکھنے والے اشفاق احمد کے افکار کی جھلک بانو میں بھی آئی۔

شوہر کے مانند انہوں نے بھی کئی ڈرامے لکھے۔ کچھ ناقدین اُن کی ڈراما نویسی کو اشفاق احمد کے مقابلے میں سماج کے زیادہ قریب محسوس کرتے ہیں۔ اُن کے ڈرامے ”آدھی بات“ اور ”کلو“ کو کلاسک کا درجہ حاصل ہے۔

بانو قدسیہ 28 نومبر 1928ء کو فیروز پور کے ایک زمین دار گھرانے میں پیدا ہوئی۔ والد کا انتقال کم سنی ہی میں ہو گیا۔ والدہ نے خاندان کو سنبھالا۔ وہ ایک پڑھی لکھی سمجھ دار

خاتون تھیں۔ ہماچل پردیش میں وہ کچھ عرصے زیر تعلیم رہیں۔
تقسیم کے بعد خاندان پاکستان اٹھ آیا۔ لاہور کے کنیئرڈ کالج برائے خواتین سے گریجویشن کیا۔ لکھنے لکھانے کا سلسلہ تب ہی شروع ہوا۔ 1951ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے اردو کی ڈگری حاصل کی۔ وہیں اشفاق احمد سے ملاقات ہوئی تھی۔ بعد از اں وہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔

ان کے افسانوی مجموعہ اور ناول بے حد مقبول ہوئے۔ آتش زیر پا، آدھی بات، ایک دن، پروا، موم گلیاں امر بیل، حاصل گھاٹ کتنی ہی کتابیں ہیں، مگر جو شہرت راجا گدھ کے حصے میں آئی، اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ کچھ ناقدین اس کا شمار اردو کے اہم ترین ناولوں میں کرتے ہیں۔ ناول کی تکنیک اور بیانیہ لاجواب ہے، مگر اس نے کچھ حلقوں میں بے چینی پیدا کردی، جن کا خیال تھا، اسے خاص مذہبی نظریے کے تحت لکھا گیا ہے۔ اس ضمن میں خود مصنفہ کے بیانات نے بھی تنازعہ کو ہوا دی۔ راجا گدھ کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔

شہاب کی شخصیت کو روحانی جہت دینے اور اس کی تشہیر کرنے میں جن شخصیات نے کلیدی کردار ادا کیا، ان میں ممتاز مفتی اور اشفاق احمد کے ساتھ بانو قدسیہ کا نام بھی شامل، جنھوں نے ''مرد ابریشم'' کے نام سے شہاب پر ایک کتاب لکھی۔ بانو قدسیہ حیات ہیں۔ اب ان کی عمر 86 برس ہو گئی ہے۔ وہ ادبی تقریبات میں کم ہی دکھائی دیتی ہیں۔

☆ پروین شاکر

تقسیم کے بعد شاید ہی کسی شاعرہ کو وہ شہرت اور پزیرائی ملی ہو، جو پروین شاکر کے حصے میں آئی۔ ان کا ذکر خوشبو کی طرح ہر سوں پھیل گیا۔ مقبولیت کے میدان میں ان کا موازنہ کسی سے ممکن نہیں۔ ان کی شعری پر غالب رومانوی رنگ نے کتنے ہی شاعرات کو متاثر کیا، مگر کوئی ان کے نقوش پا کا تعاقب نہیں کر سکا۔



وہ 24 نومبر 1954ء کو کراچی کے ایک علمی و ادبی گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ خاندان میں کئی شعرا اور ادبا گزرے۔ بہار حسین آبادی ایک اہم نام۔ اُن کے نانا حسن عسکری بھی ادبی ذوق کے حامل تھے، جنھوں نے پروین کو شاعری کے ابتدائی اسباب پڑھائے۔

زمانہ طالب علمی میں اُن کی صلاحیتیں آشکار ہوئیں۔ وہ مباحثوں میں حصہ لینے لگیں۔ پھر ریڈیو کا رخ کیا۔ انہوں نے انگریزی میں جامعہ کراچی سے ماسٹرز کیا۔ اوائل میں تدریس سے وابستہ رہیں۔ 1986ء کسٹمز ڈیپارٹمنٹ، سی بی آر اسلام آباد میں سیکریٹری ہو گئیں۔ 1991ء میں ہاورڈ یونیورسٹی سے پبلک ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے ڈاکٹر نصیر علی سے شادی کی تھی، مگر وہ چل نہیں سکی۔

شاعری میں انہیں احمد ندیم قاسمی کی سرپرستی حاصل رہی۔ ان کا بیشتر کلام فنون میں چھپا۔ ان کی شاعری کا بنیادی موضوع محبت اور عورت تھا، کچھ ناقدین نے ان موضوعات کو فرسودہ ٹھہرایا، مگر ان کی شہرت کے سامنے اس طرح کے دلائل بے معنی ثابت ہوئی۔ 1976ء میں خوشبو کی اشاعت کے ساتھ ہی ان کا شمار برصغیر کی مقبول شاعرات میں ہونے لگا۔ پھر صد برگ، خود کلامی اور انکار کی اشاعت عمل میں آئی۔ ماہ تمام آخری کتاب تھی۔ بعد کے مجموعوں میں ان کے ہاں زندگی کے حقائق کا رنگ نظر آیا۔ انہوں نے رومانویت سے نکل کر عورت کے مسائل کو بھی نظر کیا۔ گو ان کے زمانے میں کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض جیسی شاعرات موجود تھیں، مگر ان کے جذبات و احساسات کے اظہار نے قارئین کو گرویدہ بنا لیا تھا۔

26 دسمبر 1994ء کو یہ شاعرہ ایک ٹریفک حادثے میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی۔

☆ نیرہ نور

برصغیر کی غزل گائیکوں میں نیرہ نور ایک اہم نام ہیں۔ ''اے جذبۂ دل گر میں چاہوں''، ''پھر ساون رت کی پون چلی تم یاد آئے''، ''اے عشق ہمیں برباد نہ کر''، ''چلے تو جلاؤ گوری'' جیسے یادگار گیت ان ہی کی جادوئی آواز میں ریکارڈ ہوئے۔ ''وطن کی مٹی گواہ رہنا'' جیسا مقبول ملی نغمہ اُنھوں نے ہی گایا۔

ان کے اجداد کا تعلق امرتسر سے تھا۔ وہ 3 نومبر 1950ء کو آسام میں پیدا ہوئیں، جہاں ان کا خاندان تجارت کے سلسلے میں مقیم تھا۔ ان کے والد مسلم لیگ کے فعال رکن تھے۔ تقسیم کے کچھ عرصے بعد یہ خاندان پاکستان آن

بسا۔

گھرانے کا فن گائیکی سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا، مگر نیرہ نور میں یہ صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ کانن دیوی اور بیگم اختر سے وہ بہت متاثر تھیں۔ لاہور میں کالج کی ایک تقریب میں ایک پروفیسر نے سنا، تو خوب سراہا۔ ان کی رہنمائی کام آئی۔



70 کی دہائی کے اوائل میں انہوں نے پی ٹی وی میں قدم رکھا۔ سخت چیلنجز درپیش اور تجربہ محدود، مگر صلاحیت کے آگے کون بندھ باندھ سکتا ہے۔ غالب، ناصر کاظمی، ابن انشا اور فیض احمد فیض کے کلام کو اتنی خوبصورتی سے گایا کہ ملک بھر ان کا چرچا ہونے لگا۔ انہوں نے مہدی حسن، احمد رشدی اور عالمگیر سمیت اپنے زمانے کے کئی معروف فنکاروں کے ساتھ گایا۔ غزل گائیکی کے چاہنے والے تو ان کے مداح ہوگئے۔ فلموں میں بھی ان کی سریلی آواز سنائی دی۔ ایک کے بعد ایک اعزاز ان کے نام ہوتا چلا گیا۔ انہیں ایک سادہ، کم گو اور شرمیلی فن کار کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ سادگی میں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اب وہ گائیکی سے کنارہ کش ہو چکی ہیں۔

☆ شیخ رشید

سیاست داں تو ہزاروں ہیں، مگر ایسے کم ہی ہوں گے، جو شیخ رشید کے مانند خبروں میں رہنے کا فن جانتے ہوں۔ کھلا ڈلا انداز، ہاتھ میں سگار، ایک کے بعد دوسری پیش گوئی، یہی ہے پنڈی کی لال حویلی والے شیخ رشید کا انداز۔ اپنی ذات میں انجمن ہیں۔ ماضی میں ثقافت، ریلوے اور اطلاعات و نشریات جیسی وزارتیں ان کے پاس رہیں۔

شیخ رشید 6 نومبر 1950ء کو راولپنڈی کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ زمانہ طالب علمی میں سیاست میں قدم رکھا۔ ایوب مخالف تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ گورڈن کالج میں طلبا یونین کے صدر منتخب ہوئے۔ ماسٹرز کے بعد عملی سیاست میں قدم رکھا۔ اوائل میں تحریکِ استقلال میں شمولیت اختیار کی، لیکن جلد ہی علیحدہ ہوگئے۔ 1984ء میں بلدیاتی کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ اگلے برس کے غیر جماعتی انتخابات میں قومی اسمبلی کے رکن بنے۔ جونیجو دور میں آزاد پارلیمانی گروپ کے پرچم تلے خاصے متحرک رہے۔ 1988ء کے عام انتخابات میں اپنی مقبولیت اور شعلہ بیانی کے بل پر پیپلز پارٹی کے امیدوار جنرل ٹکا خان کو شکست دے کر قومی اسمبلی میں پہنچے۔ 1990ء اور 1993ء کے انتخابات میں کامیابی حاصل کی۔ نواز شریف کے پہلے دور میں پہلے مشیر اطلاعات و نشریات، پھر وزیر صنعت و حرفت رہے۔



مخالفین ان کے غیر محتاط طرز گفتگو اور کاٹ دار بیانات سے تنگ تھے۔ لال حویلی میں کلاشنکوف رکھنے کا الزام عائد کر کے انہیں جیل پہنچا دیا گیا۔ رہائی کے بعد پھر کامیابی اپنے نام کی اور نواز شریف کی کابینہ کا حصہ بنے۔ بعد میں ق لیگ میں شمولیت اختیار کی اور پرویز مشرف کی ٹیم کا حصہ بنے۔ مشرف مخالف لہر 2008ء کے انتخابات انہیں بھی لے ڈوبی۔ عبرت ناک شکست ہوئی۔ اب ق سے علیحدہ ہو کر عوامی مسلم لیگ نام کی ایک نئی جماعت کی بنیاد ڈالی، مگر 2010ء کے ضمنی انتخابات میں بھی شکست مقدر بنی۔ یوں لگتا تھا کہ ان کا سیاسی کیریر ختم ہوگیا ہے۔ مگر پھر عمران خان سے ان کی قربت نے منظر کو یکسر بدل دیا۔ 2013ء کے انتخابات میں اپنے روایتی حلقے سے کامیابی حاصل کی۔ آج حکومت مخالف تحریکوں میں پیش پیش ہیں اور ٹی وی اسکرینوں پر چھائے ہوئے ہیں۔

☆ حسینہ معین

پاکستان ٹیلی ویژن ڈراما نویسوں کے معاملے میں خودکفیل رہا۔ کبھی زنبیل میں اچھے لکھنے والوں کی کمی نہیں رہی۔ ادھر خواتین قلم کاروں نے بھی اپنی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا۔ ایک زمانے میں فاطمہ ثریا بجیا کا شہرہ رہا۔ پھر بانو قدسیہ کے نام کا ڈنکا بجا۔ ان کے بعد یہ مسند حسینہ معین نے سنبھالا۔ انہوں نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے کتنے ہی یادگار ڈرامے لکھے۔ "تنہائیاں" اور "ان کہی" جیسے شاہکار انہوں نے ہی لکھے۔ انہیں تمغۂ حسن

کارکردگی سمیت کئی اعزازات سے نوازا گیا۔

20 نومبر 1941ء کو وہ بھارتی شہر کانپور میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم وہیں سے حاصل کی۔ تقسیم ہند کے بعد ان کا خاندان پاکستان آ گیا۔ اوائل میں کئی برس راولپنڈی میں گزرے۔ پھر لاہور کا رخ کیا۔ 1950ء میں کراچی پہنچیں۔ جامعہ کراچی سے 1963ء میں انہوں نے تاریخ کے مضمون میں ماسٹر کیا۔

فن ڈراما نویسی میں خود کو شناخت کیا۔ ایک کے بعد ایک یادگار ڈرامے ان کے قلم سے نکلے۔ شہزوری، زیر زبر پیش، انکل عرفی، دھوپ کنارے، دھند، آہٹ، کہر، پڑوسی، آنسو، بندش اور آئینہ اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔

فلمیں بھی لکھیں۔ وحید مراد کی فلم ''یہاں سے وہاں تک'' کے مکالمے لکھے۔ راج کپور کی درخواست پر انہوں نے ہندوستانی فلم ''حنا'' کے مکالمات لکھے تھے۔ پاکستانی فلم ''کہیں پیار نہ ہو جائے''، حسینہ معین کے قلم سے نکلی۔

☆امجد خان

اس منفرد فنکار نے 130 فلمیں کیں، ''شعلے'' اور ''مقدر کا سکندر'' کو امر کرنے میں کچھ کمال اس کا بھی تھا۔ ایک زمانے میں وہ بالی ووڈ کی ضرورت بن گیا تھا۔



یہ ممتاز اداکار امجد خان کا ذکر ہے، جو 12 نومبر 1940ء کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ عجب اتفاق ہے، بالی ووڈ پر راج کرنے والی کتنی ہی شخصیات نے اس شہر میں آنکھ کھولی۔ دلیپ کمار، راج کمار، ونود کھنہ اور پرتھوی راج اس کی نمایاں مثال۔ مدھو بالا کا تعلق بھی پشاور ہی سے تھا۔ اداکاری تو گھٹی میں پڑی تھی۔ اپنے وقت کے معروف اداکار ذکریا خان المعروف جے انت (Jayant) کے صاحب زادے تھے۔ امجد خان کے بھائیوں نے انڈسٹری کا رخ کیا۔

وہ بمبئی میں زیر تعلیم رہے۔ طلبا سیاست میں حصہ لیا۔ فنی کیریر کا آغاز تھیٹر سے کیا۔ 1951ء میں ریلیز ہونے والی ''نازنین'' میں پہلی بار فلمی پردے پر نظر آئے۔ اوائل میں چھوٹے رول کیے۔ باقاعدہ آغاز 1973ء میں ''ہندوستان کی قسم'' سے کیا۔ 1975ء میں انہیں فلم ''شعلے'' میں گبر سنگھ کے رول کی پیش کش ہوئی۔ اس فلم نے انہیں راتوں رات سپر اسٹار بنا دیا۔ ان کا شمار ہر دلعزیز اداکاروں میں ہونے لگا۔ انہوں نے ولن کے کردار کو ایک نئی جہت عطا کیا۔ فلم قربانی، چکر پے چکر، لاوارث اور کالیا سمیت کتنی ہی فلموں میں انہوں نے یادگار رول کیے۔

وہ ورسٹائل اداکار تھے۔ ایکشن کے ساتھ سنجیدہ اور مزاحیہ کردار بھی نبھائے۔ کئی ایوارڈ اپنے نام کیے۔ 27 جولائی 1992ء کو اس ممتاز اداکار کا انتقال ہوا۔

☆جون ایلیا

8 نومبر 2008 میں اردو ادب کے لاجواب شاعر جون ایلیا کی وفات ہوئی۔ ان کا اردو ادب کے ان منتخب شعرا میں شمار ہوتا ہے، جن کی شاعری گہری فکر کا پرتو ہے۔ ہر شعر سوچ کے نئے در وا کرتی ہے۔

وہ 14 دسمبر 1937ء کو بھارت کے صوبہ اتر پردیش کے شہر امروہہ میں پیدا ہوئے۔ تین بھائی محمد تقی، رئیس امروہوی اور سید محمد عباس سے چھوٹے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ جون ایلیا اس عہد میں اپنی مثال آپ تھے تو غلط نہ ہوگا۔ ان کے پاس الفاظ کا خزانہ تھا۔ کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ عربی، فارسی (پہلوی) سنسکرت اور عبرانی پر دسترس حاصل تھی جب کہ اب پہلوی کو مردہ زبانوں میں شمار کیا جاتا ہے گویا سنسکرت، عبرانی اور پہلوی تین مردہ زبانوں کے جاننے والے تھے۔



ان کی شاعری کا مجموعہ اس وقت آیا جب وہ 58 سال کے ہو چکے تھے۔ وہ بھی سلیم جعفری کی مسلسل کوشش کے بعد 1989ء میں ''شاید'' کے عنوان سے، دوسرا شعری مجموعہ 2003ء میں ''یعنی'' کے عنوان سے آیا۔ زاہدہ حنا سے شادی کی لیکن ازدواجی زندگی کامیاب نہ رہی۔ عالمی ڈائجسٹ نکالا لیکن وہ بھی بند ہو گیا۔ عجب مستانہ فقیرانہ زندگی گزاری ہے۔

شاعرِ خوش نوا

سید زین مہدی

اردو ادب کے معماروں کی جب فہرست ترتیب دی گئی ہے اس میں آزادی کے فوراً بعد جو نام ابھر کر سامنے آئے ان میں ایک بڑا نام جمیل مظہری کا ہے جو شاعری میں یدطولیٰ تو رکھتے ہی ہیں۔ نثر بھی خوب خوب لکھی۔ رثائی ادب میں بھی اعلیٰ مقام حاصل کیا اور لوگ کہہ اٹھے کہ میر انیس و مرزا دبیر نے مرثیہ گوئی کو اوج ثریا بخشا تو جوش ملیح آبادی اور جمیل مظہری نے اسے نیا زاویہ عطا کیا۔

دورِ حاضر کے ایک بڑے مرثیہ نگار، غزل کو نیا آہنگ دینے والے کا زندگی نامہ



اکثر حضرات یہ سوال کرتے کہ جمیل صاحب، اپنے نام کے ساتھ مظہری کیوں لکھتے ہیں، کاظمی کیوں نہیں لکھتے؟ اسی سوال کے جواب کو میں اپنا موضوع بنانے کی جرأت کر رہا ہوں یعنی اس خانوادے کے کچھ حالات بیان کرنا چاہتا ہوں جس کی روایات کی گود میں ان سب نے پرورش پائی۔ خاندانی شجرہ اور بزرگوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاندان سادات موسوی ہے اور آئمہ اثنا عشری کے ساتویں امام حضرت موسیٰ کاظم ان کے مورث اعلیٰ ہیں اور ان سے

ان لوگوں تک اکیس پشتیں گزر چکی ہیں۔ سادات موسوی مدینے سے نکل کر بغداد اور وہاں سے ایران کے علاقے سبزوار میں آکر پناہ گزین ہوئے۔ سبزوار سے ان کی بعض شاخیں دوسرے ممالک میں پھیلیں ان میں سے کچھ ہندوستان آنکلے اور شاہان دہلی کے سایہ معدلت پناہ میں گوشہ گیر ہوئے۔ انہی میں سے ایک بزرگ سید سالار غازی تھے جن کی سرکردگی میں وہ علاقہ فتح ہوا جو ان کے نام پر غازی پور کے نام سے مشہور ہوا اور آج بھی مشرقی یوپی میں ایک مردم خیز خطہ سمجھا جاتا ہے۔ انہی سید سالار کی نسل میں ایک بزرگ سید تاج الدین گزرے ہیں جن کے نام سے قصبہ تاج پور آج بھی غازی پور سے دو تین اسٹیشن کے فاصلے پر آباد ہے۔ سید تاج الدین کی اولادیں آس پاس کی بستیوں میں منتشر ہوئیں' تونہرہ' پارہ' کاموں پور' زنگی پور وغیرہ چند ایسی بستیاں ہیں جہاں ان کی نسل کے سادات آباد ہیں۔ انہی خاندان میں سے ایک خاندان ان کے جد اعلیٰ مولانا سید ریاض الحسن کا تھا جو شہر غازی پور کے محلہ قاضی ٹولہ میں آباد ہوا۔ ان کے جد امجد کو گلزار باغ اسٹیٹ پٹنہ کی وارثہ امام باندی بیگم صاحبہ نے اپنے شوہر کی تربیت دینی اور مسجد کی امامت کے لیے منتخب کیا اور وہ تمام عمر یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ان کے دو صاحب زادے سید فیاض حسن اور سید مظہر حسن اور ایک صاحب زادی تھیں۔ جناب سید فیاض حسن بھی عرصہ تک عظیم آباد میں ملازم رہے۔ سید مظہر حسن نے اپنے والد مرحوم کا علم اور ذوق شعروادب ورثہ میں پایا جسے زمانہ تعلیم میں لکھنو اور مٹیا برج (کلکتہ) کے قیام نے اور اس کے بعد عظیم آباد (پٹنہ) کی علم پرور فضا نے جلا بخشی۔ زمانہ طالب علمی میں ہی جب وہ لکھنو میں تھے' ان کی قوت بصارت چھن گئی صرف 32 سال کی عمر میں وہ نابینا ہو گئے۔

انہی مولانا سید مظہر حسن کے بارے میں ذکر آتا ہے کہ حسین آباد شیخ پورہ ضلع مونگیر بہار کے نواب علی خان کی ریاست کے مدارالمہام سید مظہر حسن کی آنکھیں بے نور تھیں مگر نباضی میں ملکہ حاصل تھا۔ کبھی کبھی مریضوں کو بھی دیکھ لیتے اور زبانی نسخے بتادیتے یا پھر مصاحبین واحباب سے خوش گپیوں میں وقت گزار دیتے۔ اس دن بھی وہ بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ایک صاحب آئے کچھ دیر باتیں کیں اور چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی ایک ہم نشیں نے پوچھا "مولانا! آپ کچھ متفکر ہو گئے تھے۔" انہوں نے جواب دیا کہ ابھی جو صاحب اٹھ کر گئے ہیں' ان کی آواز کی نقاہت سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ہفتہ دو ہفتہ کے مہمان ہیں۔ سوال کرنے والے نے استہزاء کیا کہ مولانا' آپ کی بھی باتیں ہیں' وہ تو اچھے خاصے ہٹے کٹے ہیں۔ اس وقت تو بات آئی گئی ہوگئی مگر دسویں دن خبر آئی کہ جن صاحب کے متعلق انہوں نے بتایا تھا' وہ راہی عدم ہوئے۔

اس واقعے کے کچھ ہی دنوں بعد کی بات ہے کہ مولانا سید مظہر حسن قبلہ چھڑی ٹیکتے چلے جارہے تھے۔ جاننے والے جانتے تھے کہ ان کی آنکھوں کا کام حسیں کرتی ہیں اس لیے نابینا کو اکیلے جاتے دیکھ کر بھی کسی نے ٹوکا نہیں۔ راستے میں ایک میدان تھا' اس میدان میں دربار کے شہسوار جگن خان نیا خرید کردہ گھوڑا پھرا رہے تھے۔ مولانا رک کر بے بصیرت آنکھوں سے ادھر ہی دیکھنے لگے کچھ دیر تک گھوڑے کی ٹاپ سنتے رہے پھر پکار کر کہا "خان صاحب' گھوڑے کا پچھلا پیر غلط پڑ رہا ہے۔"

خان صاحب نے دھیان نہ دیا' سمجھے کہ مولوی آدمی پھر اندھے' گھوڑے کی چال کیا سمجھیں گے خوامخواہ ٹانگ اڑا رہے ہیں۔ قصداً انہوں نے پاؤں ٹھیک کر کے اگلا پاؤں بگاڑ دیا۔

مولانا نے فوراً ٹوکا اب اگلا پاؤں بگڑ رہا ہے۔

خان صاحب گھوڑے سے کودے اور مولانا کے پیر پکڑ کر بولے "مولوی صاحب' ہم تو آپ کو نابینا سمجھے تھے مگر آپ تو روشن ضمیر ہیں۔"

مولانا نے مسکرا کر کہا "میاں! خدا نے آنکھوں کے ساتھ کان بھی دیے ہیں۔ میں نے آنکھوں کا کام کان سے لیا تھا بس!"

مولانا مظہر حسن کے بارے میں نواب علی خان کا کہنا تھا کہ اکبر کے پاس نورتن تھے' میرے پاس ایک اور یہ ایک رتن ہی نو کے برابر ہے۔

مولانا کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ منشیوں سے حساب سنتے اور زبانی میزان کر کے حساب کی غلطی پکڑ لیتے۔ بیٹے کو خود پڑھاتے اور بتاتے جاتے کہ دیکھو فلاں صفحہ کی فلاں سطر کے سامنے حاشیہ پر فلاں نوٹ لکھا ہوا ہے' پڑھو۔ حالانکہ کتابوں سے الگ ہوئے چالیس سال گزر گئے تھے۔ وہ حاشیہ کے الفاظ پڑھتے تو بعینہ وہی الفاظ ملتے۔

فن تاریخ گوئی میں بھی انہیں ملکہ حاصل تھا کہ مختلف صنعتوں کے ساتھ تاریخ نکالتے' ایک ایک فقرے سے

اٹھارہ اٹھارہ طریقے سے مادہ ہائے تاریخ نکالتے۔ دیگر اصنافِ سخن میں قصیدے، مثنوی، مرثیے، رباعیاں، قطعے، سلام اور نوحے کہتے۔ ان کے بیٹے مولانا خورشید حسین خورشید کو بھی وراثت میں فکروفن کا شوق ملا اور وہ اپنے بڑے بھائی سید اطہر علی اطہر کی طرح خوش گو شاعر ثابت ہوئے۔

مولانا خورشید حسین کی شادی ہادی علی خان ڈپٹی مجسٹریٹ مغلپورہ پٹنہ سٹی کی بیٹی سے ہوئی۔ شادی کے دوسرے یا تیسرے سال یکم جنوری 1905ء ان کے بطن سے مغلپورہ میں میر کاظم علی پیدا ہوئے۔ کاظم علی کی والدہ سب سے چھوٹی تھیں اس لیے اپنے گھر والوں کو زیادہ پیاری تھیں اور میکے میں ہی زیادہ وقت گزارتی تھیں لیکن جب کاظم علی چار سال کے ہوگئے تو انہیں ان کی دادی نے اپنے پاس بلالیا۔ اب وہ دادی کے پاس ہی رہنے لگے۔

چھوٹے بھائی جناب رضا مظہری ''آج کل'' دہلی اگست 82ء کے جمیل مظہری نمبر میں لکھتے ہیں ''بھیا (جمیل مظہری) جب چار سال کے ہوئے تو دادی نے انہیں اپنے پاس رکھ لیا اور اتنے لاڈ پیار سے پرورش کرنے لگیں کہ خود اپنے ہاتھوں سے ان کے لیے الگ کھانا پکاتیں اور سب سے چھپا کر کھلاتیں۔ نماز روزے طہارت وغیرہ کی بے حد پابند تھیں۔ ان کے بستر پر ان کے صاحب زادوں کو بھی بیٹھنے کی اجازت نہ تھی مگر یہ لاڈلے پوتے ضد میں آکر آنگن میں لوٹ لگاتے اور آکر بستر پر دراز ہوجاتے۔

جب بھیا نے پانچویں سال میں قدم رکھا تو ان کا مکتب ہوا۔ موضع عشری کے مولوی سید طالب حسین ان کے معلم مقرر ہوئے۔ پڑھائی شروع ہوئی۔ بھیا کبھی جانے میں کچھ تامل کرتے تو اماں انہیں زبردستی بھیجنا چاہتیں۔ وہ ماں کے ڈر سے جانے لگتے تو دادی کہتیں' کیسا لڑکا ہے' کہہ دے سر میں درد ہے جاکے لیٹ رہ۔ اس صورتِ حال کو دیکھتی تو اماں جزبز ہوجاتیں مگر ساس کے سامنے کچھ نہ کہہ سکتیں۔ ان کا تعلق اس گھرانے سے تھا جو پٹنہ کا گریجویٹ خاندان کہلاتا تھا اس لیے وہ تعلیم کو مقدم سمجھتی تھیں۔ وہ موقع کی تلاش میں تھیں کہ کسی طرح بہ عنوان شائستہ دادی کو پوتے سے الگ کردیں۔ حسنِ اتفاق سے یہ موقع انہیں 1910ء میں مل گیا۔ والد مرحوم کو علمی وادبی ذوق بہت تھا۔ زمیندار خاندان سے تھے۔ اس لیے ملازمت کی ضرورت نہ تھی مگر منجھلے ماموں خان بہادر سید احمد علی خان علیم نے ان کی علمی صلاحیت اور ادبی ذوق کو رائیگاں جاتے دیکھ کر انہیں مشورہ

علامہ وحشت کلکتوی لکھتے ہیں

''جمیل مظہری کے کلام کی دلکشی کا راز ان کی انفرادیت میں مضمر ہے۔ ان کا کہا ہوا پکار پکار کر کہتا ہے کہ میں جمیل مظہری کی تخلیق ہوں۔ ان کے خیالات ایک خاص انداز کے لفظ طلب کرتے ہیں جو ہمیشہ ان کی خدمت کے لیے حاضر رہتے ہیں۔ خیالات کی ندرت اور الفاظ کی مناسبت اعجاز کے درجے تک پہنچ جاتی ہے۔'' پروفیسر مجنوں گورکھپوری رقم طراز ہیں کہ وہ شاعر تھا اور شاعر کے عام تصور سے بلند تھا' وہ مفکر تھا اور مفکر کے عام تصور سے بلند تھا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ تخلیقی اور تنقیدی صلاحیت کے ساتھ اتنا وسیع تاریخی وادبی علم رکھتے ہوں۔ گویا جمیل مظہری کی شخصیت شعر اور علمی فضلیت دونوں کا خوشگوار جوہر تھی۔'' علامہ نیاز فتح پوری ان کے بارے میں لکھتے ہیں ''جمیل مظہری ملک کے ان مخصوص شعراء میں ہیں جو اردو شاعری میں اس وقت استادانہ بلکہ مرشدانہ حیثیت رکھتے ہیں اور جن کی شاعری ایک مستقل دبستان کی حیثیت رکھتی ہے۔'' ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی اظہارِ خیال کرتے ہیں ''مقبولیت حاصل کرنے والے شعرا میں کسی کی پرواز جمیل مظہری تک نہیں۔ فکروفن کے اعتبار سے ان کا کوئی ہم عصر ان کے حریف ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔'' جوش ملیح آبادی لکھتے ہیں ''لکھنو سے خط آیا تو وہاں کے گلی کوچے اور کوٹھے نظروں کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے لیکن جمیل مظہری کے انتقال کی خبر پڑھی تو تصورات کا یہ محل گر کر تباہ ہوگیا۔ ہائے جمیل مظہری! کیا کہوں' کیا لکھوں کیا کروں؟ سب نے ساتھ چھوڑ دیا۔ کس کس کا ماتم کروں۔ اب تو میری موت پر آنسو بہانے والا پرانا دوست شاید ہی کوئی باقی ہو۔''

دیا کہ وہ پٹنہ اینگلو عربک اسکول میں اردو' فارسی اور عربی کے معلم مقرر ہوجائیں۔ والد نے یہ مشورہ قبول کرلیا۔ اب والدہ کو مستقل پٹنہ رہنے کا موقع ملا تو بھیا کو دادی سے جدا کرکے پٹنہ لے آئیں۔ مولوی صاحب جو بھیا کے معلم تھے

وہ بھی ساتھ آئے تاکہ تعلیم کا حرج نہ ہو۔ وہ انہیں گھر میں پڑھاتے پھر بھیا کو مدرسہ سلیمانیہ پچھم دروازہ پٹنہ سٹی کی ابتدائی جماعت میں داخل کر دیا گیا مگر وہ زیادہ دن وہاں پڑھ نہ سکے کیونکہ والد صاحب کا تبادلہ موتیہاری ضلع اسکول میں ہوگیا۔ اسی دوران میں یعنی 1912ء میں دادی کا انتقال ہوگیا پھر مولوی طالب علی نے بھی پٹنہ چھوڑ دیا اور اپنی جگہ اپنے ایک عزیز مولوی سید امداد امام عشروی کو رکھوا گئے۔ مجبوراً 1914ء میں والدہ صاحبہ کو بھی موتیہاری منتقل ہونا پڑا۔ وہیں کے ضلع اسکول میں بھیا کو پانچویں جماعت میں داخلہ دلوا دیا گیا مگر وہاں بھی ہم زیادہ دن نہ رہ سکے اور 1915ء میں والدہ صاحبہ ہم سب کو لے کر پٹنہ لوٹ آئیں۔ بہانہ تھا ان کے میکے کی ایک شادی کا۔

1916ء میں والد صاحب کا پھر ایک بار تبادلہ ہوگیا۔ اس بار انہیں ضلع مظفر پور اسکول میں مقرر کیا گیا تھا۔ بھیا کو بھی اسی اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ اسی سال انہوں نے سالانہ امتحان میں اردو کے پرچے میں گھوڑے پر مضمون لکھا' اس مضمون میں انہوں نے میر انیس کے ایک مرثیے کے وہ اشعار بھی لکھے جو گھوڑے کی تعریف میں تھے۔ کاپی چیک کرتے ہوئے مولانا شعیب عربک ٹیچر نے اس مضمون کو پڑھا تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی وہ پورے شہر میں اس کاپی کو فخریہ دکھاتے پھرے کہ یہ ایک بارہ سال کے بچے نے لکھا ہے' میری پیش گوئی ہے کہ یہ بچہ بڑا ہو کر یقیناً بہت بڑا ادیب بنے گا۔

1916ء کی ہی بات ہے۔ شہر کے ایک رئیس جناب امام الدین خان نے اپنی امام منزل میں ایک طرحی مشاعرہ منعقد کیا۔ یہ مشاعرہ اس لیے منعقد ہوا تھا کہ رام پور کے ایک تاجر عطر ثابت رامپوری ان دنوں مظفر پور آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے فخریہ کہا تھا کہ شاعری تو یو پی والوں کا حصہ ہے' بہار والے شاعری کیا جانیں۔ (حالانکہ عظیم آباد (پٹنہ) جو دلی اور لکھنو کے بعد اردو شاعری کا تیسرا گہوارہ تربیت تھا شاد عظیم آبادی' مبارک عظیم آبادی' مولانا فضل حق آزاد' نواب امداد امام اثر' میر باقر حسن کے متعلق داغ نے مثنوی ''فریاد داغ'' میں لکھا ہے۔

میر باقر کے گھر قیام ہوا
خوب دعوت کا اہتمام ہوا

مذکورہ بالا شعرا کے علاوہ یاس یگانہ چنگیزی' صفیر بلگرامی' شہید اعظم آبادی وغیرہ جیسے مشہور شاعر بھی بہار کے تھے)

امام الدین صاحب کو یہ بات گراں گزری اور انہوں نے صرف یہ دکھانے کے لیے کہ بہار کے اس چھوٹے سے شہر میں اردو کے اچھے شاعر موجود ہیں۔ والد مرحوم نے اپنی غزل طرح میں کہہ کر بھیا کو دے دی کہ وہ مشاعرہ میں پڑھ آئیں۔ اس غزل کا صرف ایک مصرع یاد رہ گیا ہے۔

رو ئے گئے وہ زار زار میرا مزار دیکھ کر

بھیا نے اس غزل کو ایک خاص انداز سے لہک لہک کر پڑھی۔ لوگوں نے خوب داد دی۔ اس کے بعد تو بھیا کو ہر مشاعرے میں بلایا جانے لگا۔

مظفر پور میں بھیا کی غزل خوانی کا یہ سلسلہ 1920ء تک چلتا رہا پھر وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے کلکتہ چلے گئے۔

اس کے بعد کا ذکر رضا مظہری ''سہیل'' گیا جمیل مظہری نمبر 1960ء میں اس طرح کرتے ہیں ''1920ء میں بھیا نے کلکتہ کا رخ کیا۔ حسن اتفاق سے ہمارے ماموں زاد بھائی مولوی سید زاہد علی خان' اس زمانے میں مدرسہ عالیہ' کلکتہ میں مدرس تھے۔ والد مرحوم نے بھیا کو انہی کی نگرانی میں مدرسہ عالیہ میں داخل کر دیا۔ 1921ء میں بھیا درجہ نہم سے درجہ دہم میں آئے۔ ان دنوں مدرسہ عالیہ کے ہیڈ ماسٹر خان بہادر مولوی محمد یوسف تھے۔ وہ ''سینٹ اپ'' کرنے کے معاملے میں کسی سے رعایت نہیں کرتے تھے۔ بھیا ہمیشہ سے ریاضی میں کمزور تھے۔ انہوں نے رعایت نہ ملنے کے خوف سے ٹیسٹ سے دو تین مہینے پہلے ہی ہائی اسکول میں اپنا نام لکھوالیا۔ اسی اسکول سے انہوں نے 1922ء میں فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا۔ (جبکہ وہ کلام حیدری کو دیے گئے انٹرویو میں کہتے ہیں کہ میں نے مدرسہ عالیہ سے میٹرک پاس کیا) مدرسہ عالیہ کے دوران تعلیم میں بھیا نے گویا شاعری شروع کی۔ ان کے ہم درس ایک صاحب اطہر قادری تھے جو جثہ وقد میں تو مخنی تھے مگر فتنہ انگیزی میں بلا کا سلیقہ رکھتے تھے چنانچہ بھیا نے ان کی ہجو لکھی۔

چلو آئے گا کلاس میں تکوار قادری

مگر باضابطہ شعر گوئی انہوں نے اس کے دو تین سال بعد شروع کی ہاں مشاعروں میں سامع کی حیثیت سے ضرور شریک ہوتے۔''

—

1922ء میں دفتر عصر جدید سے ایک رسالہ ''نشر'' شائع ہوا اسی میں علامہ جمیل مظہری کی پہلی نظم ''بادل کی بیٹی''

چھپی۔ اسی رسالہ میں انہوں نے گلی ورس ٹریول کا ترجمہ ''خوردک آباد کی سیر'' کے عنوان سے کیا۔

مشہور ادیب مالک رام ''آج کل'' دہلی میں لکھتے ہیں۔ ''اس کے بعد جمیل مظہری نے 1925ء میں سینٹ زیویرس کالج کلکتہ سے انٹر اور 1928ء میں اسلامیہ کالج اور بنگ باشی کالج کلکتہ سے بی اے کیا۔ اسی دوران میں ان کی زندگی قوس قزح سے مزین ہوگئی۔ اب تک ان کی شاعری صرف اور صرف تخیل کے سہارے رواں دواں تھی مگر اب اس میں رنگ بھر گئے تھے جس نے ان کی شاعری پر گہرے نقوش مرتب کرنا شروع کر دیے۔''

بقول ماہ منیر ''میرے بھیا (جمیل مظہری) بھی کبھی جوان تھے' ان کی شاعری بھی جوان تھی' ان کے دل کی صدائیں بھی کبھی سہانے گیت بنا کرتی تھیں۔ ان کی تمنائیں بچپن کے گھروندوں میں خوب خوب کھیل رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں کے آنسو کسی کے آنچل میں موتی بن رہے تھے۔ دھانی سائے اور گلابی دھوپ میں انہوں نے بھی پنگھٹ کا نظارہ کیا۔ پازیب کی جھنکار سے انہوں نے ہوا کو جھومتے سنا' نشیلی آنکھوں میں نیند کو کھیلتے بھی دیکھا۔ میرے بھیا کی زندگی شاید اسی جوانی کا سوگ ہے۔''

جمیل مظہری خود کہتے ہیں۔

کچھ اپنے منہ سے بولیں نہ بولیں سیج کی کلیاں
شکن بستر کی کہتی ہے کہ نیند آئی نہ عذرا کو

لیکن بدقسمتی سے یہ عشق پروان نہ چڑھ سکا اور 1938ء میں اس پر خط تنسیخ کھنچ گیا۔

اک تبسم کی ضرورت تھی سو وہ بھی نہ ملا
کیوں نہ جمیل اس کی جگہ زخم تمنا لیتے

اسی دوران میں جمیل مظہری کی مشہور نظم ''ڈرو خدا سے ڈرو'' سامنے آئی اور اتنی زیادہ مقبول ہوئی کہ شائقین ادب کے علاوہ عام لوگوں میں بھی اس نے جگہ بنالی اور فلمی گانوں کی کتابوں ایسی دو ورقی کتاب کلکتہ کے ایک صاحب نے چھاپ کر ہاتھوں ہاتھ بیچی۔ اس نظم کے چند اشعار یہ ہیں۔

سنو جمیل سنو تم سے یہ گزارش ہے
یہ آرزو نہیں دل سے نظر کی سازش ہے
سمجھ لو یہ کہ محبت بھی ایک خواہش ہے
اسے جنوں نہ بناؤ' ڈرو خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو

کاظم علی جمیل مظہری کی سن پیدائش میں اختلاف ہے۔ وفا راشدی نے ''شاعر'' آگرہ اپریل 1946ء میں 1904ء رضا مظہری نے ''سہیل'' گیا بھارت میں جمیل مظہری نمبر جلد دوئم میں یکم جنوری 1906ء لکھا ہے۔ جبکہ میر کاظم علی جو ان کا تاریخی نام ہے اس سے تاریخ ولادت 1321ھ نکلتی ہے اور اسکول سرٹیفکیٹ پر غلطی سے یکم جنوری 1905ء درج ہوگیا تھا۔ ''جمیل مظہری'' از مالک رام ''آج کل دہلی'' اگست 84ء اجتماع ضدین از رضا مظہری ''آج کل دہلی'' ''نقوش'' لاہور شخصیات نمبر۔ ''بیسویں صدی میں مغربی بنگال کے اردو شعراء'' از مشتاق احمد'' مسلم شعرائے بہار از حکیم سید احمد اللہ ندوی۔ ''سہیل'' گیا جمیل مظہری نمبر فروری مارچ 82ء سید محمد رضا کاظمی ''جمیل مظہری' مختصر حالات زندگی'' میں تحریر کرتے ہیں خاندانی روایت کے مطابق ان کی پیدائش ستمبر 1904ء میں ہوئی لیکن اسکول کے بابو نے سہولت کی خاطر یکم جنوری 1905ء کر دیا تھا اور یہی تاریخ ولادت ان کی تعلیمی اسناد میں نقل ہوئی۔

ادھر اُدھر نظر اٹھے تو سامنے تم ہو
ہلیں ہوا سے جو پردے تو سامنے تم ہو
کروں خدا کو جو سجدے تو سامنے تم ہو
نماز میں نہ ستاؤ! ڈرو خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو

جو پاس چولھے کے اماں کے ڈر سے جاتی ہوں
تو خود بھی جلتی ہوں سالن کو بھی جلاتی ہوں
نمک سمجھ کے شکر دال میں ملاتی ہوں
نہ یوں دیوانہ بناؤ' ڈرو خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو

میں ہاتھ جوڑ رہی ہوں تمہیں خدا کی قسم
شکستہ حالئی عذرائے بے وفا کی قسم
جو جل رہی ہو بتدریج اس چتا کی قسم
ہوس کی آگ بجھاؤ' ڈرو خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو

54 مصرعوں کی اس نظم کے بارے میں جمیل مظہری

خود کہتے ہیں ''لوگوں نے اسے میری آپ بیتی سمجھ لیا جو میرے خیال سے میری کامیابی کی دلیل ہے کیونکہ میرے خیال میں شاعری نام ہے اس شعور کا جو دوسروں کی بیتی ہوئی کو آپ بیتی بنا کر اس طرح پیش کرے کہ ہر سننے والا یہ سمجھے کہ کہنے والا اپنی کہانی کہہ رہا ہے۔ آپ کو سن کر یہ حیرت ہوگی کہ اس نظم کے پیچھے جو واقعہ ہے وہ میرا نہیں ہے' میرے ایک عزیز دوست کا ہے جسے ایک ایسی لڑکی سے محبت ہوگئی تھی جو سولہ سترہ سال کی عمر میں ایک بوڑھے سے بیاہ دی گئی تھی مگر اپنے دل میں ایک امنگوں بھرے دل کے ساتھ ایک شدید احساس فرض بھی رکھتی تھی۔ عشق و فرض کہ یہ ذہنی کش مکش اس کے ان خطوط میں نمایاں ہوتی رہتی جو اپنے چاہنے والے کو لکھا کرتی۔''

جمیل مظہری کی اس بات کو اکثر نقادوں نے غلط ٹھہرایا ہے اور اس نظم کو انہی کی آپ بیتی قرار دیا ہے۔ جمیل مظہری نے اس نظم کا جواب بھی لکھا تھا جس میں محبوب جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو اپنی محبوبہ کو سمجھاتا ہے۔

جوانی ایک چھاؤں تھی گزر گئی نکل گئی
ہمارا انتظار کر کے دوپہر بھی ڈھل گئی

لیکن ''عشق ناتمام'' نامی نظم کو اتنی مقبولیت نہیں ملی جو پہلی نظم کو ملی۔ جمیل مظہری نے 1931ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا۔ جمیل مظہری خود لکھتے ہیں ''پہلے میں نے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا اور پھر بنگو باشی کالج میں۔ وہیں سے میں نے بی اے کیا۔ فارسی اور تاریخ اسلام میں ایم اے کیا۔''

ایم اے کرنے کے بعد انہوں نے ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔ ذہن ادبی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ انہیں کسی ایسی نوکری کی تلاش تھی جو روح کو بھی غذا فراہم کر سکے۔ کچھ دوستوں نے مدد دی اور کچھ اپنا شوق' وہ روزنامہ الہند کے مدیر بن گئے۔ اپنے کلام کی اصلاح کے لیے وہ علامہ وحشت کلکتوی کے پاس جا چکے تھے۔ طوطی بنگال علامہ وحشت نے دو تین غزلوں پر اصلاح بھی دی مگر بعد میں انہوں نے کہہ دیا۔

''میاں جمیل! تمہاری زبان دانی مستند ہے' عروض و قواعد سے بھی واقف ہو' تمہیں اصلاح کی ضرورت نہیں۔''

علامہ وحشت کا حکم تھا اس لیے وہ اپنے اشعار انہیں برائے اصلاح نہیں دیتے لیکن نہ دل سے انہیں اپنا استاد مانتے۔ صرف گنتی کی چند غزلیں اصلاح کروائی تھیں پھر بھی دل میں عقیدت رکھتے تھے۔

میراث ملی ہے ہم کو وحشت تیری
کانٹوں کا مگر فرش ہے سنت تیری
اے سوز کی بھیک دینے والے سورج
کیا ہوگی چراغوں سے نیابت تیری

جمیل مظہری اس دور کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''ایم اے کا امتحان دے کر کلکتہ کی صحافتی زندگی میں داخل ہوا اور رفتہ رفتہ کلکتہ کی ادبی اور علمی مجلسوں تک جا پہنچا۔ میری عمر کا وہی حصہ جس کی یاد آج بھی میرے دل کو ایک روشن کنول بنائے ہوئے ہے۔ ماضی کی تاریکی میں مجھے پہلا روشن چہرہ جو نظر آتا ہے وہ اپنے شفیق ترین استاد مولانا رضا علی وحشت کا سنجیدہ اور گمبھیر چہرہ ہے۔ لیکن عام مولویوں کے چہرے کی طرح خشک اور سپاٹ نہیں بلکہ متبسم' محبت انگیز اور عقیدت آموز ان کے نام سے اس وقت سے واقف تھا جبکہ میری عمر دس بارہ سال کی تھی اور میں ''تمدن'' اور ''مخزن'' کے رسالوں میں ان کی غزلیں پڑھا کرتا تھا' بغیر سمجھے۔

چار پانچ سال بعد جب کلکتہ آیا تو میں نے انہیں ''مسلم انسٹی ٹیوٹ'' کے ایک مشاعرے میں غزل پڑھتے دیکھا۔ پھر ویلسلی اسکوائر کی سڑکوں پر آتے جاتے دیکھتا رہا اور ادب سے سلام کرتا اور وہ شفقت سے جواب دیتے رہے لیکن گفتگو کی ہمت نہ ہوئی۔ یہ ہمت اس وقت ہوئی جب وہ کلکتہ کے نئے اسلامیہ کالج میں بحیثیت پروفیسر اور میں بحیثیت طالب علم کے داخل ہوا۔ اسی دوران میں ان کے شاگردان خاص ابوالحسن بسمل اور قمر صدیقی سے میری ملاقات بڑھی اور انہی کے توسط سے میں بھی کبھی کبھی اتوار کو ان کے دولت کدے پر حاضر ہونے لگا۔ ہر اتوار کو ان کے دولت کدے کی یہ نشست ادب اور فن کا ایسا مدرسہ ہوتی تھی جو دس بجے دن سے دو بجے دن تک کھلا رہتا۔ ارباب ذوق اور یاران ادب آتے رہتے اور بہترین زعفرانی چائے' کیک اور سموسے سے ان کی ضیافت ہوتی رہتی۔

مولانا رحمتہ اللہ علیہ اپنی ذات سے بقول نواب امداد امام اثر میخانہ غالب کے تنہا ساقی تھے۔ میں اس میخانے کا جرعہ نوش بن کر کاظم سے جمیل مظہری بنا۔ استاد مرحوم بحیثیت شاعر کے ہندوستان کے ہر عظیم شاعر کے مقبول و مخدوم ہم عصر تھے۔ ان کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد اور نیاز فتح پوری کے علاوہ آغا حشر کاشمیری اور نواب خیال نے میرے ذہن

اور اس کی تعمیر میں مساوی حصہ لیا تھا۔ میں نے ہی ان دونوں (آخرالذکر) بزرگوں کی ملاقات کرائی تھی لیکن اس ملاقات کا سلسلہ بڑی تلخ کلامی پر ختم ہوا اور آغا حشر کے ڈراموں کا انگریزی ترجمہ کرانے کی جو تجویز تھی۔ وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ اس کی داستان یوں ہے کہ داستان اردو (تاریخ ادب اردو) کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے بعد نواب خیال نے ایک مقالہ فردوسی کی ڈرامائی رزمیہ نگاری پر لکھا اور تجویز یہ ہوئی کہ ایک بڑے جلسے میں وہ اسے پڑھ کر سنائیں۔ چنانچہ جلسہ ہوا۔ بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ نواب امام نے اپنے رسوخ سے ''کلکتہ میوزیم'' کا ایک بڑا ہال مخصوص کرادیا۔ صدارت کے لیے نواب صاحب نے آغا حشر کو موزوں ترین سمجھا۔ حالانکہ میں نے دبی زبان سے اس کی مخالفت کی کیونکہ میں جانتا تھا کہ آغا صاحب فردوسی (فارسی کا شاعر) کے قائل ہی نہیں بلکہ بدترین دشمن ہیں۔ وہ مجھ سے بار بار یہ کہہ چکے تھے کہ فردوسی شاعر نہیں بھانڈ تھا جو لوگ میر انیس کو فردوسی ہند کہتے ہیں وہ انیس کی توہین کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ جلسے میں نواب صاحب نے اپنا مقالہ پڑھا۔ سامعین نے ان کی تعریف میں بار بار تالیاں بجائیں اور آغا حشر کرسی صدارت پر بیٹھے پیچ و تاب کھاتے رہے' صدارتی تقریر کے لیے اٹھے' آندھی کی طرح چنگھاڑے اور بادل کی طرح گرجے' برسنے لگے۔ خطابت کے ساتھ ایکٹنگ کے کرشمے بھی دکھائے' فردوسی کو جی کھول کر کوسا' محمود غزنوی کی شرافت اور فردوسی کی ذلالت کی نئی نئی کہانیاں سنائیں اور سب سے بڑا ظلم یہ کیا کہ نواب صاحب کے مقالے کا ادبی حیثیت سے تعارف بھی نہیں کرایا جو بہ حیثیت صدر ان کا فرض منصبی تھا۔ ان کا غضب ناک چہرہ اور نواب خیال کی متحمل منفعل صورت وہ تصویریں تھیں جن کی عکاسی کی قدرت نہ میری زبان میں ہے اور نہ میرے قلم میں۔ بہرحال جلسہ بڑی ناگواری کے ساتھ ختم ہوا۔ نواب زادہ عبدالعلی اور علامہ وحشت جو بانیان جلسہ میں تھے' منہ لٹکائے ہوئے ہال سے باہر نکلے۔ آغا حشر' رزاق ملیح آبادی کے کاندھے پر ہاتھ دھرے کچھ مسکراتے اور کچھ شرماتے ہوئے چلے جارہے تھے۔ تیسرے دن نواب خیال کا مراسلہ روزنامہ ''ہند'' میں شائع ہوا جس میں شرکائے جلسہ کی شرکت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے آغا حشر کی گرم گفتاری کے سلسلے میں چبھتا ہوا جملہ لکھا تھا کہ تماشا اچھا تھا اور آپ لوگوں کی شام دلچسپی سے گزر گئی۔ آغا حشر نے جو اس مراسلے کو پڑھا تو آدمی سے سلگتا ہوا تنور بن گئے۔ آغا حشر جائیں تو جائیں کہاں۔ سیدھے عصر جدید کے دفتر پہنچے۔ شومئی تقدیر سے جناب خیال پہلے ہی سے میری میز کے سامنے ایک کرسی پر تشریف فرما تھے۔ آغا صاحب انہیں دیکھتے ہی مرکھنے بیل کی طرح چونچیں مارنے لگے۔ لیکن نواب صاحب حلم مجسم بنے بیٹھے رہے۔ ادھر شعلگی ادھر یخ بستگی ادھر خاموش اضطراب بڑی مشکل سے مولانا شائق احمد عثمانی نے آغا حشر کے ہاتھ پاؤں جوڑ کر انہیں رخصت کیا۔ حالات بدترین شکل اختیار کرچکے تھے کہ نواب زادہ عبدالعلی نے صلح کرادی۔

جمیل مظہری نے ایم اے کرتے ہی صحافتی زندگی کی شروعات کردی تھیں۔ سعید ملیح آبادی کے روزنامہ ''الہند'' کی ادارت سنبھال لی۔ نیا جوش تھا' ولولہ تھا' جوانی تھی خون میں گرمی تھی۔ حکومت برطانیہ کو خوب خوب لتاڑنا شروع کردیا۔ غلام ملک کا ایک معمولی اخبار اس حکومت پر تنقید کرے جس کے راج میں سورج کبھی غروب ہی نہیں ہوتا تھا۔ یہ بات حکومت برطانیہ کو بہت بری لگی اور اس بے باک اخبار کو صرف اداریوں کی وجہ سے ایک ماہ کے اندر بند کردیا گیا۔ اخبار بچانے کے لیے ملیح آبادی نے ان سے کنارہ کشی اختیار کرلی الہند سے نکلے تو فری لانسر کی حیثیت سے مختلف پرچوں میں لکھنے لگے۔ قلم میں تیکھا پن تھا' غضب کی کاٹ تھی۔ ان کے مضامین کو شائق احمد عثمانی بغور دیکھ رہے تھے۔ ان کی اسی خاصیت پر شائق احمد عثمانی نے انہیں جھپٹ لیا تاکہ ان کے روزنامے ''عصر جدید'' میں لکھیں حالانکہ شائق احمد عثمانی اور جمیل مظہری کے درمیان نظریاتی اختلافات کی گہری کھائی تھی پھر بھی دونوں میں خوب نبھنے لگی۔ اس اختلافات کی بنا پر جمیل مظہری نے یہ کہہ دیا تھا کہ میں ادبی حصہ لکھوں گا اور آپ سیاسی۔ چنانچہ وہ ''کوچہ گرد'' کے قلمی نام سے کالم لکھنے لگے۔ اسی دوران میں ایک ہفتہ وار اخبار بھی نکالا مگر وہ چل نہ سکا لیکن ان کا کالم بدستور چلتا رہا۔

مختلف اوقات میں زمانہ' ہمدرد' شفاعت اللہ خان نے جاری کیا ان میں بھی وہ بہ حیثیت جوائنٹ ایڈیٹر کے کام کرتے رہے جب صدیق انصاری نے ''پنچ'' شروع کیا تو انہوں نے اس اخبار کے ذریعے اپنا ایک الگ ''روپ'' قارئین کے سامنے پیش کیا۔

کلکتہ کئی معنوں میں اہم مقام رکھتا تھا۔ آبادی کے لحاظ سے اس دور میں بھی سب سے بڑا شہر تھا۔ انگریزوں نے 1875ء کے بعد سے ہی دہلی کو پایۂ تخت بنالیا تھا۔ دارالحکومت منتقل ہوجانے کی وجہ سے اس شہر کو اجڑ جانا چاہیے تھا مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کی وجہ سے اب تک یہ شہر اہمیت کا حامل بنا ہوا تھا۔ ہندوؤں اور کرچھوں کی مجموعی آبادی کے برابر مسلمانوں کی آبادی تھی۔ ''چوبیس پرگنہ'' میں اکثریت مسلمانوں کی تھی اس لیے شہر میں بھی مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی تھی۔ شہری اور دیہاتی مسلمانوں میں اگر کوئی فرق تھا تو صرف اتنا کہ دیہاتیوں کی زبان بنگلہ تھی اور شہریوں کی اردو اسی وجہ سے 1935ء میں خلافت کمیٹی نے مسلم کانفرنس کا انعقاد کیا۔ اس کانفرنس کے ساتھ اردو لٹریری کانفرنس کی بھی داغ بیل ڈالی اور حسین شہید سہروردی وملاجان محمد نے اصرار کرکے مجلس استقبالیہ کی صدارت جمیل مظہری کو سونپ دی۔

اس کانفرنس میں انہوں نے ایک ایسا خطبہ پڑھا جو خاصہ انقلابی تھا۔ اس خطبے میں انہوں نے صاف اور واضح الفاظ میں کہا کہ ادب برائے ادب کے نظریہ سے انحراف ضروری ہے۔ اردو ادب اگر آزادی کی تحریک کے کام نہیں آسکتی تو اس کے یہی معنی ہیں کہ یہ اپنا فرض پورا نہیں کرسکتا۔ مولانا حسرت موہانی نے اس خطبے پر سخت تنقید کی لیکن خواجہ حسن نظامی نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ وطن عزیز کی آزادی کے لیے ضروری ہے کہ ہر سطح پر کوشش ہو۔ ادب تو ہمارا سب سے مضبوط ذریعہ ہے۔

جس وقت جمیل مظہری اسٹیج سے اترے مولانا شوکت علی نے مجمع کے درمیان سے انہیں کھینچا اور اپنے سینے سے لگالیا۔ وہ انہیں بار بار چوم رہے تھے اور کہتے جارہے تھے۔ ''مظہری، تم نے میرے دل کی بات کہہ دی، خدا تمہارے قلم اور زبان کو مزید تقویت دے۔''

اس کانفرنس نے انہیں مولانا ابوالکلام آزاد سے زیادہ قریب کردیا اور بعد میں یہ قربت اتنی زیادہ مضبوط ہوگئی کہ انہوں نے بہار کے محکمہ نشرواشاعت میں بطور پبلسٹی افسر تقرر کے لیے پروفیسر عبدالباری کو ہدایت کردی۔ پٹنہ میں عبدالباری کو کلیدی اہمیت حاصل تھی۔ انہوں نے فوراً جمیل مظہری کو پٹنہ بلوالیا۔ مولانا ابوالکلام بھی پٹنہ آگئے اور انہوں نے بھی سفارش کردی۔ اس طرح 2 دسمبر 1937ء سے وہ بطور پبلسٹی افسر مقرر ہوگئے۔

وقت گزرتا رہا اور پھر ہندوستان کی سیاسی کشمکش کا سب سے اہم سال آگیا۔ دوسری عالمی جنگ اپنے شباب پر تھی۔ اتحادیوں کو ہر محاذ پر ہزیمت کا سامنا تھا۔ جاپان نے پرل ہاربر پر امریکی اور انگریزی بحری بیڑے کو شدید نقصان پہنچایا تھا اور جرمنی، اٹلی کے محور کے ساتھ اپنی وابستگی کا اعلان کرکے اتحادیوں کے خلاف میدانِ جنگ میں کود پڑا تھا۔ اس نے سنگاپور، مایا، برما کو برق رفتاری سے روند ڈالا تھا اور اب کلکتہ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ مسلم لیگ کی کامیابی بہت نزدیک آچکی تھی کہ کانگریس کی مجلس عاملہ نے 8 اگست 1942ء کو Quit India یا بھارت چھوڑو قرارداد منظور کرلی۔ اس کے بعد وسیع پیمانے پر کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے ورکروں کی گرفتاریاں شروع ہوگئیں۔ ان حالات میں جمیل مظہری کے لیے ملازمت میں رہنا ناممکن ہوگیا اور انہوں نے استعفیٰ داغ دے دیا۔ یہ استعفیٰ کئی معنوں میں انوکھا تھا۔ اس میں نوکری چھوڑنے کی وجہ جو بتائی گئی تھی اس میں فنی اصطلاحات کی جگہ سخت و درشت الفاظ کا استعمال کیا گیا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں بھی گرفتار کرلیا گیا۔ ایک ماہ تک وہ قید رہے، رہائی ملتے ہی انہوں نے عظیم آباد (پٹنہ) سے باہر نکلنے کی ٹھان لی۔ کلکتہ کے دروازے پر جاپانی دستک دے رہے تھے۔ وہاں ہر طرف خوف وہراس پھیلا ہوا تھا۔ کہاں جائیں، وہ بھی اسی الجھن میں تھے کہ بمبئی سے جوش ملیح آبادی کا بلاوا آگیا۔ انہوں نے جمیل مظہری کو یقین دہانی کرائی تھی کہ ان کی خود اعتمادی مجروح نہیں ہوگی اور اس یقین دہانی پر وہ بمبئی روانہ ہوگئے۔ جوش پہلے انہیں فضلی برادرس کے پاس لے گئے لیکن وہاں کلکتے سے آرزو لکھنوی آکر ذمے داری سنبھال چکے تھے۔ اس کے بعد وہ انہیں محبوب اور کاردار صاحب کے پاس لے گئے۔ محبوب صاحب نے ان کے اعزاز میں ایک بہت بڑی دعوت کا اہتمام کیا اور ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ انہوں نے جمیل مظہری سے اپنی ایک فلم کے لیے معاہدہ بھی کرلیا لیکن ایک سین پر دونوں کا اختلاف ہوگیا اور وہ جوش کے ساتھ پونا چلے گئے۔ بمبئی آکر جمیل مظہری مشہور نقاد محمد رضا کاظمی کے والد موسیٰ رضا کاظمی کے گھر ''گوبائی ہاؤس'' بائی کلہ میں ٹھہرے تھے۔ پونا میں ان کا قیام جوش کے ساتھ ظاہر پیلس میں رہا۔ انہی دنوں جمیل مظہری کی ملاقات یونیٹی فلمز کے رنجیت شرما کے ساتھ ہوگئی اور وہ انہیں اپنے ساتھ واپس کلکتہ لے آئے۔ یہیں انہوں نے کروشیتر کے گانے

لکھے جسے سہگل نے گایا اور کافی مقبول ہوئے۔ انہوں نے ''گھومتی دنیا'' کی کہانی لکھی مگر فلم مکمل نہ ہو سکی۔ بقول جمیل مظہری ''خاندان کا بوجھ تھا۔ بے کار رہ نہیں سکتا تھا۔ کلکتہ میں بھی اسی لیے رہا اور بمبئی بھی فکر معاش کھینچ لے گئی اور میں 43ء سے 47ء تک فلمی دنیا سے وابستہ رہا۔ فلم آرزو کے مکالمے اور کرو... شیتر کے گانے لکھے۔ وارث شاہ کی زندگی سے متعلق ایک ڈراما لکھا مگر فلم بننے کے بعد کارکنان کا جھگڑا ہو گیا۔ مقدمہ تک بات پہنچی اور پھر پتا نہیں اس فلم کا کیا بنا۔ مجموعی طور پر فلمی دنیا مجھے پسند نہیں آئی اس کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کر سکتی ہے مگر طمانیت نہیں دے سکتی۔ ظاہر داری' تصنع کے علاوہ مجھے پورا ماحول بڑا عامیانہ معلوم پڑا۔''

فلمی دنیا سے بے زاری کا اظہار وہ اپنی مشہور نظم ''بھاگ شاعر بھاگ'' میں بڑی خوش اسلوبی سے بیان کرتے ہوئے فلمی دنیا سے بھاگ آئے۔ اسی دور کا ذکر ہے' علامہ جمیل مظہری نے شادی نہیں کی تھی اس کی ایک وجہ یہ بھی کہ انہیں اختلاج قلب کا عارضہ تھا۔ اسی اختلاج قلب کی وجہ سے ایم اے کے امتحان میں ایک پرچہ چھوڑ آئے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بجائے فرسٹ کے سیکنڈ ڈویژن ملا حالانکہ جس دوست کو انہوں نے فارسی ادب پڑھایا تھا' وہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوا۔ اختلاج کی اس شدت کو بعض اعزا نے جنون سمجھا اور اسی غلط فہمی نے 1928ء میں بچپن سے منصوب پھوپی زاد کا رشتہ منقطع کروا دیا۔ اسی سال چھوٹی بہن کی شادی ہوئی لیکن وہ کم نصیب صرف ساڑھے تین سال سہاگن رہی۔ ان دو حادثوں کا انہوں نے اتنا اثر لیا کہ شادی نہ کرنے کا عزم کر لیا۔ بہن کے بچوں کو اپنی اولاد کی طرح پالا۔ 1938ء میں انہیں شادی کا خیال آ گیا اور محمود طرزی سے استدعا کی کہ ان کے لیے دلہن دیکھی جائے۔ عمر پینتیس چھتیس ہونا چاہیے۔ محمود طرزی نے تلاش شروع کر دی۔ کافی تلاش کے بعد انہیں ایسی ہی ایک عورت مل گئی۔ انہوں نے علامہ سے ذکر کیا۔ علامہ نے اب ایک نئی بات کر دی۔ ان کا اصرار تھا کہ وہ اس عورت کو دیکھیں گے۔ 1945ء میں ایسی بات ناممکن تھی پھر بھی محمود طرزی نے اپنے طور پر کوشش کی اور اس عورت کو دکھا دیا۔ اسے دیکھنے کے بعد علامہ نے مسترد کر دیا۔ ساتھ ہی یہ تاکید بھی کی کہ تلاش جاری رہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مجھے ڈاکٹروں نے تاکید کی ہے کہ جلد شادی کر لوں ورنہ میری

غزلیں

بقدر پیمانہ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

بس ایک احساس نارسائی نہ جوش اس میں نہ ہوش اس کو
جنوں پہ حالت ربودگی کی' خرد پہ عالم غنودگی کا

ہے روح تاریکیوں میں حیراں بجھا ہوا ہے چراغ منزل
کہیں سر راہ یہ مسافر پٹک نہ دے بوجھ زندگی کا

خدا کی رحمت پہ بھول بیٹھوں' یہی نہ معنی ہے اس کے واعظ
وہ ابر کا منتظر کھڑا ہو' مکان جلتا ہو جب کسی کا

جمیل حیرت میں ہے زمانہ مرے تغزل کی مفلسی کا
نہ جذبہ اجتبائے رضوی نہ کیف پرویز شاہدی کا

☆☆☆

کچھ تو گرد راہ گرد کارواں بنتے رہے
کچھ غبار ایسے بھی تھے جو آسماں بنتے رہے

ہم نے یہ عالم بھی دیکھا اے جنون خود گری
کہ چمن اجڑا کیا اور آشیاں بنتے رہے

تارے سورج ہو گئے لمحات صدیاں بن گئے
اور خلا میں آسماں پر آسماں بنتے رہے

کاروانِ وقت آگے کی طرف بڑھتا رہا
اور ہم انسان گرد کارواں بنتے رہے

ہم نے اس دنیا میں آ کر کیا بتایا' کیا بنے
ہاں مگر کچھ عالم وہم وگماں بنتے رہے

ایک وہ جو بے تپش کرتے رہے اظہارِ نور
ایک ہم جو سوز رکھ کر بے زباں بنتے رہے

ہم نہ سمجھے کچھ' چمن کا راز اچھالا کی نسیم
پھول کھل کھل کر مشیت کی زباں بنتے رہے

مظہری جلتا رہا یوں ہی میرے دل کا الاؤ
کوئی پاس آیا نہیں شعلے دھواں بنتے رہے

(جمیل مظہری)

شاعرانہ صلاحیتیں ماند پڑ جائیں گی۔ محمود طرزی نے جھلا کر کہا کہ اب کیا میرا یہی کام رہ گیا ہے کہ ہر گھر میں گھس کر لڑکیاں دیکھوں اور پھر آپ کو دکھاؤں۔ یہ ناممکن ہے اس کا انجام یہ ہوگا کہ محلے والے میری اور آپ کی ایسی مرمت کریں گے کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ بات معقول تھی' علامہ خاموش ہو گئے۔ اور پھر اپنی تلاش کا رخ ضیا برج کی جانب موڑ دیا اور کامیاب بھی ہو گئے۔ محمود طرزی نے جس خاتون کو دکھایا تھا وہ خود کو یوں مسترد کیے جانے کو اپنی ہتک سمجھنے لگیں مجبوراً ان سے محمود طرزی کو شادی کرنا پڑی۔

اسی دوران میں روزنامہ عصر جدید کلکتہ کی سلور جوبلی منانے کا اہتمام ہوا۔ سلور جوبلی نمبر میں جمیل مظہری نے اپنے اور مولانا شائق احمد عثمانی (مدیر عصر جدید) کی دوستانہ تعلقات کی داستان نہایت انوکھے انداز میں لکھی۔ اس مضمون کو خاصی شہرت مل گئی تھی۔

بمبئی سے 1947ء میں لوٹنے کے بعد ان کا تقرر بہ حیثیت ڈپٹی ڈائریکٹر پبلسٹی اینڈ فلم سیکشن گورنمنٹ آف بہار ہو گیا۔ لیکن وہ اس عہدے پر صرف تین سال رہے اور پھر جنوری 1950ء میں پٹنہ کالج میں پروفیسر کی آسامی پر چلے گئے۔ اس دور کا ذکر کرتے ہوئے امہ جبیں لکھتی ہیں۔

''پروفیسروں میں عام طور پر علمی رکھ رکھاؤ' ضرورت سے زیادہ متانت' عالمانہ شان اور اپنے کو ہمہ وقت لیے دیے رہنے کا انداز اپنایا جاتا ہے۔ علامہ چچا جمیل مظہری میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ علم کے ایک بحرِ ذخار تھے مگر ہمہ دانی کی شان اپنے اندر پیدا نہیں ہونے دی ان کے پڑھانے کی تعریف کرنا دشوار ہے۔ ان کے کلاس کی منظر کشی کرنا ناممکن ہے' کلاس میں داخل ہوتے ہی وہ منہ پھاڑ کر اور آنکھیں پھیلا کر چند منٹوں تک اِدھر اُدھر خلا میں دیکھتے مگر آپ یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ وہ کیا دیکھ رہے ہیں' بعد ازاں ٹوپی اتار کر میز پر رکھتے ہوئے ایک خاص انداز سے اپنی کرسی پر دراز ہو جاتے پھر جیب سے سگریٹ کا ڈبا نکال کر مرغولہ بناتے' اس دوران میں آنکھیں بند رہتیں اور یہ سلسلہ اس وقت تک رہتا جب تک کوئی ان کے ہاتھوں میں رجسٹر دے کر چونکا نہ دیتا۔ اگر کسی روز لڑکے پڑھنے کے موڈ میں نہ رہتے تو ان کو اسی حالت میں چھوڑ دیتے ایسی حالت میں جب یکا یک علامہ چچا اپنے خیالوں کی دنیا سے باہر آتے تو ایک خاص انداز سے کہتے' ہاں بھئی حاضری بنواؤ اور جب ان کو معلوم ہوتا کہ وقت ختم ہو رہا ہے تو پیشانی پر شکن ڈال کر کہتے آپ لوگوں نے مجھے قبل ہی کیوں نہیں کہا اور پھر جلدی جلدی پڑھانا شروع کر دیتے اور اس طرح ڈوب کر پڑھاتے کہ وقت ختم ہونے کا احساس ہی نہیں رہتا۔ جب ہم میں سے کوئی ڈرتے ڈرتے کہتا کہ سر وقت ختم ہو گیا تو اپنے مخصوص انداز میں جواب دیتے کہ آپ لوگوں نے قبل ہی کیوں نہیں کہا۔ علامہ چچا شاگردوں کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتے' ان کی تعریف کرتے' ہمت افزائی کرتے' ان کے دکھ درد میں کام آنا اپنا فرض سمجھتے۔ نہایت بے تکلفی سے اپنے شاگردوں کے گلے میں بانہیں ڈال کر باتیں کرتے اور جب غصہ آتا تو مدرسہ کے مولوی صاحب کی طرح گوشمالی کرتے۔ کلاس میں پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ شروع ہوتا تو یکا یک ایسا محسوس ہونے لگتا گویا ہم سب اس محفل میں سامعین کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ علامہ چچا ہم میں ہر ایک سے فرداً فرداً باتیں کر رہے ہیں۔ کسی بھی موضوع پر گفتگو کر رہے ہوں' الفاظ و معنی کا ایک سمندر سا امنڈ پڑتا۔ غور و فکر کی نئی شاہراہیں ابھرتی نظر آتیں۔ نیا شعور انگڑائیاں لے کر اٹھتا ہوا نظر آنے لگتا۔ خرد و آگہی کے نقاروں پر چوٹ پڑتی سنائی دینے لگتی۔ لیکچر کے دوران میں گرج دار آواز' شاندار الفاظ' انوکھا انداز بیان' شاعرانہ تشبیہیں اور فنکارانہ استعارے استعمال کرتے۔ وہ اقوال اور اشعار کا حوالہ اس طرح دیا کرتے جیسے کسی مشہور اخبار میں شائع شدہ مضامین کو پڑھ کر سنا رہے ہوں۔ ان کے پڑھانے کے انداز میں بڑی گرم جوشی ہوتی جیسے ادب کی تعلیم اس شخص کے لیے صرف روزی کمانے کا ذریعہ نہ ہو بلکہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہو۔ وہ اکثر مجھ سے کہتے کہ بیٹی' میں چاہتا ہوں کہ تیرے اندر علم کا صحیح ذوق پیدا ہو۔ ڈگریاں تو سبھی حاصل کر لیتے ہیں لیکن طالبِ علم بہت کم ہوتے ہیں۔ ایک بار انہوں نے بڑے ہی جذباتی انداز میں مجھ سے کہا تھا ''بیٹی' میں علم کی دولت کو ودیعت کر رہا ہوں' تم اسے اپنے سینے میں دفن مت کر دینا بلکہ اس دولت کو سینہ بہ سینہ منتقل کرنا لیکچروں ہی میں نہیں بلکہ ٹیکسٹ بک پڑھانے میں بھی بار بار اس کا احساس ہوتا کہ طلبہ اور استاد ایک فطری سفر پر ایک ساتھ روانہ ہوئے ہیں۔ کوئی ایک قدم آگے ہے کوئی کچھ پیچھے۔ اس وقت علامہ چچا ایک ایسے گائیڈ کی طرح نظر آتے جو خود بھی ہم سفر کی ٹولی میں گھل مل گیا ہو اور اپنے بیان سے لذت لے رہا ہو۔ یہ احساس اس وقت اور شدید ہو جاتا جب علامہ چچا' غالب پر لیکچر دیتے۔ اس وقت ایسا

معلوم ہوتا کہ وہ راہ کسی سمن پوش کناریوں اور جلوہ بار گلستانوں کو متعارف کراتے ہوئے بڑھے جا رہے ہیں اور بڑھتے بڑھتے ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتے اور گل گشت کرنے لگتے ہیں۔ ان کے پڑھائے اشعار جمالیاتی تجربہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مشکل الفاظ کے ساتھ ساتھ باریک نفسیاتی و جذباتی مسائل بھی حل کرتے جاتے۔ خواہ اس میں کتنا بھی وقت صرف ہو۔ اکثر محض ایک شعر کی تشریح کے لیے پورا ایک گھنٹا صرف کر دیتے۔"

پھر وہ پٹنہ کالج سے سبکدوش ہو گئے شاید وہ 1960ء کا سال تھا۔ تو انہیں پٹنہ یونیورسٹی نے شعبہ اردو کے لیے تقرر کر لیا۔ 1965ء تک علامہ یونیورسٹی سے وابستہ رہے پھر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے ریسرچ اسکالر مقرر ہو گئے۔ انہوں نے اپنے مقالے کے لیے اردو مرثیے کا تاریخی پس منظر کا موضوع انتخاب کیا تھا لیکن برا ہو چور کا۔ وہ پٹنہ سے اپنے گھر بھیکن پور مظفر پور جا رہے تھے کہ دورانِ سفر ان کا بیگ جس میں مواد تھا کسی نے اڑا لیا۔

عام طور پر لوگ جمیل مظہری کو ایک بلند پایہ شاعر، ایک شفیق استاد اور ایک خلیق انسان کی حیثیت سے جانتے ہیں، کچھ ایسے لوگ جو مظہری کی طرح خود بھی ادب و شاعری کی بزم میں شمع کی مانند جلتے ہیں اور اب اس بزم کے غم فراق میں کم ہیں جمیل مظہری کے ظریفانہ رنگ سخن سے بھی کسی حد تک واقف ہیں لیکن اب تک جمیل مظہری کی تنقیدی صلاحیتوں کے احساس اور اعتراف پر بہت کم لکھا گیا۔ ان کی پچاس سالہ ادبی زندگی کے تقریباً ہر دور میں ان کی شاعری کے ساتھ ساتھ نثر نگاری کا بھی ضمنی طور پر ذکر ہوتا رہا۔ مثلاً ندیم کے بہار نمبر 1935ء میں جمیل مظہری کی کامیاب افسانہ نگاری اور دلکش اسلوب کا اعتراف کیا گیا۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین نے جب 1960ء کے قریب مختصر تاریخ ادب اردو کا دوسرا ترمیم شدہ ایڈیشن ترتیب دیا تو جمیل مظہری کی شاعرانہ عظمت کے تفصیلی اعتراف کے بعد ان کی "شگفتہ نثر نگاری" کا بھی ذکر کیا۔ آل احمد سرور نے "عصری ادب" میں ان کی شاعری کے ساتھ ساتھ نثر نگاری کا بھی تذکرہ چھیڑا۔ اویس احمد دوراں نے "سریر" میں اعتراف کیا کہ اگر جمیل مظہری شعر گوئی کی طرح نثر نگاری کو بھی اپنے فکر وفن کے ابلاغ کا مستقل وسیلہ بنائے ہوئے ہوتے تو آج اردو کے نثری ادب میں بھی وہ بڑے بڑوں کے ہمسر ہوتے۔

جمیل مظہری

رباعی

(1973ء میں جب بینائی زائل ہو گئی)

زخم اپنے دل و جگر کا سی لیں گے جمیل
جس طرح جلائے گا جی لیں گے جمیل

جب آنکھ نہیں پھر قلم سے کیا کام
خون اپنے دماغ کا بھی پی لیں گے جمیل

☆☆☆

اے عمر رواں ٹھہر کہ چلتا ہوں میں
دے مہلت یک نفس کہ بوڑھا ہوں میں
یہ جسم کی جھریاں نہیں ہیں شاید
زنجیریں ہیں زنجیروں میں جکڑا ہوں میں

☆☆☆

جمیل مظہری کے تنقیدی مضامین میں سب سے پہلا مضمون نواب نصیر حسین خیال کی مشہور کتاب "مغل اور اردو" کا مقدمہ ہے پھر "آئینے خانے میں" اختر شیرانی پر 1934ء میں "تصویر" لاہور میں تبصرہ شائع ہوا۔ حکومت بہار کے تعلقات عامہ کا جریدہ "بہار کی خبریں" منظر عام پر آیا تو اس میں ان کے تنقیدی مضامین تواتر سے آتے رہے۔ اسی دوران میں مولانا ابوالکلام آزاد، رضا علی وحشت، ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی، انشاء اللہ خان ایک ٹریجڈی اور مرزا غالب پر لکھے گئے مضامین غالب ایک مصلح فنکار جنوری 69ء "انیسویں صدی کا ایک اجنبی ذہن" اگست 69ء کے علاوہ کل کا عظیم آباد (جنوری 1970ء) فرقہ وارانہ ذہنیت کا تاریخی پس منظر (جنوری 1971ء) قومیت کے ذہنی سانچے (اگست 1971ء) اور ہندوستان بین الاقوامیت میں ایک بین الاقوامی زبان کی ضرورت (اگست 1972ء) بہار کی خبریں میں شائع ہوئے، میر انیس کی نامقبولیت کے اسباب، میر انیس اور صنفی جذبات کی ترجمانی (مجلہ یادگار انیس کمیٹی پٹنہ 74ء) دو اقبال (علامہ اقبال سیمینار منعقدہ لکھنو 29 دسمبر 77ء) غالب کے نقش قدم پر (ماہنامہ "گنگ وجمن" کانپور اپریل 76ء اور آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے نشر شدہ) شاد عظیم آبادی کی استعاراتی شاعری (ماہنامہ

زبان وادب پٹنہ شاد عظیم آباد نمبر مارچ 79ء) صفی لکھنوی کی جغرافیائی شاعری (آج کل نئی دہلی ستمبر 80ء) دانش کی شاعری پر ایک نظر (1954ء) مکاشفات کشفی (1958ء) واحد پریمی کا گل پو (1967ء) مظفر حیدری کا جام جم (1967ء) قاسم شبیر نقوی کی میری غزلوں میں آثار کربلا (سرفراز لکھنو 2 مئی 1970ء)

قاسم شبیر کی نقش مرثیہ (سرفراز لکھنو 27 دسمبر 1973ء) فضا شمسی کا دیوان نکہت و خلش (1974ء) تقریظ۔ سازو آواز (1975ء) علقمہ شبلی کا حرف وصوت (1975ء) تجزیہ۔ وہ جو شاعری کا سبب ہوا (مجموعہ کلام کلیم عاجز ''بزم کاف'' 1946ء) صفیر بلگرامی حیات وکارنامے (1976ء) تعارف وحرف آگہی (1977ء) محمد عسکری جدید کے چھ مرثیے اعجاز ناطق (1978ء) تبصرہ وتقریظ بقا نظامی عظیم آبادی کی صہبائے بقا (1979ء) مقالہ۔ کلکتہ اک رباب (1966ء) تعارف۔ بکھری کرنیں (1980ء) تعارف۔ حکایت ہستی (1980ء) میرا نظریہ شعر اور میری شاعری (خودنوشت۔ ماہنامہ کائنات مرزا پور جمیل مظہری نمبر جون 1982ء اور جمیل مظہری نمبر ماہنامہ صبح نو پٹنہ مارچ 1963ء) غبار کارواں' شعروشاعری اور برکات اسلام (کائنات جمیل مظہری نمبر) ''اسلام اور نازیت کا فرق'' ''اجتماع ضدین'' (روز نامہ عصر جدید سلور جوبلی نمبر) قومیت کے ذہنی سانچے (بہار کی خبریں اگست 71ء) یاد ماضی (خودنوشت' آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے نشر اور کائنات مرزا پور اپریل تا جون 82ء میں طبع) اس کے علاوہ بھی بے شمار تنقیدی مضامین وقتاً فوقتاً مختلف ادبی جریدوں میں چھپے یہ سارے مضامین بزبان خود ان کی تنقیدی صلاحیت کی آئینہ دار ہیں۔

جمیل مظہری نے ایک اور صنف سخن کو معراج دی۔ وہ ہے مرثیہ نگاری۔ بقول کلیم الدین احمد ''اردو شاعری کے دامن میں صرف ایک مرثیہ ہی ہے جسے مانگے کا نہیں کہا جاسکتا ورنہ تمام صنف سخن عربی وفارسی سے مانگی ہوئی ہیں۔'' میر ضمیر نے صنف مرثیہ کو مسدس کا قالب دیا اور اس کے عناصر بھی مقرر کردیے مثلاً چہرہ' رخصت' آمد' جنگ' شہادت' بین وغیرہ۔ اس لیے مرثیہ کو مسدس سے الگ چیز مان لیا گیا ہے۔ فن مرثیہ گوئی میں دور حاضر کے جن بڑے مرثیہ گو کا نام لیا جاتا ہے وہ ہیں آل رضا' رضا' نسیم امروہوی' جوش ملیح آبادی' وقا ناگپوری' مظہر سیتا پوری' نجم آفندی اور جمیل مظہری۔ جمیل مظہری کے مراثی میں ادبیت بھی ہے اور فکر کا سمندر بھی۔ محمد رضا کاظمی ''جدید اردو مرثیہ'' میں لکھتے ہیں۔ ''جمیل مظہری کی مرثیہ نگاری کی ابتداء قومی مقاصد ہی کے تحت ہوئی۔ جمیل مظہری خود بیان کرتے ہیں کہ ان کا پہلا مرثیہ ''عرفان عشق'' 1930ء میں ترقی پسند تحریک اور مولانا آزاد کی تقاریر سے متاثر ہوکر کہا گیا تھا۔ سیاسی اغراض کی موجودگی کے باوجود ان کے مرثیوں میں سیاسی عنصر نمایاں نہیں ہے۔ انہوں نے نادانستہ طور پر ہمیشہ کوشش کی ہے کہ جدید مرثیہ کے مبادیات کو مرتکب کرنے تک محدود رہا جائے۔''

سب سے اہم بات یہ ہے کہ جوش نے اپنے سیاسی مسلک کی تشکیل میں مولانا محمد علی جوہر سے اثر قبول کیا تو جمیل مظہری مولانا ابوالکلام آزاد سے متاثر ہوئے۔ چنانچہ محمد علی جوہر کے مزاج کا جوش' ولولہ' بلند آہنگی' جذباتی سیلاب اور عزم سرفروشی کی جھلک جوش کے ابتدائی مرثیوں میں ملتی ہے اس کے برخلاف ابوالکلام آزاد کی علمی متانت' رفتار کی استقامت اور مصلحت کوشی تھی اس کے عناصر کی پرچھائیاں جمیل مظہری کے ہاں ملتی ہیں۔ اسی لیے دونوں کو جدید مرثیہ نگاری کا میر اور امیر کہا گیا ہے۔ جمیل مظہری نے جدید مرثیے کو ایک نیا رخ دیا تو جوش نے اسے وسعت دی۔ جمیل مظہری نے امام حسین کو بطور نجات دہندہ انسانیت قرار دیا تو جوش نے امام مظلوم کو نجات دہندہ تاج مشرقین کہا لیکن جوش کے مراثی اور جمیل مظہری کے مراثی کا اگر تقابلی مطالعہ کیا جائے تو جوش کے الفاظ تراشی کو نظرانداز کرکے حاصل یہ ہوگا کہ جمیل مظہری نے مراثی کو بطور پیغام زیادہ موثر انداز میں عام کیا ہے۔

ہے حکمران عقل پہ دولت ابھی تلک
ایمان کی ہورہی ہے تجارت ابھی تلک
جاگیر اہرمن کی ہے جنت ابھی تلک
ابلیس ہے معلم فطرت ابھی تلک
پامالئی حقوق کا تہذیب نام ہے
انسانیت کی روح کا ایک قتل عام ہے

جمیل مظہری کے مراثی کی ایک خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے جو بھیہ جتنے نظم کیے ہیں ان میں یہ برابر خیال ملحوظ رکھا ہے کہ گریہ وبکا کی فضا تخلیق کرتے وقت امام حسین یا ان کے اعزاء' احباب یا مخدرات عصمت وطہارت کا ایسا کردار پیش نہ ہو کہ جس سے ظاہر ہو کہ مصائب وآلام نے ان کے

عزائم میں شکستگی و ماندگی پیدا کر دی تھی اور آپ کے بین کا یہ بھی ایک بڑا وصف ہے کہ ان میں رقت و دلدوزی بھی خوب ہے یعنی ایک جانب بشری تقاضے بھی ہیں اور دوسری جانب الوہی تقاضے بھی پورے ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جمیل مظہری کے ایک مرثیے سے جانب زینبؑ کے مطمئن نفس کو دیکھیں۔

بیٹھ کر لاش پہ آنسو نہ بہایا اس نے
صبر مخدومہ کونین دکھایا اس نے
صحن میں آن کے سجادہ بچھایا اس نے
سجدہ شکر میں سر اپنا جھکایا اس نے
ماننا دل کو مسلنے جو لگی بات یہ کی
تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں سے مناجات یہ کی
اے میرے پالنے والے مرا فدیہ ہو قبول
میری قربانی احقر مرے مولا ہو قبول
آل احمد کا یہ ناچیز ہدیہ ہو قبول
تپش داغ دل دختر زہرا ہو قبول
کیا ہے اعدا نے میری کوکھ جو ویراں کر دی
تیری بخشش تھی تیری راہ میں قربان کر دی

جمیل مظہری کا مزاج فلسفیانہ ہے جو کائنات کے اسرار و رموز کی عقدہ کشائی کسی خاص نقطۂ نظر کا سہارا لے کر نہیں کرتا بلکہ یہ حقیقت کی ذاتی تلاش و تاویل کا نتیجہ ہے کہ جمیل مظہری نے فطرت کی کھلی کتاب کو اپنے علم و وجدان اور تجربے کی روشنی میں واقعاتِ کربلا کا جائزہ لے کر مذہب اور خالص فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے بلند کیا اور یہ ذہن نشین کرایا کہ ہم اس سانحہ میں انسانی قدروں کو مکمل طور پر جلوہ گر دیکھ سکتے ہیں۔ جمیل مظہری کا حکیمانہ شعور اخلاقی و روحانی پیکروں کو سامنے رکھتا ہے جس سے زندگی کے لیے جوش و حرارت کا پیغام مل سکے۔

حیف وہ قوم جو ہو ملت شاہ شہدا
وہ حکومت کی کنیزی میں ہو حیرت کی ہے جا
زندگی میت احساس ہے دل مردہ ہیں
جتنے جذبات ہیں قومی وہ سب افسردہ ہیں

جمیل مظہری کے مشہور مرثیوں میں عرفان عشق معزاب شہادت۔ شام غریباں، افسانہ ہستی، عزم محکم، حقیقت نور و نار، لمحہ غور، علم دار کربلا اور مراثی کی دوسری جلد وجدان جمیل کے مرثیے وغیرہ ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جمیل مظہری کی جگہ اردو کے ان شعرا میں ہے جنہوں نے اردو شاعری کی روایت میں توسیع کی ہے۔ نئے ابعاد اور جہتیں پیدا کی ہیں۔ انہوں نے اردو شاعری کے معنوی دائرے کو جس حد تک وسیع کیا ہے، وہ یقیناً ان کا ایک اہم اور قابلِ قدر کارنامہ ہے اور اسی میں ان کی انفرادیت کا راز مضمر ہے۔ اس انفرادیت کا ثبوت ان کی لوریاں بھی ہیں۔ جس طرح دوہے اور برہے گیت کے ذیل میں شمار کیے جاتے ہیں۔ لوری کو بھی اس کے تحت جانا پہچانا جاتا رہا ہے۔ کافی بعد لوری آزاد صنف کی حیثیت سے تسلیم کی گئی۔ اردو ادب کی بدقسمتی ہے کہ شعرانے اس صنف سے بے توجہی برتی اور اردو کا دامن لوری سے خالی رہا۔ جمیل

مظہری نے جہاں بڑی تعداد میں بچوں کی نظمیں لکھیں وہیں لوریوں سے بھی اردو کی مانگ سجائی۔ جمیل مظہری کی لوریوں کا کینوس کافی وسیع ہے۔ ان کے مخاطب اگرچہ بچے بچیاں ہیں لیکن زندگی کے مسائل، رموز ونکات، عصری سیاست، عالمی عصری صورتِ حال، امیروغریب کے امتیاز وفرق کے زیریں لہریں بھی لوریوں میں مدغم ہیں۔ یہ اندازِ فکر لوریوں کو نئے رنگ اور نئی جلوہ سامانیاں عطا کرتا ہے۔

جاگتی سنسار کی پرچھائیاں بھی سوگئیں
شام سے بجتی ہوئی شہنائیاں بھی سوگئیں
نیند پروانے پہ آئی اور جگنو سوگئے
سوگئیں سارنگیاں محفل کے گھنگرو سوگئے
جلتے جلتے سوگئی شمع شبستاں سو رہو
جانِ جاناں...... .... سو رہو

لوریوں کی طرح جمیل مظہری نے مثنوی کو بھی حیات نوبخشی، ان کی مثنویوں میں صرف مربوط داستان ہی نہیں ایک پیغام بھی پایا جاتا ہے۔

اس طولِ بیاں سے یہ غرض ہے
نفرت بھی تمہاری ایک مرض ہے
دشمن سے جو دشمنی کروگے
اس قرض کا سودا بھی بھروگے

(آب وسراب)

اب آخر میں ان کی غزل پر بھی دو باتیں کرلی جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ایک فطری شاعر تھے، ان کی شعری تخلیقات قاری کو دعوت فکرونظر دیتی ہیں۔ ایک فکری شاعر اپنا ایک نظریۂ حیات رکھتا ہے۔ وہ اس عالم کون وفساد کو اپنی مخصوص نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کی شاعری اس کے نظریہ کی فن کارانہ ترجمانی کرتی ہے۔ اس کا نظریۂ حیات اس کی تخلیقات میں ایک ربط پیدا کرتا ہے جس کی بنیاد پر قاری کچھ مثبت نتیجے اخذ کرکے اس کے نظریے کورد یا قبول کرتا ہے۔

جمیل مظہری نے اردو شاعری کی عام اور مروجہ روایت کے مطابق محض نظم نما غزلیں یا غزل نما نظمیں لکھنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اردو شاعری کی مختلف اصناف اور فارموں کو استعمال کرکے ان کے ذریعہ اظہار وبیان میں وسعتیں پیدا کیں اور اپنے تجربوں کو نیا گداز اور نکھار عطا کیا۔ ان کے ہاں موضوع اور ہیت دونوں اعتبار سے خاصی جدت اور انفرادیت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی نظمیں اور غزلیں یکساں اہمیت رکھتی ہیں اور ان میں کسی ایک کو بھی دوسرے پر آسانی سے فوقیت نہیں دی جاسکتی۔ جس طرح ان کی نظموں کے تین واضح مدارج اور اقسام ہیں۔ رومانی، انقلابی اور قومی فکری وفلسفیانہ۔ اسی طرح ان کی غزلوں میں بھی تین نمایاں رنگ رومانی، انقلابی اور فکری وفلسفیانہ دکھائی دیتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جمیل مظہری اپنی غزلوں کو افکار منظوم کا نام دیتے ہیں اور انہیں روایتی تغزل کے معیار کو پیشِ نظر رکھ کر غزل قرار دینے سے ہچکچاتے بلکہ انکار کرتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی غزلوں کے مجموعے کو "فکر جمیل" کے نام سے شائع کیا۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنی غزلوں کو فکر وفلسفہ ایسی چیز سمجھتے تھے۔

لیکن نقادوں کی رائے ہے کہ جمیل مظہری نے غزل گوئی کو ایک نیا مزاج ایک نیا آہنگ بخشا ہے اور غزل کی روایتوں کو ایک نئی سمت دی ہے۔

ان کی غزلوں میں اپنے خدوخال اتنے واضح ہیں کہ جن کے محسوسات وخیالات کی ایک الگ شخصیت بن گئی ہے لیکن افسوس اس شخصیت کا پرتو آج پورے برصغیر میں نہیں ہے۔ اس کی وجہ شاگرد بنانے میں دلچسپی نہ لینا بھی ہے۔ جو بذاتِ خود ان کی شاگردی کے لیے پہنچ جاتے انہیں جلد ہی میدان چھوڑنا پڑتا اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اشعار پر اصلاح نہیں، قطع برید کرتے تھے۔ اتنی زیادہ کاٹ پیٹ ہوتی کہ شاگرد کی غزل غائب ہوکر استاد کی غزل رہ جاتی۔ اس بات سے بھی آگاہ تھے نتیجتاً لوگ اس شخص کی غزل کو مشکوک نظروں سے دیکھتے جو خود کو جمیل مظہری کا شاگرد کہتا۔ شاید اسی وجہ سے سہیل جمیلی بھی بعد میں سہیل عظیم آبادی بن گئے۔ وہ اپنا کلام سنانے میں بھی بخل سے کام لیتے۔ بقول جوش ملیح آبادی "میرے محبوب دوست پروفیسر جمیل مظہری کہ جب تک انہیں جسمانی زدوکوب کا اندیشہ نہ ہو، شعر نہیں سناتے۔"

کہتے ہیں ہر بڑا شاعر نا ؤنوش سے دلچسپی لیتا ہے مگر جمیل مظہری اس لعنت سے محفوظ تھے۔ جبکہ انہیں جوش ملیح آبادی کی قربت بھی حاصل تھی۔ جوش کا ایک شعر خاص طور پر انہی کے لیے ہے۔

الحمدللہ جوش اس بد مذاقی کے زمانے میں
جمیل مظہری سا قدر داں بخشا گیا مجھ کو

آخری ایام میں وہ خود سے اتنے بے پروا ہوگئے تھے کہ سہیل عظیم آبادی، آل انڈیا ریڈیو پٹنہ کا کنٹریکٹ بھیجا کرتے اور وہ اسے گم کردیتے۔ مجبور ہوکر سہیل عظیم آبادی

کنٹریکٹ ڈاک سے بھیجنے کی بجائے خود جا کر دستخط کروالیا کرتے تھے۔ کمرا ہمیشہ بے ترتیب رہا کرتا۔ ڈھیلی چارپائی پر گندی میلی توشک وہ بھی جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی۔ بستر کی چادر جیسے برسوں سے بدلی نہ گئی ہو۔ گرمیوں میں بھی سوئٹر جسم سے چپکا رہتا۔ مڑے تڑے کاغذوں کا ایک ڈھیر سا توشک کے نیچے جمع رہتا جن پر کلام لکھتے۔ قلم برداشتہ پوری پوری نظم یا غزل منٹوں میں کہہ ڈالتے۔ اساتذہ قدیم کے سیکڑوں اشعار یاد رکھتے مگر اپنا کلام بھول جاتے۔

ان کی زندگی میں شائع ہونے والے مجموعے مندرجہ ذیل ہیں۔

شکست و فتح طویل افسانہ (کلکتہ 1950ء) نقش جمیل (پٹنہ نظموں کا مجموعہ 1952ء) فکر جمیل (غزلیات ورباعیات پٹنہ 1959ء) آب وسراب (فلسفیانہ مثنوی کلکتہ 1970ء) عرفان جمیل (مراثی وقصائد لاہور 1970ء۔ الہ آباد 1979ء) وجدان جمیل (مراثی ولی نظمیں لاہور 1979ء)

جمیل مظہری کی زندگی میں ماہنامہ سہیل (گیا) بہار نے دو حصوں میں جون، جولائی 1960ء مجلہ جشن جمیل مظہری پٹنہ نے 1975ء میں خصوصی شمارے شائع کیے اور انتقال کے بعد ماہنامہ ''کائنات'' (مرزا پور یوپی) ماہنامہ ''آج کل'' (دہلی) اور سہیل (گیا) 1982ء میں خصوصی شمارے اور طلوع افکار (کراچی) نے گوشہ شائع کیا۔

آخری ایام میں جمیل مظہری کو پٹنہ یونیورسٹی نے خصوصی لیکچرر کی حیثیت سے مقرر کرلیا تھا وہ 1969ء سے 1974ء تک کبھی کبھی درس دینے چلے جایا کرتے تھے لیکن جب پیرانہ سالی نے پیروں کو جکڑ لیا اور کثرتِ امراض نے پریشان کرنا شروع کردیا تو انہوں نے خود ہی سبکدوشی حاصل کرلی اور اپنے چھوٹے بھائی رضا کاظمی مظہری کے ساتھ کلکتے میں رہنے لگے۔

وہ مئی 1980ء میں بھیکن پور (مظفر پور) سفر پر روانہ ہوئے۔ کسے خبر تھی کہ وہ ہمیشہ کے لیے کلکتہ چھوڑ رہے ہیں۔ بھیکن پور کے قیام کا، مشہور نقاد جناب سید محمد کاظمی ''تنقیدی ورثا'' میں یوں نقشہ کھینچتے ہیں ''میں کاظم ماموں کی جانب مڑا، ان کی آنکھیں بند تھیں اور ان پر غنودگی طاری تھی۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑلیا۔ تین چار مرتبہ آواز دی۔ جواب نہ پاکر میری گھبراہٹ بڑھتی گئی۔ میں اپنا نام لے کر ان کو متوجہ کرتا رہا۔ آخر بہت دھیمی آواز میں بولے ''میں سمجھا بابو!'' انہیں باہوش پاکر کچھ غذا دینے کی کوشش کی، وہ نہ مانے۔ اس گھر کے اخلاق کے مطابق ایسے کٹھن وقت میں بھی مہمان کی ضیافت مقدم تھی۔ میرے لیے دسترخوان بچھ گیا، اس پریشانی میں کیا کھاتا، پھر بھی بیٹھ گیا۔ اس دوران امیر رضا ماموں، اپنی خالہ اور دیگر رشتے داروں کے ساتھ باتیں کرتا رہا اور پاکستانی اعزہ کی خیریت بتاتا رہا۔ آخر جب میری بے تابی کم نہ ہوئی تو ان کا ہاتھ پکڑ کر میں نے کہا ''اگر کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف کردیجیے۔'' یہ جملہ بھی بار بار دہرانا پڑا، کچھ دھیمی آواز میں بولے ''معاف کیا بابو!'' اور لوگوں سے میری حالت دیکھی نہیں جارہی تھی۔ مجھے باتوں میں لگالیا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے سگریٹ مانگا دو ایک کش یوں لیے کہ امیر رضا ماموں کے ہاتھ میں سگریٹ تھی جو ان کے ہونٹوں پر لگادیتے۔ دس منٹ بعد انہوں نے کروٹ لی اور تکیہ پر کچھ بلند ہوئے۔

میں نے امیر رضا ماموں سے کہا ''ان کو جلدی سے اچھا کردیجیے، میں آیا ہی ہوں ان کو کراچی لے جانے کے لیے۔ وہاں ان کے چاہنے والے بہت ہیں۔ ان کے شاگردوں کی وہاں اتنی پذیرائی ہوتی ہے، یہ خود پہنچ جائیں تو دھوم مچ جائے گی۔ ان کو تو سب مانتے ہیں صرف میں ان کے خلاف لکھنے لگا ہوں۔ کاظم ماموں نے یہ جملہ سنا تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اب کسی قدر قوت کے ساتھ کاظم ماموں (جمیل مظہری) بولے ''رات بھر تو ٹھہر جاتے۔'' میں نے عذر پیش کیا کہ صبح آؤں گا۔ آخر جب اٹھا تو صاف اور بلند آواز میں ''فی امان اللہ'' کہہ کر کاظم ماموں نے رخصت کیا۔ یہ ان کی آخری آواز تھی جو میں نے سنی تین دن بعد وہ خود اللہ کی امان میں چلے گئے۔''

23 جولائی 1980ء کو رات کے گیارہ بجے وہ راہی ملک عدم ہوئے۔ جنازہ اگلے دن ساڑھے چار بجے سہ پہر میں اٹھا اور انہیں ان کی والدہ مرحومہ کے پہلو میں سپرد خاک کردیا گیا۔ اپنے مرنے کی تاریخ انہوں نے خود ہی ''مظہری مرد'' سے (1399ھ) نکال لی تھی لیکن دس مہینے بعد رضا کاظمی مظہری نے ''از سرآہ'' سے (1400ھ) تاریخ نکالی۔

حیا کے دوش پہ اک میت وفا ہوں میں
مرے قریب نہ آؤ ڈرو خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو



سفر وسیلہ ظفر کہلاتا ہے مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سفر تجربے کی دولت سے بھی مالا مال کرتا ہے۔ علیم شاہد کا تعلق قلم قبیلے سے ہے اس لیے انہوں نے اس سفر کو ایک نئے زاویے سے احاطہ تحریر میں لایا ہے۔ اس سفر نامے میں آپ کو امریکا ایک نئے انداز میں سامنے آتا محسوس ہوگا۔

سفرِ امریکا

علیم شاہد

آخری حصہ

سفرنامہ پسند کرنے والوں کے لیے ایک جداگانہ تحریر

ایسٹ بے کے مشرقی کنارے اوک لینڈ کے قریب الامیڈا ایک چھوٹا جزیرہ ہے جو تقریباً سوا سو سال پرانا ہے۔ شہر کے چاروں طرف پانی ہے، چار درمیانے اور چھوٹے پلوں سے جڑا ہوا ہے۔ انتہائی صاف ستھرا اور پُرسکون شہر ہے۔ یہاں کے رہنے والے بھی وہ ہیں جنہیں یہاں کی الگ تھلگ خاموش زندگی پسند ہے۔ یہاں کا ڈاؤن ٹاؤن مرکزی سڑک پر واقع ہے جہاں سے یہ لوگ شاپنگ کرتے اور چہل قدمی کرتے ہیں۔ باہر سے لوگ پل پار کرکے اسی صورت آتے ہیں جب انہیں ضروری کام ہو، یہاں اسکول، کالج، اسپتال ہیں۔ اچھے رہائشی علاقے اور پارک ہیں۔ پانی کے کنارے چاروں طرف ہیں الامیڈا فیری اسٹیشن بھی ہے جہاں سے سان فرانسسکو ڈاؤن ٹاؤن کے لیے فیریز ملتی رہتی ہیں۔

2006ء میں جب میں امریکا آیا تھا تو فیصل کی رہائش الامیڈا میں تھی۔ مجھے یہ علاقہ بہت پسند آیا تھا۔ میں نے یہاں چار ماہ گزارے تھے لہٰذا اب یادداشت کے

سہارے کچھ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ پانی کے بہت قریب Kitty Hawk کے Shore Line روڈ پر Blessing Apptt میں دوسری منزل کا فلیٹ چھوٹا سا خوب صورت سا فیصل کے پاس تھا۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی چھوٹا سا کچن سامنے ڈائننگ ہال پھر لاؤنج اور گیلری۔ سائیڈ میں 2 بیڈروم بمعہ اٹیچڈ باتھ۔

میں صبح واک کے لیے جاتا تھا۔ شور لائن پر ایک طرف دومنزلہ اپارٹمنٹ دور تک گئے ہیں دوسری طرف فٹ پاتھ۔ واکنگ ٹریک کے ساتھ ریت اور ریت پر ساحلی لہریں۔ عموماً موسم خوشگوار رہتا ہے۔ بادل چھائے رہتے ہیں۔ کبھی ہلکی بارش ہو جاتی ہے، کبھی تیز ہوتی ہے اور اس ماحول میں ٹہلنا بہت اچھا لگتا ہے۔ یہاں سے بلڈنگ کی پچھلی طرف سے سڑک Otis Drive ہے۔ تھوڑی ہی دور کمرشل ایریا شروع ہو جاتا ہے۔ Mervins Safe Way اور Office Max کے مشہور اسٹور ہیں۔ بس اسٹاپ ہے تھوڑا آگے ڈاؤن ٹاؤن اور پارک اسٹریٹ ہے جس کے دونوں جانب دکانیں ہیں ہر قسم کے چھوٹے چھوٹے اسٹور ہیں۔ ریسٹورنٹ، کافی شاپ اور بار ہیں جو زیادہ تر اسی شہر کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ یہاں کے مکانات زیادہ تر پرانے ہیں لیکن اچھی حالت میں ہیں طرز کشادہ اور روایتی ہے۔ زیادہ تر رہائشی بھی پرانے ہیں۔ مرد و خواتین زیادہ گورے ہیں۔ خوش اخلاق اور ملنسار ہیں۔ اس شہر کے کلچر میں روایتی سکون اور صفائی شامل ہے۔ یہاں کے رہنے والوں کو اپنے اس علاقے سے لگاؤ ہے لہٰذا وہ اس سے بہتر دوسری جگہوں پر منتقل ہونا پسند نہیں کرتے۔ فیصل راحت عتیق سعدیہ شکی شانی جواد سب نے یہاں خاصا وقت گزارا ہے اور سب ہی الامیڈا کو یاد کرتے ہیں۔ مجھے بھی اس محلے میں اس کے کمرشل ایریا میں ٹہلتے اور سفر کرتے ہوئے بالکل کراچی ناظم آباد نمبر 4 جیسا لگتا ہے۔

Tukker الامیڈا میں آئس کریم کی منفرد دکان ہے۔ اچھی آئس کریم کھانے کا سب کو شوق ہوتا ہے لیکن ٹکر والوں کو اچھی آئس کریم بنانے اور کھلانے کا شوق ہے۔ آئس کریم کے اجزاء دودھ، کریم، فروٹ، خشک میوہ ہر چیز عمدہ تازہ پوری توجہ سے حاصل کی جاتی ہے۔ اوپر سے آئس کریم بنانے کا پرانا فن جس نے بھی ایک بار کھائی بار بار دور سے کھانے آیا۔ الامیڈا کے رہنے والے روایتی پُرسکون حضرات ہیں۔ ٹکر کی مقبولیت سارے ایسٹ بے میں ہے لیکن اس کے مالکان نے دوسری جگہ دکان یا شاخ نہیں کھولی۔ شہروں میں جگہ جگہ آئس کریم کی دکانیں موجود ہیں لیکن جو Taste ٹکر نے Develop کیا ہے لاجواب ہے۔ یہاں آنے والوں میں فیملیاں، شہروں کے فنکار، کھلاڑی، متمول تاجر اور اسٹوڈنٹ ہیں جن کی تصاویر بھی دیواروں پر آویزاں ہیں۔ مختلف اداروں کی جانب سے Tukker آئس کریم بنانے والوں کو اعزازات اور انعام و اکرام بھی ملتے رہے ہیں جن کو انہوں نے دکان میں سجا رکھا ہے۔ ٹکر کی دکان اگر ساری رات کھلی رہے تو شوقین آتے رہیں لیکن یہ پابندی سے روز آٹھ بجے رات بند ہو جاتی ہے۔ امریکا میں ایسے لوگ بھی بستے ہیں جن کے مزاج میں فن ہے، معیار ہے ٹھہراؤ ہے۔

پارک اسٹریٹ کے قریب ہی Alameda Adult School ہے جہاں میں نے بھی English Second Language Conversation کلاسز جوائن کی ہیں۔ یہ بڑا دلچسپ تجربہ ہے۔ کلاس میں تقریباً 30 اسٹوڈنٹ ہیں جو 20 ممالک سے تعلق رکھتے ہیں۔ قومیں مختلف ہیں زبانیں کلچر مختلف ہیں۔ سب شادی شدہ ڈھلتی عمر کے مرد و خواتین ہیں بڑے ہیں دوستانہ اور خوشگوار ماحول میں انگریزی بولنے سمجھنے لکھنے کی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ آپس میں ایک دوسرے کا تعارف معہ اپنے ملک اور کلچر کے کرایا جاتا ہے۔ مختلف اداروں کے لوگ آکر لیکچر دیتے ہیں۔ کچھ فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ شہر کی اہم جگہوں پر وزٹ کرائی جاتی ہے۔ اہم دنوں میں لنچ اور ٹی پارٹیاں ارینج کی جاتی ہیں۔ مقصد یہ کہ امریکا میں آنے والوں کو یہاں رہنے، سروس کرنے کاروبار کرنے کے طور طریقوں سے، گفتگو سے یہاں کے کلچر سے رکھ رکھاؤ، نشست و برخاست سے پوری پوری آگاہی ہو سکے۔ ہر تین ماہ میں امتحان ہوتا ہے اور بارہ ماہ میں فارغ التحصیل کر دیا جاتا ہے۔ میں یہاں سے 12 بجے نکلتا ہوں۔ پارک اسٹریٹ بس اسٹینڈ سے بس میں بیٹھ کر براستہ کانٹی لیور برج اوک لینڈ کے فروٹ ویل بارٹ اسٹیشن جاتا ہوں۔ کالسیوم، سان لیانڈرو ہوتا ہوا میں بے فیر پر اتر جاتا ہوں۔ وہاں سے 97 کی بس لے کر فیصل کی دکان جو ہیورڈ میں ہسپرین کے کنارے وٹنی پیلس میں ہے چلا جاتا ہوں دکان پر سلائی مشینوں اور ویکیوم کلینرز کے خریدار مرد و خواتین آتے رہتے ہیں۔ سلائی مشین کی خریدار زیادہ تر شوقین عمر رسیدہ خواتین ہوتی ہیں۔ دکان پر سنگر، برادر، جوکی، نئے سے نئے ماڈل کی کمپیوٹرائزڈ مشینیں دستیاب ہیں جو سادہ سلائی

سے لے کر رنگین پھول پتیاں بیلیں حتیٰ کہ کپڑے پر تصویریں تک بیک وقت سات سات رنگوں میں کاڑھ دیتی ہیں۔ ویکیوم کلینرز کے خریدار عموماً میکسیکن مرد و خواتین ہوتے ہیں۔ فیصل ہمہ وقت دکانداری میں مصروف رہتا ہے۔ کسی کسی دن راحت بھی دکان آتی ہے اور کافی ہیلپ کرتی ہے۔

دونوں چیزوں کی مرمت کا بھی اسٹور کے اندرونی حصہ میں بندوبست ہے۔ سلائی مشینوں کی مرمت کے لیے چینی ماہر Mike ہفتہ میں تین دن آتا ہے۔ ویکیوم کی مرمت میکسیکن کارلوس کرتا رہتا ہے۔ 1947ء میں اباجی دہلی سے کراچی آئے اور اصول، پابندی اور کاروبار کے لیے زندگی وقف کردی۔ 1989ء میں فیصل امریکا گیا اور اپنے دادا کے نقش قدم پر بڑی مستعدی سے رواں ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ بزرگوں کے ہر قدم پر ایمان سلامتی کے ساتھ کامیاب رہے۔

☆......☆

میں، نجمہ، راحت، فیصل اور شکیل گاڑی میں بیٹھے اور روانہ ہوگئے۔ ہمارا رخ Napa Valley کی جانب تھا جو سان فرانسسکو کے شمالی علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ عتیق سعد یہ کو فون پر بتا دیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ کسی جگہ بھی راستے میں ملاقات ہوجائے گی۔ ہم اوک لینڈ سے نکلے آگے برکلے تھا یہاں سے آگے بڑھ کر شمالی مغرب کی طرف ہم نے سان رافیل پل پار کیا، آگے علاقہ بہت سرسبز ہے۔ پہاڑی ہے۔ سڑک لہراتی ہوئی جنگل سے گزرتی رہی اور ہم Valleja والیہو سٹی اور امریکن کینین سے گزرتے ہوئے Napa Valley پہنچ گئے جو ڈبلن سے 50 میل ہے۔ یہاں سڑک کے کناروں سے انگور کی بیلیں شروع ہو جاتی ہیں اور حدِ نگاہ تک بلکہ میلوں دور تک ملتی ہیں۔ دراصل یہ زمین انگور کی کاشت کے لیے بہت موزوں ہے، یہاں انگور بہت عمدہ رس والا اور میٹھا ہوتا ہے۔ یہاں کی فصلوں کے مالکان اور مختلف ادارے بھرپور دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ان بیلوں کی بڑی ترتیب سے کٹنگ کی جاتی ہے اور دیکھنے میں یہ بہت خوشنما لگتی ہیں۔ سڑک کے دونوں جانب میل ہا میل تک وائنریز یعنی انگور کی فصلیں لہلہاتی ہیں۔ کھیتوں کے نزدیک ہی بڑے بڑے ویر ہاؤسز بنائے گئے ہیں جن میں انگوروں کا اسٹاک رکھا جاتا ہے۔ لہٰذا یہیں آس پاس وائن کی فیکٹریاں بھی قائم ہوگئی ہیں۔ تازہ انگور کی فصل تیار ہوتی ہے اور فوری طور پر فیکٹریوں میں پہنچ جاتی ہے۔ فصل خراب بھی نہیں ہوتی اور تازہ شکل میں وقت پر دستیاب ہونے کی وجہ سے اس علاقے میں بہترین وائن تیار ہوتی ہے اور پورے کیلی فورنیا میں مشہور ہے۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ موسم اچھا ہو۔ فضا میں مہک ہو اور دور تک لہراتی بل کھاتی اونچی نیچی پہاڑی سڑکوں کے دونوں جانب لہلہاتی ہوئی انگور کی بیلوں کے جھنڈ کے جھنڈ استقبال کریں تو ٹورسٹ اور شوقین موسم کو انجوائے کرنے اور وائن کا شوق پورا کرنے کھنچے چلے آتے ہیں۔

ہم جب پہنچے سردی خوب تھی۔ ہلکی بارش بھی تھی۔ ہم نے موسم کو خوب انجوائے کیا، انگور بھی چکھے۔ ہم نے ایک وائن فیکٹری بھی دیکھی لیکن ہم میں سے شوقین کوئی نہیں تھا حالانکہ بنانے والے فری چکھانے کو فری پلانے کو تیار تھے اور موسم کھلی دعوت دے رہا تھا کہ

پی لو گے تو اے شیخ ذرا گرم رہو گے
تمہیں ٹھنڈا ہی نہ کر دیں جنت کی ہوائیں

ہم ان خوب صورت مناظر کو آنکھوں میں بسائے دل میں حسرت کو چھپائے واپس گھر کی جانب روانہ ہوگئے۔

☆......☆

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد فیصل اپنے پرانے دوست اظفر سے ملنے Los Vegas آئے اور پھر یہیں اقبال مارک صاحب اور سہیل بٹالیہ سے ملاقات ہوئی جو Al Vaccume کے مالکان تھے۔ فیصل نے یہاں سے اپنی سروس کی ابتدا کی۔ فیصل نے بڑی محنت سے کام کیا لہٰذا آپس میں تعلقات بہت خوشگوار رہے۔ اس شہر میں فیصل نے اچھا وقت گزارا۔

جب ہم ہیورڈ آئے تو اظفر اور سہیل بھائی نے فیصل پر زور دیا کہ اپنے والدین کو لاس ویگاس میں لے آئیں۔ لہٰذا ایک خوشگوار صبح فیصل ہمیں کار میں لے کر لاس ویگاس کی جانب روانہ ہوئے۔ یہ خاصا لمبا سفر تھا جیسے ہی ہم کیلی فورنیا سے باہر نکلے نیواڈا کے گرم خشک ریتیلے علاقے میں سفر کرنے لگے اور آٹھ گھنٹے بعد ہم لاس ویگاس میں داخل ہوگئے۔ ہمارا پروگرام اظفر کے گھر جانے کا تھا لیکن شہر کے پہلے پیٹرول پمپ پر سہیل بھائی ہمارے استقبال کو موجود تھے۔ بڑی محبت سے ملے اور اپنے بنگلے پر لے گئے۔ لاس ویگاس میں اتنا بڑا دو منزلہ بنگلا جس میں Swiming Pool ہو چھوٹا سا گارڈن ہو، بڑی بات ہے۔ ہمارا استقبال اقبال صاحب اور کوثر بھابی نے کیا۔ اس مکان میں ہم دو دن رہے۔ سہیل بھائی نے اور کوثر بھابی نے لاس ویگاس کے ڈاؤن ٹاؤن جہاں

ان کے اسٹور ہیں سیر کرائی۔ ہم نے یہاں کی اسٹریٹس، محلے، بازار دیکھے۔ لاس ویگاس خالصتاً ٹورسٹ پیلس ہے اور گیمبلنگ کا بازار ہے لہٰذا یہاں ہوٹلوں کا جنگل ہے، وہ دیکھے۔

لاس ویگاس ایک گرم ریتیلا علاقہ تھا اور غیر آباد تھا۔ اس کے دونوں جانب خوشگوار ماحول اور موسم کی اسٹیٹ تھیں لہٰذا یہاں کسی کامیاب شہر کا بسنا ممکنات میں سے نہیں تھا۔ صرف ایک شخص کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ دور دراز ریتیلے گرم علاقے میں سفر کے دوران سانس لینے کے لیے ایک ریسٹ ہاؤس ایسا ہونا چاہیے جہاں زندگی کی زیادہ سے زیادہ سہولیات مہیا ہوں۔ جہاں انسان کی دلچسپی، دل لگی، دل بستگی بلکہ دل فریبی کے سامان مہیا ہوں۔ اس شخص نے بڑی مشکل سے اپنے ساتھیوں کو آمادہ کیا اور سنگلاخ جنگل میں ایک ہوٹل کی بنیاد رکھی جو ابتداء میں صرف ایک ٹرانزٹ ریسٹ ہاؤس کے طور پر مشہور ہوا جس میں راستہ کے مسافروں کے لیے کھانے پینے آرام کرنے کے علاوہ Gambling جوئے کا بھی بندوبست تھا۔ لوگوں کو سفر کرنے کے دوران یہ تفریح بہت بھائی اور یہاں سے جو بھی جیتا اس نے اس ہوٹل کی بڑی پبلسٹی کی لہٰذا نئے ہوٹل بننے لگے، لوگ جوق در جوق آنے لگے جن میں شراب، کباب، شباب اور خاص مشینوں کے ذریعے جوئے کے نت نئے تجربات ہونے لگے حالانکہ امریکا کے دوسرے شہروں میں یہ سہولتیں موجود تھیں لیکن اس نئے ابھرتے ہوئے گرم شہر میں ان سہولتوں کے اٹریکشن نے امریکا کی دولت کا رخ اس شہر کی جانب موڑ دیا۔ بڑے بڑے فنکار، فلم ایکٹر، نامور ہیرو ہیروئن، گانے والے سنگرز نے اس شہر کی پذیرائی کی۔ دولت کی ریل پیل نے یہاں کیسینو انڈسٹری کی بنیاد رکھی اور یہ گرم ریتیلا علاقہ Hot Tourist Spot بن گیا۔ یہاں دنیا کے بہترین ہوٹل وجود میں آئے جن میں ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے قیام کی گنجائش موجود ہے۔ یہاں آنے والوں کے لیے ان کی دلچسپی کے لیے بڑی قیمتی، حیرت انگیز کمالات کا اہتمام کیا گیا۔ یہاں زبردست قسم کے کھانے پینے کا بندوبست کیا گیا۔ دنیا بھر کے ریسٹورنٹ بنائے گئے۔ رقص و موسیقی اور فنون لطیفہ کی وہ محفلیں ترتیب دی گئیں جن میں دنیا بھر کے ماہر آرٹسٹوں نے حصہ لیا اور لیتے ہیں۔ عجیب و غریب فوارے لگائے گئے جو موسیقی کی دھنوں پر ایسا اجتماعی رقص کرتے ہیں کہ دیکھنے والا دنگ رہ جاتا ہے۔ لگتا ہے یہ پانی نہیں انسان رقص کر رہے ہیں جن میں وہ خود بھی شامل ہو کر گم ہو جاتا ہے۔ مصنوعی پہاڑ جنگل ترتیب دیئے گئے ہیں جن میں بارش کا سماں پیدا کیا گیا اور جنگلی جانوروں اور بجلی کی مدد سے ڈراؤنے مناظر دکھائے جاتے ہیں۔ بچھو، کھجورے، مصنوعی چھپکلیاں اس طرح گرتی ہیں کہ دیکھنے والا محسوس کرتا ہے کہ یہ اس کے اوپر آرہے ہیں وہ اپنے اوپر آتے دیکھ کر ڈر جاتا ہے اور پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اسی طرح فائر شوز دکھائے جاتے ہیں۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سامنے کی بلڈنگ اور سامان جل رہا ہے۔ افراتفری اور بے چینی کا ماحول ہے۔ لوگوں کے دل ہولنے لگتے ہیں اور وہ چیخنے لگتے ہیں۔

دنیا کے مشہور بڑے تاریخی ممالک کے لوگوں نے یہاں ہوٹل بنائے ہیں جن میں اپنی تہذیب ثقافت اور فن تعمیر کو اس خوب صورتی سے Project کیا ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے آدمی اپنے آپ کو مصر میں، فرانس میں، جاپان میں، چائنا میں، میکسیکو میں نیویارک میں پاتا ہے۔ نیویارک ہوٹل میں عمارتیں اس طرح اسٹیج کی گئی ہیں کہ اصل کا گمان ہوتا ہے۔

ایک ہوٹل میں، میں نے دنیا کے 27 ملکوں کے چھوٹے چھوٹے ریسٹورنٹ دیکھے۔ ٹورسٹ کسی ملک سے آیا ہو اپنے علاقے کی اپنی مرضی کی ڈش اسے مل سکے گی۔ ہوٹل میں چھوٹے چھوٹے تالاب ہیں، آپ خود مچھلی پکڑیں ریسٹورنٹ والے اسی وقت پکا کر آپ کے لیے پیش کر دیں گے۔ غرض جہاں کچھ نہیں تھا وہاں 80-70 سال میں سب کچھ ہے۔ سڑکیں ہیں، بازار ہیں، اسکول، اسپتال ہیں، رہائشی علاقے ہیں۔ دن میں یہاں کے رہنے والوں کی رونق ہوتی ہے لیکن راتیں وہاں جاگتی ہیں اور دن کی روشنی کو شرماتی ہیں۔

کوثر بھابی ہمیں سیزرز پیلس لے گئیں۔ وہاں کی سیر کرائی۔ یہ عمارت بالکل محل کی طرز پر بنی ہوئی ہے اس کی چھت خاص طور سے بہت اونچی بنائی گئی ہے جس پر آسمان چاند اور ستاروں کے مدارج اصل کی مانند دکھائے گئے ہیں۔ ایئر کنڈیشنڈ اور لائٹنگ افیکٹ کے ذریعے موسم کو اور فضا کو پابند کیا گیا ہے۔ ہم رات دس بجے پیلس میں داخل ہوئے۔ پہلے درجے میں صبح صادق کا وقت اور ماحول بنایا گیا ہے یعنی علی الصبح آسمان کا جو رنگ ہوتا ہے اور چاند تاروں کی رخصتی کا جو منظر ہوتا ہے۔ وہ اصل سے قریب دکھایا گیا ہے اور اس کا موسم پر اثر صبح کی تازگی، جنگلی جھٹپٹے کے ماحول میں چڑیوں کی چہچہاہٹ یہ منظر کشی ایسی تھی کہ ہم ہی نہیں بہت سارے لوگ اس

سحر خیزی میں کھو گئے۔ تھوڑی دیر بعد آگے بڑھے تو آسمان صاف ہونے لگا۔ جھٹپٹا ختم ہو گیا اور دن کی آمد کے آثار کی ابتدا ہونے لگی۔ فضا میں خنکی کم ہونے لگی ہمیں یقین ہونے لگا کہ اس وقت رات کے گیارہ نہیں صبح کے چھ بجے ہیں۔ اس حسین، دل نشین ماحول میں ہر شخص مسحور تھا گم تھا۔ آسمان رنگ بدل رہا تھا۔ موسم تبدیل ہو رہا تھا چاند ستارے رخصت ہو رہے تھے تقریباً ایک گھنٹے کی اس نظر بندی مس مریزم کے بعد ہم کیسل سے باہر نکلے۔ اصلی دنیا میں آگئے۔ رات بھیگنے لگی تھی۔ لاس ویگاس دلہن کی طرح سجا ہوا اور دولہا کی طرح جگمگا رہا تھا۔ ہم گھر لوٹ آئے۔

ہم دو روز اقبال صاحب کے گھر رہ کر اظفر کے گھر آ گئے۔

اظفر، اشعر، انصر اور حمیرا نے ہمیں خوش دلی سے خوش آمدید کہا۔ اظفر اور اشعر وسیم اور فیصل کے سینٹ پیٹرز ہائی اسکول کے فیلوز ہیں۔ تینوں بھائی اور اشعر کی بیگم حمیرا بہت پڑھے لکھے خوش اخلاق ہیں، بہت جلد گھل مل گئے ہمارا بہت خیال رکھا۔ اظفر ہمیں چارلس ماؤنٹین دکھانے لے گئے جو لاس ویگاس سے تھوڑے فاصلے پر ہے۔ سڑک پر عمودی چڑھائی ہے تھوڑی سی دیر میں ہم چیڑ دیودار کے بڑے بڑے درختوں کے جنگل اور اونچائی پر پہنچ گئے۔ نیچے موسم گرم تھا اور آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد ایک دیہاتی قہوہ خانہ کے پاس ہم اترے تو کپکپی ناقابلِ برداشت تھی۔ قہوہ خانہ کے بیچ میں آگ کا الاؤ جل رہا تھا۔ ہم جلدی سے اس میں داخل ہوئے درختوں کے تنوں پر بیٹھ کر گرم گرم کافی پی بہت اچھا لگا۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی میں بیٹھے اور واپس گھر کی راہ لی۔ زیادہ اوپر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ دوسرے دن اظفر ہمیں ہُوور ڈیم دکھانے لے گئے حمیرا بھی ہمراہ تھیں۔ ہُوور ڈیم عجائبات عالم میں سے ہے۔ 70-80 سال پہلے جس محنت سرمائے انجینئرنگ اور قومی لگن سے یہ بند تعمیر ہوا وہ امریکا نہیں دنیا کے لیے مثال بن گیا۔ اس ڈیم سے امریکا کے ویسٹ کوسٹ 500 میل تک کا علاقہ زبردست کاشت کاری اور آبپاشی کی وجہ سے ہرا بھرا ہو گیا۔ ایگریکلچرل انقلاب آگیا۔ عظیم بجلی گھر تعمیر ہوئے اور لاس ویگاس جیسا روشن شہر وجود میں آگیا۔ ہُوور ڈیم کے متعلق لکھنا آسان نہیں صرف پانی کو روکنے کی دیوار دریا کی سطح سے 700 فٹ اونچی بنائی گئی ہے اور 700 فٹ تک پانی روکا گیا۔ دیوار کی لمبائی دریا کے پاٹ کی برابر ہے اور موٹائی اتنی کہ اس کے اوپر دو طرفہ ٹریفک چلتی ہے۔

اس عجوبہ روزگار کاریگری کو دیکھنے دنیا کے انجینئر، ماہرین تعمیرات اور سیاح ساری دنیا سے آتے اور سر دھنتے ہیں۔ لفٹ میں سوار کرا کے سیاحوں کو پانی کے دوسری طرف یعنی دیوار کے دوسری طرف 700 فٹ نیچے لے جایا جاتا ہے جہاں پہنچ کے آدمی کو ہول آتا ہے۔ نیچے مختلف ہال نما کمرے ہیں جن میں Hoover Dam کے متعلق فلم دکھائی جاتی ہے اور وہ تفصیلات بتائی جاتی ہیں کہ کن حالات میں کن لوگوں نے اس محیر العقول کارنامہ کو انجام دیا۔

ہمیں لاس ویگاس میں رہتے ہوئے سیر کرتے ہوئے کھاتے پیتے ہوئے پتا ہی نہ چلا اور چار پانچ دن گزر گئے۔ اشعر اور ان کی بیگم حمیرا نے واپسی پر ہمارے لیے بڑی زحمت کی۔ ہمیں اپنی گاڑی میں چھوڑنے کے لیے ہمارے ساتھ Hayward San Leandro تک نو دس گھنٹے کا لمبا سفر کیا۔ رات ہمارے پاس Tempo Bell کے فلیٹ میں رہے اور صبح ناشتا کے بعد خوش و خرم لاس ویگاس کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہ سفر ہم نے 1998ء میں کیا تھا لیکن یادوں میں آج تک محفوظ ہے۔

☆......☆

پچھلی مرتبہ 2006ء میں جب میں امریکا آیا تھا تو شکیل کے ہمراہ Am Track پر سیکرامینٹو کی جانب سفر کیا۔ ہم South Hayward اسٹیشن گئے وہاں سے ٹکٹ لیا اور گاڑی میں سوار ہو گئے۔ Am Track امریکا کی Super Express دومنزلہ ٹرین ہے۔ یہ ٹرین امریکا کے دور دراز علاقوں میں سفر کرتی ہے۔ اس میں ٹکٹ لینے کے لیے ہر مسافر کو اپنی شناخت کرانی ہوتی ہے۔ اس ٹرین میں مسافروں کے بیٹھنے، سونے، کھانے پینے کی بھرپور سہولت موجود ہے۔ ہم ساؤتھ ہیورڈ سے چلے اور ٹرین کے اوپری حصے پر کھڑکیوں کے کنارے بیٹھ گئے۔ ٹرین نے ساحل کے ساتھ ساتھ شمال کی جانب سفر شروع کیا اور مارٹینیز تک ایسا لگتا تھا جیسے ٹرین پانی پر چل رہی ہے۔ آگے پلین میدانی علاقے اور کھیت شروع ہو گئے۔ ہم سارے علاقوں کی سیر کرتے ہوئے U.C.Davis یونیورسٹی پہنچ گئے۔ U.C ڈیوس امریکا کی مشہور یونیورسٹی ہے۔ اسٹیشن اس سے آدھے گھنٹے آگے تھا۔ واپسی کی ٹرین میں ایک گھنٹا تھا۔ لہٰذا یونیورسٹی جو اسٹیشن سے ہی شروع ہوتی تھی گھومنے لگے۔ صاف ستھری سڑکیں، کیمپس کی اجلی اجلی عمارتیں ان کے درمیان گھاس کے تختے۔ ہم چہل قدمی کرتے ہوئے یونیورسٹی کے شاپنگ سینٹر چلے گئے۔ شام ہو رہی تھی سردی زیادہ تھی میں نے ایک ٹوپی خرید لی جو بہت پسند کی گئی۔ کافی شاپ سے کافی پی۔ یونیورسٹی ڈاؤن ٹاؤن میں گھومتے رہے۔ اسٹوڈنٹس کی آمد و رفت اور تعلیمی ماحول دیکھتے ہوئے اسٹیشن آئے واپسی کی ٹرین پکڑی اور الامیڈا اپنے گھر آ گئے۔

دوبارہ پھر اسی راستے پر بائی کار عدیل کے ساتھ آئے۔ ہم ڈائریکٹ سیکرامینٹو پہنچ گئے۔ شہر میں داخل ہوئے پرانا شہر Old Sacramento آ گیا۔ اس شہر کا حدود اربعہ تقریباً آدھ میل مربع ہے اور اب صرف ٹورسٹ پیلس کے طور پر محفوظ کیا گیا ہے۔ شہر کی مرکزی سڑک کے دونوں جانب لکڑی کے فٹ پاتھ، بازار، دکانیں، دکانوں کے آگے سایہ دار راہداریاں اوپر برآمدے، چوبارے، سائیڈ میں گلیاں، گلیوں کے دونوں جانب رہائشی عمارتیں سوا سو سال سے جوں کی توں موجود ہیں۔ بازار کے اسٹور، دکانوں کے فرنیچر ان کی آرائش میں وہی وکٹورین انداز موجود ہے۔

سڑک پر اسی زمانے کی رنگین سجی سجائی گھوڑا گاڑیاں۔ ان کے کوچوان اسی دور کے لباس زیب تن کیے ہوئے سیاحوں کو اس چھوٹے سے شہر کی سیر کرا رہے ہیں۔ لوگ جوق در جوق اس میں سواری کر رہے ہیں۔ راہداریوں میں ٹہل رہے ہیں، پرانے زمانے کی کافی شاپ سے کافی پی رہے ہیں۔ آئس کریم کھا رہے ہیں۔ کافی اور آئس کریم بنانے کے طریقے بھی پرانے لگتے ہیں اور کھانے پینے کے برتن بھی روایتی ہیں۔ اسی زمانے کی فوٹوگرافر شاپ ہے جو پرانے زمانے کے لباس پہنا کر پرانے زمانے کے کیمروں سے آپ کی بلیک اینڈ وائٹ ایسی تصویر بنا کر دیں گے کہ آپ کی عمر 100 سال پیچھے چلی جائے گی۔ لوگ اس Antique City میں بڑی دلچسپی سے گھومتے پھرتے کھاتے پیتے شاپنگ کرتے ہوئے اپنے آپ کو سو، سوا سو سال پہلے کے دور اور ماحول میں پاتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ یہاں کی رونق میں کبھی کمی نہیں آتی ہم بھی سڑک پر راہداروں میں گلیوں میں گھومتے رہے۔ آئس کریم بھی کھائی سووینیر بھی خریدے۔

قریب ہی اس زمانے کا ریلوے اسٹیشن تھا جس کا پلیٹ فارم جس کا ریلوے ٹریک جس کے انجن اسی زمانے کے جوں کے توں محفوظ تھے اور اب کوئی چیز زیر استعمال نہیں تھی اسٹیشن میں داخل ہو کر اندازہ ہوا کہ ابتدائی دور میں ٹرین سروس کیسی تھی۔

یہاں سے ہم گاڑی میں سوار ہوئے اور تھوڑی دور

نئے Sacramento میں داخل ہوگئے۔ یہ شہر صوبہ کیلی فورنیا کا دارالحکومت ہے۔ اس کی سڑکیں فٹ پاتھ گلیاں عمارتیں، ڈاؤن ٹاؤن بہت عمدہ ہیں۔ نئے ہیں، خوب صورت ہیں۔ اسٹوروں میں سامان کی بھرمار ہے۔ اچھے ریسٹوران ہیں اور گورنمنٹ کے دفاتر اسکول اسپتال ہیں۔ گورنمنٹ کے لوگوں کی رہائش گاہیں ہیں۔ ہم گھومتے رہے۔ تصویریں بھی کھنچیں لیکن یہ شہر ہمیں سویا ہوا اور خاموش لگا۔ جو رونق پرانے شہر میں تھی وہ گہما گہمی ہمیں یہاں نظر نہ آئی۔ ہم نے گاڑی کا رخ الامیڈا کی جانب موڑ دیا اور گھر آ گئے۔

اس مرتبہ مجھے پرانا شہر دیکھنے کا شوق پھر ہوا۔ میں عتیق کے ہمراہ Am Track پر سوار ہو کر Old Sacramento گیا وہاں ماحول حسبِ سابق تھا کچھ بھی نہیں بدلا تھا پرانا شہر اپنی پرانی حالت میں موجود تھا اور ہزاروں ٹورسٹ پیدل اور بگھیوں میں گھوم رہے تھے۔ شہر کے ایک ایک کونے کو دیکھ رہے تھے۔ ہم بھی گھومے۔ آئس کریم کھائی واپسی کی Am Track میں سوار ہوئے مارٹینز اترے وہاں سے عتیق نے اپنی گاڑی لی پلیزنٹ ہل پہنچ گئے وہاں سے فیصل راحت مجھے ڈبلن لے گئے۔

☆......☆

یہاں میں یہ بات گوش گزار کرنا چاہوں گا کہ تہوار خصوصاً مذہبی تہوار کو بنانا سجانا اور منانا پاکستانیوں کا ایسا فن ہے جسے دیکھ کر جس میں شامل ہو کر غیر قومیں بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ پاکستانی جہاں بھی ہوں اپنی تہذیب، ثقافت اور روایت سے جڑے ہوئے ہیں۔

ہم بقرعید کی نماز پڑھنے پلیزنٹن کے گراؤنڈ گئے۔ پارکنگ کے بعد بڑا گراؤنڈ کا حصہ پار کر کے ہم پہنچے۔ بڑا سا کمیونٹی ہال ہے۔ جس میں تقریباً ایک ہزار لوگ فریضہ نمازِ عید ادا کرنے آئے ہوئے تھے۔ برابر کے ہال میں خواتین تھیں، بچے تھے۔ ایک مسلم اجتماع تھا جس میں افغانی، پاکستانی، انڈین، بنگلہ دیشی، ایرانی اپنے اپنے ممالک کے روایتی لباس میں سج رہے تھے۔ مولوی صاحب نے قربانی کے موضوع پر بہت پُراثر تقریر کی۔ قربانی کی اہمیت اور افادیت کو دل نشین انداز میں بیان کیا۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی اللہ کی خوشنودی کی خاطر اپنی محبت اپنے جذبوں اور اپنی زندگی کی قربانی کی وہ مثال قائم کی کہ ہزاروں سال گزارنے پر بھی نسلوں میں وہ جذبے تازہ ہیں، لگتا ہے کل کی ہی بات ہے اور مسلمان بڑے شوق سے بڑے ذوق سے بڑی لگن سے بڑی

چاہت سے مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک اللہ کا نام لینے والے، رسول کی پیروی کرنے والے اس کار خیر میں حصہ لیتے ہیں۔ کیوں کہ قربانی اتباع رسول ہے۔ قربانی عبادت ہے۔ قربانی ہماری ثقافت ہے۔ قربانی ہماری روایت ہے۔ قربانی ہماری پہچان ہے۔ وجہ افتخار ہے۔ دنیا جب سے قائم ہوئی ہے قربانی کے اتباع، اہتمام اور تسلسل کی ایسی مثال دنیا کی کسی قوم میں زندہ نہیں ہے۔ مولوی صاحب قربانی کے موضوع پر تقریر کیا کررہے تھے۔ منظر کشی کررہے تھے۔ اردو، فارسی اور انگریزی میں علم کا دریا بہہ رہا تھا۔ لوگ جسم و جاں سے بڑھ کر روح کو سرشار کررہے تھے۔ نماز عید کے بعد دیر تک لوگ گلے ملتے رہے اور خوش ہو ہو کر مبارک باد دیتے رہے۔ ایسے موقعوں پر مشروبات کا بندوبست بھی رہتا ہے۔ یہ امریکا کے ایک چھوٹے سے علاقے کا روح پرور اجتماع تھا۔ ایسے اجتماعات ہر سٹی میں ہوتے ہیں۔ نیویارک، شکاگو اور لاس اینجلس کی بڑی مسجدوں میں بڑے اجتماعات ہوتے ہیں اور ہزاروں لوگ عید کی نماز پڑھتے ہیں۔ کچھ لوگ یہاں قربانی کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ زیادہ لوگ اپنے ملک میں اپنے احباب کے ذریعے قربانی کے فریضے کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ مختلف جگہوں پر گھروں پر اکٹھے ہوتے ہیں۔ اچھے اچھے کھانے پکاتے ہیں۔ کھاتے ہیں اور شوق سے کھلاتے ہیں۔ بچوں کو عیدیاں دی جاتی ہیں اور تحائف کا تبادلہ بھی ہوتا ہے۔ ہم دوستوں سے عید ملتے ہوئے گھر آگئے۔

عتیق جس علاقے میں رہتے ہیں وہاں اکثر مسلمانوں کی عید دوسرے دن تھی لیکن شام میں عتیق کی فیملی ہمارے ساتھ عید منانے آگئی۔ راحت اور نجمہ نے بہت اچھی اچھی ڈشز تیار کی ہوئی تھیں۔ شیر خرما بھی تھا اور لولہ سوئیٹ کی مٹھائیاں بھی تھیں۔ سب نے بڑی پسندیدگی سے ڈنر میں حصہ لیا۔ رات گئے عتیق، سعدیہ بچے چلے گئے۔

دوسرے دن عتیق اور بچوں نے کانکرڈ کے علاقے کی مسجد میں نماز عید ادا کی۔ شام کو ہم لوگ ان کے عید ڈنر میں شرکت کے لیے چلے گئے۔ وہاں رضا بھائی کی فیملی بھی آئی ہوئی تھی۔ رضا بھائی فیصل اور عتیق کے عمر رسیدہ دوست ہیں۔ اچھی اردو میں دلچسپ گفتگو کرتے ہیں۔ رضا بھائی اور ان کی بیگم نے جوانی کا ٹائم کراچی میں بحیثیت کالج لیکچرار گزارا ہے۔ اب گزشتہ دس سال سے پوری فیملی امریکا میں بہت آرام سے رہ رہی ہے۔ ایک بیٹا پاکستان میں ہے۔ رات بھیگ رہی تھی۔ سردی بڑھ رہی تھی۔ جانا دور تھا لہٰذا خوش گپیوں اور مزیدار گفتگو چھوڑ کر ہم پلیزنٹ ہل سے ڈبلن کی جانب رواں دواں ہوگئے۔

☆......☆

اب امریکا میں یہ میرا آخری ہفتہ ہے۔ آج مجھے فیکی اوک لینڈ لے جارہا ہے۔ اوک لینڈ۔ الامیڈا کاؤنٹی ایسٹ بے کا سب سے بڑا شہر ہے۔ سان فرانسسکو کے مقابل مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ یہ ایسٹ بے کا پرانا علاقہ ہے اور سب سے زیادہ آباد ہے۔ اس کاؤنٹی میں سی پورٹ ہے۔ کنٹینرز ویئر ہاؤسز ہیں۔ اس کا بہت بڑا انٹرنیشنل ایئرپورٹ ہے۔ ایسٹ بے کا سب سے بڑا میک آرتھر اسپتال بھی اسی علاقے میں واقع ہے۔ اس کا ہاربر، میرینا اور دہارف بہت خوب صورت تفریح گاہ ہے۔ اس کے ڈاؤن ٹاؤن میں بڑی بڑی بلڈنگیں سڑکیں اور بازار ہیں اور ایسٹ بے گورنمنٹ کے دفاتر، اسکول کالج اور بازار ہیں۔ بے برج اسی کاؤنٹی کو سان فرانسسکو سے ملاتا ہے۔ اس کے علاوہ فیریز بھی صبح سے شام تک ڈاؤن ٹاؤن اور میرین کاؤنٹی جاتی رہتی ہیں۔ اوک لینڈ کے ساحلی حصے پر بڑی خوب صورت اور صاف ستھری بستیاں ہیں۔

اندرون زیادہ آبادی مکس ہے جن میں اکثریت میکسیکن اور کالوں کی ہے۔ اس سے پیشتر بھی میں ان علاقوں میں بذریعہ بس آچکا ہوں اور انتہائی اندرون علاقوں میں سفر کیا اور دیکھا ہے، جن میں صرف کالے ہی رہتے ہیں۔ اس علاقے میں چھوٹی چھوٹی سڑکیں، تنگ گلیاں، شکستہ مکانات، چھوٹے بازار اپنی خستہ حالی اور پسماندگی کا کھلا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس علاقے میں کالوں کے علاوہ کسی قوم کے لوگوں کی آمدورفت نہیں ہے۔

کالے امریکا کی سب سے بڑی اقلیت ہیں۔ کالوں کو دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ لمبے چوڑے، مضبوط، محنتی لوگوں کی قسمت میں غلامی، محرومی، ناکامی صدیوں سے چلی آرہی ہے۔ کئی سو سال پہلے انگریز افریقا سے غلام بنا کر زنجیروں میں باندھ کر پانی کے جہازوں میں بھر کر ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں امریکا لائے گئے۔ یہاں شہر سے باہر بیگار کیمپوں میں رکھا گیا۔ ان سے بے حد سخت بیگار، مزدوری، سخت جانی سے کام لیا گیا اور جانوروں سے بدتر سلوک کیا گیا۔

امریکا جیسے ملک میں پہنچ کر یہ قوم بنیادی سہولتوں تعلیم، علاج، رہائش، کاروبار سے محروم رہی۔ دوسری قوموں سے

برابری، آزادانہ میل جول سے نہ صرف دور رہی بلکہ مسلسل نفرت و حقارت کا نشانہ بنتی رہی عرصہ دراز تک اسکولوں، کالجوں، اسپتالوں، ہوٹلوں حتیٰ کہ گاڑیوں بسوں میں بھی داخل ہونے پر پابندی رہی جب کہ امریکا کی تعمیر و ترقی اور شان و شوکت میں انہی حبشی قیدیوں کا خون پسینا شامل ہے۔ ان ہی لوگوں کی محنت عظیم شامل ہے جنھیں انگریز اپنی نو آبادیات سے گھیر کر غلام بنا کر یہاں لائے اور ان سے سخت بیگار لی گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی یہ قوم سخت ذہنی انتشار اور بغاوت کا شکار ہے۔ گداگری، جیب تراشی، لوٹ مار، چاقو زنی اور فائرنگ ان کے محبوب مشغلے ہیں۔ سان فرانسسکو کی بہت سی شاہراہوں کے کونوں پر ان کے قبضے ہیں۔ یہ آزادانہ منشیات اور غیر قانونی کاروبار کرتے ہیں۔ رات ڈھلے ان علاقوں سے مسافر صحیح سالم گزر نہیں سکتا۔ اتنے سخت جان ہیں کہ پولیس کی کسی قسم کی سختی ان پر اثر نہیں کرتی۔ یہ المیہ صدیوں کی محرومی اور بے انصافی ہے۔ جس کا خمیازہ آج کی مہذب اور تعلیم یافتہ قوم اٹھا رہی ہے۔ آج ماحول میں بڑی تبدیلی ہے۔ بہت ساری سہولتوں کے معاملے میں گورنمنٹ نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ تعلیم، علاج، سفر اور میل جول پر سے پابندیاں ختم ہو چکی ہیں لیکن کالوں کی ذہنی پسماندگی اور بیماری ناسور کی شکل میں موجود ہے۔ آج بھی ان کا بڑا طبقہ ریاستی قانون کا نافرمان ہے اور دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنے تعلیم حاصل کرنے اور ترقی کی طرف قدم اٹھانے سے گریزپا ہے۔ ریاست اس کمپیوٹر کے دور میں بھی بے بس ہے۔ کالے سارے امریکا میں موجود ہیں۔ آج کسی بھی جگہ کالوں کو جانے سے کوئی نہیں روک سکتا لیکن جس جگہ کالے ہوں گورے وہاں جانے سے خود بخود رک جاتے ہیں۔ یہ امریکا کے روشن ماحول کا ایک تاریک پہلو ہے۔ جس کا مظاہرہ نیویارک، شکاگو، سان فرانسسکو اور لاس اینجلس میں دیکھا جا سکتا ہے۔

☆......☆

لیک میرٹ، کالسیوم، فروٹ ویل اور بے فیر بھی اوک لینڈ کے چھوٹے شہر ہیں۔ ہم کافی دیر اوک لینڈ کی سیر کرتے رہے اور پھر برکلے میں داخل ہو گئے۔ برکلے بھی ساحلی شہر ہے اس کی سب سے بڑی خوبی اور خصوصیت امریکا کی مشہور برکلے یونیورسٹی ہے اور پورا شہر اسی یونیورسٹی کے گرد گھومتا ہے۔ صاف ستھری Streets خوب صورت مکانات، سڑکیں اور عمدہ ڈاؤن ٹاؤن ہے۔ یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹ چاروں طرف سے آتے جاتے کھاتے پیتے، گھومتے پھرتے، شاپنگ اور خوش گپیاں کرتے نظر آتے ہیں یہ اسٹوڈنٹ دنیا بھر سے تعلیم حاصل کرنے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ تعلیم اس شہر کے چپے چپے سے ٹپکتی ہے۔ ہر مکان، ہر دکان، ہر بلڈنگ کا ایک منفرد ڈھنگ ہے۔ ایک سلیقہ ہے۔ یہیں یونیورسٹی کے کیمپس ہیں۔ ساری دنیا سے لڑکے لڑکیاں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے یہاں آتے ہیں۔ اس شہر میں اسٹوڈنٹ ہوسٹل ہیں۔ پروفیسرز کی رہائش گاہیں اور بنگلے ہیں۔

برکلے میں مرینا ساحل بہت ہی خوب صورت ہے۔ بے شمار کشتیاں ساحل پر موجود رہتی ہیں اور لوگ خاص طور سے اسٹوڈنٹ کشتی رانی کا شوق پورا کرتے ہیں۔ برکلے کے سب سے خوب صورت اور حسین اور قیمتی مکانات برکلی ہلز پر واقع ہیں۔ یہ پہاڑیاں بہت اونچی ہیں۔ Peak پر کئی ایسے موڑ اور مقامات آتے ہیں جہاں سے برکلے کی آبادی، پورا بے سمندر اور ڈاؤن ٹاؤن سان فرانسسکو کی بلڈنگیں روشن نظر آتی ہیں اور بہت ہی بھلا منظر پیش کرتی ہیں۔ ہرے بھرے پہاڑوں اور گھنے جنگلوں اور اونچے اونچے پیڑوں میں سے جگہ جگہ مکانات کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ مکانات بڑے خوب صورت اور قیمتی ہیں۔ ان میں بڑے بڑے شاعر، ادیب، یونیورسٹی کے پروفیسرز، فلسفی، الیکٹرونک میڈیا کے نمائندے اور صاحب ذوق لوگ رہتے ہیں۔ کیوں کہ یہاں کا موسم، پہاڑوں کی ہریالی، سکون اور خواب ناک مناظر انسان کو قدرت کی صناعی اور مصوری کا مطالعہ کرنے، سوچنے، پڑھنے اور لکھنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ پہاڑ سے سڑک اس طرح لہراتی، بل کھاتی ہوئی اترتی ہے جیسے ہری گھاس سے سانپ گزر رہا ہو۔ اسی وجہ سے اس سڑک کا نام Snake ہے، ہم Mount Snake سے نکلے اور واپس ڈبلن کی راہ لی۔

اب ذہن پر کراچی سوار ہے۔ وہ کراچی جو میرا وطن ہے۔ وہ کراچی جو امریکا سے بھی اچھا ہے۔ وہ کراچی جس میں رہتے ہوئے مجھے تین مرتبہ امریکا آکر لمبی مدت رہنے کا موقع ملا۔ وہ کراچی جہاں میرے دوست، میرے عزیز رشتہ دار اور میرے بچے میرے انتظار میں گھڑیاں گن رہے ہیں۔ اس مرتبہ امریکا میں چار ماہ پلک جھپکتے گزر گئے۔

روئے گل سیر نہ دیدم و بہار آخر شد
حیف درچشم زدن صحبتِ یار آخر شد

☆......☆

امریکی معاشرہ کا مطالعہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ

امریکی عورت کا بھی مطالعہ کیا جائے۔
لمبا قد، چھریرا جسم، دلکش سفید رنگت، سنہری زلفیں، خوش مزاج، تعلیم یافتہ، Co-Operative Working Women ہوتی ہیں۔
اسکول، کالج، یونیورسٹی، اسٹورز تقریباً ہر شعبہ زندگی میں آپ سے ملاقات ہوسکتی ہے۔ آپ کے قریب ہوسکتی ہیں۔ ایشین، درمیانے قد اور براؤن رنگ کے پڑھے لکھے کاروباری لوگوں کو یہ قدرتی طور پر نسبتاً لمبے چوڑے امریکی لوگوں کے زیادہ پسند کرتی ہیں بلکہ ترجیح دیتی ہیں۔ ایشین جن میں جاپانی، چائنیز، ہندوستانی، پاکستانی، ایرانی، افغانی، عرب اور دوسرے لوگوں سے یہ راہداری بشرطیکہ وفاداری رابطہ کرتی ہیں۔ دوستی اور تعلق کو شادی تک نبھاتی ہیں اور یہ محض تبرہ ہی ہوتا ہے۔ جب دل بھر جاتا ہے تو چھوڑ کر بے فکری سے اپنی راہ لیتی ہیں۔ اس تجربہ کا دورانیہ ایشین کے لیے بڑے فائدے کا باعث بھی بنتا ہے۔ چونکہ یہ نیٹو ہوتی ہیں لہٰذا رشتہ داروں، دوستوں اور ملنے والوں، پڑوسیوں سے لے کر انتظامیہ تک سے ان کے تعلقات ہوتے ہیں لہٰذا یہ دوستوں اور شوہروں کے ورک پرمٹ، گرین کارڈ اور نیشنلٹی کے مسائل حل کرانے میں دل کھول کر مدد کرتی ہیں بلکہ رہنمائی کرتی ہیں۔
عورت سے محبت و مشقت کے وہ کام کرائے گئے جو ماضی کی عورت نے کبھی نہیں کیے تھے۔ جیسے جیسے عورت کام میں آتی گئی وہ کمانے کی مشین بنتی گئی ویسے ویسے وہ گھر سے آزاد ہوتی گئی۔ گھر کی، شوہر کی، بچوں کی خدمت اور سہولت سے زیادہ اہم اس کی نوکری ہوتی گئی۔ معاشرہ بھی پہلے سے زیادہ Materialistic ہوتا گیا اور عورت کی آمدنی وقت کی گھر کی ضرورت بنتی چلی گئی اور اس آمدنی کی خاطر اسے اپنے آپ کو بھی بیچنا پڑا تو یہ کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن پر عورت کی مانگ بڑھتی رہی۔ عورت کے لیے ماڈلنگ، ہوٹلنگ، فلمنگ، اسٹیج ڈانسنگ کاروباری اور معزز پیشے بن گئے۔ یعنی ایک نیا مقام عورت کو حاصل ہوگیا جس کی ضرورت اہمیت معاشرہ کو پیدا ہوگئی۔ آج عورت نے وہ حیثیت حاصل کرلی ہے جس کا نعم البدل مرد کے پاس نہیں ہے۔

☆......☆

مجھے امریکا آئے ہوئے چار ماہ ہو گئے۔ میں نے یہاں بھرپور تفریح کی بہت لوگوں سے ملا یہ وقت بہت اچھا پلک جھپکتے گزر گیا۔ میں نے یہاں کی Committed ستھری زندگی اور صاف شفاف ماحول اور موسم کا بہت اچھا اثر قبول کیا۔ یہاں کے لوگوں نے سخت محنت اور دیانت کو تسلیم کرلیا ہے۔ اشرافیہ نے عوام کی سہولت کے لیے بہترین قوانین بنا دیے ہیں اور عوام الناس نے انہیں دل و جان سے قبول کر کے عمل شروع کردیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ معاشرے میں رواداری آپس کا تعاون ایک دوسرے سے ہمدردی۔ وقت کی پابندی اور سخت محنت سرائیت کرگئی ہے۔ اتنی ساری خصوصیات اگر کسی معاشرے میں پیدا ہو جائیں تو ترقی کی تیز رفتاری کو کوئی روک نہیں سکتا۔ کسی بھی ترقی پذیر ملک کے مسافر کے لیے امریکا جیسے ترقی یافتہ ملک میں بڑا اٹریکشن ہے لیکن انسان اپنے مزاج کے مطابق ہی کسی جگہ کا اثر لیتا ہے میں بہت اچھی سیر گاہوں میں گھوما۔ بہت سی نئی چیزوں کا مطالعہ کیا۔ بہت اچھے اور مزیدار کھانوں اور مشروبات سے لطف اندوز ہوا لیکن ہمیشہ یہ تاثر عارضی ثابت ہوا۔ مجھے اپنا شہر اپنا گھر اپنے لوگ یاد آتے رہے۔ حالانکہ اپنے گھر میں یہاں کے مقابلے میں سہولتیں بہت کم اور دشواریاں بہت زیادہ تھیں۔ مجھے یہاں کی بہت ساری ڈشز کے مقابلے میں اپنے گھر کے کھانے یاد آتے رہے۔ وہاں کے کباب بہت اچھے ہوتے ہیں لیکن میرے ملک کا ذائقہ وہاں نصیب نہیں وہاں اورنج کا جنگل ہے لیکن کینوں کی چمک کہاں وہاں دنیا کے آم دستیاب ہیں لیکن یہاں کے رٹول اور چونسہ کو لوگ ترستے ہیں۔ مجھے میرے دوست میرے رشتے دار اور بچے بھی مسلسل یاد آتے رہے۔
اپنی اپنی وسعتِ فکر و یقیں کی بات ہے جس نے جو عالم بنا ڈالا وہ اس کا ہوگیا۔ امریکا بہت ترقی یافتہ اور خوب صورت ملک ہے لیکن اصل خوب صورتی وہ ہوتی ہے جسے آپ کا دل قبول کرے۔ امریکا کے مقابلے میں مجھے پاکستان کیوں پسند ہے شاید میں اس کا تجزیہ نہ کرسکوں لیکن میرے لیے میرے ملک میں کوئی ایسی بات ضرور ہے جسے امریکا کی چمک دمک بھی دور نہ کرسکی۔ امریکا کو دیکھ کر سبق ضرور ملتا ہے کہ امریکنوں کی طرح محنت، دیانت، انصاف و عدل کے قوانین کی پاسداری کر کے ہمیں بھی ترقی کرنی چاہیے۔ اپنے ملک کو اسلامی فلاحی ریاست بنانا چاہیے قوموں کی برادری میں قدم سے قدم ملا کر فخر سے سر بلند کر کے چلنا چاہیے۔ مجھے سوچنا چاہیے کہ امریکا کی بے تحاشا قابلِ تعریف سیاحت کے بعد بھی اگر مجھے اپنا ملک پیارا لگتا ہے تو محنت اور تعمیر و ترقی کے بعد یہ ساری دنیا کے لوگوں کو پیارا لگ سکتا ہے۔

آپ نے یقیناً سنا ہوگا کہ کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی۔

یعنی اتنا کمال حاصل کرو کہ اپنے شعبے میں ممتاز ہو جاؤ۔ لوگ تمہیں پسند کریں۔ تم سے پیار کریں تم کو نمونے اور مثال کے طور پر لیں۔

آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ فن، ہنر اور علم کی قدر نہیں ہوتی۔ یہ بات بالکل درست نہیں ہے۔ اگر آپ میں غیر معمولی صلاحیت ہے تو اس کا نوٹس ضرور لیا جاتا ہے۔ دھیان ضرور دیا جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ ٹیلنٹ کو دبا کر نہیں رکھ سکتے۔ کہیں نہ کہیں سے وہ خودرو پودے کی طرح سر اٹھا کر اپنا احساس دلا ہی دیتا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان کیسا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں بہت سی خوبیاں ہوں لیکن ایک خرابی ایسی بھی ہے جو ساری خوبیوں پر پانی پھیر دیتی ہے اور وہ ہے تنگ نظری اور تعصب۔

وہاں کے مسلمان جس حال میں زندگی گزار رہے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دنیا والے آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں۔

وہاں کے کسی بھی شعبے میں مسلمانوں کے لیے آگے بڑھنے کے مواقع بہت کم ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود وہاں بھی علم اور ہنر کو دبانا اور نظر انداز کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

ہندوستان کے دو بہت بڑے سول اعزازات ہیں۔ پدم بھوشن اور پدم شری۔

یہ اعزازات بھی مسلمانوں کو دیے گئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہزاروں اعزازات کے درمیان مسلمانوں کے ملنے والے اعزازات بہت کم ہیں لیکن اس مضمون کا اصل مقصد صرف یہ ہے کہ لاکھ تنگ نظری کے باوجود کمالِ ہنر کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔

مسلمانانِ ہند

ثنا ثاقب

دو سو سالہ برطانوی غلامی کے بعد 14 اگست 1947ء کو مسلمانِ ہند کو پاکستان کی شکل میں خداوند قدوس نے ایک تحفہ عطا کردیا۔ ہند کے ان حصّوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے بہت سوں نے ہجرت کر کے پاکستان آباد کرلیا مگر ایک بڑی تعداد وہیں رہ گئی آج ان کے حالات کیا ہیں؟ کن کن مسائل کا انہیں سامنا ہے اس کا احاطہ کرتی ایک مختصر سی تحریر۔

پاکستان نامی جنت میں بود و باش رکھنے والے اسے ضرور پڑھیں

آیئے ذرا جائزہ لیتے ہیں کہ وہاں کے تنگ نظر معاشرے میں مسلمانوں نے کتنے ایوارڈ حاصل کیے۔

ذاکر حسین ماہر تعلیم، سیاست داں، حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام فدا حسین تھا، ذاکر حسین علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے ہیں۔ 1957ء میں بہار کے گورنر مقرر ہوئے۔ 1954ء میں پدم بھوشن حاصل کیا۔ 1954ء میں ہندوستان کے صدر بھی بن گئے۔

1956ء میں فضل علی نے یہ ایوارڈ حاصل کیا۔ (ان کا شعبہ مفاد عامہ تھا) وہ اڑیسہ اور آسام کے گورنر کے علاوہ بہار کے چیف جسٹس بھی رہے۔

1965ء میں مہدی نواز جنگ نے پدم بھوشن حاصل کیا۔ ان کا شعبہ بھی مفاد عامہ تھا۔ مہدی نواز جنگ 1965ء میں بیوروکریٹ اور سیاست داں تھے۔

حافظ محمد ابراہیم 1967ء۔ احمد آباد میں پیدا ہوئے۔

علاؤ الدین خان 1971ء نے آرٹ کے شعبہ میں ایوارڈ حاصل کیا۔ غلام محمد صادق نے مفاد عامہ کے شعبے میں ایوارڈ حاصل کیا۔ بشیر حق زیدی نے 1976ء میں تعلیم اور ادب کے شعبے میں ایوارڈ لیا۔

1976ء ہی میں سلیم سیف الدین نے سائنس اور انجینئرنگ کے شعبے میں بھی ایوارڈ وصول کیا اور 1977ء میں علی یار جنگ نے مفاد عامہ کے شعبے میں۔

1980ء میں استاد بسم اللہ خان نے آرٹ کے شعبے میں پدم بھوشن کا ایوارڈ حاصل کیا وہ ایک بے مثال شہنائی نواز تھے۔

مرزا حمید اللہ بیگ نے قانون کے شعبے میں یہ ایوارڈ 1988ء میں حاصل کیا تھا۔

علی اکبر خان نے 1989ء میں آرٹ کے شعبے میں یہ ایوارڈ حاصل کیا۔ 1990ء میں عبدالکلام نے سائنس اور انجینئرنگ کے شعبے میں۔ بعد میں وہ ہندوستان کے صدر بھی بن گئے۔

1991ء ہی میں ایم ایف حسین نے یہ ایوارڈ حاصل کیا۔ حسین بین الاقوامی شہرت یافتہ مصور تھے۔

ارونا آصف علی نے 1992ء میں۔ ان کا شعبہ مفاد عامہ تھا۔

سکندر بخت نے 2000ء میں۔ ان کا شعبہ مفاد عامہ تھا۔

امجد علی خان نے 2001ء میں آرٹ کے شعبے میں۔ یہ ایوارڈ حاصل کیا۔

عبید صدیقی نے 2006ء میں سائنس اور ٹیکنالوجی میں ایوارڈ حاصل کیا۔

ابراہیم القاضی نے 2010ء میں آرٹ میں۔ امجد علی خان نے بھی 2011ء آرٹ کے شعبہ اور سید حیدر رضا نے 2013ء فنون۔

استاد احمد علی خان اور استاد رحیم فہیم الدین نے فنون کے شعبہ میں۔ میاں بشیر احمد نے پبلک افیئر میں پروفیسر ڈاکٹر کے ایس مختار احمد نے ادب اور تعلیم۔ محمد یوسف نے بھی ادب، تعلیم۔ حاجی حکیم الدین خان نے آموں کی قلم کاری کے ماہر ہونے کی وجہ سے یہ ایوارڈ حاصل کیا۔

حیدر رضا، ہندوستانی نژاد فرانسیسی مصور (2007ء میں)۔ عبدالرشید خان، کلاسیکل گائیک، مغربی بنگال اس ایوارڈ کو حاصل کرنے والے شاید یہ معمر ترین فرد ہیں ایوارڈ وصول کرتے وقت ان کی عمر 105 برس تھی۔)

پروفیسر ڈاکٹر شریف عالم، وائس چانسلر مولانا مظہر الحق یونیورسٹی، پٹنہ تعلیم اور ادب کے شعبے میں۔ ندا فاضلی، انہوں نے بھی ایوارڈ حاصل کیا ہے۔ فدا صاحب ایک مشہور شاعر اور گیت نگار ہیں۔ فدا صاحب کے ایک دو اشعار سن لیں۔ زندگی انتظار جیسی ہے۔ دور تک رہ گزار جیسی ہے۔ یا۔ ممکن ہے سفر ہو آسان اب ساتھ بھی چل کر دیکھیں۔ کچھ تم بھی بدل کر دیکھو کچھ ہم بھی بدل کر دیکھیں۔ اور یہ شعر تو ضرور سنا ہوگا۔ گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں ہی سہی۔ کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اختر الواسع نے بھی یہ ایوارڈ حاصل کیا تھا۔ ان کے علاوہ مشہور شاعر سالک لکھنوی، غلام احمد جموں اور کشمیر کے ساز نواز۔ راجستھان کے ایس شاکر علی۔ مشہور شاعر ڈاکٹر کلیم احمد عاجز۔ جن کا ایک شعر... برصغیر میں گونج رہا ہے۔ وہ شعر یہ ہے۔ دامن میں کوئی چھینٹ نہ خنجر نہ کوئی داغ۔ تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو۔ ان کے علاوہ دلیپ کمار (فنون)، قرۃ العین حیدر، جوش ملیح آبادی وغیرہ۔

بے شک یہ تعداد بہت کم ہے۔ کروڑوں کے ملک میں یہ انگلیوں پر گنے جانے والے لوگ ہیں لیکن بتانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اگر آپ کسی ایک شعبے میں پوری ایمانداری اور محنت کے ساتھ کام کرتے ہیں، اپنا ٹیلنٹ ظاہر کرتے ہیں تو ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ آپ کو نظر انداز کر دیا جائے۔ چاہے وہ کوئی بھی ملک ہو اور آپ کیسے ہی لوگوں کے درمیان کیوں نہ ہوں۔



تاریخ عالم

منظر امام

یہ عالمِ رنگ و بُو لفظِ کُن سے خلق ہوا، سائنسدانوں نے کہا یہ تو بِگ بینگ سے وجود میں آیا۔ اس کرۂ ارض کے وجود میں آتے ہی زندگی نے انگڑائی لی۔ آدمی کا وجود سامنے آیا۔ آدمی نے ہی اس کرۂ ارض کی رنگینی میں اضافہ کیا۔ اس میں ترقی کا اسپ تیز رفتار دوڑایا۔ یہ دنیا ترقی یافتہ دنیا، رنگینیوں، آسائشوں سے بھری دنیا کوئی ایک دن کی کہانی نہیں۔ ہزاروں سال پر محیط کہانی ہے جسے نہایت مختصر مگر جامع انداز میں احاطہ تحریر میں لایا گیا۔

خوش ذوق قارئین کے لیے ایک دلچسپ تحریر کا پانچواں حصہ

ہم پچھلی قسط میں برصغیر میں آریاؤں کی تہذیب تک آچکے ہیں۔

دراصل یہ بہت پھیلا ہوا موضوع ہے۔ پوری دنیا کی تاریخ کا جائزہ لینا اتنا آسان نہیں ہے۔ ہم سہولت کے لیے دنیا کی تاریخ کو دو حصوں میں بانٹ دیتے ہیں۔

پہلا حصہ تو وہ ہے جب دنیا میں کچھ بھی نہیں تھا۔ لوگ جنگلوں اور غاروں میں رہا کرتے۔ درندوں اور سخت موسم کا مقابلہ کیا کرتے۔ اس وقت پوری دنیا کی تاریخ ایک ہی

جیسی تھی۔ ہر ملک میں، زمین کے ہر ٹکڑے پر اپنی بقا کی جنگ لڑتے ہوئے لوگ۔ یعنی وہ عہد بقا کی جنگ کا تھا۔ کوئی تہذیب نہیں۔ کوئی ثقافت نہیں۔ کوئی نظریہ نہیں۔ کوئی سلطنت نہیں۔ اس لیے پوری دنیا تاریخی اور تہذیبی انداز سے ایک ہی تھی۔ انسان انسان میں کوئی تفریق نہیں تھی۔

پھر انسان نے دھاتوں کا استعمال کیا۔ زراعت کا پیشہ اختیار کیا۔ آبادیاں قائم کیں۔ تمدن اور تہذیب کی بنیاد پڑی۔

اور یہاں سے معلوم تاریخ کا دور شروع ہوا۔ راجے، مہاراجے، سردار وغیرہ سامنے آنے لگے۔ تمدن اور تہذیب نے مذہب کی راہ دکھائی۔ دیوی دیوتا وجود میں آئے اور نیک لوگ انسان کو نیکی اور اچھائی کے راستے دکھاتے رہے۔ تحریر کی ابتدا ہوئی اور یہاں سے معلوم تاریخ کا دور شروع ہوا۔

ہم معلوم تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے ایران کا جائزہ لے چکے ہیں۔ پچھلی قسط میں ہند کا جائزہ لیا تھا لیکن وہ ہند کا مکمل جائزہ نہیں تھا۔ بلکہ برصغیر کی تاریخ کی ایک آؤٹ لائن تھی۔ اب ہم ہندوستان (پاکستان) کی تاریخ کو ذرا تفصیل سے دیکھتے ہیں۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ برہمنوں نے ہند میں ایک ہمہ گیر سماج تعمیر کرنے کے لیے آریاؤں اور مقامی افراد کے عقائد کو ایک ہی لڑی میں پرونے کی کوشش کی اور اس میں وہ کامیاب بھی رہے۔

اوتاروں یعنی انسان کی صورت میں خدا کے ظہور کے عقیدے کو راج کیا اور آواگون کے عقیدے کو پھیلایا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی روح اپنے اچھے یا برے اعمال کے مطابق تا بہ بدلتی رہتی ہے۔

برہمن مت کے خداؤں اور دیوتاؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جن کی مورتیاں عجیب عجیب شکلوں کی بنائی جاتی ہیں اور پوجا کے لیے مندروں میں رکھی جاتی ہیں۔

جیسے برہما، وشنو، شیو، گنیش، سرسوتی، درگا، لکشمی، پاربتی وغیرہ۔

ایک نیا ہندو سماج وجود میں آ گیا۔

اس سماج کے معاشرتی قوانین منو کے دھرم شاستر میں تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔

یہاں میں ایک بار پھر یہ واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ تاریخ عالم کا یہ سلسلہ ممکن ہے کہ کہانیوں اور داستانوں کی چاشنیوں سے بھر گیا ہو۔ کیونکہ یہ ایک خالصتاً علمی، تحقیقی اور تاریخی سلسلہ ہے اور مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ سرگزشت پڑھنے والے سنجیدہ مزاج قارئین اس سلسلے کو دلچسپی سے پڑھ رہے ہیں۔

اس سلسلے کو لکھنے کے لیے بے شمار کتابوں سے ریسرچ کی گئی ہے جیسے محمد الیاس عادل کی تاریخ پاکستان، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا (سبط حسن)، انسائیکلو پیڈیا، ویدانت وغیرہ۔

منو کے دھرم شاستر میں ہندو سماج کو چار طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ان سب کے فرائض مقرر کر کے ضابطے اور قوانین بنا دیے گئے ہیں۔

منو کا دھرم شاستر مذہبی، معاشرتی اور اخلاقی ضابطوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں ہر بات کو نہایت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

معاشرے کے چار طبقے برہمن، کھشتری، ویش اور شودر مقرر کیے گئے ہیں۔

برہمنوں کا کام علم اور فکر کی زندگی بسر کرنا اور مذہبی رسومات کی ادائیگی کرنا بتایا گیا ہے۔ کھشتری طبقے کے لوگ راجے، سپاہی، پیشہ ور اور حاکم افراد ہیں۔ ویش تجارت و صنعت وغیرہ اور اس قسم کے دیگر پیشوں سے منسلک رہنے والے ہیں۔ جب کہ شودر غلام ہیں جن سے جسمانی مشقتوں کا کام لیا جاتا ہے۔

چنڈال وہ لوگ ہیں جن کو سماج نے کسی جرم کی وجہ سے معاشرے سے خارج کر دیا ہو۔

منو کے دھرم شاستر میں انسان کی زندگی کے چار ادوار مقرر کیے گئے ہیں (خاص طور پر برہمنوں کے لیے)۔

ابتدائی دور میں برہمچاری بن کر تعلیم حاصل کرنا لازم ہے۔ دوسرے دور میں شادی کر کے خانہ داری کی زندگی بسر کرنا ہے۔ تیسرے دور میں کاروبار سے الگ ہو کر جنگل میں گیان دھیان کی زندگی بسر کرنا ہے اور چوتھے دور میں سنیاسی بن کر تمام دنیاوی لذت کو ترک کر دینا ہے۔

ہندو سوسائٹی آج تک ان ہی اصولوں پر عمل کر رہی ہے۔

یہ ذکر ہو چکا ہے کہ آریاؤں یا برہمن مت میں عورت کا درجہ مرد سے کم تھا۔ پھر بھی رگ وید میں ان رشیوں کے بھجن موجود ہیں جو عورتیں تھیں جیسے ''وشواوارا، گھوشا اور اپالا''۔

یہ چونکہ ایک دل چسپ اور ہماری تہذیب سے بالکل مختلف تہذیب تھی۔ اس کی اگر تھوڑی سی تفصیل بیان کر دی جائے تو بہتر ہوگا۔

ان کے یہاں شادی بیاہ کی رسمیں لڑکی کے میکے میں منائی جاتی تھیں۔ عام طور پر ایک مرد اور ایک عورت کا رواج تھا لیکن کبھی کبھی ایک مرد کی کئی بیویاں بھی ہوتی تھیں۔

ستی کا رواج نہ تھا۔ (ستی اس رسم کو کہتے تھے جس میں شوہر کی موت کے بعد اس کی بیوی کو بھی اس کی چتا میں جلنا پڑتا تھا۔ ویسے تو اس رسم پر ہندوستان میں مکمل پابندی ہے۔ اس کے باوجود دور دراز کے علاقوں میں آج بھی ایسی خبریں سننے کو مل جاتی ہیں)۔ بیواؤں کی دوبارہ شادی کر دی جاتی تھی۔

یہ لوگ بھی اپنے مُردوں کو جلاتے تھے اور کبھی دفن کرتے تھے۔

آریاؤں میں چھوت چھات کی کوئی تمیز نہیں تھی (ذات پات اور چھوت چھات کا کلچر برہمن مت سے شروع ہوا تھا)۔ پیشے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ ہر شخص آزاد تھا کہ جو پیشہ چاہے اختیار کر لے۔

چنانچہ رگ وید کا ایک شاعر لکھتا ہے۔ ''میں کوی ہوں۔ میرا پتا وید ہے (وید، حکیم) اور میری ماں چکی پیستی ہے۔ ہمارے خیالات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ پھر بھی ہم سب فائدے کے پیچھے اس طرح بھاگتے ہیں جیسے مویشیوں کے پیچھے۔

آریاؤں کے معاشرتی نظام کے کئی درجے تھے۔ خاندان کی سماجی وحدت کو ''گراما'' کہتے تھے اور گھر کے بزرگ کو گرامن''۔

پنجابی زبان کا گرائیں اور اردو کا گھرانا اسی لفظ سے مشتق ہیں۔

ابتدائی آریاؤں میں نہ تو مورتیوں کی پوجا کا رواج تھا اور نہ وہ مستقل عبادت گاہیں تعمیر کرتے تھے۔ البتہ وہ مظاہر قدرت کو دیوتاؤں کا درجہ دیتے تھے۔

ان کے سب سے بڑے دیوتا کچھ یوں تھے۔

ورونا (آسمان) اگنی (آگ) وایو (ہوا) اور مترا (سورج)۔

ورونا سب سے بڑا دیوتا تھا اور وہ اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگا کرتے تھے۔ ایک بھجن کے بول کچھ

یوں ہیں۔
''اگر ہم نے کسی بے قصور انسان کو ستایا ہے۔
اگر ہم نے کسی بھائی، دوست یا ساتھی کے ساتھ بدی کی ہے یا کسی پڑوسی یا اجنبی کو دکھ دیا ہے، تو اسے ورونا ہمیں گناہ کے راستے سے بچالے۔
اے ورونا ہم نے انسانوں کی حیثیت سے تیری قوت کے خلاف اگر کوئی گناہ کیا ہے۔
اگر ہم نے انہی فطرت سے مجبور ہو کر تیرا کوئی قانون توڑا ہے۔
تو اے ہمارے دیوتا تو ہمیں سزا سے محفوظ رکھ۔
یہ کتنی سیدھی سادی اور سچی دعا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدائی آریہ لوگ نیک اور پُرخلوص ہوا کرتے تھے۔
پھر جب برہمن مت کا نیا کلچر وجود میں آیا تو ان میں خرابیاں شروع ہو گئیں۔
رگ وید میں اگنی، وایو، مترا اور دوسرے دیوتاؤں کی تعریف میں بہت سے بھجن ہیں مگر ایسا لگتا ہے کہ وادی سندھ میں داخل ہونے کے بعد اِندر سب دیوتاؤں پر بازی لے گیا۔
چنانچہ رگ وید کے چوتھائی سے زیادہ بھجن اندر ہی سے منسوب ہیں۔
اِندر اور ورونا کی قوت عمل کا مظہر تھا۔
یہ ذکر ہو چکا ہے کہ آریا تہذیبی اعتبار سے مقامی لوگوں سے برتر تھے۔ ان کے پاس جنگی ہتھیار بھی تھے اور تیز دوڑنے والے رتھ بھی تھے۔ انہوں نے مقامی باشندوں پر فتح حاصل کرنا شروع کر دی اور پہلے تو وہ بستیاں وغیرہ نہیں بساتے تھے لیکن یہاں کے کلچر سے متاثر ہو کر انہوں نے بستیوں اور شہروں کی تعمیر شروع کر دی۔
آریوں نے بعد میں جو شہر بسائے وہ ٹیکسلا، پش کلارت (چارسدہ) اور پورت پورا (پشاور) تھے۔
ان میں سب سے بڑا مرکز ٹیکسلا ہی تھا۔
ٹیکسلا کا پرانا نام ٹیکس سیلا ہے۔ تک سی سنسکرت میں کالے ناگ کو کہتے ہیں۔ ناگ کی پوجا یہاں کے قدیم باشندوں کی روایت ہے۔ آریائی وراثت نہیں ہے۔ ناگ کی پوجا کرنے والی قوم میں کسی زمانے میں ٹیکسلا کے آس پاس آباد تھیں۔ ان کے آثار کشمیر میں آج بھی موجود ہیں۔
ناگا قوم کے لوگ آسام، برما اور وسطی ہند میں بھی بسے ہوئے ہیں۔
ٹیکسلا کے آثار راولپنڈی سے بیس میل شمال مغرب میں گیارہ میل لمبی اور پانچ میل چوڑی ایک نہایت شاداب وادی میں واقع ہے۔
ٹیکسلا اور اس کے قبائل اور اس سے وابستہ داستانوں کا اگر تھوڑا سا ذکر کر دیا جائے تو میرا خیال ہے کہ بہت مناسب ہوگا۔
یونان کے مشہور مؤرخ ہیروڈوٹس نے بھی ٹیکسلا کا ذکر شاندار الفاظ میں کیا ہے۔ اس مؤرخ کا زمانہ 484-425 ق م ہے۔
رامائن کی روایت کے مطابق ٹیکسلا کی بنیاد راجا رام چندر کے سوتیلے بھائی راجا بھرت نے رکھی تھی۔ اس نے اپنے ایک بیٹے کو ٹیکسلا کی گدی پر بٹھایا تھا اور دوسرے بیٹے پشکا کو پشکاوت کی گدی پر۔ مگر کہا جاتا ہے کہ یہ ایک فرضی داستان ہے۔
البتہ مہابھارت میں ٹیکسلا کا ذکر تاریخی اعتبار سے زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ مہابھارت کی جنگ میں جب کوروں کو شکست ہوئی اور پانڈو فتح یاب ہونے کے باوجود ہستناپور (دہلی) میں راج نہ کر سکے تو ان کے ایک وارث پریکشت نے ٹیکسلا میں حکومت قائم کی۔
اس کے زمانے میں اس شہر میں خوش حالی اپنے عروج پر تھی۔
پریکشت نے ناگا قبائل کو زیر کر کے گھوڑے کی قربانی کی رسم شروع کی۔
اس موقع پر کولی ویاس کی لکھی ہوئی مہابھارت کی رزمیہ داستان ابتدا سے انتہا تک پڑھ کر سنائی گئی۔
یاد رہے کہ دنیا کی سب سے پرانی کتاب رگ وید اسی سرزمین پر تصنیف ہوئی تھی اور مہابھارت کی شکل میں دنیا کی سب سے پہلی اور سب سے طویل رزمیہ نظم بھی اسی سرزمین پر لکھی گئی۔
مہابھارت کا سب سے قدیم تذکرہ سنسکرت کے مشہور پنڈت ''پانسنی'' کی کتابوں میں ملتا ہے۔ پانسنی ٹیکسلا کے قریب سلوترا کا باشندہ تھا۔ سنسکرت زبان کی پہلی گرامر بھی اسی نے لکھی تھی۔ وہ چھٹی یا پانچویں صدی قبل مسیح میں ٹیکسلا میں تعلیم دیتا تھا۔
پانسنی کی کتابوں میں مہابھارت کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ مہابھارت کم از کم چھٹی صدی قبل مسیح سے پہلے کی

تصنیف ہے۔ ابتدا میں مہابھارت کے اشعار کی تعداد 25 ہزار کے لگ بھگ تھی لیکن بعد میں اضافے ہوتے چلے گئے۔

یہاں تک کہ گیتا راجاؤں کے عہد تک آتے آتے ان کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہوگئی۔

مہابھارت کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس کو بھگود گیتا کہتے ہیں۔ ہندو دھرم میں بھگود گیتا کا مرتبہ رگ وید سے بھی بلند ہے۔

بھگود گیتا وہ فرضی مکالمہ ہے جو کرشن بھگوان اور پانڈوؤں کے ہیرو ارجن کے درمیان جنگ کے میدان میں ہوا تھا۔

یہ مکالمے بہت زبردست ہیں اور فصاحت و بلاغت کا شاہکار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فلسفیانہ طرز زندگی کی بھی نمائندگی کرتے ہیں۔

قارئین کی دل چسپی کے لیے اس مکالمے کے کچھ اقتباسات درج کر رہا ہوں۔

پس منظر کچھ یوں ہے کہ کوروں اور پانڈوں کی فوجیں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑی ہیں۔ ارجن بہت الجھن میں مبتلا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ وہ کیا کرے۔

اس کے سامنے صف آرا لوگوں میں اس کے دوست، عزیز، رشتے دار بھی ہیں۔ ان ہی میں بزرگ بھیشم بھی ہے جس نے ارجن کو پالا تھا اور گیان دھیان کی خاطر راج پاٹ کو ٹھکرا دیا تھا اور درونا ہے جس نے ارجن کو تعلیم دی تھی۔

وہ کہتا ہے۔ ”کیا میں ان کا خون بہاؤں۔ یہ سچ ہے کہ انہوں نے راج پاٹ کا لالچ کیا لیکن وہ میرے گرو ہیں۔ میں اس سنسار میں اپنا پیٹ بھیک مانگ کر بھر لوں گا مگر وہ شاہی پکوان نہیں چکھوں گا جس میں ان لوگوں کے خون کا مزہ ہو۔ نہیں کرشن میں ہتھیار نہیں اٹھاؤں گا۔“

کرشن، ارجن کو سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں۔ ”ارجن دانا لوگ زندوں کا غم نہیں کرتے اور نہ مُردوں کے لیے آنسو بہاتے ہیں۔ کیوں کہ زندگی اور موت دونوں گزارنی ہیں۔ البتہ آتما امر ہوتی ہے اور انسان کے اندر جو امر ہے اسے کوئی مار نہیں سکتا۔ پس ارجن اپنے فرض کو پہچان اور راہ حق سے گریز نہ کر۔ کہ چھتری کے لیے سچائی کی لڑائی میں شرکت سے بہتر کچھ نہیں ہے۔ اپنے فرض کی ادائیگی میں مرنا عین زندگی ہے اور دوسروں کی فرماں برداری میں زندہ رہنا عین موت ہے۔“

غرض یہ کہ دونوں کے درمیان اس قسم کے مکالمے ہوتے رہے اور مہابھارت کی تخلیق ہوتی چلی گئی۔ چونکہ ہمارا موضوع ہندوستان کی تاریخ کا جائزہ لینا ہے کہ تہذیب کی آمد سے ایک قبل مسیح تک وہاں کے سیاسی، معاشرتی، سماجی اور مذہبی معاملات کیا تھے۔ اس لیے ہم جلد وگیتا اور مہابھارت سے ہٹ کر پھر تاریخ کی طرف آتے ہیں۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ہم نے اس پورے پیریڈ (عہد) کی مجموعی صورتِ حال کا جائزہ لیا ہے۔ سال بہ سال تفصیلات میں نہیں گئے ہیں۔ ورنہ یہ کہانی اتنی پھیل جائے گی کہ اس کو سمیٹنا دشوار ہو جائے گا۔

چونکہ ہم نے ہند (پاکستان) کی مذہبی اقدار کا جائزہ لیا ہے اور ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ مقامی باشندوں کے مذاہب کیا تھے۔ ان کے دیوی دیوتا کیا تھے۔ پھر آریہ اپنے ساتھ کون سے مذہبی نظریات لے کر آئے۔

اور ایک نیا مذہب ان دونوں کے امتزاج سے تشکیل پانے لگا۔ جس کو برہمن مت یا آج ہندوازم کا نام دیا گیا ہے۔

اب یہ دیکھیں کہ پھر اس دور میں برصغیر میں کون کون سے مذاہب سامنے آئے۔ ان کی فلاسفی کیا تھی۔ مذاہب کے تذکروں کے بعد ہم حکمرانوں کے مختصر حالات کی طرف آئیں گے اور یہ سلسلہ ایک قبل مسیح تک جاری رہے گا۔

اس کے بعد ایک قبل مسیح سے 2015ء تک۔ لیکن اس سے پہلے ہم ہند (پاکستان) کی تاریخ کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ دوسری تہذیبوں کی طرف بھی جائیں گے۔ جیسے چین، عراق، یورپ، روس، امریکا وغیرہ۔

اب آجائیں ہند میں برہمن مت کے طاقت ور اثرات والے مذہب کے درمیان دوسرے مذاہب کے اثرات۔

اس مختصر جائزے سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ ایک صدی عیسوی تک ہند (پاکستان) میں کون کون سی تہذیبیں سامنے آرہی تھیں اور یہاں کے لوگوں کی زندگی پر ان کے کیا اثرات تھے۔

ہندوستان میں چھٹی صدی قبل مسیح میں برہمن مت کا دور دورہ تھا۔ عوام میں مورتی پوجا کو فروغ ہو رہا تھا۔ یوگیوں اور سنیاسیوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔

ایسے میں اس صدیوں پرانے سسٹم میں تبدیلی کی

ایک زبردست لہر بدھ مت کی صورت میں سامنے آئی۔

بدھ مت

سنیاسیوں اور جوگیوں کا دور۔ مورتی پوجا۔ سنیاسیوں اور جوگیوں کی مکتی حاصل کرنے کی اذیت دہ ترکیبیں اور طریقے۔

یہ لوگ اپنے جسموں اور جانوں کو جان بوجھ کر طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتے تھے اور اس طرح عوام کو اپنا گرویدا کرلیتے۔

کوئی ہاتھ کھڑا کر کے سکھا لیتا تھا۔ کوئی مہینوں ایک ٹانگ پر کھڑا رہتا۔ کوئی فاقہ کشی کر کے ہڈیوں کا پنجر بن جاتا۔

برہمن راجے، سرکاری اہل کار اور تاجر عیش کی زندگی گزار رہے تھے۔ عوام کی حالت خراب تھی۔ ایسے ماحول میں سدارتھ گوتم نے لوگوں میں بدھ مت کو پھیلانے اور رائج کرنے کا کام شروع کیا۔

گوتم ایک شاہی خاندان کے شہزادے تھے۔ ان کی پیدائش 560 قبل از مسیح نیپال کی شمالی سرحد کے قریب لمبنی میں ہوئی۔

ان کا باپ ایک کھشتری ہندو تھا۔ سدارتھ گوتم کی تربیت بہت ناز و نعم میں ہوئی۔ کیونکہ آگے چل کر راج پاٹھ سنبھالنا تھا۔

ان کے جوان ہونے پر باپ نے ان کی شادی اپنے رشتے داروں کی ایک خوب صورت شہزادی سے کردی۔ جس کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا۔

گوتم کو 28 برس کی عمر تک شاہی محلات کی حدود سے باہر نکلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ پھر ایک دن جب انہوں نے باہر نکل کر سیر کی تو عجیب عجیب مناظر دیکھنے کو ملے۔

انسانوں کی بے بسی، مجبوری، ان کی محنت مشقت، بھوک سے نڈھال بچے، روتی ہوئی عورتیں، ایک بیمار انسان اور ایک میت جس کو دفنانے کے لیے اس کے رشتے دار روتے پیٹتے چلے جا رہے تھے۔

گوتم ایک دردمند اور حساس دل کے انسان تھے۔

پہلا خیال ان کے ذہن میں یہی آیا کہ اس دنیا میں اتنے دکھ کیوں ہیں اور ان سے نجات حاصل کرنے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے۔

اس سوچ بچار میں انہوں نے راج محل اور رشتوں کو چھوڑ دیا اور سچائی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔

آخر برسوں کی ریاضت کے بعد ایک رات ایک درخت کے نیچے انہیں گیان (عرفان) حاصل ہوگیا۔ اگلے دن سے نوع انسانی کے لیے ایک نیا پیغام لے کر انہوں نے تبلیغ شروع کردی۔

وہ کپیل وستو بھی آگئے۔ جہاں باپ کی حکومت تھی۔ انہوں نے بھی گوتم کے پیغام کو قبول کرلیا اور اس نئے مذہب کے پیروکار ہوگئے۔

اب گوتم کو بدھا (یعنی عارف) کے نام سے جانا جانے لگا۔ انہوں نے راج پاٹ بالکل چھوڑ دیا اور ساری زندگی اپنے مذہب کی تبلیغ میں لگادی۔

بدھا کا انتقال 480 قبل مسیح میں ہوا۔ ان کے مشاہدات اور مکاشفات کے حوالے سے جو کتابیں ملتی ہیں ان میں ان کے پیغام تحریر کیے گئے ہیں۔

بدھا کا سیدھا سادا پیغام یہ تھا۔ ”دنیا کی زندگی ہیچ ہے۔ اس سے دل نہیں لگانا چاہیے۔ یوگیوں کی ریاضتوں اور مجاہدوں سے حقیقت کا عرفان حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ عرفان قلبی کیفیات اور روحانی محسوسات کی تربیت سے ملتا ہے۔

دنیا دکھوں کی جگہ ہے اور اس کی آسائشیں بے معنی ہیں۔ اس لیے انسان کو اپنے احساسات ایسے بنالینے چاہئیں کہ وہ دکھ سکھ سے بے نیاز ہوجائے۔ ایسی کیفیت کے حصول کو بدھ نے ”نروان“ کا نام دیا ہے۔

بدھ کی تعلیم میں سچائی، بزرگوں کی عزت، ازدواجی وفاداری، ماں باپ کی عزت، نیک اعمال، خیرات، عاجزی، صبر، ضبط اور قناعت پر بہت زور دیا گیا ہے۔

بدھ کی تعلیمات بہت سیدھی اور سچی ہیں۔ اس لیے لوگ بدھ مت اختیار کرتے چلے گئے۔ ان کی موت کے بعد چونکہ ہندوستان میں بت پرستی عام تھی۔ یہ ان کے مزاج میں شامل تھی۔ لہٰذا بدھ کی بھی مورتیاں بنا کر ان کی پوجا ہونے لگی۔

ہندوستان میں بدھ مت کا زور آٹھ نو سو برسوں تک رہا۔ اس دوران سری لنکا، برما، چین اور افغانستان کے لوگوں نے بھی اس مذہب کو قبول کرلیا۔

برہمن مت کے لیے یہ بہت تکلیف دہ صورت حال تھی۔ وہ بدھ مت کو برداشت نہیں کر پارہے تھے۔ لہٰذا انہوں نے بدھ لوگوں سے لڑائیاں شروع کردیں۔ ان کی خانقاہوں کو تباہ و برباد کردیا۔

بہار کے شہر گیا میں بدھ کے پیروؤں کا مندر اب تک موجود ہے۔ اس مندر کے پاس بڑ کا جو درخت ہے وہ اس اصل بڑ کا بچہ ہے۔ جس کے نیچے گوتم کو عرفان حاصل ہوا تھا۔
اس بڑ کا ایک بچہ سری لنکا میں بھی ہے۔ جس کی عمر دو ہزار سال سے زائد بتائی جاتی ہے۔
بدھ نے یہ بھی کہا تھا کہ مجھ سے پہلے بھی انسانوں کی رہنمائی کے لیے بدھ آتے رہے ہیں اور میرے بعد بھی آتے رہیں گے (یعنی روایات کے مطابق انہوں نے حضور کے بارے میں نشانیاں بتادی تھیں)۔
بدھ کا ایک شاندار مجسمہ لاہور میوزیم میں بھی موجود ہے۔

جین مت

ہند (پاکستان) میں جن دنوں بدھ مت کی تعلیمات پھیلائی جارہی تھیں اور فکری سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ ان ہی دنوں بدھ مت کی طرح جین مت کا بھی ظہور ہوا۔ جس کے پیروکار بہت ہوگئے۔ وہ آج بھی موجود ہیں۔
جین مت کا بانی مگدہ دیش (بہار) کے ایک کھشتری رئیس کا بیٹا وردمن مہاویر نامی تھا جو 599 قبل مسیح سے 627 قبل مسیح تک زندہ رہا۔
مہاویر نے تیس سال کی عمر میں دنیا چھوڑ دی اور چالیس سال کی عمر میں اپنے مذہب کا پرچار شروع کیا۔
مہاویر کی تعلیم یہ تھی کہ انسان کو نیک اعمال، خیرات اور سخاوت سے موکش کا درجہ حاصل کرنا چاہیے جو انسان کی روح کو آواگون کے چکر سے نجات دلاتا ہے۔ نیکی، پرہیز گاری، حرص و ہوس سے آزادی، دنیا سے دل نہ لگانے، گناہوں کے خیال تک سے بچنے اور کسی جاندار کو دکھ نہ پہنچانے سے موکش حاصل ہوتی ہے۔
مہاویر نے بھی کئی برسوں تک جنگلوں میں ریاضت کی اور سچائی کی تلاش میں لگا رہا۔ اسے سچائی کی روشنی بالآخر حاصل ہوگئی۔ اور مہاویر جین کہلانے لگا۔ جس کا مفہوم فتح حاصل کرنے والا ہے۔ اس کے پیروکار جین کہلاتے ہیں۔
ہندوستان میں ایک قبل از مسیح یا پہلی عیسوی تک کے مذاہب کا جائزہ مختصر طور پر تحریر کردیا گیا اب یہ دیکھیں کہ اس زمانے میں پورے برصغیر کی کیا صورت حال تھی۔

سکندر اعظم

327 قبل مسیح تک دریائے اٹک تک کی سرزمین سلطنت ایران میں شامل تھی۔ جب کہ دریائے اٹک کے

عدنان مندیریس

(1899ء۔1961ء)

ایک ترک سیاست داں۔ امریکن کالج از میر اور انقرہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ 1936ء میں نیشنل اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور اتاترک کی ری پبلکن پارٹی کے مقابلے میں ڈیمو کریٹک پارٹی کی داغ بیل ڈالی۔ 1945ء سے 1950ء تک حزب اختلاف کے لیڈر رہے۔ 1950ء میں ڈیموکریٹک پارٹی بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی اور مندریس نے وزارت بنائی۔ 1954ء کے انتخابات میں بھی ڈیموکریٹک پارٹی برسراقتدار آئی تو مندریس ہی نے وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھالا۔ مئی 1960ء میں جنرل گرسل نے ان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ 17 ستمبر 1961ء کو طویل مقدمے کے بعد انہیں غداری، قتل اور غبن وغیرہ کے الزامات میں پھانسی دے دی گئی۔

مرسلہ: اشرف عباس۔ ساہیوال

اس پار کے علاقے پر اولین حکومت ٹیکسلا راجاؤں نے قائم کی تھی۔ جن کی قلمو اٹک اور جہلم کے درمیان تھی۔
جہلم سے پنجاب تک راجا پورس کی حکومت تھی۔ کشمیر میں راجا ابی سارئیس حکومت کررہا تھا۔ یہ سب راجا مگدھ (بہار) کے مہاراجا کے تابع تھے۔ جس کا مرکز حکومت دریائے گنگا کے جنوبی کنارے پر تھی اور اس کا مشہور راجا چندر گپت گزرا ہے۔
327 میں ہی سکندر نے برصغیر پر حملہ کردیا۔ درۂ خیبر سے ہوتی ہوئی اس کی فوج پنجاب کی طرف بڑھی۔ دریائے جہلم کے کنارے پورس نے اس کا راستہ روکا۔ زبردست جنگ ہوئی۔ پورس کی کوشش تھی کہ سکندر کو دریائے جہلم سے نہ گزرنے دے۔
سکندر نے جنگی چال چلی اور تقریباً 34 کلومیٹر لمبا چکر کاٹ کر ایک دوسری گھاٹی سے جہلم کو پار کرلیا۔
راجا پورس نے اپنے ہاتھیوں کو دشمن کی طرف بڑھانے کی بڑی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوسکی۔ بلکہ یہ ہاتھی خود پورس کی فوج کو روندتے ہوئے بھاگ گئے۔ (اس وقت پر راجا پورس کے ہاتھی جیسی کہاوت بھی دہرائی جاتی

ہے)۔
پورس کا بیٹا مارا گیا۔ پورس گرفتار ہو کر سکندر کے سامنے پہنچا۔ یہاں ان دونوں کے درمیان وہ گفتگو ہوئی جو تاریخ کا حصہ بن گئی ہے۔
سکندر نے پوچھا۔ ''اب تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟''
پورس نے جواب دیا۔ ''وہی جو ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کے ساتھ کرتا ہے۔''
پورس کی ایسی گفتگو نے سکندر کو متاثر کیا۔ اس نے پورس کو اس کا ملک واپس کر دیا۔
سکندر نے یہاں دو شہر تعمیر کیے۔ ایک دریائے چناب کے مغربی کنارے پر جو موجودہ شہر جلال پور کے قریب واقعہ تھا۔
دوسرا شہر نکائیکا تھا۔ سکندر نے اپنے سے مفتوحہ علاقوں کا دورہ کیا اور دورے کے بعد نکائیکا آباد کر کے آگے بڑھ گیا۔
ان علاقوں میں ایک بہت زبردست و جنگجو قوم آباد تھی۔ جسے یونانیوں نے کیتھی کا نام دیا ہے۔ اس سے مراد غالباً آج کی کاٹھیاواڑی قوم ہے کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ کھتوں لوگ تھے۔
جنگ شروع ہوئی تو ملتان اور اوچ کے لوگ بھی سکندر کے خلاف ان کے ساتھ آ کر مل گئے۔ بہت ہی گھمسان کی جنگ ہوئی۔
سکندر کی فوجوں نے سنگھالا کا محاصرہ کر کے اسے فتح کر لیا۔
سکندر کی جنگیں ملتان اور اوچھ میں بھی ہوئیں۔ ملتان میں سکندر کی فوجوں کو سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ لیکن سکندر نے فتح حاصل کر لی۔
اس کا ارادہ آگے بڑھنے کا تھا لیکن اس کی فوج مسلسل جنگ اور وطن سے دوری کی وجہ سے تھک چکی تھی لہٰذا اس نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا اور سکندر کو یہاں سے واپس ہو جانا پڑا۔
اس نے اپنی فتوحات کی یادگاریں تعمیر کیں اور اس علاقے کی تہذیب پر اپنے گہرے نقوش چھوڑ گیا۔
ہند میں سکندر کی آمد اور اس کی فتوحات کے بعد حالات بدلنے لگے۔ راجاؤں کو خیال آیا کہ انہیں متحد ہو کر ایک بڑی سلطنت قائم کرنی ہے۔

اس سلسلے میں ایک بڑی کامیابی بہار کے راجا چندر گپت موریا کو ہوئی۔ اس نے متحدہ ہندوستان کی بنیاد رکھی۔
چندر گپتا موریا کی موت کے بعد اس کے پوتے اشوک اعظم نے ایک وسیع تر سلطنت کی بنیاد رکھ دی۔ درہ خیبر سے لے کر راس کماری تک گویا سارے ہندوستان نے اسے اپنا شہنشاہ تسلیم کر لیا۔ لیکن اشوک ایک حساس دل رکھنے والا شخص تھا۔ اسے انسانی جانوں کی بنیاد پر فتوحات حاصل کرنا اچھا نہیں لگا۔ اس نے قسم کھا لی کہ وہ اب کبھی جنگ نہیں کرے گا۔
اس نے بدھ مت قبول کر لیا۔
اس کے بدھ ہو جانے کے بعد ہندوستان میں اس مذہب کو بے پناہ عروج حاصل ہوا۔
اشوک کی وفات 227 قبل مسیح میں ہوئی تھی۔
یہاں تک یعنی پہلی عیسوی صدی تک کے حالات کا جائزہ لے لیا گیا ہے۔ یعنی ہندوستان اور پاکستان میں کون کون سی تہذیبیں موجود تھیں۔ کون کون سے فلسفیانہ عقائد اور نظریات سامنے آئے۔ کن کن مذاہب نے فروغ حاصل کیا۔ ہندو مت سے لے کر بدھ مت اور جین مت تک۔
اس کے علاوہ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ کون کون سی ہندو سلطنتیں حکمرانی کرتی رہیں اور سکندر اعظم نے کہاں تک کامیابیاں حاصل کیں وغیرہ۔
ویسے تو اس سرزمین پر بے شمار راجے اور مہاراجے تھے۔ جن میں آپس میں جنگیں ہوا کرتیں جو فتح اور شکست کے نشیب و فراز سے گزرتے رہتے تھے لیکن ہم نے صرف ان کا ذکر کیا ہے جن کے اثرات بہت گہرے تھے۔
ہم نے یہاں کے طبقاتی نظام اور رسوم و رواج کا کس حد تک جائزہ لیا ہے لیکن یہ سب کچھ پہلی عیسوی سے پہلے کی ہے۔

ایران اور ہندوستان کی تہذیبوں کے جائزے کے بعد دنیا کی وہ اقوام جن کی تاریخ بھی ہنگامہ خیز ہے۔ جن کی تہذیبوں نے عروج و زوال دیکھے ہیں لیکن یہ ذکر اجمالی طور پر الگ اقساط میں آئیں گے۔ میرا خیال ہے کہ ہم اس موقع پر شاید کسی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں کہ ملکوں کی تاریخ کا جائزہ عہد بہ عہد لیا جائے۔ اب یہ دیکھا جائے کہ جب فلاں عہد میں فلاں ملک میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا تو اس عہد میں دنیا کے دوسرے ممالک اور دوسری تہذیبوں میں کیا ہو رہا تھا۔




فلم نگری

ببوّ

انور فرہاد

پاکستان کی فلمی صنعت بڑے مصائب سے گزر کر سنبھلی تھی۔ جلے ہوئے اسٹوڈیو، لٹے ہوئے سنیما گھروں کو کن کن پریشانیوں کے بعد آباد کیا گیا تھا یہ الگ داستان ہے۔ اس داستان کی سرخیل وہ ہستیاں ہیں جنہوں نے دن رات کی محنت سے اس صنعت کو ترقی دی اور عروج پر لے آئے۔ وہ لوگ پیسوں کی خاطر کام نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے پیشے کو عبادت کی طرح برت رہے تھے۔ انہی نابغہ روزگار ہستیوں میں عشرت سلطانہ کا نام بھی آتا ہے۔

ایک بڑی فلمی شخصیت کی زندگی کا احوال

میں دفتر میں کام نمٹا رہا تھا۔ کاپی پریس بھیجنی تھی اس لیے سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ اداکار محمد علی پر خصوصی اشاعت تھی اس لیے بھی کام زیادہ پھیل گیا تھا۔ چار کاپی پریس جا چکی تھی۔ تین باقی تھی کہ دوسرے کمرے سے ٹیپ ریکارڈ پر بجتے گانے کی آواز آئی۔ میں اٹھ کر اس کمرے کی طرف چل پڑا۔ آصف پاکستانی گیتوں پر مضمون تیار کر رہا تھا۔ شاید اسی لیے وہ پرانے گیت سن رہا تھا اور یہ گیت میرے پسندیدہ تھے۔ میں کام جاری نہ رکھ سکا اور اپنی سیٹ سے اٹھ

گیا۔ میں نے اندر جاتے ہی سوال کیا۔
''آخری کاپی میں آپ کا مضمون ہے۔ کیوں نہ کچھ گپ لگا لیا جائے گا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔''تاکہ ان سدابہار گانوں کا لطف بھی مل جائے اور ذہن پر چھایا جمود بھی ٹوٹ جائے۔''
''کیوں نہیں، کیوں نہیں۔'' کہتے ہوئے انہوں نے قلم کو پیڈ پر رکھ دیا۔
''ان پرانے گانوں کو سن کر آپ کو وہ فلمیں بھی یاد آتی ہوں گی جن کے یہ گانے ہیں۔''
''ہاں، وہ فلمیں جو دیکھی ہیں ان کی یاد بھی آگئی ہے اور وہ چہرے بھی ذہن میں تازہ ہو جاتے ہیں جن پر یہ پکچرائز ہوئے تھے۔ پورا ایک دفتر نظروں میں تازہ ہو جاتا ہے۔''
''آپ نے پاک فلم نگری کا ابتدائی دور بھی دیکھا ہے۔ اسے کوریج بھی دی ہے کوئی ایسی اداکارہ یاد ہے جس نے ذہن پر پرانمٹ نقوش چھوڑا ہو؟''
میری بات سن کر وہ یادوں کی راکھ کریدنے لگے۔ پھر ذرا توقف کے بعد بولے۔''لو ایک ایسی اداکارہ کی یاد آگئی ہے جس نے لاہور کی فلموں میں بھی کام کیا ہے اور بمبئی کی فلموں میں بھی۔''
''وہ کون خوش قسمت اداکارہ ہے؟''
''اس کا نام عشرت سلطانہ تھا مگر ببو کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔''
''وہ موٹی سی بھدی سی عمر رسیدہ اداکارہ جو ہماری فلموں میں کیریکٹر رول کیا کرتی تھی۔''
''میاں اس کا ذکر اس طرح حقارت سے نہ کرو۔'' انہوں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔''بے شک تم نے انہیں جن دنوں فلموں میں دیکھا ہوگا، وہ ایسی ہی ہوں گی مگر وہ ہمیشہ ہی ایسی تو نہ تھیں۔ ان کا ماضی بڑا شاندار تھا۔''
''جی ہاں ہمیشہ کوئی ایک جیسا نہیں رہتا۔''
''پاکستان میں ببو کی بطور کیریکٹر زہر عشق، فانوس، غالب اور عشق پر زور نہیں اداکاری کے لحاظ سے خاص فلمیں تھیں۔''
''یہ فلمیں تو میں نے دیکھی ہیں۔'' میں نے کہا۔''ان فلموں میں انہوں نے اپنے کرداروں کی ادائیگی میں اپنی نئی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا۔''
''پاکستان میں ان کی پہلی فلم ''شمی'' تھی جو پنجابی زبان میں بنائی گئی تھی۔ 1947ء میں پاکستان بننے کے بعد وہ بمبئی سے ہجرت کر کے لاہور آگئی تھی۔ ان دنوں یہاں کی فلمی صنعت جو فسادات کی نذر ہو کر تقریباً ختم ہو گئی تھی نئے سرے سے اسے زندہ کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ نوزائیدہ پاکستانی فلمی صنعت کی تعمیر و ترقی میں عشرت سلطانہ عرف ببو کا بھی حصہ ہے۔''
''شمی کس سن میں نمائش پذیر ہوئی تھی؟''
''اس کی نمائش 1950ء میں ہوئی تھی۔ ببو 20 سال سے زیادہ عرصہ تک پاکستانی فلمی صنعت سے وابستہ رہیں۔''
''پھر تو انہوں نے بے شمار فلموں میں کام کیا ہوگا؟''
''نہیں ببو نے 20 برس میں صرف 25 فلموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔''
''کیوں اس کی وجہ؟''
''اس کی وجہ میرے خیال میں تو یہی ہو سکتی ہے کہ انہیں ان کی پسند کے کردار نہیں ملتے ہوں گے۔ کیوں کہ اولڈ کیریکٹرز میں تو یوں بھی کچھ کر دکھانے کا موقع کم ملتا ہے۔ وہ محض فلموں میں رونمائی کے لیے آنا پسند نہیں کرتی ہوں گی کیوں کہ وہ اپنے وقت کی بڑی اداکارہ رہ چکی تھیں۔''
''ان کی کچھ فلموں کے بارے میں بتائیں۔''
''ان کی ابتدائی دور کی پاکستانی فلموں میں ''دوپٹا'' 1952ء، ''گلنار'' 1953ء اور ''سسی'' 1954ء کی فلمیں ہیں۔ جو اس دور کی کامیاب فلمیں تھیں۔ 1955ء میں ببو کی چار فلمیں ریلیز ہوئیں۔ قاتل، سوہنی، شرارے اور نذرانہ۔ اگلے سال یعنی 1956ء میں بھی ببو کی چار فلمیں ہی نمائش پذیر ہوئیں۔ ان میں سندھی فلم ''عمر ماروی'' اور اردو فلمیں ''کارنامہ، کنواری بیوہ اور منڈی'' تھیں۔ ایک سال کے گیپ کے بعد 1958ء میں تین فلمیں ''جان بہار، زہر عشق'' اور پنجابی فلم ''مکھڑا'' ریلیز ہوئیں۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان کی فلم ''زہر عشق'' میں انہیں 1958ء کی بہترین معاون اداکارہ کا نگار ایوارڈ ملا۔ یہ بات بھی بتانے کے قابل ہے کہ نگار ایوارڈ کا اجرا ایک سال قبل یعنی 1957ء میں ہوا تھا۔ وہ ذرا رک کے پھر یاد کرتے ہوئے بولے۔''میں کیا بتا رہا تھا؟''
''آپ ببو کی فلموں کے بارے میں بتا رہے تھے۔''
''ہاں یاد آیا۔ 1959ء میں ان کی فلم ''آج کل'' اور 1960ء میں ''سلمیٰ'' ریلیز ہوئیں۔ 1960ء کی دہائی میں ان کی کم فلمیں ریلیز ہوئیں۔ کیونکہ بڑھتی ہوئی عمر کے باعث ان سے زیادہ کام نہیں کیا جاتا تھا وہ موٹی اور بھدی ہو گئی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ فلموں میں غرارے اور بڑی قمیص

پہنا کر انہیں پیش کیا جانے لگا تھا۔ خیر، یہ تو فلموں سے ہٹ کر باتیں تھیں۔ 1960ء کی دہائی میں ببو کی جو فلمیں نمائش پذیر ہوئیں ان میں 1961ء میں ''غالب'' 1963ء میں فانوس، عشق پر زور نہیں، باجی، دلہن۔ 1964ء میں چھوٹی بہن اور 1966ء میں ارمان تھیں۔ ان کی پاکستان میں بننے والی آخری فلم ''بزدل'' تھی جو 1969ء میں ریلیز ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے بیماری اور ضعیفی کی وجہ سے اداکاری کو خیر باد کہہ دیا۔''

''آپ نے کہا تھا کہ ببو نے لاہور کی فلموں کے علاوہ بمبئی کی فلموں میں بھی کام کیا تھا۔''

''ہاں کہا تھا۔''

''تو وہاں کی فلموں کے بارے میں بھی بتایئے نا۔''

1931ء میں جب برصغیر میں بولتی فلموں کا آغاز ہوا تو پہلی فلم ''عالم آرا'' کی کاسٹ میں ببو بھی شامل تھیں مگر بحیثیت ہیروئن ان کی پہلی فلم ''مایا جال'' تھی جو 1933ء میں اسکرین کی زینت بنی۔ اسی سال ان کی تین اور فلمیں مرزا صاحبان، رنگیلا راجپوت اور شانِ خدا'' بھی ریلیز ہوئیں۔ اگلے سال یعنی 1934ء میں ببو کی چار فلمیں ''مل مزدور، سیر پرستان، دخترِ ہند اور واسوداتا'' نمائش پذیر ہوئیں۔ ان فلموں میں سیر پرستان بے حد مقبول ہوئی جس میں ببو کے قدرتی حسن کو بھرپور طور پر اجاگر کیا گیا تھا۔ اس فلم میں ببو کے ساتھ اس دور کے مشہور اداکار ماسٹر نثار نے ہیرو کا کردار کیا تھا۔

1935ء میں ببو کی فلم ''پیار کی مار'' ریلیز ہوئی پھر 1936ء میں ''غریب پرور'' اور ''من موہن'' نمائش پذیر ہوئیں۔ 1937ء میں ''قزاق کی لڑکی، کیپٹن کیرتی کمار، جاگیردار اور ساگر کا شیر'' ریلیز کی گئیں۔ اگلے برس ریلیز ہونے والی فلموں میں ''گراموفون سنگر، وطن، پرنس نگار، ڈائنا مائٹ، پوسٹ مین، تین سو دن کے بعد اور ابھی لاشا'' شامل تھیں۔ ان میں گراموفون سنگر بے حد کامیاب ہوئی جس میں وہ سریندر کے ساتھ ہیروئن آئی تھیں۔ 1939ء میں ''بھولے بھالے، لیڈیز اونلی، سادھنا اور سروس لمیٹڈ'' ریلیز ہوئیں۔ 1940ء کی دہائی کے دوران ببو نے کوئی درجن بھر فلموں میں کام کیا۔ 1940ء میں سچ بندھن، لکشمی، سہاگ اور اکیلا ریلیز ہوئیں جب کہ 1941ء میں صرف ایک فلم میرا راجا نمائش پذیر ہوئی۔ اس دور کے مشہور اداکار ماسٹر نثار، سریندر اور کمار کے ساتھ ببو کی جوڑی بہت مقبول رہی۔

ایسی بلندی ایسی پستی

عشرت سلطانہ عرف ببو جو اپنے عروج کے دور میں لاکھوں میں کھیلتی تھیں۔ عام لوگوں سے لے کر نواب اور راجے مہاراجے ان کے پرستار تھے۔ ان کے ایک اشارے پر قیمتی تحائف کے ڈھیر لگا دیتے تھے۔ کون جانتا تھا کہ ان کے آخری ایام اس قدر دردناک ہوں گے۔ قیام پاکستان کے بعد بمبئی سے لاہور آگئیں۔ لاہور میں کچھ دنوں تک کیریکٹر اداکارہ کے طور پر کام کیا۔ پھر بڑھاپے اور فربہی کی وجہ سے یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا تو کراچی چلی آئیں اور اپنے کسی جاننے والے کے گھر قیام کیا اور ساری زندگی یہیں گزار دی۔ جب بیماری کا حملہ شدید ہوا تو انہیں کراچی کے سول اسپتال داخل کرادیا گیا۔ اس موقع پر بھی فلمی دنیا کے کسی فرد نے ان کی خبر نہیں لی۔ کیوں کہ فلم والے تو ہمیشہ چڑھتے سورج کو پوجتے ہیں۔ ایک دن ہدایت کار اقبال یوسف نے سول اسپتال آکر ان کی عیادت کی تو ان کی حالت زار دیکھ کر انہیں بڑا افسوس ہوا۔ جب وہ جانے لگے تو ببو نے بڑی حسرت سے کہا۔

''بیٹا! اگر ہو سکے تو مجھے ایک کینو لا دو۔ میرا دل کینو کھانے کو بہت چاہ رہا ہے۔''

اقبال یوسف کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور انہوں نے دل ہی دل میں کہا۔ ''یا اللہ! یہ کیسا انقلاب ہے۔ یہ وہی ببو آنٹی ہیں جن کے جوتوں میں کبھی ہیرے جواہر ٹکے ہوتے تھے۔''

اقبال یوسف نے ایک نہیں پورے ایک درجن کینو لا کر انہیں دیئے اور اپنے ہاتھ سے چھلکے نکال کر ایک دو کینو کھلائے بھی۔

ان کا انتقال سول اسپتال ہی میں ہوا اور اسی گھرانے نے تدفین کا بندوبست کیا جن کے ساتھ وہ رہتی تھیں۔ قدرت نے انہیں اولاد کی نعمت سے محروم رکھا تھا۔ انہوں نے بمبئی کے قیام کے دوران ذوالفقار علی بھٹو کے چچا سے جو پولیس میں ڈی ایس پی تھے سے شادی کی تھی جس کے بعد وہ پاکستان آگئی تھیں مگر یہ شادی کامیاب نہ ہو سکی اور وہ طلاق لے کر بمبئی واپس چلی گئیں۔ اس کے بعد دوبارہ شادی نہیں کی۔

انہوں نے سریندر کے ساتھ کئی دوگانے بھی گائے جو مقبول ہوئے۔ اس دوران ببو خلیل سردار نامی ایک نوجوان کی محبت میں گرفتار ہو گئیں اور اس سے شادی کر کے بمبئی سے لاہور چلی گئیں مگر کچھ عرصہ بعد ہی یہ شادی ناکام ہو گئی اور وہ واپس بمبئی آ گئیں۔ اب وہ پھر سے فلموں میں اداکاری کرنے لگیں۔ اس دور کی فلموں میں بڑے نواب صاحب، 1944ء، نصیب، زینت اور پہلی نظر 1945ء، سالگرہ اور سسی پنوں 1946ء اور پہلا پیار 1947ء شامل ہیں۔ پہلا پیار ان کی آخری بھارتی فلم تھی۔

''اس کا یہ مطلب ہوا کہ ببو نے 1931ء سے لے کر 1947ء تک بمبئی کی بہت سی فلموں میں اداکاری کی۔''

''ہاں بھئی یہ ان کی جوانی کا دور تھا جس میں انہوں نے بڑی کامیاب اننگز کھیلی۔ یہ ان کے عروج کا دور بھی تھا۔ انہیں قدرت نے بے پناہ حسن سے نوازا تھا۔ جب وہ فلموں میں آئیں تو اپنی بے مثال خوب صورتی اور دل نواز اداؤں سے لوگوں کو دیوانہ بنا دیا۔ اس دور کے بڑے بڑے راجے مہاراجے اور نواب ان کے پرستاروں کی فہرست میں شامل تھے۔''

''گویا اس دور کی وہ سپر اسٹار تھیں۔''

''ہاں بھئی! بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ تھیں۔''

''پھر تو انہوں نے کمایا بھی ہو گا ٹھیک ٹھاک؟''

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ اگرچہ وہ آج کی طرح مہنگا دور نہیں تھا اور آج کی طرح آرٹسٹ کروڑوں میں معاوضہ نہیں لیتے تھے۔ لاکھوں میں لیتے تھے۔ پھر بھی ببو لاکھوں میں کھیلتی تھی۔ جس طرح اس نے بے پناہ عزت اور شہرت کمائی اسی طرح بے اندازہ دولت بھی کمائی۔ اس دور میں ببو نے ایک شہزادی کی طرح زندگی گزاری۔ خوب کمایا خوب خرچ کیا۔ یہ بات مشہور ہے کہ ببو کے جوتے اور چپل ہیروں اور قیمتی پتھروں سے مرصع ہوتے تھے۔ انہیں شاپنگ کا بے حد شوق تھا۔ انہیں خوب صورت رومال جمع کرنے کا بھی جنون تھا۔ بمبئی میں ہونے والی گھوڑوں کی ریس سے بھی وہ دلچسپی رکھتی تھیں اور وہ مقابلوں میں حصہ لینے والے بہترین گھوڑوں کے ناموں سے بھی واقف تھیں۔''

''بھئی! میں نے تو انہیں فلموں میں جب دیکھا تھا اس وقت ان کی مثال ایک کھنڈر کی سی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اپنے دور کی ایک عالی شان عمارت تھیں۔ یہ تو آپ کی مہربانی ہے کہ آپ نے ماضی کے دریچے کھول دیے اور ہماری نظروں سے جو کچھ اوجھل تھا ہمیں دکھا دیا۔ میں آپ سے گزارش کروں گا کہ ان خاتون محترم کی ابتدائی زندگی کے بارے میں بھی ہماری معلومات میں اضافہ کریں۔''

''بتاؤں گا، ضرور بتاؤں گا مگر یہ بتانے سے پہلے یہ بھی بتاؤں گا کہ نادانستگی کی حالت میں بھی کسی کی موجودہ صورت حال کو دیکھ کر اس کے بارے میں نامناسب بات نہیں کہنی چاہیے۔ کچھ دن پہلے کی بات ہے آپ کے اسی شہر میں ایک مفلوج شخص کسی فٹ پاتھ پر بیٹھ کر بھیک مانگتا تھا۔ منہ سے کچھ نہیں کہتا تھا۔ اس کی خراب و خستہ حالت کو دیکھ کر گزرنے والے راہ گیر حسبِ توفیق اس کی مدد کر دیتے تھے کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ کون ہے۔ معدودے چند ایک کے کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ اپنے وقت کا سپر اسٹار صادق علی تھا۔ لوگ اسے پرنس آف منروا کے نام سے پکارتے تھے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ کسی کو حقارت کی نظر سے بھی نہ دیکھو۔ چاہے وہ کتنے ہی خراب و خستہ حالت میں کیوں نہ ہو۔ عروج و زوال، رب ذوالجلال کی طرف سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ جب جس کو چاہے جس حال میں رکھے۔''

وہ اتنا کہہ کر چند لمحوں کے لیے رکے، ہمارے تاثرات کا جائزہ لیا پھر بولے۔ ''عشرت جہاں (ببو) دہلی کے عشرت آباد چاوڑی بازار کے علاقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کی والدہ حفیظاں بائی ایک مشہور مغنیہ اور درباری گائیکہ تھیں۔ عشرت جہاں کی پرورش و پرداخت حفیظاں بائی کے زیرِ سایہ ہوئی۔ رقص و موسیقی کا ذوق و شوق ابتدا ہی سے پیدا ہو گیا تھا۔ جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی گئیں ناچ گانے سے ان کی دلچسپی بھی بڑھتی گئی۔ اللہ نے انہیں بڑی فیاضی کے ساتھ حسن کی دولت سے بھی مالا مال کیا تھا۔ جب وہ جوان ہوئیں تو ان کی ماں نے انہیں اپنے پروفیشن سے وابستہ رکھنے کی بجائے بیٹی کے حسن و شباب کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لیے انہیں فلمی دنیا میں لے جا کر شہرت اور دولت کمانے کی منصوبہ بندی کی۔ خاموش فلموں کے بعد جب بولتی فلموں کا دور شروع ہوا تو انہوں نے پہلی بولتی فلم ''عالم آراء'' میں اپنے اثر و رسوخ سے بیٹی کو اس کی کاسٹ میں شامل کرا دیا۔ یہ بہت بڑی بات تھی۔ بہت بڑی کامیابی تھی۔ اس کامیابی کی وجہ جہاں حفیظاں بائی کی پہنچ تھی وہیں عشرت سلطانہ کی..... جہاں سوز حسن و جوانی بھی تھی۔ اس وقت سے لے کر آج تک شوبز کی دنیا میں یہ بہت بڑا بہت موثر ہتھیار سمجھا جاتا ہے۔ ''عالم آراء'' میں انٹری کے بعد عشرت جہاں کے لیے

خود بخود راستے ہموار ہوتے گئے۔ فلموں میں عام طور پر نام بدل کر کام کرنے کا رواج ابتدا ہی سے قائم ہے۔ عشرت جہاں نے بھی اپنا نام بدل کر ببو رکھا۔ 1930ء اور 1940ء کی دہائیوں میں وہ ہیروئن کے طور پر خاصی مستحکم اداکارہ کی حیثیت سے فلموں میں جلوہ گر ہونے لگی تھیں۔"

"آپ نے کہا تھا کہ ماں کے ماحول میں رہنے کی وجہ سے عشرت سلطانہ کو بھی ناچ گانے سے دلچسپی ہوگئی تھی۔"

"ہاں کہا تھا۔"

"فلموں میں جانے اور اداکاری کرنے کے بعد کیا ان کا یہ شوق ختم ہوگیا؟"

"اچھا سوال کیا ہے تم نے۔" وہ بولے۔ "نہیں ایسا نہیں ہوا۔ تم شاید بھول گئے میں نے یہ بھی کہا تھا کہ ببو نے اداکار سریندر کے ساتھ کئی ڈوئیٹ سانگز بھی گائے تھے۔"

"جی ہاں یاد آیا۔ آپ نے کہا تھا۔"

"گانا بجانا تو ببو کے خون میں شامل تھا۔ وہ ایک دم اسے کیسے ترک کرسکتی تھی۔ تمہارے لیے تو یہ اطلاع چونکا دینے والی ہوگی کہ عشرت سلطانہ عرف ببو برصغیر میں فلمی دنیا کی پہلی خاتون موسیقار تھیں۔"

"اوہ! یہ تو بریکنگ نیوز ہے۔"

بولتی فلموں کے آغاز سے ہی فلموں میں موسیقی اور گانوں کو نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے۔ پہلی بولتی فلم "عالم آراء" میں بھی چھ گانے تھے جو بے حد مقبول ہوئے۔ اس کے بعد سے آج تک کوئی بھی فلم رقص و موسیقی کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی۔ فلموں کی موسیقی کے شعبے میں یوں تو مرد چھائے ہوئے تھے مگر بولتی فلموں کے آغاز سے صرف تین سال بعد ہی تین خواتین اس میدان میں داخل ہوئیں۔ یہ خواتین عشرت سلطانہ، جدن بائی اور سرسوتی دیوی تھیں۔ ان میں عشرت سلطانہ کو برصغیر کی فلمی دنیا کی پہلی خاتون موسیقار بننے کا اعزاز حاصل ہے۔ انہوں نے "عدلِ جہانگیر" کے گانوں کی موسیقی ترتیب دی۔ یہ فلم 1934ء میں نمائش پذیر ہوئی۔ ایک سال بعد "تلاشِ حق" ریلیز ہوئی جس کی موسیقار جدن بائی تھیں۔ 1935ء میں سرسوتی دیوی کی پہلی فلم "جوانی کی ہوا" پیش ہوئی۔

عشرت سلطانہ کی دوسری فلم "قزاق کی لڑکی" 1937ء میں نمائش پذیر ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے کسی اور فلم کی موسیقی ترتیب نہیں دی۔ غالباً اس کی یہی وجہ ہوسکتی ہے کہ بطور اداکارہ ان کی مصروفیات بہت بڑھ گئی ہوں گی۔ ان کی

اس دور کی فلموں کی تعداد سے بھی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے۔ سال بھر میں ان کی تین تین چار چار فلموں کی نمائش ہوئی تھی۔ واضح رہے کہ آج کی طرح پہلے بھی اداکاروں اور اداکاراؤں کے معاوضے پس پردہ ہنرمندوں سے زیادہ ہوتے تھے۔ ایسے میں بھلا کوئی آرٹسٹ کم کمائی کے شعبہ پر کیوں زیادہ توجہ دیتا۔

"آپ نے دو اور خاتون موسیقاروں کا بھی نام لیا ہے۔ ان کے بارے میں کچھ اور باتیں بھی بتایئے۔"

دوسری خاتون موسیقاروں میں جدن بائی اور سرسوتی دیوی اس دور کی موسیقار تھیں۔ جدن بائی نے موسیقی اور گلوکاری میں بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ انہوں نے چند فلموں میں گلوکاری کے ساتھ اداکاری بھی کی تھی۔ یہ بات بتانے کی ہے کہ ابتدائی دور میں جب پلے بیک ریکارڈنگ کی ٹیکنالوجی متعارف نہیں ہوئی تھی جس پر گانے پکچرائز ہوتے تھے وہ خود اپنے گانے عکسبندی کے دوران گاتا تھا لہٰذا ایسے اداکار اور اداکارہ کو ترجیح دی جاتی تھی جو گلوکار یا گلوکارہ ہوتی تھی۔ وہ بڑی جہاندیدہ خاتون تھیں۔ انہوں نے فلمی دنیا کی چمک دمک دیکھی تو سمجھ گئیں کہ عزت اور شہرت کمانے کے ساتھ دولت حاصل کرنے کی اگر کوئی جگہ ہے تو فلمی صنعت ہی ہے۔ اس سوچ کے بعد انہوں نے اپنی کمسن بیٹی فاطمہ رشید کو بطور چائلڈ اسٹار متعارف کرایا کہ کل جب وہ جوان ہوگی تو اسے بطور ہیروئن پیش کرنے میں دشواری نہیں ہوگی۔ فاطمہ جوان ہوئی تو اسے نامور ہدایت کار محبوب خان نے اپنی فلم "تقدیر" میں بطور ہیروئن پیش کیا اور اس کا فلمی نام نرگس رکھا۔ ماں کی تربیت اور محبوب خان کی رہنمائی سے اس کی پہلی ہی فلم سے اس کی شہرت کے ڈنکے بج گئے۔ آنے والے دنوں یعنی 1940ء اور 1950ء کی دہائیوں میں وہ ہندوستانی فلموں کی بہت بڑی ہیروئن بن گئی۔

وہ ذرا رکے تو میں نے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "آج کی نئی نسل اپنے دور کی اس مہان فلم اسٹار نرگس کو اتنا نہیں جانتی جتنی ان کے بیٹے سنجے دت کو پہچانتی ہے۔"

"آپ کا مطلب منے بھائی سے ہے؟"

"جی ہاں، یہ ورسٹائل اداکار اس نرگس اور سنیل دت کا بیٹا ہے مگر واضح رہے کہ سنجے اپنے باپ سے بڑا اداکار تو تسلیم کیا جاسکتا ہے مگر وہ اپنی ماں کی فنی صلاحیتوں کی بلندیوں تک نہیں پہنچ سکا ہے۔ بلاشبہ نرگس بہت عظیم اداکارہ تھی۔ اس کے بعد بہت سی اچھی اور باصلاحیت اداکارائیں منظر عام پر

آئیں مگر اب تک کوئی دوسری نرگس پیدا نہ ہو سکی۔'' اتنا کہہ کر وہ رکے۔ پھر ذرا توقف کے بعد بولے۔ ''نرگس کی والدہ جدن بائی کے بارے میں تم دونوں نے یہ نہیں پوچھا کہ کیا ''تلاشِ حق'' کے بعد انہوں نے کسی اور فلم کی موسیقی ترتیب نہیں دی؟''

''وہ، آپ نے نرگس کا ذکر کچھ ایسے چھیڑا کہ ہم اس میں کھو کر رہ گئے۔ ہمیں واقعی جدن بائی کے دوسری فلموں کے بارے میں ضرور پوچھنا چاہیے تھا۔''

''چلو، میں اب بتائے دیتا ہوں۔ جدن بائی نے تلاشِ حق کے بعد مزید چار فلموں کی موسیقی کمپوز کی۔ تلاشِ حق (1935ء) ہردیا نتھان (1936ء) میڈم فیشن (1936ء) جیون سپنا (1937ء) اور موتی کا ہار (1937ء) اس کے بعد جیسا کہ میں بتا چکا ہوں۔ انہوں نے میوزک ڈائریکٹر کی حیثیت سے اپنے آپ کو الگ کر لیا۔''

''اب سرسوتی دیوی کے بارے میں بتائیے۔''

سرسوتی دیوی کی بطور موسیقار پہلی فلم ''جوانی کی ہوا'' تھی جو 1935ء میں ریلیز ہوئی۔ ان کا اصل نام خورشید منوچہر ہومجی تھا اور وہ پارسی مذہب سے تعلق رکھتی تھیں۔ انہوں نے اپنے اصل نام کی بجائے سرسوتی دیوی کے نام سے فلمی دنیا میں انٹری دی اور عشرت سلطانہ اور جدن بائی کے مقابلے میں طویل عرصہ تک میوزک ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کرتی رہیں۔ ان کا کیریئر 25 سال سے زائد عرصہ تک جاری رہا۔ اس دوران انہوں نے کوئی 35 فلموں کے لیے موسیقی ترتیب دی۔

''ان تین خواتین موسیقاروں کے بعد کیا کوئی اور خاتون اس فیلڈ میں سامنے نہیں آئی؟''

''نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ کئی دیگر خواتین بھی موسیقار کی حیثیت سے منظر عام پر آئیں۔ ان میں مختار بیگم نے 1936ء میں اور گوہر کرناٹکی نے 1937ء میں فلموں میں موسیقی ترتیب دی۔''

''مختار بیگم کا نام کسی اور حوالے سے بھی میں نے کہیں سنا یا پڑھا ہے۔'' سید صاحب بولے۔

''یقیناً سنا یا پڑھا ہوگا۔'' وہ بولے۔ ''وہ انڈین شیکسپیئر آغا حشر کاشمیری کی اہلیہ تھیں اور غزل گائیکی میں بھی ان کی بڑی شہرت تھی۔ وہ پاکستانی مغنیہ فریدہ خانم کی بڑی بہن اور استاد بھی تھیں۔'' پھر ذرا رک کر بولے۔ ''آزادی کے بعد بھارت میں کئی خواتین موسیقی کے میدان میں وارد ہوئیں جن میں امیر بائی کرناٹکی، شانتا آپٹے، سدھا ملہوترا اور شکیلہ بانو بھوپالی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ جب کہ پاکستان میں صرف ایک خاتون شمیم نازلی نے فلموں میں موسیقی دی۔ وہ مشہور گلوکارہ مالا کی بڑی بہن تھیں۔''

''ہم لوگ عشرت سلطانہ عرف ببو کی باتیں کرتے کرتے کس کس کی باتیں کر گئے۔'' میں نے کہا۔ ''ان محترمہ کے آخری ایام کی باتیں تو شاید رہ گئی ہیں۔''

''ببو پر فلم میں چاہے ان کا کردار بڑا ہو یا مختصر بڑی دیانتداری کے ساتھ متاثر کن اداکاری کرتی تھیں۔'' آصف صاحب نے ببو کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ''انہیں مکالموں کی ادائیگی میں مہارت حاصل تھی۔ زبان و بیان اور تلفظ پر اس قدر عبور تھا کہ نوجوان اداکارائیں ان سے جملوں کی ادائیگی سیکھتی تھیں۔ وہ جو ایک زمانے میں ہندوستان بھر کے نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن بنی ہوئی تھیں۔ ضعیفی اور بیماری میں ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔ عیش و عشرت کی زندگی گزارنے والی عشرت سلطانہ اب عسرت کا عبرتناک نمونہ بن چکی تھیں۔ اس عالم میں وہ 1972ء میں کراچی میں انتقال کر گئیں۔

عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو

چند لمحے ہم سب خاموش رہے پھر بولے اگلی ملاقات میں انشاء اللہ برصغیر کی پہلی خاتون ہدایت کار کے بارے میں بتاؤں گا۔

☆......☆

کئی دنوں کے بعد آصف کے کمرے میں پہنچ کر میں نے کہا۔ ''یار! آپ کہاں غائب ہو گئے تھے۔ کئی جگہ تلاش کیا آپ کہیں نہیں ملے۔''

''کیوں تلاش کر رہے تھے مجھے؟ کیا کوئی خاص بات تھی بتانے کی؟ کیونکہ کاپی تو چھپ کر آ گئی۔''

''بتانے کی نہیں بلکہ خاص بات معلوم کرنے کی تھی۔ آپ بھول گئے آپ نے وعدہ کیا ہے کہ اگلی ملاقات میں برصغیر کی پہلی خاتون ڈائریکٹر کے بارے میں بتائیں گے۔''

''میں واقعی بھول گیا تھا۔ دراصل کئی دنوں تک کچھ اتنا مصروف رہا کہ باقی باتوں کا دھیان ہی نہیں رہا۔''

''اچھا تو آج ہو جائے ان محترمہ کا ذکرِ خاص؟''

''یہ بات شاید آپ کو معلوم نہیں ہوگی کہ برصغیر ہندو پاک میں فلمسازی کا آغاز 1913ء میں ہوا تھا۔ جب پہلی خاموش فلم ''راجا ہریش چندر'' عام نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔''

"گویا آج سے کوئی 102 سال پہلے۔"

"ہاں۔ اس پہلی خاموش فلم کے فلمساز و ہدایت کار دادا صاحب پھالکے تھے۔ اس کے بعد دوسرے لوگ بھی فلمیں بنانے لگے۔ لیکن 1920ء کی دہائی کے آغاز سے فلم سازی کی رفتار میں تیزی آگئی اور کئی فلمساز و ہدایت کار فلم میکنگ کی فیلڈ میں آگئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں ایک خاتون بھی شامل تھیں۔ ان کے بارے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ اس سے قبل فلموں میں اداکاری کر رہی تھیں۔ ان کا نام فاطمہ بیگم تھا جنہیں برصغیر کی فلمی دنیا میں پہلی خاتون ہدایت کار بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔"

"یعنی برصغیر کی پہلی خاتون موسیقار عشرت سلطانہ کی طرح فاطمہ بیگم بھی پہلی مسلمان ہدایت کارہ تھیں۔"

ہاں یہ اعزاز بھی ایک مسلمان خاتون کو حاصل ہوا۔ فاطمہ بیگم 1892ء میں ایک اردو بولنے والے مسلمان خاندان میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے تھیٹر پر اردو ڈراموں میں اداکاری سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا پھر فلموں میں کام کرنے لگیں۔

ان کی شادی سورت کی ایک ریاست سچین کے نواب سیدی ابراہیم محمد یاقوت خان سوم سے ہوئی۔ نواب کی بیگم ہونے کے باوجود فاطمہ بیگم کو فنون لطیفہ سے بے حد لگاؤ تھا۔ وہ پہلی مرتبہ فلم "ویر ابھیمانو" میں ہیروئن آئیں۔ 1922ء میں ریلیز ہونے والی اس خاموش فلم کے تخلیق کار فلمی دنیا کی ایک مشہور شخصیت اردشیر ایرانی تھے۔ اس فلم میں فاطمہ بیگم کے ساتھ ان کی بڑی بیٹی سلطانہ نے بھی چائلڈ آرٹسٹ کی حیثیت سے کام کیا تھا۔

دو سال بعد 1924ء میں فاطمہ بیگم کی چار فلمیں نمائش پذیر ہوئیں۔ یہ فلمیں "گل بکاؤلی، کالا ناگ، پرتھوی ولبھ اور ستی سردار با تھیں۔ ان چاروں فلموں میں فاطمہ بیگم کے ہمراہ ان کی دو صاحبزادیوں سلطانہ اور زبیدہ نے بھی اداکاری کی۔ زبیدہ، فاطمہ بیگم کی تیسری اور سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ جن کی عمر اس وقت صرف 12 سال تھی۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ فاطمہ بیگم کی رنگت اس قدر گوری تھی کہ انہیں فلموں میں گہرا میک اپ کرنا پڑتا تھا تاکہ بلیک اینڈ وائٹ اسکرین پر ان کا چہرہ نمایاں نظر آئے۔ کیونکہ ابتدا ہی سے خوب صورت عورتوں کو اسکرین کی زینت بنایا جاتا رہا ہے؟ خوب صورت اور دلکش چہروں کو ترجیح دی جاتی رہی ہے۔"

"اب تو......" میں نے کہا۔ "سانولی اور جاذبِ نظر ناک نقشے والیوں کو بھی پیش کیا جاتا ہے۔ جیسے ریکھا اور بپاشا باسو جیسی اداکارائیں جو فلم میکرز اور شائقینِ فلم دونوں میں پسند کی جاتی ہیں۔"

آصفہ نے میرے خاموش ہوتے ہی اپنی بات آگے بڑھائی۔ 1925ء میں فاطمہ بیگم کی تین فلمیں "دیوداس، سوشل پائیریٹس اور بنگال کا جادوگر" ریلیز ہوئیں۔ اگلے سال بھی اتنی ہی فلمیں نمائش پذیر ہوئیں۔ یہ فلمیں "اندر جال، پنارتنا اور سوسائٹی بٹر فلائی" تھیں۔ 1926ء ہی میں فاطمہ بیگم نے فلمسازی کا اپنا ذاتی ادارہ فاطمہ فلمز کے نام سے قائم کیا اور اس کے بینر تلے انہوں نے پہلی فلم "بلبل

کمال اور زوال

آج کی نئی نسل تو صادق علی کے نام سے بھی واقف نہیں ہے۔ ایک وقت تھا جو وہ بمبئی کی فلم انڈسٹری میں پرنس آف منروا کہلاتا تھا۔ 1934ء میں جب سہراب مودی کی عظیم فلم "پکار" ریلیز ہوئی تو ہندوستان میں اس کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ سہراب مودی نے اسے اپنا بیٹا بنا رکھا تھا۔ پاکستان بننے کے ابتدائی زمانے میں وہ پاکستان آگیا۔ جب وہ پاکستان آنے لگا تو سہراب مودی نے اسے بہت روکا مگر وہ نہ مانا۔ اس کا خیال تھا کہ پاکستان کی فلمی صنعت کو اس کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس نے 1950ء تک لاہور کی کچھ فلموں میں کام کیا۔ مگر ان فلموں کی ناکامی کی وجہ سے اس کی ساکھ برقرار نہ رہ سکی اور وہ مایوس ہو کر کراچی چلا آیا۔ ان دنوں کراچی میں فلمی صنعت نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہاں آکر اس کی بے کاری اور بیماری کے دن شروع ہوئے تو اس کی موت تک برقرار رہے۔

ایک فالج زدہ اور مفلوک الحال شخص کی حیثیت سے وہ ہر شام صدر کی ایک گلی کے نکڑ پر ایک پان فروش کیبن والے کے پاس اسٹول پر بیٹھ جاتا تھا۔ گزرتے ہوئے راہ گیر حسبِ توفیق اس کی مدد کر دیا کرتے تھے۔ ایک بار اداکار کمال نے اپنے پروگرام کمال شو میں صادق علی کو بلایا اور اس کی فلموں کے ٹکڑے اسے دکھائے تو وہ انہیں دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

پرستان" بنائی۔ اس فلم کی ہدایات بھی خود انہوں نے ہی دی۔ اس طرح وہ برصغیر کی فلمی دنیا میں پہلی خاتون ہدایت کار بن گئیں۔ اس فلم میں ان کی تینوں بیٹیاں سلطانہ، شہزادی اور زبیدہ نے بھی اداکاری کی۔ فاطمہ بیگم کو وہ نور اسٹوڈیو اور امپریل اسٹوڈیوز کی فلموں میں بھی اداکاری کرنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی اپنے ذاتی ادارے کی فلموں میں وہ کہانی نویس، فلمساز و ہدایت کارہ اور اداکارہ کی حیثیتوں میں بھی کام کرنے لگیں۔ ان کے ہمراہ ان کی بیٹیاں بھی اداکاری کرتی رہیں۔ دو سال بعد انہوں نے اپنے فلم ساز ادارے کا نام بدل کر وکٹوریہ فاطمہ فلمز رکھ دیا۔

1928ء میں فاطمہ بیگم نے اداکارہ کی حیثیت سے چار فلموں میں کام کیا۔ جن میں چندراولی، فولش مسینڈز، ہیر رانجھا اور سروجنی شامل تھیں۔ ہیر رانجھا ان کی ذاتی فلم تھی جس میں اداکاری کے ساتھ ساتھ انہوں نے ہدایت کاری کے فرائض بھی انجام دیے۔

بعد ازاں فاطمہ بیگم نے ''کنگ تارا'' کے نام سے ایک فلم بنائی جس کی ہدایات دینے کے علاوہ انہوں نے اداکاری بھی کی اور اپنی تینوں بیٹیوں کو بھی بطور اداکارہ پیش کیا۔ اسی سال ایک اور فلم ''ملن دینار'' بھی انہی کی زیرِ ہدایت بنی جس میں انہوں نے شہزادی اور زبیدہ کے ہمراہ اداکاری کے بھی جوہر دکھائے۔

1929ء میں فاطمہ بیگم کی چھ فلمیں نمائش کے لیے پیش ہوئیں۔ جن میں ''کنگ تارا'' اور ''ملن دینار'' کے علاوہ مہا سندر، پیناپرابھو، دی لورز اور ونڈرفل پرنس شامل تھیں۔ پھر اگلے سال ان کی تین فلمیں ڈاٹر آف این آؤٹ لا، گوڈیس آف وار اور ظلمی زلیخا ریلیز ہوئیں۔''

''1931ء میں بولتی فلموں کا آغاز ہو گیا تھا۔ جو لوگ خاموش فلموں میں کام کر رہے تھے انہیں حرفِ غلط کی طرح کیسے مٹا دیا جاتا؟ یہ لوگ اداکار اور ہنرمند تو تھے۔ تربیت یافتہ بھی تھے۔ اب صرف یہ تبدیلی آئی تھی کہ خاموش فلموں کو زبان دے دی گئی تھی۔ بولتی فلمیں بننا شروع ہوئیں تو خاموش فلموں میں کام کرنے والے ہی ان میں شامل کیے گئے۔ پہلی بولتی فلم ''عالم آراء'' جس کے تخلیق کار اردشیر ایرانی تھے اور جو امپریل مووی ٹون کے بینر تلے بنائی گئی تھی۔ اس کی ہیروئن فاطمہ بیگم کی چھوٹی صاحبزادی زبیدہ تھیں۔ جو اس وقت بیس برس کی بے حد حسین دوشیزہ تھیں۔ اس طرح انہیں برصغیر کی بولتی فلموں کی پہلی ہیروئن بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اب فاطمہ بیگم اور ان کی بیٹیاں خاموش فلموں کے بعد بولتی فلموں میں بھی اداکاری کے جوہر دکھانے لگیں۔''

1934ء میں فاطمہ بیگم کی تین فلمیں ریلیز ہوئیں۔ یہ فلمیں نیکی کا تاج، سنت تلسی داس اور سیوا سدن تھیں جس کے بعد انہوں نے اپنے فلمی کیریئر کو خیر باد کہہ دیا۔

''ظاہر ہے اس کے بعد ان کی بیٹیاں رہ گئی ہوں گی۔'' میں نے کہا۔ ''ان کی کارکردگی کے بارے میں بتائیں۔''

''ماں کی ریٹائرمنٹ کے بعد ان کی تینوں صاحبزادیاں فلموں میں کام کرتی رہیں۔ ان کی بیٹی شہزادی کا فلمی کیریئر بہت مختصر رہا۔ تاہم اس کی دوسری بہنیں سلطانہ اور زبیدہ بولتی فلموں میں ایک عرصہ تک کام کرتی رہیں۔ زبیدہ 1930ء کی دہائی کے دوران بے حد مقبول ہیروئن تھیں اور اپنی ہمعصر اداکاراؤں کی نسبت سب سے زیادہ معاوضہ وصول کرتی تھیں۔ بعد میں وہ بہت کم فلموں میں کام کرنے لگیں اور پھر 1940ء کی دہائی کے اواخر میں وہ حیدرآباد کے مہاراجا نرسنگیر دھن راج گیر گیان بہادر سے شادی کرنے کے بعد فلمی دنیا سے علیحدہ ہو گئیں۔''

''کتنی عجیب بات ہے اکثر فلمی اداکارائیں، مسلمان ہونے کے باوجود ہندوؤں سے شادی رچا لیتی تھیں؟'' میں نے کہا۔

''بات دراصل یہ ہے۔ فلم والے خصوصاً ہندوستانی اداکارائیں شادی کرنے اور گھر بسانے کے معاملے میں دین دھرم کی پاسداری کرنے کی بجائے دھن دولت کو زیادہ اہمیت دیتی ہیں۔ زبیدہ نے مسلمان ہونے کے باوجود جس طرح ایک بڑے اور عزت دار ہندو کو شریکِ حیات بنایا اسی طرح آنے والے دنوں میں بھی مسلمان فلمی خواتین نے ہندوؤں سے شادیاں کیں۔ اداکارہ نرگس نے اور گلوکارہ شمشاد بیگم نے ہندوؤں کو اپنا پتی منتخب کیا۔ بس اتنی تبدیلی ہوئی کہ اگر دولت کی چمک نے نگاہیں خیرہ نہیں کیں تو عشق و محبت کی ستیزہ کاری کارفرما ہوئی۔ یوں بھی ہندوستان میں آزادی سے پہلے اور بعد میں ایسا کلچر پھولتا پھلتا رہا جس میں مذہبی اقدار کو نظرانداز کرنے کا رجحان غالب رہا۔ عام طور پر اداکارائیں اپنے مستقبل کو محفوظ بنانے کے لیے اپنی مقبولیت کے آخری دور میں کسی مالدار پرستار کو اپنا جیون ساتھی بنا لیتی ہیں۔ اس موقع پر وہ اپنے دین دھرم پر توجہ کم دیتی ہیں۔ ان کی زیادہ تر دلچسپی دولت کی چمک دمک اور پُرتعیش زندگی پر ہوتی ہے۔''

اتنا کہہ کر میں خاموش ہوا تو... فاطمہ بیگم کی بیٹیوں کی ادھوری بات پوری کرنا شروع کردی۔ ''زبیدہ سے قبل اس کی بڑی بہن سلطانہ بھی شادی کر کے اداکاری چھوڑ چکی تھی۔ اس نے بھی ایک تاجر سیٹھ رزاق کا انتخاب کیا تھا مگر یہ ہندو نہیں مسلمان تھا۔ قیام پاکستان کے بعد سلطانہ اپنے شوہر سیٹھ رزاق کے ساتھ کراچی آگئیں۔

ان دنوں لاہور اور کراچی میں ٹھیک ٹھاک طریقے پر فلمیں بننا شروع ہوگئی تھیں۔ سلطانہ اور سیٹھ رزاق کی بیٹی جمیلہ رزاق جب جوان ہوئی تو ماں نے اسے اپنے آبائی پروفیشن سے وابستہ کرنے کے لیے شوہر کو رضامند کیا۔ جس کے بعد تھوڑی سی کوشش سے کراچی کی فلم سے اس کے فلمی کیریئر کا آغاز کردیا۔ 1950ء کی دہائی کے دوران جمیلہ رزاق نے پاکستانی فلموں میں اداکاری کی۔ 1962ء تک اس کی دس فلمیں ریلیز ہوچکی تھیں۔ جن میں ''یہ دنیا، فیصلہ، گل بکاؤلی اور عشق پہ زور نہیں کے نام قابل ذکر ہیں۔''

''آپ نے کہا تھا کہ 1924ء میں فاطمہ بیگم کی چار فلمیں ریلیز ہوئی تھیں اور اس ضمن میں ایک فلم کا نام گل بکاؤلی بھی بتایا تھا۔''

''ہاں بتایا تھا۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''وہی فلم، اس نام سے، پاکستان میں بھی بنی؟''

''ہاں، یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ لوک کہانیاں بار بار بنائی جاتی ہیں۔ ہر دور میں فلم میکرز اپنے اپنے انداز میں بناتے ہیں۔ ہیر رانجھا، سسی پنوں اور لیلیٰ مجنوں کی کہانیاں متعدد بار فلمائی جا چکی ہیں۔ ''گل بکاؤلی'' اگر ایک طویل عرصہ کے بعد پاکستان میں ایک بار پھر بنائی گئی تو اس کہانی کی مقبولیت ہی اس کی وجہ ہوسکتی ہے۔ پاکستان میں بننے والی گل بکاؤلی میں جمیلہ رزاق نے اس دور کے بڑے ہیرو سدھیر کے مقابل ہیروئن کا کردار کیا تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ 1924ء میں بننے والی ''گل بکاؤلی'' میں جمیلہ رزاق کی نانی فاطمہ بیگم نے اپنی بیٹی اور جمیلہ کی ماں سلطانہ اور اس کی خالہ زبیدہ کے ساتھ کام کیا تھا اور وہ خاموش فلم تھی۔

''سلطانہ نے پاکستان آنے کے بعد اداکاری نہیں کی؟''

''نہیں، سلطانہ نے شادی کے بعد اداکاری سے ناتا توڑا تو پھر دوبارہ اداکاری نہیں کی۔ ہاں 1961ء میں کراچی میں ایک فلم ''ہم ایک ہیں'' ضرور پروڈیوس کی جس میں اس نے اپنی بیٹی جمیلہ رزاق کو اس دور کے معروف اداکار اسلم پرویز کے مقابل ہیروئن کاسٹ کیا۔ ''ہم ایک ہیں'' پہلی پاکستانی فلم تھی جس کے کچھ مناظر رنگین فلمائے گئے تھے۔ اس کے باوجود یہ فلم باکس آفس پر ہٹ نہ ہوسکی۔ فلموں کی ناکامی سے اس کے آرٹسٹوں پر بھی اثر پڑتا ہے۔ مگر ''ہم ایک ہیں'' کی ناکامی کا جمیلہ رزاق کی ساکھ پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس کی فلم ''عشق پر زور نہیں'' انتہائی معیاری اور کامیاب ثابت ہوئی جس سے اس کی ساکھ کو خاصا استحکام ملا۔ یہ وہ وقت تھا جب فلمساز و ہدایت کار اس کی طرف زیادہ متوجہ ہوگئے تھے اور اس کی مقبولیت اور فنی صلاحیت سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے کہ اس نے ایک دم فلمی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔''

''کیوں جمیلہ رزاق نے ایسا کیوں کیا؟''

''جو کچھ ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ ہوتی ہے۔ جمیلہ رزاق کا یہ اقدام بھی بے وجہ نہیں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ کیوپڈ کا تیر چل گیا تھا۔ اس دور کے مشہور کرکٹر وقار حسن اس کے اور وہ وقار حسن کے پیار میں پاگل ہوگئے تھے۔ وقار حسن اپنی اسٹائلش بیٹنگ کی وجہ سے بے شمار لوگوں میں بے حد مقبول تھے۔ جمیلہ رزاق کو بھی ان کی یہی ادا مار گئی تھی۔ لہٰذا اس نے اماں بابا کو رضامند کیا کہ میری ڈولی اس سوہنے منڈے کے گھر پہنچا دو۔

بیٹی غریب کی ہو یا امیر کی، ایک دن سب کو رخصت کرنی پڑتی ہے۔ سلطانہ چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی اپنے اس اچھے وقت سے کچھ فائدہ اٹھالے تو اس کے ہاتھ پیلے کردیں گے مگر جب پیار محبت کا بھوت دل و دماغ پر سوار ہو تو کوئی نفع نقصان نہیں دیکھتا، کسی کی نہیں سنتا۔ یہاں سلطانہ کی سلطانی نہیں چلی اور اسے بیٹی کی مرضی سے اس کی شادی کردینی پڑی۔''

''یوں بھی شوبز سے وابستہ خواتین کی منزلِ مقصود ایک اچھے شوہر کا حصول ہوتا ہے۔ جمیلہ رزاق کو وقار حسن سے اچھا شریکِ حیات پھر کہاں ملتا۔'' میں نے کہا۔ ''اس لیے اس نے فلمی دنیا سے ناتا توڑ کر وقار حسن سے رشتہ جوڑلیا۔''

''اور یوں......'' میں نے بات آگے بڑھائی۔ ''فاطمہ بیگم جنہیں ایک کامیاب اداکارہ اور برصغیر کی پہلی خاتون ہدایت کار ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ ان کے فلمی خانوادے کا دور جو تیسری نسل تک جاری رہا۔ اختتام کو پہنچا۔ جب کہ فاطمہ بیگم کے بارے میں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ ان کی زندگی کا چراغ 1983ء میں 91 برس کی عمر میں گل ہوگیا۔''

سراب

راوی : شہباز ملک

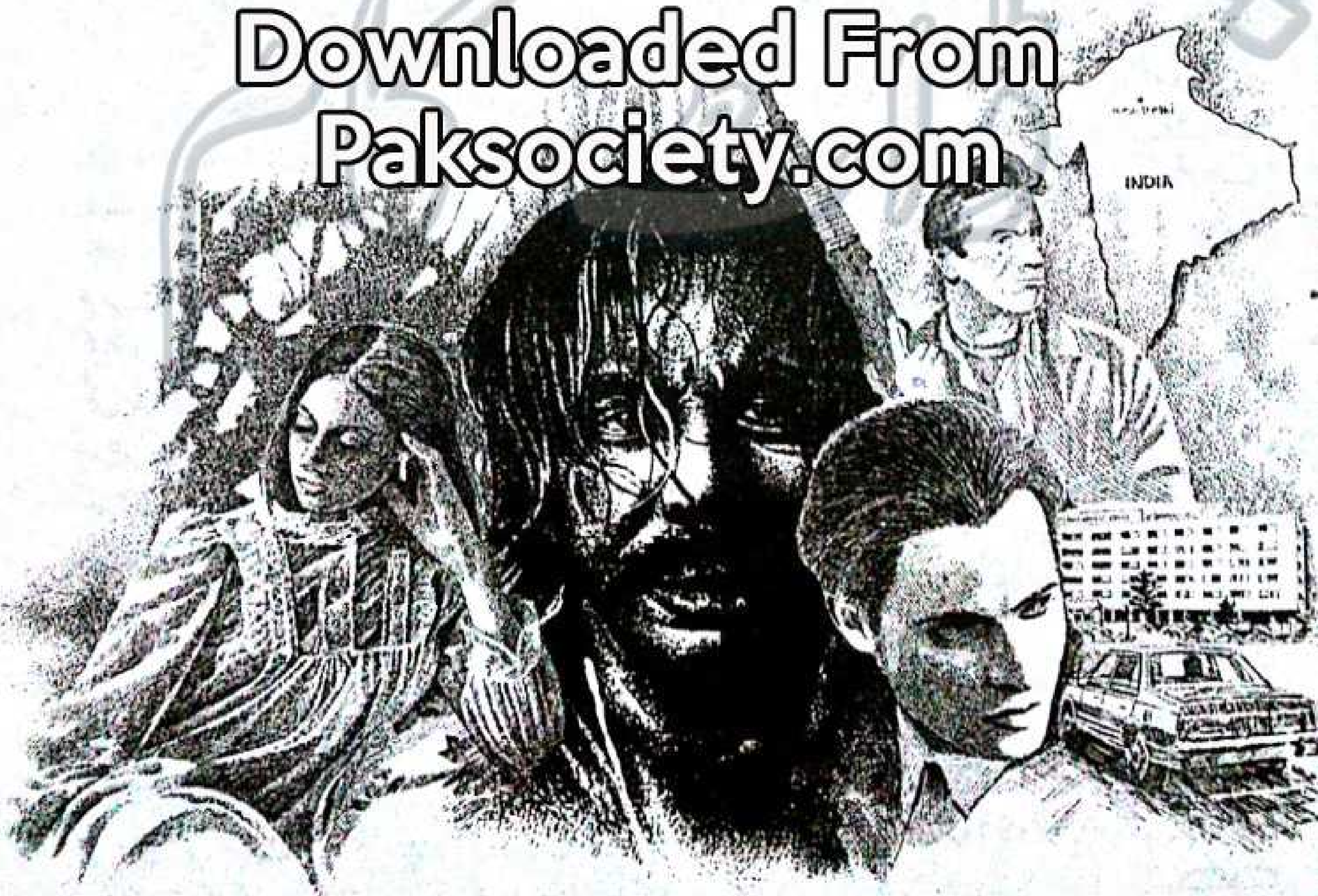
تحریر: کاشف زبیر

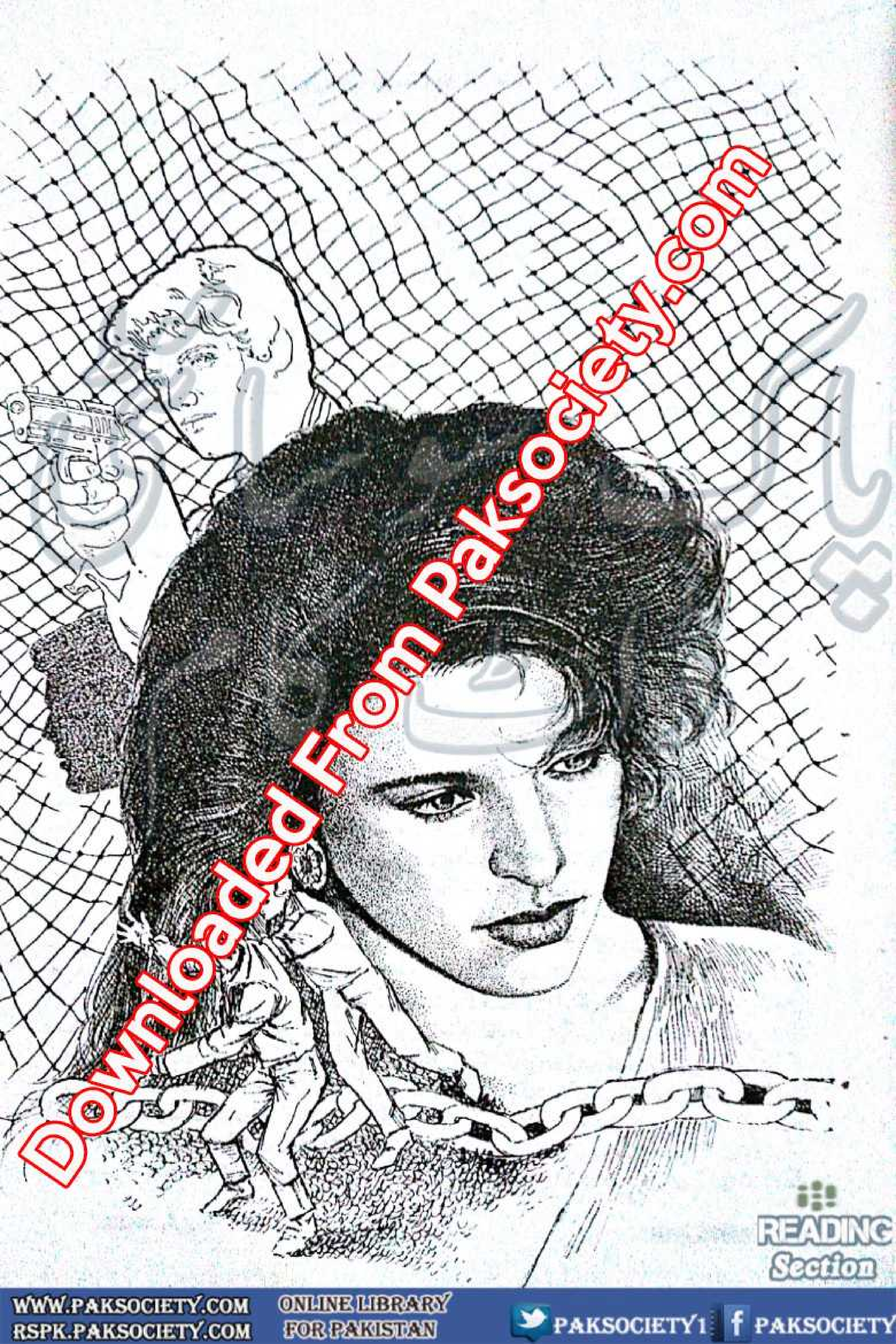
قسط نمبر: 103

☆☆

وہ پیدایشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو ،مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب...... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی





(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

میری محبت سویرا، میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران میں نادر علی سے ٹکراؤ ہوا، اور یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کردیا کہ مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا ہی تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ میں نے کرنل زروسکی کو زخمی کرکے بساط اپنے حق میں کرلی۔ میں دوستوں کے درمیان آکر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ ہم مانسہرہ پہنچے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہروگی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زروسکی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کررہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زروسکی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کردیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپادیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جینس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کردی اور میں نے ان کے ساتھ جاکر بریف کیس حاصل کرلیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آگئے۔ سفیر کو دبئی بھیجنا تھا اسے ائرپورٹ سے سی آف کرکے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی بنٹی کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالتِ مجبوری میں راضی ہوگیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہوکر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر... آگے بڑھے تھے کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا، اس نے ڈیوڈ شا کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شا کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پُراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور پیلس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے منشی دل جی کی آواز سنائی دی "شاجی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔" ڈیوڈ شا کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائک بند کردیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگادی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کررہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کرکے بے ہوش کردیا اور محل میں پہنچادیا۔ مجھے پتا تھا ہر جگہ ڈیکٹافون لگا ہوا ہے۔ تبھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا "کنور ہوشیار" سادی کو لے کر چیمبر...... "مگر جملہ ادھورا رہ گیا اور سادی کی چیخ سنائی دی پھر منشی دل نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کردیا تھا۔ میں اس سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آکر مجھے اور سادی کو نشانے پر لے لیا۔ تبھی راج کنور آگیا۔ اس نے گولی چلائی جو بیتو کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا پستول راج کنور پر خالی کردیا بیتو مرچکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چتا کے حوالے کیا اور ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعہ سرحد تک پہنچے۔ وہاں سے اپنے شہر۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ڈیوڈ کی کال آگئی اس نے تصفیہ کرانے کی بات کی اور کال کٹ گئی۔ ہم بنگلے میں بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ گیس پھینک کر ہمیں بے ہوش کردیا گیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔ شا کی قید میں شا نے مجھے کہا کہ میں فاضلی کی مدد کروں کیونکہ میرے ہاتھوں میں ایک ایسا کڑا پہنادیا گیا تھا جو فاضلی سے 500 میٹر دور جاتے ہی زہر انجیکٹ کردیتا، میں حکم ماننے پر تیار ہوگیا فاضلی نے مرشد کی جعلی خانقاہ پر حملے کا پروگرام بنایا۔ ہم نے فاضلی کے آدمیوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ حملہ کامیاب رہا فاضلی مارا گیا اور مجھے سانپ نے ڈس لیا مگر سانپ کا زہر مجھ پر کارگر نہ ہوا۔ فاضلی نے جو کڑا مجھے پہنایا تھا اس کا الٹا اثر ہوا اور وہ خود کڑے میں چھپے سائینائیڈ زہر سے مارا گیا۔ میں مرشد کی خانقاہ سے نکل کر دوستوں کے پاس پہنچا پھر راجا صاحب سے ملنے جیپ کے ذریعے ان کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ علاقہ بھی تھا جہاں برٹ شا نے ہیرے چھپائے تھے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے پیڑ پر چڑھا تھا کہ فائر ہوا اور میں پھسل کر نیچے گرا ہی تھا کہ فتح خان کی آواز آئی کہ تم ٹھیک تو ہے پھر وہ مجھے قید کرکے لے چلا۔ راستے میں اس کے ساتھیوں نے غداری کی مگر میری مدد سے فتح خان فتح یاب ہوگیا۔ مگر آگے جاکر میں نے فتح خان کو گولی ماردی اور واپس وہاں آیا جہاں گاڑی کرکے گیا تھا۔ وہ لاش پڑی تھی۔ ابھی میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ پولیس والے آگئے اور مجھے تھانے لے آئے۔ وہاں سے رشوت دے کر چھوٹا پھر راجا صاحب کے محل پہنچا مگر وہاں کے حالات بدل چکے تھے۔ میں واپس ہو گیا کہ راستے میں ایک عورت اور دو نوجوانوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے سر پر کسی چیز سے وار ہوا۔ میں بے ہوش ہوکر گر پڑا۔ ہوش آیا تو میں شیر خان کی قید میں تھا۔ وہ لوگ مجھے افغانستان کے راستے بھارت لے آئے تب پتا چلا کہ وہ لڑکی ڈیوڈ کی کارندہ ہے لیکن اس نے ڈیوڈ شا کے گلے

لگ کر کہا ’’پاپا‘‘ تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے خواب میں بھی ایسا نہیں سوچا تھا ڈیوڈ نے اوشا کو بھی وہیں قید کر رکھا تھا۔ وہیں میری ملاقات ایک نیپالی سے ہوئی جو انہیں کا کارندہ تھا اس نے مجھے ایک موبائل فون دیا جس سے میں نے ایمن سے باتیں کیں مگر اس کا راز کھل گیا اور شانے اسے قتل کر دیا۔ وہ دون کے بعد تاریک وادی کا سفر شروع ہو گیا۔ ہم آگے چلے جا رہے تھے کہ باسو کا پیر پھسلا اور وہ ایک کھڈ میں گرنے لگا۔ ہم سب برف پوش پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے ایک ہی رسی میں خود کو باندھے ہوئے تھے اس لیے میرا توازن بگڑا اور میں آگے کی سمت گرا تھا کر زبی نے سنبھال لیا۔ کرنل نے باسو کو رسی پھینک کر بچا لیا۔ ہمارا سفر جاری رہا۔ ایک جگہ برفانی آدمیوں کے ایک غول نے گھیر لیا۔ ان سے بچ کر نکلا تو راستہ بھٹک گیا اور ایک سرنگ میں پہنچ گیا جو برف والے آدمی کی تھی۔ برف والے سے ملاقات ہوئی برف والے نے کنپٹی دبا کر بے ہوش کر دیا جب ہوش آیا تو میرے سر پر تیر کمان سے لیس کچھ سپاہی کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے گرفتار کر کے وادی کے حکمران ریناٹ کی قید میں پہنچا دیا، وہاں ایک ہمدرد گیرٹ نے مجھے فرار میں مدد دی اور میں برف والے کے کہنے کے مطابق سامیرا کی فوج کی مدد کرنے کے لیے اس کے علاقے میں پہنچ گیا۔ میں نے فوج کو ازسرنو تیاری کرانا شروع کر دی تھی کہ ریناٹ کے قلعہ آرگون کی طرف سے قرنا پھونکے جانے کی آواز بلند ہوئی سامیرا کا چہرہ زرد ہو گیا اور اس نے زیرِ لب کہا ’’اعلانِ جنگ‘‘ میں نے فوراً ہی سامیرا کی فوج کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ فوج کو رسد کی اشد ضرورت رہتی ہے۔ رسد کے لیے مناسب انتظام کیا۔ ایک روز معائنہ کے بعد واپس لوٹ رہا تھا کہ ایک بچے کے منہ سے برف والے کا پیغام ملا کہ رات سے پہلے ٹھکانے پر لوٹ آیا کرو۔ رات باہر نہ گزارنا۔ میں روبیر کے ساتھ علاقے کو دیکھنے کے لیے نکلا تو پہاڑیوں کے درمیان مجھے کچھ ایسے گول پتھر نظر آئے جنہیں اسلحہ کے طور پر استعمال کر سکتا تھا۔ ابھی میں اسے دیکھ رہا تھا کہ خونخوار اسمار نے گھیر لیا اور میں روبیر کے ساتھ ایک پہاڑی غار میں گھس گیا۔ پھر اسمار اور بندر نما جانور کے علاوہ ہارن سے بھی مڈبھیڑ رہی مگر اگلی صبح ہم بخیریت واپس سامیرا کے پاس آگئے۔ سامیرا نے کہا کہ یہ بہت برا ہوا ہے۔ تبھی سومرو چند سپاہیوں کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوا اور مجھے جکڑ لیا۔ مجھے ملزم قرار دے کر آبادی سے نکال دیا گیا۔ سامیرا ابھی نہیں تھی کہ یہ میرے خلاف سازش ہے۔ اس لیے اس نے خفیہ طریقہ زادِ راہ کے علاوہ ایک رہبر کو بھی ساتھ کر دیا۔ پھر مجھے روبیر مل گئی جسے میری طرح علاقہ بدر کیا گیا تھا۔ ہم ایک ٹیلے پر آگئے۔ سامیرا نے ربیک کے ساتھ کچھ سپاہیوں کو بھی بھیجا تھا۔ ایک دن آرگون کے سپاہیوں نے حملہ کیا اور روبیر کو اٹھا لے گئے۔ اس کی تلاش میں گئے تھے کہ ... ساشا ملی جو گیرٹ کی بیٹی تھی۔ گیرٹ کو سزائے موت دی گئی تھی اور ساشا اس کی موت کا ذمے دار مجھے ٹھہرا رہی تھی۔ پھر بھی اسے ہم نے ساتھ رکھ لیا۔ ہم سب مل کر آرگون پر حملہ کرنے کے لیے چھاپہ مار جنگ کی تیاری کر رہے تھے کہ قرنوں کی آواز گونج اٹھی۔ آرگون والوں نے اعلانِ جنگ کر دیا تھا۔

(اب آگے پڑھیں)

’’اعلانِ جنگ۔‘‘ ربیک نے سرسراتی آواز میں کہا۔

میرے ذہن فوری آرگون کا خیال آیا مگر اس خیال کے راستے میں یہ ہارن موجود تھے۔ قرنا پھونکے جانے کا مطلب تھا کہ آرگون کی فوج حرکت میں آنے والی تھی اور اس فوج کو سامیرا کے قلعوں تک پہنچنے میں نصف دن بھی نہیں لگتا۔ مگر باقاعدہ ساز و سامان اور حملے کی مکمل تیاری میں شاید انہیں قلعوں کے سامنے کچھ وقت لگتا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اگر ریناٹ کا رات کے وقت جنگ کا ارادہ نہیں تھا تو حملہ اگلی صبح ہی ہوتا۔ اس سے سامیرا کی فوج کو اپنی تیاری مکمل کرنے کا موقع مل جاتا۔ دفاعی انتظامات ایسے تھے کہ سامیرا کی فوج اگر ذرا بھی استقامت سے کام لیتی تو ریناٹ کی فوج کو کئی دن روک سکتی تھی اور اتنا وقت میرے لیے کافی ہوتا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ آرگون میں داخل ہوتا اور ریناٹ اور اس کے ساتھیوں تک پہنچنے کی کوشش کرتا۔

ساشا نے بتایا تھا کہ فوج کا زیادہ تربیت یافتہ حصہ ریناٹ نے اپنی اور سرکاری علاقے کی حفاظت کے لیے مخصوص کر لیا تھا۔ اس صورت میں ہمیں اندر کہیں زیادہ مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا مگر یہ اس لحاظ سے اچھا تھا کہ سامیرا کی فوج کو ریناٹ کی کم تربیت یافتہ فوج کا مقابلہ کرنا پڑتا۔ قرنے کی آواز نے سب کو ہی بے چین کر دیا تھا۔ ان نوجوانوں کے گھر بار اور رشتے قلعوں میں تھے اور فطری طور پر انہیں سب سے زیادہ فکر اپنے گھر والوں کی تھی۔ ایک نوجوان نے آگے آکر کہا۔ ’’ہمیں فوراً قلعوں کی طرف جانا چاہیے۔‘‘

ایرٹ نے اس سے کہا۔ ’’قلعوں میں لڑنے کے لیے بہت ساری فوج موجود ہے اور وہاں ہماری موجودگی اتنی ضروری نہیں ہے جتنا ضروری شہباز کا ساتھ دینا ہے۔‘‘

’’بالکل۔‘‘ ربیک نے اس کی تائید کی۔ ’’ہم اسی لیے یہاں ہیں کہ شہباز کا ساتھ دیں اور جو یہ کہے اس پر عمل کریں۔ ہمیں بھول جانا چاہیے کہ پیچھے ہمارے گھر بار اور رشتے دار ہیں۔‘‘

’’ہم ان ہی کے لیے تو نکلے ہیں۔‘‘ ایمار نے کہا اور میری طرف اشارہ کیا۔ ’’یہ شخص ہمارا کچھ نہیں لگتا اس کے باوجود ہمارے لیے لڑنے کو تیار ہے۔ کیا ہم اسے اس وقت

اکیلا چھوڑ دیں۔"
"نہیں...... ہرگز نہیں...... بالکل نہیں۔" کچھ آوازیں ابھریں۔
"تب ہمیں اس کا ساتھ نہیں دینا چاہیے۔" ایرٹ بلند آواز سے بولا۔
"دینا چاہیے...... دینا چاہیے۔" اس بار سب ہی چلّائے تھے۔ "ہم سب شہباز کے ساتھ ہیں۔"
ساشا عجیب سی نظروں سے سب کو دیکھ رہی تھی اس نے اس دوران میں ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ "تم کیا کہتی ہو کیا تم میرا ساتھ دو گی؟"
وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں میں تمہارا ساتھ دوں گی۔"
مجھے اس کا انداز ذرا مختلف لگا۔ مگر موقع نہیں تھا کہ میں اس پر غور کرتا۔ میں نے حکم دیا۔ "تب ہمیں یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے ہمیں آرگون جانا ہے۔"
"ہم آرگون کیسے جا سکتے ہیں؟" ربیک نے بے یقینی سے کہا۔ "اس کے چاروں طرف فصیل اور اس پر پہرہ ہو گا۔"
"ایک راستہ ہے جس سے ہم کسی کی نظروں میں آئے بغیر آرگون میں داخل ہو سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "مگر پہلا مرحلہ یہاں سے نکلنا ہے اور اس کے لیے ہارن کو یہاں سے ہٹانا ہو گا۔"
ہارن بذاتِ خود ایک بڑا مسئلہ تھے اور ہماری ساری قوت بھی ان کے خلاف بیکار تھی۔ انہیں یہاں سے ہٹا کر ہی ہم نکل سکتے تھے اور یہ بھی ضروری تھا کہ وہ ہمارے پیچھے نہ آنے پائیں۔ ایرٹ نے تجویز پیش کی۔ "ہم اوپر سے تیر مارتے ہیں۔"
"غیر منظم تیر اندازی کا ان پر اثر نہیں ہو گا۔ چند ایک تیر لگے بھی تو اس کے بعد یہ دور ہٹ جائیں گے جہاں تک تیر نہ جا سکیں۔"
میرے انکار پر ربیک نے پوچھا۔ "پھر ہم کیا کریں سامنے سے اترنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"
"ہمیں پیچھے کی طرف کوئی راستہ تلاش کرنا پڑے گا۔" میں نے چٹان کے عقب میں دیکھا۔ ویسے تو چٹان چاروں طرف سے الگ تھی مگر اس کے عقب میں ایک چھوٹا سا حصہ زمین سے خاصی بلندی پر دوسری چٹانوں تک جا رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ "اگر ہم اس کی مدد سے پیچھے چٹانوں تک جا سکیں تو ہارن کی نظروں میں آئے بغیر یہاں سے نکل سکیں گے۔"
"اس پر اترنا آسان نہیں ہو گا۔" ربیک نے کہا۔
"ہم کوشش کر سکتے ہیں۔" ایرٹ نے اپنا ترکش اور کمان رکھتے ہوئے کہا۔ اس نے ایک رسی باندھی اور اس کے سہارے نیچے اترنے لگا۔ اس دوران میں چند نوجوان ہارن پر نظر رکھے ہوئے تھے کہ ان میں سے کوئی اس طرف نہ آ جائے۔ اگرچہ یہ مختصر سی جگہ زمین سے خاصی بلند لگ رہی تھی مگر کیا کہا جا سکتا تھا کہ ہارن اس تک رسائی حاصل کر لیں۔ ایرٹ خاموشی سے جا رہا تھا چند منٹ میں وہ اس چھوٹے سے حصے پر تھا اس نے رسی ڈھیلی کی اور آگے جانے لگا۔ اوپر جاتے ہوئے پتھر کا یہ ٹکرا مختصر اور سیدھا ہوتا جا رہا تھا۔ آگے چڑھنا دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں ایرٹ کی مہارت کام آئی اور وہ کسی نہ کسی طرح دوسری طرف موجود چٹان پر چڑھ گیا۔ سب سے پہلے اس نے چٹان کا جائزہ لیا کہ وہ محفوظ ہے یا نہیں اور اس کے بعد اشارے سے ہمیں اس پر آنے کو کہا۔ وہ جو رسی ساتھ لے کر گیا تھا، اس نے اسے ہی کہیں باندھ دیا اور اب دوسرا کوئی اس رسی کے سہارے باآسانی اس چٹان تک جا سکتا تھا۔
ہم باری باری چٹان پر جانے لگے اور اس دوران میں ہارن کی نگرانی جاری رہی تھی۔ وہ ہماری سرگرمی سے بے خبر تھے، مگر وہ زیادہ دیر بے خبر بھی نہ رہتے۔ آخر میں صرف میں، ساشا اور ربیک رہ گئے۔ میں نے ان دونوں کو پہلے جانے کو کہا مگر ربیک نے اصرار کیا کہ پہلے میں جاؤں۔ میں مان گیا۔ پہلے ساشا گئی۔ اس کے پیچھے میں تھا۔ اس دوران میں ربیک نگرانی کر رہا تھا۔ میں چٹان سے نیچے اترا تو ساشا دوسری چٹان پر جانے والے راستے پر تھی۔ اسے چٹانوں پر چڑھنے میں کمال مہارت تھی۔ مگر وہ کہتے ہیں نا کہ تیراک ہی ڈوبتا ہے اور شہ سوار گرتے ہیں۔ تو یہاں بھی یہی ہوا تھا۔ وہ اوپر جاتے ہوئے بے پروائی سے کام لے رہی تھی کہیں کہیں وہ رسی چھوڑ بھی دیتی تھی ایسے ہی ایک موقع پر اس کے پاؤں تلے موجود چٹان کا ایک حصہ جو یقیناً پہلے سے ہلا ہوا تھا یک دم ہی ٹوٹا۔ وہ لڑکھڑائی اور دونوں اطراف میں سے کسی طرف گرنے سے بچنے کی کوشش میں راستے پر گری اور لڑھکتی ہوئی میری طرف آنے لگی۔
ڈھلان پر اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ گرتے ہوئے اس نے چیخ بھی ماری تھی اور پھر اس کے منہ سے مسلسل

آواز نکل رہی تھی۔ وہ مجھ سے کوئی بیس بائیس گز آگے گری تھی اور جب وہ نیچے آرہی تھی تو مجھے لگا کہ وہ راستے پر نہیں رہ سکے گی اور چٹان سے نیچے گر جائے گی۔ اس کے باوجود میں اسے روکنے کے لیے تیار تھا۔ میں نے رسی دائیں ہاتھ پر لپیٹ لی اور قدم مضبوطی سے راستے پر جمائے۔ میری نظر نزدیک آتی ساشا پر جمی ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے چار گز دور تھی جب راستے پر بھی اس کا توازن بگڑا اور وہ بائیں طرف گرنے لگی۔ میں نے آگے کی طرف جست لگائی اور رسی سے تقریباً جھولتے ہوئے ٹارزن کی طرح ساشا کو پکڑ لیا۔ میرے ہاتھ میں اس کا بایاں ہاتھ آیا تھا اور اب وہ اس کے سہارے خلا میں جھول رہی تھی۔ زمین اس کے پیروں تلے کوئی بیس فٹ نیچے تھی۔ اتنی بلندی سے گر کر مرنے کا امکان کم تھا مگر اس کی کوئی ہڈی ٹوٹ سکتی تھی اور سب سے بڑا خطرہ ہارن کا تھا۔ یہاں چٹانوں کے درمیان اتنی جگہ تھی کہ ہارن کوشش کرتے تو اس طرف آسکتے تھے۔ ساشا اب بھی چیخیں مار رہی تھی۔ میں نے کہا۔

''چیخو مت ہارن یہاں آسکتے ہیں۔''

یک دم وہ ساکت اور خاموش ہوئی تو میں سمجھا میری بات کا اثر ہوگیا ہے۔ رسی میری کلائی پر لپٹی ہوئی تھی اور میں ٹارزن کی... طرح ہی جھولتے ہوئے واپس آیا تھا۔ مگر ساشا کے پاؤں ابھی راستے پر نہیں آئے تھے وہ بدستور راستے کے بائیں طرف جھول رہی تھی۔ یہ اوپر بندھی رسی کی پوزیشن کا کمال تھا کہ جب اس پر پورا زور آیا تو یہ اس طرف ہوگئی جس طرف بندھی ہوئی تھی اور اب ہم دونوں ہی راستے سے دور ہوگئے تھے۔ البتہ میں چٹانی دیوار سے آکر لگا تھا۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ میں راستے سے کوئی دو گز کی دوری پر اور کوئی دو گز ہی نیچے خلا میں تھا اور ساشا میرے ہاتھ کے سہارے بالکل ہی خلا میں تھی۔ میری پشت دیوار سے رگڑ کھا رہی تھی مگر اس کے پاس جسم ٹکانے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ میں اسے جھلا کر اوپر لے جانے کی کوشش کرنے کا سوچ رہا تھا کہ ٹاپوں کی مخصوص آواز آئی اور میں ساکت ہو گیا۔

تب میں نے اس ہارن کو دیکھا جسے ساشا نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا اور ساکت و خاموش ہوگئی تھی۔ وہ چٹانوں سے گھومتا ہوا ہم سے کوئی پچاس گز کی دوری پر نمودار ہوا تھا۔ یقیناً ساشا کی چیخوں نے اس کی رہنمائی کی تھی۔ مگر ابھی اس کی نظر ہم پر نہیں گئی تھی کیونکہ وہ سر جھکا کر زمین کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس وقت ساشا کے پاؤں زمین سے کوئی پندرہ سولہ فٹ کی بلندی پر تھے اور یہ بلندی خطرے کی حد میں تھی۔ میں نے رسی پر زور دیتے ہوئے اپنا جسم جھلایا تاکہ ساشا کو راستے تک پہنچاسکوں۔ اس نے بھی سمجھ لیا کہ میں کیا کوشش کر رہا ہوں اور وہ جھولنے میں میرا ساتھ دینے لگی۔ پہلی کوشش ناکام رہی کیونکہ یہ عجلت میں کی گئی تھی۔ میرا جسم راستے کے نزدیک ہوگیا تھا مگر ساشا پیچھے تھی اور اس کا دایاں ہاتھ راستے سے دور رہا۔ اسی دوران میں ہارن نے ہمیں دیکھ لیا۔ وہ بھڑک کر غرایا اور ہماری طرف لپکا تھا۔

''پاؤں اوپر کرلو۔'' میں نے ساشا سے کہا۔ ''میرے اوپر چڑھنے کی کوشش کرو۔''

ساشا نے سہی اور گھگیائی ہوئی آواز نکالی اور اپنے پاؤں ممکن حد تک اوپر کر لیے تھے۔ اب وہ دائیں ہاتھ سے میرا کرتہ تھام کر اوپر ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہارن عین ہمارے نیچے آیا اور اس نے دونوں ہاتھ بلند کر کے ساشا کو پکڑنے کی کوشش کی۔ ایک لمحے کو مجھے لگا کہ وہ اسے پکڑ لے گا مگر اس کے ہاتھ ساشا سے ذرا ہی دور رہ گئے تھے۔ اگر اس نے پاؤں اوپر نہ کیے ہوتے تو شاید ہارن کامیاب ہو جاتا۔ پہلی ناکامی کے بعد وہ ذرا پیچھے ہوا اور پھر گھوڑے کی طرح پچھلے پیروں پر کھڑے ہوتے ہوئے اس نے دوبارہ ساشا پر ہاتھ مارا۔ اس بار وہ اس لیے بچ گئی کہ میں اسے دوسرے جھولے میں اوپر لے گیا تھا۔ ہارن کے ہاتھ ایک بار پھر خلا میں لہراتے رہ گئے تھے۔ ہارن کی وجہ سے ساشا کو راستے کا ہوش نہیں تھا ورنہ وہ کوشش کرتی تو کنارہ تھام لیتی۔ میں کنارہ پکڑنے کو کہتا رہ گیا اور اس نے یہ موقع ضائع کردیا۔

میں بڑی مشکل پوزیشن میں تھا۔ رسی میری کلائی کے گرد لپٹی ہوئی تھی مگر یہ دونوں چٹانوں پر بندھی تھی اس لیے اس کے بلوں کا زور میری کلائی پر آرہا تھا۔ اگر یہ ایک طرف بندھی ہوتی تو زیادہ بوجھ میری ہتھیلی کی پکڑ اٹھالیتی مگر یہاں رسی دو طرف بندھی تھی اور میں ہتھیلی سے اسے پوری طرح گرفت نہیں لے سکتا تھا۔ میرے وزن کے ساتھ ساشا کا وزن بھی تھا۔ رسی کے دوہرے بندھن کی وجہ سے ہم ٹھیک سے جھول بھی نہیں پارہے تھے۔ ہم واپس آئے اور نیچے ہوتے ہارن کے عین اوپر سے گزرے جو دوسری بار اچھلنے کی تیاری کر رہا تھا اور اس بار اس نے اندازہ کرلیا تھا ہم کب اس کے اوپر سے گزریں گے وہ اسی لحاظ سے اوپر ہوتا۔ وہ

بالکل درست وقت پر اچھلا تھا اپنے دونوں پیروں پر کھڑے ہوتے ہوئے اس نے اپنے خوفناک ہاتھ ساشا کی طرف بڑھائے اور اس بار بہ ظاہر اس سے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

مگر جب ہم اس کے اوپر سے گزر گئے اور اس کے ہاتھ ہم سے دور رہے تو میں اس کرشمے پر حیران رہ گیا تھا۔ میرے حساب سے بچنے کا امکان نہیں تھا اس کے باوجود ہم بچ گئے تھے اور جب ہم جھولتے ہوئے کنارے تک آئے تو مجھے دوسری خوشگوار حیرت کا سامنا کرنا پڑا کہ اب ہم راستے سے اوپر تھے۔ ساشا نے دوسرا موقع ضائع نہیں کیا اور پہلے پاؤں ٹکائے اور پھر خود بھی بل کھا کر راستے پر چلی گئی۔ میں نے اس کی کلائی چھوڑ دی اور اس کے ساتھ ہی یک دم مجھے بہت سکون ملا تھا۔ میری کلائی پر آنے والا دباؤ بہت کم رہ گیا تھا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے بھی رسی تھام لی۔ اب اس کا زاویہ بدل رہا اور میں بغیر جھولے ہی راستے پر جا رہا تھا۔ ساشا کے اترنے کے چند لمحے بعد میں بھی راستے پر آ گیا تھا مگر میں نے رسی نہیں چھوڑی تھی۔ کیونکہ میرے قدم ڈگمگا رہے تھے۔

یہ سارا کمال ایرٹ، ایمار اور دوسرے نوجوانوں کا تھا۔ انہوں نے اپنی طرف والی رسی پکڑ کر کھینچی تو پہلے ساشا ہارن کی دوسری کوشش سے بھی بچ گئی۔ پھر انہوں نے رسی کا زاویہ بدلتے ہوئے مجھے بھی راستے پر ڈال دیا تھا۔ مشکل سے ایک منٹ کے واقعہ نے مجھے اور ساشا دونوں کو پسینے پسینے کر دیا تھا اور ہماری سانس یوں پھول رہی تھیں جیسے ہم نے میراتھون میں حصہ لیا ہو۔ ساشا راستے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ گرنے سے اس کا کرتہ رگڑ کے باعث کچھ جگہوں سے پھٹ گیا تھا اور اس کا گلابی جسم جھلک رہا تھا۔ مگر جان بچ گئی تھی۔ اس کے مقابلے میں کرتہ پھٹ جانے یا معمولی چوٹوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ’’تم ٹھیک ہو؟‘‘

’’ہاں۔‘‘ اس نے مرتعش لہجے میں کہا۔ ’’تم بھی ٹھیک ہو؟‘‘

میں نے سر ہلایا۔ ’’اب تم پوری احتیاط سے اوپر جاؤ۔ رسی مت چھوڑنا۔‘‘

اس نے سر ہلایا اور اوپر جانے لگی۔ ربیک پچھلی چٹان کے اوپر سے جھانک رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ’’تم بھی آ جاؤ اس سے پہلے کہ مزید ہارن یہاں آئیں۔‘‘

ناکام ہارن غضب ناک نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا کیونکہ ہم اس کی پہنچ سے باہر تھے۔ دو تین بار اس نے راستے پر چڑھنے کی کوشش کی مگر جلد اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ راستہ کم سے کم بھی زمین سے پچیس فٹ اوپر تھا۔ مگر ہارن کے یہاں آنے سے ہمیں یہ نقصان ہوا کہ وہ واقف ہو گئے کہ ہم یہاں سے فرار ہو رہے ہیں اور اب وہ آگے کہیں ہمارا راستہ روک سکتے۔ ساشا کے بعد میں بھی دوسری طرف پہنچا تو ربیک بدستور اسی چٹان پر تھا اور نیچے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے آواز دی تو اس نے پلٹ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر اشارے سے ہمیں رکنے اور صبر کرنے کو کہا۔ وہ یقیناً ہارن کا جائزہ لے رہا تھا۔ راستے کی طرف آنے والا ہارن بھی باہر چلا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد ربیک ہماری طرف آیا مگر اس نے رسی نہیں کھولی تھی۔ چٹان پر چڑھتے ہی اس نے بتایا۔

’’وہ کنویں کے گرد گھوم کر آگے جا رہے ہیں۔‘‘

کنواں اس چٹان سے نظر نہیں آ رہا تھا کیونکہ وہ پہلی چٹان کے ساتھ تھا۔ میں نے سوال کیا۔ ’’سب گئے ہیں؟‘‘

’’سب چلے گئے ہیں۔‘‘ ربیک نے یقین سے کہا۔ ’’ہمارے پاس موقع ہے۔‘‘

’’کیسا موقع؟‘‘ ایرٹ نے پوچھا۔

’’ہم واپس چٹان پر جا کر اتریں اور یہاں سے نکل جائیں۔‘‘

’’لیکن اگر یہ دھوکا ہوا یا ہارن اس دوران میں آ گئے تو؟‘‘ ایمار نے اعتراض کیا۔

’’اس کا خطرہ تو آگے بھی ہے ہم جہاں اتریں گے وہاں ہارن موجود ہو سکتے ہیں۔ وہ یہاں آتے ہیں اور اس جگہ کے چپے چپے سے واقف ہیں۔‘‘

’’ربیک ٹھیک کہہ رہا ہے۔‘‘ میں نے تائید کی۔ ’’ہارن کا خطرہ ہر جگہ ہے اور ہمیں یہاں سے نکلنے کے لیے مختصر ترین راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ ویسے ہارن سے بچنے کے لیے ہمارے پاس محلول ہے۔ جس کی بو سے یہ بھاگتے ہیں۔‘‘

ربیک چونکا۔ ’’اسے تو ہم بھول گئے تھے۔‘‘

’’لیکن مجھے یاد ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’البتہ اگر ہم صرف اس محلول کے بل بوتے پر ہارن سے بچنے کی کوشش کرتے تو اس کا امکان تھا کہ وہ ہماری کوشش کسی طرح ناکام بنا دیں۔ ایک آدھ ہارن پر یہ کارآمد ہوتا ہے لیکن زیادہ

تعداد کی صورت میں ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیا حکمت عملی اختیار کرتے جب کہ ہمیں بہت طویل سفر کرنا ہے۔ یعنی ان کے پاس لامحدود وقت اور مواقع ہوں گے کہ وہ ہمیں مار سکیں۔"

ان کا ہارن سے واسطہ نہیں پڑا تھا اس لیے وہ چپ رہے۔ مجھے یاد تھا کہ جس ہارن کے سامنے مجھے پھینکا گیا تھا اس نے میرے جسم سے آتی بُو کی وجہ سے مجھے ہاتھوں سے پکڑنے کی کوشش نہیں کی مگر اس نے گھوم کر مجھے دولتی سے مارنے کی کوشش ضرور کی تھی اگر ایسی ہی کوشش یہ ہارن کرتے تو ہماری بقا خطرے میں پڑ جاتی۔ ربیک کی تجویز مان لینے کے بعد میں اور ربیک واپس چٹان پر آئے اور ہم نے احتیاط سے سامنے آئے بغیر چٹان کے نیچے کا اور خاص طور سے کنویں کے آس پاس کا جائزہ لیا۔ مگر ہمیں دور تک کوئی ہارن نظر نہیں آیا۔ وہ سچ مچ یہاں سے جا چکے تھے۔ لیکن اگر وہ کہیں دور جا بھی چکے تھے تب بھی ان کو واپس آنے میں دیر نہ لگتی اگر انہیں کسی طرح پتا چل جاتا کہ ہم اس چٹان سے اتر آئے ہیں۔ ان کے دوڑنے کی رفتار ہمارے گھوڑے سے زیادہ ہی تھی۔ ان کا بے خبر رہنا ہی ہماری بقا کی ضمانت تھی۔ میں نے دور جنگل کی طرف اشارہ کیا۔

"ہمیں وہاں تک پہنچنا ہے اس کے بعد ہی ہم محفوظ ہو سکتے ہیں۔"

ربیک نے سر ہلایا۔ "تب ہمیں فوری روانہ ہو جانا چاہیے ہم جتنی دیر کریں گے ہارن کی واپسی کا خطرہ اتنا ہی بڑھ جائے گا۔"

"ہم باری باری نیچے اتریں گے اور جب ایک جنگل تک پہنچ جائے گا تو دوسرا اترے گا۔"

"اس میں بہت وقت لگ سکتا ہے۔" ربیک نے نقطہ اٹھایا۔

"اس صورت میں دو دو کر کے روانہ ہوں گے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اس سے زیادہ نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔"

"جو پہلے جائیں گے ان کے پاس محلول ہوگا۔ کسی خطرے کی صورت میں وہ فوری محلول پی لیں اور جب تک جسم سے بُو نہ آنے لگے خود کو ہارن سے دور رکھیں۔"

ربیک نے تائید کی تو میں نے باقی سب کو بھی واپس آنے کا اشارہ کیا۔ وہ ایک ایک کر کے اسی راستے سے واپس آئے اور آخر میں ایرٹ رسی کھولتا ہوا آیا تھا۔ ان میں سے کچھ اس فیصلے سے مطمئن نہیں تھے مگر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ ربیک نے سب کو سمجھایا کہ ہم نے کیا کرنا ہے۔ سب سے پہلے ربیک اور ایک نوجوان جاتے۔ سامیرا نے اس بار محلول کی کئی بوتلیں بھجوائی تھیں۔ ایک بوتل اور کچھ سامان ربیک اور اس کے ساتھی نے لیا۔ وہ رسی اور لکڑی کی سیڑھی کی مدد سے نیچے اترے اور پوری رفتار سے جنگل کی طرف دوڑ پڑے تھے۔ دوسری ٹیم میں ایمار اور ایک نوجوان تھا۔ وہ بالکل تیار تھے جیسے ہی پہلی ٹیم جنگل میں داخل ہوئی وہ بھی نیچے اترے اور دوڑ پڑے۔ اس دوران میں کچھ آس پاس کی نگرانی کر رہے تھے کہ کسی طرف سے بھی ہارن نمودار ہوں تو دوسروں کو خبردار کر دیا جائے۔

حکمت عملی میں یہ بھی شامل تھا کہ کسی ناگہانی کی صورت میں اگر کوئی دوسروں سے بچھڑ جائے تو وہ تباہ ہونے والے ٹیلے تک پہنچے۔ کیونکہ اس صورت میں باقی سب بھی وہیں جائیں گے۔ دوسری ٹیم کے پہنچتے ہی تیسری ٹیم روانہ ہو گئی۔ ہر ٹیم تقریباً چار منٹ میں جنگل پہنچ رہی تھی یوں آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں سب جنگل میں پہنچ جاتے اور اس کے بعد ہم آگے سفر کرتے۔ سب سے آخر میں، میں اور ساشا تھے۔ اس نے کسی اور کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور میرے ساتھ جانے کو کہا تھا۔ جب چھٹی ٹیم بھی چلی گئی تو میں نے سیڑھی اوپر کھینچی۔ اسے لپیٹ کر سامان میں رکھا اور رسی نکال کر اسے ایک ابھرے پتھر کے گرد گھما کر دونوں رسیوں کو ملا کر چند بل دیئے اور ساشا سے کہا۔ "اسے پکڑ کر نیچے اترو مگر دونوں رسیاں مضبوطی سے پکڑنا ایک بھی ہاتھ سے نکل گئی تو تم گر جاؤ گی۔"

اس نے سر ہلایا اور نہایت آرام سے نیچے پہنچ گئی۔ پھر میں نے رسی پکڑی اور اسی طرح نیچے آیا۔ رسی کے بل کھولے اور اسے کھینچ لیا۔ اس کا بنڈل بنا کر شانے پر ڈالا اور ہم بھی جنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔ ساشا آگے دوڑ رہی تھی اور میں اس سے ذرا فاصلے پر تھا۔ اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ حالانکہ اس نے بھی کچھ سامان اٹھا رکھا تھا۔ دیکھنے میں وہ خاص نہیں لگتی تھی مگر اب تک میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ جسمانی طور پر بہت فٹ اور اچھے اسٹیمنا کی مالک تھی۔ چٹانوں پر چڑھنے کی مہارت میں دیکھ چکا تھا۔ پھر مشکل وقت میں جب ہارن اسے پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا تب بھی اس نے اپنے حواس بحال رکھے تھے۔ جب کیرٹ نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں ساشا کو اپنے ساتھ لے

جاؤں گا تب میں یہ سوچ کر بھی ہچکچایا تھا کہ وہ کمزور لڑکی یہ مشکل ترین سفر کیسے کرے گی۔ مگر اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ کمزور نہیں تھی۔ ہم بھی چند منٹ میں درختوں تک پہنچ گئے جہاں باقی سب بے تابی سے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ربیک نے کہا۔

''آپ بروقت آئے وہ دیکھیں۔''

میں نے پلٹ کر دیکھا تو کنویں والی سمت سے ہارن نمودار ہو رہے تھے۔ شاید انہیں چٹانوں میں ہمارا سراغ نہیں ملا اور شاید ان کے ذہن میں یہی خیال آیا ہوگا کہ کہیں واپس اسی چٹان سے اتر کر فرار ہو جائیں اور ہم نے ایسا ہی کیا تھا۔ ہارن چٹان کے اوپر دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ ان کی نظر کی رسائی سے بہت بلند تھی۔ اچانک ایک ہارن جو زمین پر جھکا ہوا کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ زور سے غرایا۔ اس کی آواز یہاں تک آئی تھی اور پھر وہ اپنے ساتھیوں کو اشاروں آمیز زبان میں کچھ بتانے لگا۔ پھر اس نے ہاتھ اٹھا کر جنگل کی طرف اشارہ کیا تو میری چھٹی حس نے مجھے اشارہ دیا اور میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''دوڑو...... پوری رفتار سے۔''

خطرہ سب نے محسوس کر لیا تھا اور میرے کہتے ہی سب حرکت میں آگئے۔ ہم ایک قطار میں دوڑ رہے تھے اور جنگل کے آڑے ترچھے راستوں میں ہماری رفتار خاصی تیز تھی۔ اس بار سب سے آگے میں تھا اور ساشا میرے پیچھے تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہارن کو زمین پر کوئی ایسا نشان نظر آگیا تھا جو اس سے پہلے وہاں نہیں تھا اور اسی وجہ سے اس نے سمجھ لیا کہ ہم چٹان سے اتر کر جنگل کی طرف فرار ہو گئے ہیں۔ میں نہیں دیکھ سکا تھا کہ اس کے باقی ساتھی قائل ہوئے یا نہیں اور وہ ہمارے پیچھے آرہے تھے؟ یہ وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوتا ہم اس یقین کے ساتھ دوڑ رہے تھے کہ پیچھے ہارن ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ٹیلے تک کا سفر مشکل سے پندرہ منٹ میں طے ہو گیا اور جب ہم ندی کے پاس رکے تو سب ہانپ رہے تھے۔ سب نے اپنے خشک ہو جانے والے گلے تر کیے اور دوڑنے سے گرم ہو جانے والے جسموں کو ندی کے سرد پانی سے ٹھنڈا کرنے لگے۔ میں خود ندی کے ساتھ گھاس پر لیٹا ہوا تھا۔

ساشا جو نزدیک بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بھی لباس سمیت ندی میں چلی گئی۔ بھیگنے سے کھلا کرتہ اس کے جسم سے چپک رہا تھا۔ روبیر اتنے دن میرے ساتھ رہی مگر اس نے کبھی میرے یا کسی کے سامنے ندی میں غسل نہیں کیا تھا۔ وہ ہمیشہ اکیلے میں غسل کرتی تھی۔ مگر ساشا کو اتنے مردوں کی موجودگی میں ندی میں نہانے میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کی وجہ سے ربیک اور اس کے ساتھی جھینپ کر ندی سے نکل آئے۔ ہم نے پانچ منٹ سے زیادہ آرام کر لیا تھا جو میرے حساب سے کافی تھا۔ اگرچہ ابھی تک ہارن ہمارے پیچھے نہیں آئے تھے مگر ان کا خطرہ ٹلا نہیں تھا۔ میں اٹھا اور منہ ہاتھ دھو کر خود کو تازہ دم کیا اور دوسروں سے مخاطب ہوا۔ ''اب ہمیں قلعوں کی طرف جانا ہے۔''

ربیک چونکا۔ ''مگر آپ نے تو کہا تھا کہ ہمیں آرگون جانا ہے۔''

''ہمیں آرگون ہی جانا ہے لیکن اس سے پہلے ریناٹ کی فوجوں کی پیش قدمی اور جنگ کی صورتِ حال دیکھنی ہے۔ ہم مداخلت نہیں کریں گے۔''

اس بار بھی کسی نے اعتراض نہیں کیا وہ سب پوری طرح فرمانبرداری کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ دوپہر ہو چکی تھی اور اب سورج شاید مغرب کی طرف جھک چکا تھا۔ ہمیں تاریکی چھانے سے پہلے قلعوں کے پاس پہنچنا تھا تاکہ صورتِ حال کا واضح جائزہ لے سکیں۔ کھانا بنانے کا موقع نہیں تھا اس لیے سب نے خشک لنچ کیا جو چنوں، پنیر اور میٹھی روٹی پر مشتمل تھا اس بار سامیرا نے پکوا کر بڑی مقدار میں یہ میٹھی روٹی بھیجی تھی۔ یہ خاصے دن تک محفوظ رہ سکتی تھی اور اس کا ذائقہ خراب نہیں ہوتا تھا۔ اس نے پنیر اور مکھن میرے لیے بھیجا تھا۔ ربیک اور اس کے ساتھی اپنے لیے خشک گوشت لائے تھے۔ اناج تھا اور کچھ خشک کیے ہوئے پھل تھے۔ یہ سب اتنا تھا کہ ہم آرام سے ہفتے بھر گزارا کر سکتے تھے۔

قرنے کی آواز نے سب کو فکر مند کر دیا تھا۔ اگرچہ ان میں سے کسی کو جنگ کی ہولناکی کا پتا نہیں تھا مگر ان کی چھٹی حس آنے والے مشکل حالات کا پتا دے رہی تھی۔ آج ندی میں خاصی مچھلیاں نظر آئیں مگر کسی کا موڈ نہیں تھا کہ پکڑتا اور نہ ہی وقت تھا۔ ہم مشکل سے دس بارہ منٹ وہاں رکے اور کھاتے ہی روانہ ہو گئے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ہم باغات کی آڑ لیں گے کیونکہ امکان تھا کہ اب دونوں طرف باغات میں کوئی نہیں ہوگا۔ آرگون کی طرف سے خطرہ تھا کہ کوئی صرف ہماری نگرانی کے لیے نہ موجود ہو اس لیے ہم پہلے جنوب کی طرف گئے اور جب قلعوں کی زمین کے پاس پہنچے

تو یہاں سے مشرق کی طرف مڑ گئے۔ اس جگہ سے قلعوں کے کھیت اور باغات زیادہ فاصلے پر نہیں تھے جب کہ آرگون کے کھیت ہمارے بائیں طرف شمال میں شروع ہو گئے تھے۔

اسی جگہ سے ہم نے ساشا کو حاصل کیا تھا۔ وہ عجیب لڑکی تھی۔ ہمارے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ساتھ نہیں تھی۔ میں نے اس کی جان بچائی تو اس نے جواب میں کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا، شکریہ ادا کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی تھی۔ مجھے اس کے شکریے کی ضرورت نہیں تھی مگر اس کا یہ رویہ معمولی نہیں تھا۔ شروع میں اس نے میرے بارے میں جس طرح کا ردِعمل دیا تھا اور بے ساختہ اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا تھا اس کے بعد میرا اس کی طرف سے چوکنا رہنا فطری بات تھی۔ میری چھٹی حس رہ رہ کر اشارہ دے رہی تھی کہ وہ جسمانی طور پر ضرور ہمارے ساتھ ہے لیکن اس کا دل و دماغ ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ ابتدائی مخالفانہ ردِعمل کے بعد اس نے پھر کوئی ردِعمل نہیں دیا تھا اور اس کا انداز سپاٹ سا تھا مگر میرے نزدیک یہ اس کے کھلے ردِعمل سے زیادہ تشویشناک تھا۔

ہم قلعوں کی زمین میں داخل ہوئے۔ یہاں کاشت کی جانے والی جنس کاٹ لی گئی تھی۔ مگر دوسری فصلیں ابھی پک رہی تھیں۔ آج یہاں بھی کوئی فرد نظر نہیں آرہا تھا۔ ہم باغوں میں داخل ہوئے تو انہیں بھی خالی پایا۔ اس کے باوجود ہم محتاط تھے کیونکہ اگر سامیرا کی فوج سے سامنا ہوتا تو آرگون کے جنگی لباس کی وجہ سے وہ ہمیں دشمن ہی سمجھتی۔ ہم کوشش کر رہے تھے کہ ایسے مقامات سے گزریں کہ دور سے نظر نہ آئیں۔ ابھی ہم قلعوں سے کوئی تین میل دور تھے کہ ہمیں آرگون کی طرف سے آگے بڑھتی سپاہ نظر آگئی۔ یہ انسانوں کا بہت بڑا ریلا تھا جو سامیرا کے قلعوں کی طرف بڑھ رہا تھا اور ان کی تعداد ہزاروں میں لگ رہی تھی۔ بہت منظم اور پوری طرح مسلح سپاہیوں کے اس ریلے کو دیکھ کر میرے تمام ہی ساتھی سہم گئے تھے۔ ربیک نے کہا۔ ”ایسا لگ رہا ہے ریناٹ نے اپنی پوری قوت سے حملہ کیا ہے۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ میں نے کہا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

”میں سمجھا نہیں جناب۔“

”ریناٹ نے ساری سپاہ باہر بھیج دی ہے اس کا مطلب ہے کہ آرگون اس وقت خالی ہو گا۔“ میں نے وضاحت کی تو ربیک سمجھ گیا مگر اس کی فکر کم نہ ہوئی۔ بہت بڑی تعداد میں جارح فوج کی پیش قدمی کا منظر دیکھنا اور اسے برداشت کرنا آسان نہیں ہوتا ہے، خاص طور سے جب آپ اس حملہ آور فوج کا نشانہ ہوں۔ میں ربیک اور اس کے ساتھیوں کی فکرمندی سمجھ رہا تھا۔ ان کا گھر اور گھر والے داؤ پر لگے ہوئے تھے۔ اگر خدانخواستہ ریناٹ کی فوج کامیاب ہو جاتی تو سامیرا کے لوگ مارے جاتے اور اگر بچ جاتے تو موت سے بدتر غلامی میں مبتلا ہو جاتے۔ وہ آزادی کا مزہ چکھ چکے تھے اور اس صورت میں یہ غلامی ان کے لیے اور بھی اذیت ناک ہوتی۔ انسانوں اور قوموں کو ایسی صورتِ حال کا سامنا رہتا ہے اور وہ صرف حوصلے اور کوشش سے ہی اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

یہاں باغات کے درمیان ایک بڑی سی چٹان تھی۔ کسی وجہ سے اسے یونہی چھوڑ دیا گیا تھا ورنہ اس سارے علاقے کو بہت اچھی طرح ہموار اور پتھروں سے صاف کر دیا گیا تھا۔ چٹان کوئی دس بارہ گز لمبی چوڑی اور کوئی سات گز اونچی تھی۔ میں نے باقی سب کو وہیں رکنے کو کہا۔ صرف ربیک اور ایرٹ کو ساتھ لے کر اس کی طرف بڑھا۔ ہم کوشش کر کے اس پر چڑھ گئے اور اوندھے منہ لیٹ کر ریناٹ کی فوج کا جائزہ لینے لگے۔ اتنی بلندی سے یہ منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ سب سے آگے حسبِ معمول نیزہ بردار تھے۔ ان کی کئی قطاروں کے پیچھے تیر اندازوں کی قطاریں تھیں۔ پھر لشکر کے دوسرے حصے تھے۔ وہ اس وقت آرگون کے کھیتوں اور باغات سے گزر رہے تھے اور انہوں نے فصلوں اور درختوں کو نقصان سے بچانے کے لیے اپنی فوجی ترتیب توڑ دی تھی۔ وہ ان سے بچتے ہوئے چل رہے تھے۔ میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ان کی تعداد کتنی ہے اور مجھے لگا کہ وہ کم سے کم چار ہزار افراد تھے۔

یہاں سے سامیرا کے قلعے اتنے واضح نہیں تھے مگر ایسا لگ رہا تھا کہ وہاں سارے دفاعی اقدامات کر لیے گئے تھے۔ قلعوں کے دروازے بند تھے اور فصیلوں پر تیر انداز موجود تھے۔ آرگون کے سپاہی جس رفتار سے چل رہے تھے ان کو قلعوں کے نزدیک پہنچنے میں مزید ایک گھنٹا لگ سکتا تھا۔ اس وقت تک شام ہو جاتی اور کچھ دیر بعد رات کی تاریکی چھا جاتی۔ تو کیا آرگون کی سپاہ اندھیرے میں حملہ آور ہوتی؟ لیکن اس طرح دن میں سامنے آکر اندھیرے میں حملہ آور ہونے کی تک سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ امکان یہی

تھا کہ حملہ اگلی صبح کیا جائے گا۔ مگر سامیرا اور اس کی فوج کو کسی بھی وقت حملے کے لیے تیار رہنا چاہیے تھے۔ فوج کے عقب میں کسی قدر کھلی جگہ کچھ بڑی چیزیں حرکت کر رہی تھیں۔ مگر وہ اتنی دور تھیں کہ واضح نہیں تھیں۔ ربیک نے مجھے متوجہ کیا۔ ''وہ کیا ہوسکتا ہے؟''

میں نے غور کیا اور مجھے یہ کسی قسم کی مشینری لگی۔ ''میرا خیال ہے یہ تیر برسانے والی یا اسی قسم کا کوئی کام کرنے والی مشین ہے۔''

یہ مشینری خاصی بھاری تھی اور بہت سست رفتاری سے حرکت کر رہی تھی۔ ابھی یہ آرگون کے پاس ہی تھی اور اس رفتار سے اسے سامیرا کے قلعوں تک پہنچنے میں چھ سات گھنٹے درکار تھے۔ میں نے گنا۔ مشینوں کی تعداد ایک درجن سے زیادہ تھی اور یہ زمین سے کوئی چار گز اونچی تھیں اسی وجہ سے اتنی دوری سے الگ نظر آرہی تھیں۔ یہ یقیناً لکڑی سے بنی تھیں اور مجھے فوری آتشیں تیروں کا خیال آیا یہ ان کا آسان شکار بن سکتی تھیں۔ ریناٹ کی فوج کا اکثر ساز وسامان لکڑی کا تھا حد یہ کہ سپاہ کی زرہ بکتر بھی لکڑی کی تھی۔ ایسے میں آگ انہیں بہت زیادہ نقصان پہنچا سکتی تھی۔ میرے ساتھی بھی یہی سوچ رہے تھے۔ ایرٹ نے بھی یہی کہا۔

''آپ نے آتشیں تیروں والا جو حربہ ہمیں سکھایا ہے وہ یہاں بہت کام آئے گا۔ ان کا تو سارا ہی سامان لکڑی کا ہے۔''

''یہ درست ہے اس کے باوجود ہمیں صرف آتشی تیروں پر انحصار نہیں کرنا چاہیے یہ صرف پیش قدمی سست کرنے اور جنگ سے پہلے دشمن کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کی تدبیر ہے۔ اصل جنگ انسانوں کے درمیان ہی ہوگی اور اس میں وہی کامیاب ہوگا جو ثابت قدم رہے گا۔''

انہوں نے ابتدائی خوف کے بعد خود پر قابو پالیا تھا۔ ربیک پرعزم لہجے میں بولا۔ ''ہم ثابت قدم رہیں گے۔ معاملہ ہماری آزادی اور عزت کا ہے۔ ہم آخر تک لڑیں گے۔''

''اب ہمیں کیا کرنا ہے جناب؟'' ایرٹ بولا۔

میں بھی یہی سوچ رہا تھا اور میں نے کہا۔ ''ہمیں دو آدمی آرگون کی فصیل کی طرف روانہ کرنے ہیں جو جائیں اور وہاں کے حفاظتی انتظامات دیکھ کر آئیں۔''

ان کا خیال تھا کہ میں فوری آرگون کی طرف روانہ ہونے کا فیصلہ کروں گا۔ ان کے لیے میرا یہ فیصلہ غیر متوقع تھا۔ مگر ایرٹ نیچے اترا اور اپنے ساتھیوں کے پاس گیا اس نے ان میں سے دو افراد چنے اور انہیں آرگون کی طرف روانہ کیا کہ وہ وہاں کا جائزہ لے کر آئیں۔ وہ آرگون کی مکمل فوجی وردی میں تھے اس لیے اگر کوئی انہیں دیکھ لیتا تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا اس کے باوجود ایرٹ نے انہیں چھپ کر جانے کو کہا۔ باقی آدمیوں کو اس نے آس پاس پھیلا کر چھپنے کو کہا تھا کہ اگر کوئی اچانک خطرہ آجائے تو ہم بے خبری میں شکار نہ ہوں۔ پھر وہ واپس چٹان پر آیا۔ روشنی مدھم ہورہی تھی اور کچھ دیر میں رات آجاتی۔ آرگون کی سپاہ ابھی بھی قلعوں سے دور تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ان کا پلان سکون اور اطمینان سے قلعوں کا محاصرہ کرنے اور اس کے بعد کارروائی کا تھا۔ ریناٹ کی سپاہ کو قطعی جلدی نہیں لگ رہی تھی۔

''مجھے فوری جنگ کے آثار نظر نہیں آرہے۔'' میں نے کہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میرا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے۔ ''ربیک کیا تم سامیرا کے قلعے تک جاسکتے ہو؟''

''بالکل جاسکتا ہوں۔'' اس نے مستعدی سے کہا۔ ''میں قلعے کے عقب میں جاکر رسی کی مدد سے اندر جاسکتا ہوں آرگون والوں کو پتا بھی نہیں چلے گا۔''

''وہ چاروں طرف سے محاصرہ کریں گے۔'' میں نے اسے خبردار کیا۔ ''لیکن ابھی وہ دور ہیں۔ تم جاؤ اور سامیرا تک میرا پیغام پہنچاؤ کہ جنگ میں کسی صورت پہل نہ کی جائے اور دشمن کو نزدیک آنے دیا جائے لیکن ایک بار جنگ شروع ہو تو دفاعی پلان پر پوری طرح سے عمل کیا جائے۔ دوسرے ریناٹ کی فوج میں لکڑی کا سامان بہت زیادہ ہے تیر انداز دستے آتشیں تیروں سے انہیں نشانہ بنائیں۔ یہ پیغام دے کر جلد از جلد واپس آنے کی کوشش کرو۔''

ربیک نے سر ہلایا۔ وہ چٹان سے اترا اس نے جنگی وردی اتار کر سفید کرتا پہنا اور دوڑتا ہوا باغات میں غائب ہوگیا۔ ابھی اس کے پاس دو گھنٹے کا وقت تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ریناٹ کی سپاہ تاریکی چھانے تک قلعوں کے پاس پہنچے گی اور محاصرے کا عمل شاید نصف رات یا صبح کے قریب مکمل ہوگا۔ مگر انہیں تینوں قلعوں کو محاصرے میں لینا ہوگا۔ تینوں قلعوں کے درمیان فاصلہ اتنا کم تھا کہ وہ ان کے درمیان میں نہیں آسکتے تھے انہیں ایک بڑا بیضوی دائرہ بناتے ہوئے تینوں قلعوں کو گھیرنا تھا۔ مجھے امید تھی کہ ربیک یہ کام کرکے

دو گھنٹے میں واپس آجائے گا۔ کچھ دیر میں تاریکی کے آثار نظر آنے لگے اور اس کے ساتھ ہی قلعوں کی طرف مشعلیں روشن کی جانے لگیں۔ ربیک کو بھیجنے کی وجہ یہ تھی کہ کہیں سامیرا کے کمانڈرز اعصاب زدہ ہو کر قبل از وقت جنگ نہ چھیڑ دیں انہیں دشمن کے پوری طرح نزدیک آنے کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔

ریناٹ کی سپاہ تاریکی مکمل ہونے تک قلعوں سے کوئی نصف میل کے فاصلے پر پہنچ گئی اور وہیں رک گئی۔ اس کے بعد اس نے پڑاؤ ڈالنے کا عمل شروع کر دیا۔ وہاں خیمے نصب کیے جا رہے تھے اور قلعوں کی طرف سے کسی حملے کے تدارک کے لیے لکڑی کی بنی نوکدار دیواریں نصب کر رہے تھے۔ یہ تیار دیواریں وہ ساتھ لائے تھے اور اب انہیں صرف ترتیب سے رکھنا تھا۔ مشعلیں نصب کی جا رہی تھیں اور یہ تیز روشنی والی مشعلیں تھیں جن کی روشنی سو گز تک کے علاقے کو منور کر رہی تھیں۔ ایسی ہی مشعلیں قلعوں کی طرف بھی روشن کی جا چکی تھیں۔ اب یہاں خاصی تیز روشنی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر برف والا اوپر سے دیکھ رہا ہو تو اسے میدان جنگ سجتا ہوا دکھائی دے رہا ہو گا۔ اس وادی کے باشندے اپنی تاریخ کے خوفناک ترین معرکے سے دوچار ہونے والے تھے جس میں بہنے والے خون کا ہر قطرہ انہیں ہی کمزور کرتا۔

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے مذہب، قوم اور رنگ و نسل سے قطع نظر انسانوں کے خون کا بہنے والا ہر قطرہ انسانیت کو کمزور کرتا ہے۔ مگر نفس اور شیطان کے پیروکار کب بہنے والے خون کی پروا کرتے ہیں۔ لاکھوں کروڑوں انسانوں کی موت ان کے نزدیک مہنگا سودا نہیں ہوتا اگر ان کا مفاد حاصل ہو جائے۔ ایسا ازل سے ہوتا آیا تھا اور ابد تک ہوتا رہے گا کہ لاکھوں انسان چند افراد کے مفاد یا ہوس اقتدار کی بھینٹ چڑھتے رہیں۔ یہاں پر بھی ریناٹ اور اس کا مفاد پرست ٹولہ ایسا ہی ایک کھیل کھیلنے جا رہا تھا۔ تاریکی پھیلنے کے خاصی دیر بعد ربیک نمودار ہوا۔ اس نے چٹان کے پاس آتے ہی تاریکی میں نمایاں ہونے والا اپنا کرتہ اتار دیا اور آرگون کی سرخ وردی پہن کر اوپر آیا۔ وہ خاصا پُرجوش لگ رہا تھا اور اس نے کہا۔ ”میں نے آپ کا پیغام پہنچا دیا ہے اور سامیرا نے کہا ہے کہ وہ ایسا ہی کریں گی۔ انہوں نے جوابی پیغام دیا ہے کہ جب تک جنگ کا آغاز نہیں ہوتا آپ یہیں ٹھہریں گے۔“

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ ”کیا یہ سامیرا کی ذاتی رائے ہے؟“

”نہیں انہوں نے کہا ہے کہ ان سے کہا گیا ہے کہ آپ کو یہ پیغام پہنچا دیا جائے۔“

میں سمجھ گیا کہ سامیرا کو برف والے کا پیغام آیا ہوگا۔ مگر میں آرگون کی فوج کے اتنے نزدیک خود کو آرام دہ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ لازمی بات تھی پڑاؤ ڈالنے کے بعد ان کے گشتی دستے آس پاس کا معائنہ کرنے کے لیے نکلتے اور وہ اس چٹان تک بھی آتے۔ ہمیں اس سے پہلے پیچھے ہٹ جانا چاہیے تھا۔ مگر یہاں آس پاس ایسی کوئی جگہ بھی نہیں تھی جہاں سے ہم اتنی آسانی سے آرگون کی فوج پر نظر رکھتے۔ اس لیے میں نے پیچھے ہٹنے کے بجائے طے کیا کہ میرے ساتھی آس پاس چھپے رہیں گے اور میں ربیک اور ایرٹ کے ساتھ چٹان پر رہوں گا۔ اگر آرگون کی سپاہ میں سے کوئی اس طرف آیا تو ہم خود کو چھپائیں گے اور اگر ظاہر ہونے لگے تو حملہ کریں گے۔ حملے کا سن کر میرے ساتھی پُرجوش ہو گئے اور اسی وجہ سے چھپ کر پہرہ دینے جیسی مشکل ڈیوٹی پر آمادہ ہو گئے۔

ساشا نیچے تھی اور اسے میں نے باغوں کے درمیان دو ساتھیوں کے ساتھ رکھا تھا۔ میں نے کوشش کی تھی کہ وہ آرگون کی فوج کی نقل و حرکت سے بے خبر رہے لیکن میرے ساتھی آپس میں اس بارے میں بات کر رہے تھے اور وہ سن رہی تھی تو اسے یقیناً علم ہو گیا تھا کہ ہم ریناٹ کی سپاہ کے بالکل نزدیک ہی کہیں موجود ہیں۔ میں نے اس سے ہوشیار رہنے کو کہہ دیا تھا مگر یہ نوجوان اتنے بھی ہوشیار نہیں تھے جتنا کہ ہونا چاہیے تھا۔ وہ اسے ایک عام اور معصوم سی لڑکی سمجھ رہے تھے۔ ان کے خیال میں اس سے ہوشیار رہنے کی خاص ضرورت نہیں تھی۔ بہ ظاہر وہ ایسی ہی تھی۔ مگر اس میں کوئی ایسی بات تھی جو میں اب تک سمجھ نہیں پایا تھا۔ اس لیے میں اس سے ہوشیار رہنا چاہتا تھا۔ نیچے کہیں سونے کی گنجائش نہیں تھی اس لیے سب کے ساتھ وہ بھی جاگ رہی تھی۔ ہم اوپر چٹان پر لیٹے تھے یہ سخت مگر ہموار تھی اور ایسی کھردری جگہیں کم تھیں جو جسم میں چبھے۔

اس لیے موقع غنیمت جان کر ہم اسی پر باری باری آرام کرنے لگے۔ ہر گھنٹے بعد آرام کرنے والوں کی باری بدل جاتی تھی۔ یہ ضروری تھا ورنہ صبح تک ہم سب نیند اور آرام کی کمی سے سست ہو جاتے۔ جو آرام کر لیتے وہ پہرہ

دینے نیچے چلے جاتے تھے۔ ساشا کو بھی آرام کا موقع ملا۔ اس وقت میں اس کے ساتھ تھا۔ وہ ذرا فاصلے پر کسی مجسمے کی طرح ساکت لیٹی ہوئی آسمان کو تک رہی تھی۔ ستارے نکل آئے تھے اور ان کی ہلکی سی روشنی میں آس پاس کسی حد تک نظر آ رہا تھا۔ اس نے اچانک میری طرف کروٹ لی اور بولی۔ ''شہباز ایک بات پوچھوں؟''

''ہاں پوچھو۔''

''تم جس دنیا سے آئے وہاں لوگ اپنے رشتے داروں سے محبت کرتے ہیں۔''

''بالکل اسی طرح جیسے تم لوگ اپنے پیاروں سے کرتے ہو۔''

اس نے کچھ دیر بعد پھر کہا۔ ''اگر وہ ان سے بچھڑ جائیں تو ان کا دکھ ہمیشہ تازہ رہتا ہے؟''

''کیا تمہارے ہاں ایسا ہی ہوتا ہے؟'' میں نے جوابی سوال کیا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔ ''نہیں ہمارے ہاں لوگ کچھ عرصے بعد بھول جاتے ہیں مگر بابا کا غم میرے دل سے نہیں جا رہا ہے، مجھے لگ رہا ہے یہ غم وقت کے ساتھ ساتھ بڑھ رہا ہے۔''

اس نے پہلی بار اپنے بارے میں بات کی تھی۔ میں نے ہچکچا کر وضاحت کی۔ ''شاید اس لیے کہ کیرٹ ہی تمہارا سب کچھ تھا اور اس نے تمہیں پالا۔ اس لیے جب وہ اچانک جدا ہوا تو تم نے بہت زیادہ محسوس کیا۔''

''نہیں میں نے اس لیے زیادہ محسوس کیا کہ بابا اس انجام کے مستحق نہیں تھے۔'' اس نے بھیگے لہجے میں کہا۔ ''وہ اچھے انسان اور بہت اچھے باپ تھے۔''

''بہت سے اچھے انسان اس انجام کے مستحق نہیں ہوتے مگر انہیں اس سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ ان کی تقدیر میں ہوتا ہے۔''

''میں تقدیر کو نہیں مانتی۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

''اور مذہب کو؟''

''مجھے یہ سب دھوکا لگتا ہے۔''

''حالانکہ تم ایک پجاری کی بیٹی ہو۔''

''اسی لیے تو مجھے سب دھوکا لگتا ہے، میں نے سب بہت قریب سے دیکھا ہے۔ مجھے لگتا ہے بابا بھی اسے دھوکا ہی سمجھتے تھے مگر ان کی مجبوری تھی وہ یہ بات کہہ نہیں سکتے تھے۔''

''کیرٹ نے یہ بات دوسری طرح کہہ دی۔ اپنے ساتھیوں اور نظام کے خلاف ہمارا ساتھ دے کر۔''

''نتیجہ کیا ہوا انہیں ذلت سے سزائے موت دے دی گئی۔'' اس کے لہجے میں تلخی آ گئی۔

''ساشا تم کیا سمجھتی ہو کیرٹ کی موت کا ذمے دار میں ہوں؟'' میں نے نرم لہجے میں پوچھا۔ ''حالانکہ میں خود کیرٹ اور برف والے کے ہاتھ میں ایک مہرہ ہوں۔ برف والے نے مجھے کیرٹ کے پاس بھیجا اور اس نے مجھے آرگون کی آزادی کے لیے ایک پلان دے کر سامیرا کی طرف روانہ کیا۔ میں نہیں جانتا کہ اس کے کس آدمی نے غداری کی اور اس کا راز فاش کر دیا۔''

ساشا خاموش رہی اور پھر چت ہو کر لیٹ گئی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ اب مزید گفتگو نہیں کرنا چاہتی۔ کچھ دیر بعد دوسرے کی باری آ گئی اور میں نیچے اتر گیا۔ ایک گھنٹے بعد ساشا بھی نیچے آ گئی تھی۔ اب تک آرگون کی سپاہ کا کوئی دستہ اس طرف نہیں آیا تھا۔ مگر وہ پڑاؤ کے آس پاس منڈلا رہے تھے، اس کا اندازہ مشعلوں کی روشنی سے ہو رہا تھا۔ رات کے آخری پہر سب ہی چوکنا ہو گئے تھے کیونکہ کچھ دیر میں صبح ہونے والی تھی۔ رات میں آرگون کی فوج نے قلعوں کا محاصرہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یہ کام شاید انہوں نے اگلی صبح پر چھوڑ دیا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ قلعوں کی طرف آتے ہوئے جب وہ ہماری طرف کے باغات سے گزر رہے تھے تو انہوں نے فصلوں اور باغوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا وہ اب انہیں مال غنیمت سمجھ رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ سامیرا کی شکست کے بعد یہ کھیت اور باغات بھی ان کے ہوں گے اور یہاں موجود فصلیں اور سبزی و پھل بھی ان کے ہوں گے۔ اس لیے انہیں اجاڑنے اور برباد کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

جیسے ہی صبح کی روشنی نمودار ہوئی ریناٹ کی فوج میں حرکت کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ رات بھر آرام کر کے تازہ دم ہو گئے تھے اور یہ ریناٹ کی حکمت عملی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی تھکی ہاری فوج حملے کا آغاز کرے۔ اسی لیے وہ اس وقت یہاں پہنچی جب رات ہو چکی تھی اور اس نے پڑاؤ ڈال کر اپنے مورچے بنائے اور اب آرام کر کے جنگ کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ دوسری طرف سامیرا کی فوج حملے کے

خوف سے رات بھر جاگتی رہی ہوگی اور اب وہ اتنے تازہ دم نہیں ہوں گے۔ مگر یہ میرا قیاس تھا ممکن ہے سامیرا کے کمانڈرز نے رینانٹ کی حکمت عملی بھانپ لی اور اپنی سپاہ کو بھی رات میں آرام دیا ہو۔ روشنی تیز ہوتے ہی ان کی حرکت میں بھی تیزی آئی تھی اور فوج کے دستے منظم انداز میں نکل کر قلعوں کے دونوں طرف پھیلنے لگے۔ وہ محاصرے کا عمل مکمل کرنے جا رہے تھے۔

جو بھاری مشینیں کل آرگون سے روانہ ہوئی تھیں وہ اب قلعوں کے پاس پہنچ گئی تھیں اور ہمارے اندازے کے عین مطابق یہ تیر پھینکنے والی مشینیں ہی نکلی تھیں۔ انہیں اس ترتیب سے لایا گیا تھا کہ یہ نیم دائرے میں پھیلی ہوئی تھیں اور ان سے تینوں قلعوں کو نشانہ بنایا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ قلعوں کے دروازے توڑنے کے لیے پہیوں والے درخت کے بھاری تنے تھے جنہیں دروازوں تک لے جا کر اتنی زور سے مارا جاتا کہ ان کے قبضے جواب دے جاتے اور وہ کھل جاتے۔ آرگون کی سپاہ تیروں سے بچنے کے لیے بڑی ڈھالوں سے لیس تھی۔ یہ ڈھالیں بھی لکڑی کی بنی ہوئی تھیں۔ رینانٹ کی فوج کے سامان میں لکڑی کی بہتات تھی۔ شاید انہوں نے جنگ میں آگ کو بہ طور ہتھیار استعمال کرنے کا سوچا بھی نہیں ہوگا۔ اگر سامیرا کے تیرانداز آتشیں تیروں کا درست استعمال کریں تو دوبدو جنگ سے پہلے انہیں بہت بھاری نقصان پہنچا سکتے تھے۔

سامیرا اور اس کے لوگ جنگ نہیں چاہتے تھے کیونکہ وہ اور آرگون والے ایک ہی نسل سے تھے۔ ان کا آپس میں لڑنا ذاتی نقصان ہوتا۔ شاید یہ بات سامیرا کی فوج کو کھل کر لڑنے سے روکے مگر مجھے معلوم تھا ایک بار جنگ شروع ہوگئی تو اس کے بعد دونوں طرف سے پوری شدت سے لڑائی ہوگی اور نہ جانے کتنا نقصان ہوگا۔ اس نقصان کو روکنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ جلد از جلد رینانٹ اور اس کے ٹولے کا خاتمہ کر کے آرگون پر قبضہ کر لیا جائے۔ ایک بار آرگون ہمارے قبضے میں آ جاتا تو رینانٹ کی سپاہ اپنی پشت خالی پا کر خود ہتھیار ڈال دیتی۔ میں نے سوچا تھا کہ صبح ہوتے ہی آرگون کی طرف روانہ ہو جاؤں گا مگر برف والے نے جنگ کے آغاز تک یہیں رکنے کو کہا تھا اور میں اس کی بات ماننے پر مجبور تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے ہر حکم کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے اور یہ وجہ آگے چل کر سامنے آتی ہے اس لیے میں اس کی ہدایت سے انحراف نہیں کر سکتا

تھا۔ ویسے بھی یہ میری ذاتی جنگ نہیں تھی اس لیے مجھے اپنی عقل لڑانے کی بجائے برف والے کے حکم کے مطابق ہی عمل کرنا چاہیے تھا۔

سورج بلند ہونے سے پہلے رینانٹ کی فوج نے سامیرا کے تینوں قلعوں کا محاصرہ کر لیا تھا۔ اگرچہ تینوں قلعوں کی حفاظت کے لیے سامیرا کے دستے موجود تھے مگر ربیک کے مطابق دونوں چھوٹے قلعوں کی مکمل آبادی کو مرکزی قلعے میں منتقل کر لیا گیا تھا جیسا کہ پہلے سے طے شدہ تھا۔ اب چھوٹے قلعوں میں کوئی عام فرد نہیں تھا۔ اسی طرح سوائے سپاہیوں کی ضرورت کی رسد چھوڑ کر خوراک کا بڑا حصہ بھی مرکزی قلعے میں منتقل کر لیا گیا تھا۔ قلعوں کی مرمت اور فصیل اونچی کرنے سے ان کی حفاظت میں اضافہ ہوا تھا۔ اب تک دونوں طرف سے خاموشی تھی۔ محاصرے کے دوران کئی بار رینانٹ کی فوج قلعوں کے نزدیک بھی آئی مگر قلعوں کی طرف سے کوئی تیر نہیں چلا تھا۔ سامیرا میری ہدایت کے مطابق صبر سے کام لے رہی تھی۔ رینانٹ کی سپاہ لکڑیوں اور گھاس کے گٹھوں سے بنائی ہوئی آتشیں دیوار سے فاصلے پر تھی۔

کہیں کہیں وہ اس کے نزدیک بھی آئی مگر انہوں نے اس دیوار کو چھیڑا نہیں تھا۔ غالباً وہ اس کا مقصد نہیں سمجھے ہوں گے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ لکڑیوں کے ڈھیر کے نیچے خشک گھاس تھی جو آگ پکڑنے والے روغن سے تر تھی۔ صرف چند آتشیں تیر مارنے کی دیر تھی اور یہ پوری دیوار آگ پکڑ لیتی جسے پار کرنا آگ کا دریا پار کرنے کے مترادف ہوتا۔ اسے آگ لگانے کا سب سے مناسب وقت وہ ہوتا جب حملہ آور فوج کا کچھ حصہ اس کے پار آ جاتا اور باقی اس کے عقب میں ہوتا۔ اس طرح رینانٹ کی فوج دو حصوں میں بٹ کر رہ جاتی۔ میں رینانٹ کی فوج اور اس کی نقل و حرکت کا جائزہ لے رہا تھا۔ ربیک اور ایرٹ پُرجوش ہو رہے تھے انہوں نے کہا۔ ”کیا ہم کچھ نہیں کر سکتے؟“

ان کا اشارہ یقیناً چھاپہ مار کارروائی کی طرف تھا۔ میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ ”فی الحال نہیں، ہمیں دیکھنا اور انتظار کرنا ہے۔“

”ایک تجویز ہے۔“ ایرٹ بولا۔

”کیسی تجویز؟“

”کیوں نہ ہم رینانٹ کے فوج کے عقب میں موجود ان کی فصلوں کو آگ لگا دیں۔“

''اس سے کیا ہوگا؟'' میں نے اس کی تجویز پر غور کرتے ہوئے کہا۔

''ایک تو ان میں افراتفری پھیلے گی کہ شاید ہماری فوج کہیں عقب میں بھی موجود ہے۔ دوسرے ان کا آرگون سے رابطہ بھی ختم ہو جائے گا۔''

''ختم تو نہیں ہوگا لیکن کچھ دیر کے لیے مشکل ضرور ہو جائے گا۔'' میں نے اس کی بات پر غور کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کام ہوگا کیسے؟ فصلیں تو میلوں کے رقبے پر پھیلی ہیں۔''

''ہم کریں گے۔'' ایرٹ میری رضا مندی محسوس کر کے پُرجوش ہو گیا تھا۔ ''ہم دو شاخے جلا کر ان کی مدد سے فصلوں کو آگ لگا دیں گے۔''

''نہیں۔'' میں نے انکار کیا تو اس کا چہرہ اتر گیا۔ ''اس میں بہت زیادہ خطرہ ہے اور یہ کام کرنے والوں کی بہ حفاظت واپسی کی کوئی ضمانت نہیں ہے لیکن.....''

ایرٹ کا چہرہ پھر پُرامید ہو گیا۔ ''لیکن کیا؟''

''تمہاری تجویز اچھی ہے ہم اس پر بعد میں اور دوسرے طریقے سے عمل کریں گے۔''

''کس طرح؟''

اگرچہ مجھے قبل از وقت اپنے پلان بتانے کی عادت نہیں ہے مگر ریبک اور ایرٹ کی تسلی کے لیے میں نے انہیں بتا دیا کہ ہم کس طرح اس پلان پر عمل کریں گے کہ کامیاب بھی رہیں اور ہمیں خطرہ بھی نہ ہو۔ سب سے بڑھ کر وہ اس منصوبے پر عمل کے لیے بہترین وقت ہوگا۔ میں سوچنے کے معاملے میں نارمل انسان ہی ہوں لیکن حالات نے میرے ذہن کی تربیت ایسی کی ہے کہ کسی بھی سچویشن میں کوئی تدبیر بہت سرعت سے میرے ذہن میں آتی ہے۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا اور چند لمحوں میں ایک مکمل منصوبہ میرے ذہن میں آ گیا تھا کہ ہمیں یہ کام کس طرح کرنا ہے، ہمیں خود بھی کوئی خطرہ نہ ہو۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ اس کے لیے تیاری شروع کر دیں۔ کیونکہ جنگ کا آغاز ہوتے ہی ہمیں بھی حرکت میں آ جانا ہوگا اور تب تیاری کا وقت نہیں ہو گا۔ ریبک کچھ نوجوانوں کو لے کر روانہ ہو گیا۔ ساشا بدستور چٹان سے دور درختوں میں تھی۔ ایرٹ کو چٹان پر چھوڑ کر میں نیچے آیا اور ساشا سے کہا۔

''میرے ساتھ چلو۔''

وہ بلا جھجک کھڑی ہو گئی۔ ہم ٹہلتے ہوئے دوسروں سے ذرا فاصلے پر آئے اور میں نے ایک لکڑی لے کر زمین پر آرگون کا نقشہ بنایا۔ یعنی اس کی فصیل جس نے پورے شہر کو گھیرا ہوا تھا اور جو مجھے کیرٹ نے نقشے میں دکھائی تھی اسے زمین پر لکیر سے واضح کیا۔ ساشا غور سے دیکھ رہی تھی اور یقیناً سمجھ بھی رہی تھی۔ نقشہ مکمل کر کے میں نے لکڑی سے اشارہ کیا اور وضاحت سے کہا۔ ''یہ آرگون کی فصیل ہے۔ یہاں اس کا مرکزی دروازہ ہے۔ کیا تم سمجھ رہی ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں میں نے سارا آرگون دیکھا ہوا ہے۔''

''یہ اچھی بات ہے اب تمہیں سمجھنے میں آسانی رہے گی۔ میں شہر کا نقشہ بنا رہا ہوں اگر میں غلطی کروں تو تم بتا دینا۔'' میں نے کہا اور فصیل کے دائرے میں آبادی اور دوسری جگہوں کو واضح کرنے لگا۔ عام آبادی کو الگ کیا اور خاص یعنی امرا کی آبادی کو الگ کیا اس کے ساتھ ہی سرکاری اور پھر شاہی علاقہ تھا۔ سرکاری اور شاہی علاقے کے نزدیک سے معبد تک جانے والی سرنگ شروع ہوتی تھی۔ ساشا غور سے میرا بنایا ہوا نقشہ دیکھ رہی تھی اور میں جو بتا رہا تھا سر ہلا کر اس کی تصدیق کر رہی تھی۔ میں نے اسے تقریباً درست نقشہ بنا کر دکھا دیا۔ چند ایک جگہوں پر میں ناواقفیت کی وجہ سے غلطی کر گیا جو ساشا نے درست کر دی اور جب اس نے تصدیق کر دی کہ یہ درست ہے تو میں نے اس سے پوچھا۔ ''تمہیں کہاں قید رکھا گیا تھا؟''

''اس جگہ۔'' اس نے سرکاری علاقے میں موجود قید خانے والی جگہ اشارہ کیا جہاں میں بھی قید رہا تھا۔

''تم قید خانے کے نگران کا نام اور حلیہ بتا سکتی ہو۔''

اس نے کہا۔ ''میں نام نہیں جانتی مگر وہ بہت لمبا اور مضبوط جسم والا آدمی تھا۔''

اس نے درست بتایا تھا۔ ''تمہاری رہائش شہر میں تھی یا معبد میں؟''

''میں معبد میں پیدا ہوئی اور وہیں پلی بڑھی ہوں۔'' ساشا نے جواب دیا۔ ''لیکن میں آرگون آتی جاتی رہتی تھی۔ بابا جب آرگون آتے تو مجھے ضرور ساتھ لاتے تھے۔''

''تم کبھی شاہی محل یا اس کے آس پاس گئی ہو۔''

اس نے زمین پر بنے نقشے میں انگلی سے ایک جگہ دائرہ کھینچا۔ ''یہ شاہی محل کا حصہ ہے۔ اس کے چاروں طرف اونچی دیوار ہے جسے کوئی پار نہیں کر سکتا۔ دیوار پر ہر

تھوڑے فاصلے پر برج ہیں جن میں ماہر تیر انداز موجود ہوتے ہیں۔ چار دیواری کے اندر بھی سخت پہرہ ہوتا ہے اور کوئی نظروں میں آئے بغیر دو قدم بھی نہیں جا سکتا۔''

''تم یہاں جا چکی ہو تم نے یہاں کتنے سپاہیوں کو دیکھا ہے؟''

''بے شمار۔'' اس نے کہا۔ ''آخری بار میں دو مہینے پہلے گئی تھی اور تب وہاں بہت زیادہ پہرہ ہو گیا تھا، قدم قدم پر سپاہی موجود تھے۔''

میں غور کر رہا تھا۔ شاہی محل کا دائرہ سرنگ کے دہانے سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا مگر یہ تھوڑا سا فاصلہ یقیناً دنیا کے دشوار ترین فاصلوں میں سے ایک تھا۔ میں نے اس سے شاہی محافظوں کا حلیہ پوچھا۔ اس نے بتایا۔ ''خاص فوج کے سپاہی سرمئی رنگ کے چھوٹے کرتے اور اسی رنگ کا پاجامہ پہنتے ہیں یہ سب سے الگ لباس ہے اور کسی کو یہ رنگ استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''تم شاہی احاطے میں موجود عمارتوں کی وضاحت کر سکتی ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''یہاں نصف درجن عمارتیں ہیں۔'' اس نے دائرے میں ان کی پوزیشن واضح کرنا شروع کر دی۔ ''وسط میں شاہی محل ہے۔ اس کے عقب میں بڑا سا تالاب ہے۔ تالاب کے پار ملازموں اور ضروری سرکاری حکام کے لیے رہائش ہے۔ یہاں ان کے لیے دو عمارتیں ہیں ایک عام ملازموں کے لیے اور دوسرے حکام کے لیے۔'' اس نے اب سامنے کی طرف کھلے میدان کے دائیں طرف ایک عمارت کی نشان دہی کی۔ ''یہاں شاہی محافظ ٹھہرتے ہیں۔ مگر کسی کو خاندان ساتھ رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس کے سامنے میدان کے پار شاہی تقریب گاہ ہے اور اس کے برابر میں دربار ہے۔''

مجھے یاد تھا کہ مجھے اسی عمارت میں ریناٹ کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ مگر میں نے یہ علاقہ اس طرح سے نہیں دیکھا تھا کہ پورا میرے ذہن میں محفوظ ہو جاتا۔ ساشا نے بہت اچھی طرح سے وضاحت کر دی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ ''کیا تم یہاں حملہ کرنا چاہتے ہو؟''

''اگر ممکن ہوا تو۔'' میں نے کہا۔

''یہ ناممکن ہے یہاں کوئی نہیں گھس سکتا ہے۔''

''انسان جب تک کوئی کام کر نہ لے اسے ممکن یا ناممکن نہ کہے۔ بعض اوقات بہت آسان نظر آنے والا کام بھی ممکن نہیں ہوتا اور بعض اوقات ناممکن نظر آنے والا بھی ممکن ہو جاتا ہے۔'' میں نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ صبح سے اب تک کسی نے کچھ نہیں کھایا تھا اور سب کو بھوک لگ رہی تھی اس لیے سب پیٹ پوجا میں لگ گئے۔ ربیک اور اس کے ساتھ گئے نوجوان جب اپنا کام کر کے لوٹے تو انہوں نے بھی ناشتا کیا۔ ہمارے پاس خاصا پانی تھا۔ اس سے ہم آرام سے دو تین دن گزارا کر سکتے تھے، بہ شرط کہ اسے منہ ہاتھ دھونے میں ضائع نہ کرتے۔ اس عیاشی سے سب گریزاں تھے ورنہ انہیں جا کر بہت دور سے پانی لانا پڑتا۔ ایرٹ جو چٹان پر اب تک نگرانی کر رہا تھا میں اس کے پاس آیا تو اس نے رپورٹ دی۔

''دونوں طرف سے جنگ کے آثار نظر نہیں آرہے۔ خاص طور سے ریناٹ کے کیمپ میں بہت ٹھنڈ ہے۔''

اب تک ریناٹ کی فوج کا جتنا جائزہ لیا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اپنی ساری قوت میدان میں لے آیا تھا۔ مگر دشمن کے بارے میں ہمیشہ یہ سوچنا چاہیے کہ اس کے پاس کوئی حیران کر دینے والا حربہ ہوگا۔ ریناٹ کے پاس ڈیوڈ شا اور اس کے ساتھیوں کی صورت میں ایک حربہ تھا تو۔ خاص طور سے باسوا اس جنگ میں اکیلا ہی بہت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اگر وہ مرشد کی درگاہ پر ہونے والے حملے کی طرح سر سے پاؤں تک بلٹ پروف اور اپنے خاص ہتھیاروں کے ساتھ میدان میں آ جاتا۔ اگر وہ یہ سب نہیں لایا تھا تب بھی عام ہتھیاروں کے ساتھ وہ، کرنل اور زینی بہت بڑی قوت تھے۔ ایک بار پھر مجھے اپنے ہتھیاروں کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ اگر برف والا کسی طرح سے یہ ہتھیار مجھ تک پہنچا دیتا تو میں نسبتاً آسانی سے ریناٹ تک رسائی حاصل کر سکتا تھا۔ مگر اس نے نامعلوم وجوہات کی بنا پر یہ ہتھیار اپنے پاس رکھ لیے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اسے ڈیوڈ شا اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ کتنے خطرناک ہو سکتے تھے۔ بہر حال میں سوائے صبر کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

ریناٹ کی فوج اپنی جگہ جم کر بیٹھ گئی تھی اور ایسا لگ رہا تھا اس کا فی الحال جنگ کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اس کے سپاہی عمومی قسم کے کاموں میں مصروف تھے اور کہیں کہیں وہ آپس میں لڑنے کی مشق بھی کر رہے تھے مگر مجموعی طور پر ماحول بہت ٹھنڈا تھا۔ حد یہ کہ انہوں نے آس پاس کسی ممکنہ دشمن کی تلاش میں دستے بھی نہیں بھیجے تھے۔ وہ اپنے پڑاؤ کی

حد سے بہت کم باہر نکلتے تھے جیسے رفع حاجت یا دوسرے کاموں کے لیے اور پھر جلد واپس چلے جاتے۔ شام تک ان کا رویہ یہی رہا تو مجھے ایک خیال ستانے لگا اور میں نے ربیک و ایرٹ کے ساتھ ایک میٹنگ بلائی۔ ''مجھے لگ رہا ہے انہوں نے قلعوں کا محاصرہ ضرور کیا ہے لیکن یہ جنگ لڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔''

ربیک حیرت سے بولا۔ ''تب یہ یہاں کیوں آئے ہیں؟''

''قلعے والوں کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرنے کے لیے۔''

''وہ کیسے؟'' ایرٹ نے پوچھا۔

''وہ محاصرہ کر کے بیٹھ گئے ہیں۔ ریناٹ کی تیاری مکمل تھی اور وہ چاہتا تو ایک مہینا یا کئی مہینے پہلے بھی جنگ چھیڑ سکتا تھا مگر اس کا مقصد جنگ کرنا نہیں ہے۔''

''پھر کیا مقصد ہو سکتا ہے؟'' ربیک بے صبری سے بولا۔ ''معاف کیجیے گا آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی۔''

''دیکھو یہ فصل پکنے کا وقت ہے۔ کیا فصلیں کچھ دنوں میں تیار نہیں ہو جائیں گی؟''

''ایسا ہی ہے۔'' ربیک نے تسلیم کیا۔

''قلعوں میں گزشتہ فصل کا باقی رہ جانے والا حصہ ہے یعنی خوراک محدود ہے۔ دوسری طرف فصل پکتے ہی آرگون والے اسے کاٹنا شروع کر دیں گے اور سارا اناج آرگون چلا جائے گا۔''

ایرٹ اور ربیک کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ایرٹ بولا۔ ''آپ کا مطلب ہے ریناٹ اناج اپنے قبضے میں لینا چاہ رہا ہے تاکہ ہمیں بھوکا مار سکیں؟''

''بالکل، تم سوچو ایک بار اناج آرگون چلا گیا تو ایک یا ڈیڑھ مہینے بعد قلعوں میں خوراک کی کیا حالت ہوگی۔ دس ہزار افراد کی خوراک کہاں سے پوری ہوگی۔ جب خوراک نہیں ہوگی تو بھوکے سپاہی کیسے لڑیں گے؟''

صورتِ حال ان کی سمجھ میں آرہی تھی۔ ربیک نے ریناٹ کی سپاہ کے پڑاؤ کی طرف دیکھا۔ ''یہ اسی لیے آرام سے بیٹھے ہیں؟''

''میرا اندازہ یہی ہے کہ یہ ہمیں محاصرے سے اور فاقوں سے مجبور کر کے ہتھیار ڈلوانے آئے ہیں۔ اگر محصور لوگ قلعے سے نکل کر ان پر حملہ کریں گے تو یہ آسانی سے اس حملے کو ناکام بنا سکتے ہیں۔ ہماری نسبت ان کے پاس فوج بہت زیادہ ہے۔''

ایرٹ پریشان ہو گیا۔ یہ تصور ہی خوفناک تھا کہ کچھ عرصے بعد مرکزی قلعے میں موجود اس کے گھر والے دوسرے لوگوں کی طرح فاقہ کشی پر مجبور ہوں گے اور اگر انہوں نے ہتھیار ڈال دیے تو ریناٹ کی طرف سے کسی اچھے رویے کی امید نہیں تھی۔ یہ سب خیالات مجھے بھی آرہے تھے جیسے جیسے میں غور کر رہا تھا میرا یقین پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ ریناٹ کی اصل حکمتِ عملی یہی ہے۔ مگر مجھے اس چیز سے دھچکا نہیں لگا تھا۔ بلکہ اس لحاظ سے یہ اچھا ہوا تھا کہ ہم بہت جلد دشمن کی حکمتِ عملی بھانپ گئے تھے۔ اب ہمیں اس کا تدارک کرنا تھا۔ ہر آزمائش اپنے ساتھ امکانات بھی لاتی ہے مگر مصیبت زدگان کا دھیان اس طرف نہیں جاتا ہے۔ یہ انسانوں کا عمومی رویہ ہے۔ جو لوگ مشکلات سے آگے نکلنے کے راستے تلاش کرتے ہیں بالآخر وہی کامیاب رہتے ہیں۔ کامیابی ان کے لیے ہے جو ''کیوں؟'' کے بجائے ''کیوں نہیں'' پر یقین رکھتے ہیں۔ میں نے ان دونوں کو دیکھا۔

''تم فکر مت کرو ہم ریناٹ کی اسی حکمتِ عملی سے اس کی شکست کا طریقہ تلاش کرلیں گے۔''

''وہ کیسے جناب؟''

''اس کا تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ پہلے تم لوگ یہ بتاؤ کہ میں نے جو کام دیا تھا اس کا کیا کیا؟''

''بہت حد تک مکمل ہو گیا ہے۔'' ربیک نے کہا۔ ''میرے ساتھ آیئے۔''

ہم چٹان سے اتر کر باغ میں آئے جہاں ایک طرف قطار سے تیر رکھے تھے اور ان کی نوک سے ذرا اوپر گھاس اور باریک سوکھی بیلوں کی مدد سے ایک پولا سا بنایا ہوا تھا۔ اس کی موٹائی تین چار انچ تھی۔ میں نے تجربے کے طور پر اسے جلا کر دیکھا اور خشک گھاس اور جھاڑیوں نے فوری آگ پکڑ لی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ یہ کتنی دیر جلتی ہیں۔ میں نے تیر کو زمین میں گاڑ دیا تھا۔ پولا تقریباً دو منٹ جلتا رہا اور پھر راکھ ہونے لگا اس دوران میں تیر کی لکڑی نے آگ پکڑ لی تھی۔ پولے سے نکلنے والے شعلے بڑے حجم کے تھے اور یہ آس پاس آگ لگا سکتے تھے۔ اس کی کارکردگی سے مطمئن ہو کر میں نے ربیک سے کہا۔ ''ان کی تعداد کم ہے ہمیں کم سے کم تین گنا زیادہ تعداد میں آتشیں تیر درکار ہیں۔''

ربیک اور اس کے ساتھیوں نے دو درجن تیر بنائے

تھے۔ ہم سب کے پاس کمانیں اور ترکش میں تین تین درجن تیر تھے۔ اس لحاظ سے ہمارے پاس تیروں کی تعداد تسلی بخش تھی۔ ربیک نے سر ہلایا۔ ''میں ابھی شروع کر دیتا ہوں۔''

''دوسرے ہمیں آگ لگانے والے روغن کی ضرورت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ کہاں سے ملے گا؟''

''میں جانتا ہوں یہ کہاں سے ملے گا۔'' ایرٹ نے آگے آ کر کہا۔ ''میں لے کر آتا ہوں لیکن مجھے چھ ساتھیوں کی ضرورت ہو گی اور روغن جمع کرنے کے لیے مشکیزے بھی چاہییں۔''

ہمارے پاس پانی کے دو درجن مشکیزے تھے جن میں سے چھ خالی ہو گئے تھے بلکہ پانچ خالی تھے اور چھٹے میں کچھ پانی تھا جوان کے حوالے کر دیا کہ جب پیاس لگے تو پی کر ختم کر دینا۔ ایرٹ نے کہا۔ ''اس کام میں دیر ہو سکتی ہے کیونکہ روغن والے پودے جنوب مغرب میں وادی کی دیوار کے ساتھ لگے ہیں۔ ویسے تو یہ پوری وادی میں ملتے ہیں لیکن سب سے زیادہ وہیں پائے جاتے ہیں۔''

میں نے اندازہ لگایا کہ وہ آج واپس نہیں آسکیں گے۔ اس لیے میں نے انہیں جانوروں سے بچانے والا محلول بھی ساتھ لے جانے کو کہا اور انہوں نے خوراک بھی ساتھ لے لی تھی۔ اس طرف پانی تھا اس لیے انہیں مزید پانی ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ روانہ ہوئے تو تاریکی چھانے والی تھی۔ ایرٹ چھ نوجوان ساتھ لے گیا تھا اس لیے اب یہاں ربیک اور مجھ سمیت کل چھ افراد تھے اور ساتویں ساشا تھی۔ وہ ربیک سے محو گفتگو تھی۔ میں نے ربیک اور دوسروں سے کہا تھا کہ وہ اس سے بات کرتے رہا کریں تاکہ وہ خود کو الگ سے محسوس نہ کرے مگر ساتھ ہی اس کی طرف سے چوکنا بھی رہیں۔ تاریکی ہوتے ہی قلعوں اور پڑاؤ میں وہی تیز روشنی والی مشعلیں جلا لی گئی تھیں۔ ان کی وجہ سے آس پاس کا علاقہ بھی منور ہو رہا تھا۔ اگر ہم ایک آدھ مشعل جلا لیتے تو شاید کسی کو پتا بھی نہیں چلتا مگر میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ دور سے آنے والا روشنی کا انعکاس ہمارے لیے کافی تھا۔

رات کے لیے وہی سسٹم تھا کہ سب ایک ایک گھنٹے آرام کریں۔ سب کو دو تین بار سونے کو مل جاتا تھا۔ ایک گھنٹے کا وقت اس لیے تھا کہ آدمی آرام بھی کر لے اور ہوشیار بھی رہے۔ طویل نیند اسے سست کر دیتی اور یہاں سستی کی گنجائش نہیں تھی۔ کل چھ افراد تھے اس لیے دو آرام کرتے اور باقی چار پہرہ دیتے۔ نصف رات کو ساشا اور میری باری آئی۔ ہم چٹان پر آ کر لیٹے، وہ مجھ سے ذرا فاصلے پر تھی۔ ساشا کچھ دیر تو ساکت لیٹی رہی پھر اس نے گزشتہ رات کی طرح میری طرف کروٹ لی اور بات شروع کی۔ ''تم سوچتے ہو گے کہ میں کیسی لڑکی ہوں؟''

''کس حوالے سے؟''

''تم نے میری جان بچائی مگر میں نے تمہارا شکریہ ادا تک نہیں کیا۔''

''اس کی ضرورت بھی نہیں تھی میں اگر اپنے کسی ساتھی کے لیے کچھ کرتا ہوں تو شکریے کے لیے نہیں کرتا۔ اس یقین کے ساتھ کرتا ہوں کہ ضرورت پڑنے پر وہ بھی میرے لیے ایسا ہی کرے گا۔''

ساشا خاموش ہو گئی۔ شاید اسے میری بات ہضم نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے وہ مزید گفتگو کے بجائے سونے کی کوشش کرنے لگی اور کچھ دیر بعد اس کی سانسوں سے خرخرانے جیسی آوازیں آئیں تو میں بھی سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی کوشش میں کسی وقت آنکھ لگ گئی۔ مگر میں زیادہ دیر نہیں سویا تھا۔ میری آنکھ کھلی تو ساشا چٹان پر نہیں تھی۔ وہ نیچے اتری تھی۔ جب ساشا خاموش ہو کر سونے لگی تو میں نے محسوس نہیں کیا تھا کہ اس کا ارادہ کچھ اور ہے۔ اس نے بہت ہوشیاری سے مجھے دھوکا دیا تھا۔ میں نے چٹان سے جھانک کر ربیک کو پکارا۔ ''ساشا نیچے آئی ہے۔''

ربیک پاس ہی تھا۔ ''نہیں جناب۔''

اس جواب نے میری رہی سہی نیند بھی اڑا دی تھی۔ میں تیزی سے نیچے آیا اور دوسروں سے پوچھا مگر کسی نے ساشا کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ غائب تھی اور اپنی مرضی سے غائب ہوئی تھی۔ میں نے ربیک سے کہا۔ ''اسے تلاش کرو۔ دو دو کر کے نکلنا۔''

ربیک اور دوسرے اس کو تلاش کرنے میں لگ گئے اور میں دوبارہ چٹان پر چڑھا۔ چٹان کا اگلا حصہ بہت مشکل تھا اور اس سے چڑھنا یا اترنا دشوار تھا مگر ساشا چٹانوں پر چڑھنے کی ماہر تھی۔ میرے ذہن میں نہیں آیا کہ وہ اس طرف سے بھی آرام سے اتر سکتی ہے۔ میں آس پاس دیکھ رہا تھا۔ پڑاؤ کی طرف سے روشنی آس پاس کے باغوں اور کھیتوں کو بھی منور کر رہی تھی۔ میں وہیں دیکھ رہا تھا کہ ایک جگہ مجھے تیار فصل ہلتی نظر آئی جیسے اس میں کوئی ہو اور وہ پڑاؤ کے متوازی چل رہا تھا۔ میں چند لمحے دیکھتا رہا۔ یہ جگہ چٹان

سے کوئی دو سو گز کے فاصلے پر تھی اور پڑاؤ سے اس کا فاصلہ زیادہ تھا۔ میں نیچے اترا اور اپنے ہتھیار سنبھالتا ہوا تیزی سے اس طرف روانہ ہو گیا۔ میں اس طرف جا رہا تھا جس طرف فصل میں چلنے والا جا رہا تھا۔ اگر وہی ساشا تھی تو چند منٹ بعد وہ اس کھیت سے آگے ایک باغ میں نکلتی اور میں اس کے نکلنے سے پہلے وہاں پہنچ جانا چاہتا تھا۔

میں کھلی جگہ سے گیا تھا اور مجھے چھپنے کا مسئلہ نہیں تھا اس لیے میری رفتار بہت تیز تھی اور میں چند منٹ میں اس باغ کے پاس پہنچ گیا۔ میں باغ میں داخل ہوا تھا کہ فصل سے ایک سفید ہیولہ نکل کر بہت تیزی سے درختوں کے درمیان گیا۔ یہاں بھی درخت قطاروں کی صورت میں تھے اگر میں اس کی طرف جاتا تو وہ لازمی دیکھ لیتی۔ سفید لباس دیکھتے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ساشا تھی۔ میں نے جھانک کر اگلی قطار میں دیکھا تو وہ اگلی قطار میں جا رہی تھی میں نے تیزی دکھائی اور اس سے پہلے کہ وہ دوسری قطار سے نکلتی میں تیسری قطار کے سرے پر پہنچ گیا تھا۔ پھر اسے آگے بڑھتے دیکھ کر میں اس بار چوتھی اور پانچویں قطار عبور کر کے چھٹی تک آیا اور یہاں سے باغ میں داخل ہو گیا۔ مگر وہ اب بھی دور تھی وہ پہلے مجھے دیکھ لیتی اور میں یہی نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے میں اس سے اگلی قطار کے ایک درخت کے پاس کھڑا ہوا اور جیسے ہی وہ نمودار ہوئی میں نے اسی طرح لپک کر بہت تیزی مگر خاموشی سے کئی قطاریں پاس کیں اور پھر آگے بڑھا۔ میں نے تعین کر لیا تھا کہ وہ کس درخت سے نکلے گی میں اسی کے پاس کھڑا ہوا اور جیسے ہی وہ نکلی میں نے نیزہ اس کی گردن پر رکھ دیا تھا۔ وہ ساکت ہو گئی۔

''بس حرکت مت کرنا۔''

''ورنہ تم مجھے مار دو گے۔'' وہ آہستہ سے بولی۔ ''مار دو۔''

''میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا۔'' میں نے کہا۔ ''میں اور میرے ساتھی تمہارے دشمن نہیں ہیں۔''

''لیکن میں تم لوگوں کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔''

''آخر کیوں؟''

''اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے لیکن تم جا کہاں رہی تھیں؟''

''آرگون۔''

''تمہیں پتا ہے وہاں تمہارے دشمن بیٹھے ہیں۔''

''میرے ہمدرد بھی ہیں۔''

''مگر ان ہمدردوں تک پہنچنے کے لیے تمہیں ریناٹ کے پہریداروں کے سامنے سے گزرنا پڑے گا اور کیا وہ تمہیں جانے دیں گے؟''

اس سوال کا بھی اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے ضدی لہجے میں کہا۔ ''میں جاؤں گی مجھے جانے دو۔''

''میں نے تمہارے باپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہارا تحفظ کروں گا اور جب یہاں سے جاؤں گا تو تمہیں بھی لے جاؤں گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں یہاں سے جا سکوں گا یا نہیں مگر میں تمہارے باپ سے کیا ہوا یہ وعدہ پورا کر سکتا ہے۔ میں تمہیں کوئی ایسا کام کرنے کی اجازت نہیں دوں گا جس سے تمہیں نقصان پہنچے۔''

وہ آگے بڑھی تو میں نے اس کا بازو پکڑ کر اسے گھمایا اور اس کے پشت سینے سے لگاتے ہوئے ایک بازو سے اس کی گردن دبوچ لی۔ یہ ضروری تھا کیونکہ اگر بے بس کرنے کے دوران وہ ایک چیخ مار دیتی تو ریناٹ کی سپاہ کا پڑاؤ یہاں سے بہت فاصلے پر نہیں تھا۔ مگر اس نے چیخ مارنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ وہ مچلنے لگی اور گھٹی آواز میں بولی۔ ''مجھے جانے دو...... اس میں تمہاری بہتری بھی ہے۔''

لیکن میں نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی اور اپنے بازو کا دباؤ اس حد تک بڑھایا کہ اس کا مچلتا ہوا بدن ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ میں نے بازو ہٹا کر اسے سنبھالا اور اٹھا کر شانے پر ڈال لیا۔ چٹان تک واپس آیا تو ربیک اور اس کا ساتھی آ گئے تھے باقی تین ابھی تک نہیں آئے تھے۔ ربیک کو ساشا کو دیکھ کر سکون کا سانس لیا۔ ''یہ آپ کو کہاں ملی؟''

''یہ آرگون کی طرف جا رہی تھی۔'' میں نے ساشا کو زمین پر لٹا دیا۔ ''اس کے ہاتھ پیچھے کر کے باندھ دو اور منہ پر بھی کپڑا باندھ دو۔ اب اس پر ذرا بھی بھروسا نہیں کرنا ہے۔''

ربیک نے میرے حکم کی تعمیل کی۔ اس نے ساشا کو باندھ دیا۔ میں نے اس کی نبض دیکھ لی تھی وہ سست تھی مگر اسے کوئی خطرہ نہیں تھا میں نے بس اتنی گردن دبائی تھی کہ وہ بے ہوش ہو جائے۔ کچھ دیر میں باقی تین بھی دھکے کھا کر آ گئے کیونکہ ساشا تو اب یہاں تھی۔ ایرٹ اور دوسرے اب اگلے دن ہی آتے۔ صبح دور تھی اس لیے میں ایک بار پھر سو گیا۔ ایک گھنٹے بعد اٹھ گیا۔ یہاں گھڑی نہیں تھی مگر اس کے

بغیر وقت کا حساب کرنا رفتہ رفتہ آگیا تھا۔ مسلسل بیکاری سے جسم جیسے بندھ سا گیا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ کوئی سرگرمی ہونی چاہیے۔ صبح کے قریب میں نے ربیک سے کہا۔ ”آؤ ذرا قلعوں کے پیچھے دشمن کی موجودگی کا جائزہ لے کر آتے ہیں۔“

قلعوں کے سامنے موجود اصل پڑاؤ کے علاوہ رینانٹ کی فوج نے عقب میں بھی پڑاؤ بنایا تھا اور یہاں سے نکل کر ان کے گشتی دستے ایک مخصوص دائرے میں پہرہ دیتے تھے کہ کوئی قلعوں سے نکل نہ سکے اور نہ باہر سے قلعوں میں جاسکے۔ ہم اس دائرے سے خاصے فاصلے سے گزرتے ہوئے قلعوں کے پیچھے آئے اور یہاں کا پڑاؤ پہلی بار دیکھا۔ یہاں بھی حفاظتی انتظامات مکمل تھے۔ مگر یہاں فوج کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ یہاں ان کو خطرہ بھی زیادہ نہیں تھا۔ کیونکہ سامیرا کی فوج اگر قلعے سے نکل کر ان تک آنے کی کوشش کرتی تو سامنے والوں کو پہلے ہی علم ہوجاتا۔ محاصرہ مکمل تھا اور اس میں رخنے کی گنجائش نہیں تھی۔ ربیک نے کہا۔ ”اب اگر ہم قلعے تک جانا چاہیں تو نہیں جاسکتے۔“

میں سوچ رہا تھا کہ اگر میں سامیرا تک کوئی پیغام پہنچانا چاہوں تو اس کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی کیونکہ جو میں کرنے جارہا تھا۔ اس کے ساتھ قلعے کی طرف سے ردعمل ضروری تھا۔ ورنہ صرف میرا عمل کام نہیں آتا۔ مگر یہاں قلعوں کے اندر تک رسائی کے آثار نہیں تھے۔ میں نے ربیک سے اتفاق کیا کہ محاصرہ نہایت مکمل تھا اور قلعے تک جانے یا وہاں سے کسی کے باہر آنے کی گنجائش نہیں تھی۔ رات میں بھی دونوں طرف سے بہت زیادہ روشنی کی جاتی تھی اور کوئی بلی کا بچہ بھی چھپ کر جا نہیں سکتا تھا۔ محاصرے کا معائنہ کرکے ہم واپس آئے تو ساشا ہوش میں آگئی تھی اور خاموش لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے لیکن اس رویے پر تم نے مجھے مجبور کیا اگر تم وعدہ کرو کہ چیخو چلاؤ گی نہیں تو میں تمہارا منہ کھول دیتا ہوں۔“

وہ کچھ دیر مجھے گھورتی رہی پھر اس نے اثبات میں سر ہلایا اور میں نے اس کے منہ پر بندھا ہوا کپڑا ہٹا دیا۔ اس نے گہری سانس لی اور بولی۔ ”مجھے پیاس لگی ہے۔“

میں نے سہارا دے کر اسے بیٹھنے میں مدد دی اور پھر ایک چھاگل کھول کر اس کے منہ سے لگائی اور اس نے چند گھونٹ لے کر منہ ہٹا دیا۔ میں نے چھاگل واپس رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”اب تم بتاؤ گی کہ تمہارے ذہن میں فرار کا اور آرگون جانے کا خیال کیوں آیا؟“

”تم نے مجھے روک کر اچھا نہیں کیا۔“ وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ ”تم پچھتاؤ گے۔“

”مجھے پچھتانے کی عادت ہے۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ”لیکن تم بھول جاؤ کہ اب تم کو آزادی دی جائے گی یا تم پر اعتبار کیا جائے گا۔“

”میں نے تم لوگوں سے نہیں کہا کہ مجھ پر اعتبار کرو تم لوگوں نے زبردستی مجھے اپنے قبضے میں کیا ہوا ہے۔“

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”ہم نے تمہیں ان سپاہیوں کے چنگل سے نکالا جو تمہاری عزت کے درپے تھے۔“

”لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم مجھے اپنے قبضے میں کرلو۔“ اس نے ہٹ دھرمی سے کہا۔ ”کیا میں تمہاری قیدی ہوں جو تمہاری مرضی کے بغیر کہیں جا نہیں سکتی۔“

”تم ایک نادان لڑکی ہو جسے اپنے نفع نقصان کا خیال بھی نہیں ہے۔ مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ تم گیرٹ جیسے ذہین آدمی کی اولاد ہو۔“

بابا کے نام پر اس کے چہرے پر غم آلود غبار پھیل گیا۔ اس نے بھرائے لہجے میں کہا۔ ”بابا کا نام مت لو...... مجھے صرف ان ہی کا خیال ہے ورنہ......“ وہ بولتے ہوئے رکی اور پھر کہا۔ ”شہباز مجھے جانے دو یقین کرو اسی میں تمہارا بھلا ہے۔“

وہ سمجھنے والی چیز نہیں تھی۔ میں نے دوبارہ اس کا منہ کپڑے سے بند کیا اور اس کے پاس سے اٹھ آیا۔ ربیک کچھ فاصلے پر بیٹھا ہوا ہماری باتیں سن رہا تھا میں اس کے پاس آیا تو اس نے کہا۔ ”جناب آپ بلاوجہ اس سے سر کھپا رہے ہیں یہ سمجھنے والی چیز نہیں ہے۔ ہم بیکار میں اسے ساتھ لائے اور اب اٹھائے اٹھائے گھوم رہے ہیں۔“

”تم فکر مت کرو بیکار چیزوں کا مصرف نکال لینا مجھے آتا ہے۔“ میں اس کے پاس ہی بیٹھ گیا اور اس سے پہلے وہ ساشا پر بحث کرکے میرے دماغ کی دہی کرتا میں نے موضوع بدل دیا۔ ”ایرٹ ابھی تک واپس نہیں آیا ہے۔“

”روغن جمع کرنا آسان کام نہیں ہے اس میں بہت محنت اور وقت لگتا ہے۔“

”تبھی اسے دیر ہو رہی ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”یہ کام جتنی جلدی ہوجائے اتنا اچھا ہے۔“

اس سفر کے دوران ہم لوگوں نے کھانے کا معمول

ترک کر دیا تھا اور اس وقت کھاتے تھے جب بھوک لگتی جسے بھوک لگتی وہ کھا لیتا تھا۔ پکانے کا موقع نہیں تھا اس لیے سارا ہی کام خشک اور کچی چیزوں سے چل رہا تھا۔ دو دن سے ہم بے سروسامان اور ویرانے میں بنا کسی آرام کے زندگی گزار رہے تھے۔ ہماری آنے والی آزمائش کے لیے یہ اچھی تیاری تھی۔ ایرٹ اور اس کی پارٹی شام کے قریب آئی تھی۔ مگر وہ کامیاب لوٹے تھے ان کے پاس سات عدد مشکیزوں میں آتش گیر روغن بھرا ہوا تھا۔ ایک مشکیزے میں بیس لیٹر روغن موجود تھا اس لحاظ سے یہ کوئی ایک سو چالیس لیٹر بن رہا تھا جو بظاہر کافی تھا۔ مگر ہم نے جس رقبے کو نذر آتش کرنا تھا وہ بھی خاصا بڑا تھا۔ ہمیں فصلوں کو آگ لگانی تھی اور یہ فصلیں کم سے کم چار مربع میل کے رقبے پر پھیلی ہوئی تھیں۔ تقریباً اس سے نصف رقبہ باغات کا تھا اور اتنے ہی رقبے پر سبزیاں لگی ہوئی تھیں۔

مگر باغات ہمارا نشانہ نہیں تھے، ہمیں صرف فصلوں کو آگ لگانی تھی۔ ایک تو ان میں آسانی سے آگ لگ جاتی دوسرے اسے پھیلنے سے روکنا ممکن نہیں تھا۔ جہاں جہاں آرگون اور سامیرا کے قلعوں کی زمینیں آپس میں مل رہی تھیں ان میں درمیان میں نو مینز لینڈ تھے۔ اس لیے اس کا امکان نہیں تھا کہ آگ سامیرا کی فصلوں تک آجائے گی۔ ہاں اگر ریناٹ کی سپاہ جوابی کارروائی کے طور پر اس طرف کی فصلوں کو آگ لگانے کی کوشش کرتی تو ہم اسے روک نہیں سکتے تھے۔ آگ لگانے کے لیے ہمیں آرگون کے پاس جانا تھا کیونکہ فصلوں کا بڑا رقبہ وہیں تھا۔ اس طرف باغات کے ساتھ چھوٹے کھیت تھے۔ ان میں کھیت اور باغات آپس میں ملے ہوئے تھے۔ ربیک آرگون کے کھیتوں کے نقشے سے اچھی طرح واقف تھا اس نے زمین پر نقشہ بنا کر بتایا کہ کہاں سب سے زیادہ کھیت تھے۔ یہ آرگون سے زیادہ دور نہیں تھے۔

''ہمیں اسی جگہ آگ لگانی ہے۔'' میں نے فوری فیصلہ کرلیا۔ یہ جگہ آرگون کے کھیتوں کا ساٹھ فیصد بنتی تھی اور اگر یہ ساری جگہ نذر آتش ہوجاتی تو ان کے لیے یہ بہت بڑا نقصان ہوتا۔ میں نے کہا۔ ''ہم آج رات ہی یہ کام کر گزریں گے۔''

ربیک اور دوسرے پُرجوش ہو گئے۔ انہوں نے تیاری شروع کر دی۔ دن میں ربیک اور اس کے ساتھیوں نے مزید آتشیں تیر بنا لیے تھے۔ مگر میں اب کچھ اور سوچ رہا تھا۔ جیسے ہی ایرٹ آتشیں روغن لے کر آیا تھا میں نے اس کی تھوڑی سی مقدار لے کر ایک جگہ ہری گھاس پر ڈال دی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد اسے آگ دکھائی تو ہری گھاس نے یوں آگ پکڑ لی جیسے اس پر پیٹرول چھڑک کر آگ لگائی گئی ہو۔ میں دیکھنا چاہ رہا تھا کہ ڈالے جانے کے بعد بھی روغن کتنی دیر کارآمد رہتا ہے۔ یہ آتش گیر ضرور تھا مگر معدنی تیل کی طرح اڑنے والا نہیں تھا بلکہ نباتی روغن کی طرح چکنا اور دیر تک رہنے والا تھا۔ اب مجھے لگا کہ ہم پوری فصل کو با آسانی آگ لگا سکتے ہیں۔ اس کے لیے یہ روغن کافی ہوگا۔ آگ لگانے کے لیے میں نے دوسرا طریقہ سوچا تھا۔ اس میں تیروں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ لیکن بہرحال میں نے تیروں کی تیاری سے منع نہیں کیا۔ ہوسکتا تھا کہ میرا خیال غلط ثابت ہو اور ہمیں تیروں کی ضرورت ہی پڑ جائے۔

آگ لگانے کے مشن پر ہم بارہ افراد جاتے اور ایک یہاں ساشا کے ساتھ رکتا۔ یہاں رکنے کے لیے ایرٹ نے ایک نوجوان کو منتخب کیا اور اسے سمجھا دیا کہ ساشا پر ذرا بھی اعتبار نہیں کرنا اور نہ ہی اسے کوئی چھوٹ دینی ہے۔ نوجوان نے یقین دلایا تھا کہ وہ اس کا پورا دھیان رکھے گا۔ شابک نامی اس نوجوان کو ربیک بعد میں لایا تھا۔ تاریکی مکمل ہوتے ہی ہم روانہ ہوئے تھے۔ مگر ہمارا رخ سیدھا آرگون کی طرف نہیں تھا بلکہ ہم اس کے متوازی مغرب کی سمت جا رہے تھے جہاں باغات کا طویل سلسلہ تھا اور ہمیں اسی سے ہوتے ہوئے فصلوں والے حصے تک پہنچنا تھا۔ سیدھے جانے کی صورت میں خطرہ تھا کہ اس جگہ ریناٹ کی فوج کے کسی گشتی دستے سے سامنا نہ ہوجائے۔ پھر یہاں اس کا بھی امکان تھا کہ فوج کے لیے رسد اور سامان کی آمدورفت جاری ہو۔ بلکہ ایسا ہی تھا۔ اس لیے ہمارا اس جگہ سے دور رہنا مناسب تھا۔

نصف گھنٹے میں کوئی دو میل مغرب کی طرف جا کر ہم باغات کی طرف گھومے اور ان میں داخل ہو کر دوبارہ مشرق کا رخ کیا تھا۔ ایک میل ہم شمال کی طرف گئے تھے اور اس کے بعد ہمیں باغات ملے تھے یہاں سے آرگون کی فصیل صاف دکھائی دے رہی تھی۔ باغات میں مکمل سناٹا اور ویرانی تھی مگر ہم خاموشی سے چھپ کر اور بنا آہٹ سفر کر رہے تھے۔ ہر نئے باغ میں داخل ہونے سے پہلے ہم سن گن لیتے تھے۔ جب اطمینان ہوجاتا کہ وہاں کوئی نہیں ہے تب آگے بڑھتے تھے۔ دشمن کے بارے میں سوچنا کہ وہ بے خبر ہوگا

ہماری حماقت ہوتی۔ اس لیے ہم پوری طرح ہوشیار تھے۔ بالآخر ہم فصلوں تک پہنچ گئے۔ کوئی نصف میل لمبے اور کوئی پانچ میل طویل کھیتوں کا یہ سلسلہ آرگون کی فصیل کے ساتھ ساتھ ہوتا ہوا اس سے آگے وادی کی اس طرف والی چٹانوں تک چلا گیا تھا۔ جب مجھے سپاہی اوپر سے گرفتار کر کے لائے تھے تو وہ مجھے اسی جگہ سے گزار کر آرگون کے دروازے تک لائے تھے۔

یہ پانچ میل کا سفر کر کے ہمیں فصلوں کے آخری حصے تک پہنچنے میں مزید دو گھنٹے کا وقت لگا تھا کیونکہ ہم بہت احتیاط سے سفر کر رہے تھے۔ کھیتوں کے درمیان میں کسی قدر چوڑی سڑک تھی جس پر رات کے وقت بھی آمد و رفت جاری تھی۔ میرا اندازہ درست تھا کہ فوج تک مسلسل رسد پہنچائی جا رہی تھی۔ کھیتوں کے آخری حصے سے ذرا پہلے ہم رک گئے اور میں نے انہیں اپنا پلان بتایا۔ ”ہمیں تیروں سے آگ نہیں لگانی ہے۔“

وہ سن کر چونکے۔ ایرٹ نے کہا۔ ”پھر کیسے آگ لگانی ہے؟“

میں نے اپنا نیا پلان وضاحت سے بتایا۔ ”ہم میں سے تین افراد دو دو سو قدم کے فاصلے سے فصلوں میں مشرق سے مغرب کی طرف چلنا شروع ہوں گے اور اپنی مشکیزوں میں اس طرح سوراخ کریں گے کہ روغن تھوڑا تھوڑا کر کے فصلوں پر گرتا رہے اور جہاں ان کے مشکیزے خالی ہوں گے وہ وہیں فصل کو آگ دکھا دیں گے۔ پھر ہم درمیانی سڑک کراس کر کے فصل کے دوسری طرف جائیں گے اور باقی روغن سے وہاں آگ لگاتے ہوئے باغوں کی طرف نکل جائیں گے۔ میرا منصوبہ سمجھ میں نہیں آیا تو میں پھر سمجھاتا ہوں۔“

انہوں نے سر ہلایا تو میں نے پھر سمجھایا۔ ایرٹ ترجمان بنا ہوا تھا اور دوسروں کو سمجھا رہا تھا۔ دوسری بار بتانے پر سب جان گئے کہ انہوں نے کیا کرنا ہے۔ ایرٹ اور دو جوانوں نے مشکیزے لے لیے اور وہ اپنی اپنی جگہوں پر چلے گئے اور جیسے ہی میں نے اشارہ کیا انہوں نے ایک ساتھ دوڑنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ مشکیزوں میں سوراخ کر لیے تھے اور ان سے روغن نکل کر فصل پر گر رہا تھا۔ فصل تیاری کے آخری مراحل میں تھی اور گندم نما خوشے پک رہے تھے دوسری اجناس کی فصلیں بھی خاصی بلند ہو چکی تھیں۔ مجھ سمیت باقی ان سے آگے تھے۔ ہمارے دوڑنے سے فصل ہل رہی تھی مگر یہ اتنی اونچی تھی کہ ہم کسی کی نظر میں نہیں آتے اور یہاں دیکھنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ ابھی آرگون کی طرف سے آنے والی درمیانی سڑک ذرا دور تھی کہ مشکیزے خالی ہو گئے۔ ایرٹ نے پرندے کی مخصوص آواز نکالی جو اس بات کا اشارہ تھی کہ وہ آگ لگانے والا تھا۔

ہم رکے نہیں تھے بلکہ دوڑتے رہے تھے۔ میں نے اچانک ہی عقب میں نمودار ہونے والی روشنی پر سر گھما کر دیکھا تو فصل سے شعلے بلند ہو رہے تھے اور یہ صرف بلند نہیں ہو رہے تھے بلکہ بہت تیزی سے عقب کی طرف بھی جا رہے تھے۔ روغن آگ پکڑ رہا تھا۔ مجھے یہاں سے ایک ہی شعلوں کی لکیر دکھائی دے رہی تھی مگر کوئی بلندی سے دیکھتا تو اسے تین الگ الگ لکیریں مشرق کی طرف جاتی نظر آتیں۔ شعلے اتنے تیز اور بلند تھے کہ آرگون والے زیادہ دیر ان سے بے خبر نہیں رہ سکتے تھے۔ ہم دوڑتے ہوئے درمیانی سڑک تک پہنچے اور اسے پار کر کے فصل میں ایرٹ اور باقی دونوں کا انتظار کرنے لگے۔ وہ مزید ایک منٹ بعد آئے اور دوسری فصل میں گھس کر دوڑتے چلے گئے۔ میں نے ان کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ہمیں کہاں جمع ہونا ہے اور اگر کوئی زیادہ ہی راستہ بھٹک جائے تو وہ اپنے طور پر چٹان تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں نے ایک بار مڑ کر دیکھا تو آگ میرے اندازے سے زیادہ تیزی سے پھیل رہی تھی اور شعلوں کی تین لکیریں اب آپس میں ایک دوسرے کی طرف بھی بڑھ رہی تھیں یعنی ان کی جسامت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ آگ کی اس تیز رفتار ترقی سے مجھے اُمید ہوئی کہ اب اس آگ کو بجھانا ممکن نہیں ہوگا۔ کچھ آگے نکلنے کے بعد چار مشکیزوں میں سوراخ کر دیا گیا۔ یہاں فصل کا رقبہ زیادہ تھا اور اسی لیے میں نے چار مشکیزے یہاں کے لیے رکھے تھے۔ جاتے ہوئے ہم نے جو فاصلہ تقریباً دو گھنٹے میں طے کیا تھا واپسی میں وہی فاصلہ اس سے تہائی سے بھی کم وقت میں طے ہو گیا اور ابھی ہم باغوں سے کچھ دور تھے کہ باقی مشکیزے بھی خالی ہو گئے اور جس کا جہاں مشکیزہ خالی ہوا اس نے وہیں تیلی جلا کر آگ دکھا دی تھی۔ تقریباً تین میل پیچھے لگنے والی آگ تو یہاں سے بھی واضح دکھائی دے رہی تھی اور اب یہاں بھی آگ کے شعلے بلند ہونے لگے تھے۔

اپنا کام کرتے ہی ہم بھاگے تھے۔ آرگون اور پڑاؤ

کی طرف سے فوج کا آنا لازمی تھا اور وہ ہمیں تلاش کرنے کی کوشش کرتے مگر وہ فصل میں نہیں گھس سکتے تھے یہاں نہایت سرعت سے آگ پھیل رہی تھی اور لگ رہا تھا کہ چند گھنٹے میں ان کھیتوں میں سوائے آگ کے اور کچھ نہیں ہوگا۔
جب ہم ہانپتے ہوئے باغوں میں داخل ہوئے تو دوسری طرف بھی شعلے بلند اور زیادہ رقبے پر پھیل چکے تھے۔ یہاں چند منٹ رک کر ہم نے اپنا سانس درست کیا اور پانی سے اپنے خشک ہوتے حلق تر کیے۔ جیسے ہی ہمارے سانس درست ہوئے ہم اسی راستے سے چٹان کی طرف روانہ ہو گئے جس راستے سے آئے تھے۔ میں نے واضح کر دیا تھا کہ راستے میں وقت بالکل ضائع نہیں کرنا ہے اور ہر ممکن تیزی سے یوں واپس آنا ہے جیسے دشمن ہمارے تعاقب میں ہو۔ چھاپہ مار کارروائی میں تیزی ہی دشمن سے بچاتی ہے ذرا سی سستی آپ کے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہے۔ آرام کے وقفے کے دوران ایرٹ نے جوش سے کہا۔
''ہم کامیاب رہے۔''
ربیک نے سر ہلایا۔ ''ریناٹ ہمیں بھوکا مارنا چاہ رہا تھا ہم نے اس کی چال اسی پر الٹ دی ہے۔''
مگر میں ان سے متفق نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ ''یہ بھول جاؤ کہ فصل کو آگ لگنے سے ریناٹ کو کوئی نقصان ہوا ہے۔ اس کے پاس یقیناً خوراک کا ذخیرہ ہوگا اور اسے اپنے لوگوں کی پروا نہیں ہے اس نے پہلے ہی عام لوگوں کا راشن نصف کر دیا ہے۔''
''اس کے سپاہی ان ہی عام لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں جب وہ بھوکے ہوں گے تو سپاہی کہاں دل سے لڑیں گے۔''
''اس کا بھی امکان ہے مگر فی الحال ہمیں اس حربے کو بہت زبردست نہیں سمجھنا چاہیے۔ ہاں اگر اس کی گھبراہٹ میں ریناٹ کی فوج نے جنگ شروع کر دی تو یہ ہماری کامیابی ہوگی۔'' میں کہتے ہوئے کھڑا ہوگیا۔ ''اب چلو ہمیں جلد از جلد اپنے ٹھکانے پہنچنا ہے۔''
ہم سب پھر بھاگنے لگے تھے۔ خالی ہونے والے مشکیزے بیکار تھے ان کو وہیں پھینک دیا تھا۔ اب ہمارے پاس صرف ہتھیار اور پانی کی چھاگلیں تھیں۔ اس لیے ہم ہلکے ہو کر زیادہ تیز رفتاری سے سفر کر رہے تھے۔ جب ہم واپس چٹان کے پاس پہنچے تو نصف رات کا وقت تھا مگر آرگون کے سامنے ایسا لگ رہا تھا جیسے دن نکل آیا ہو۔

فصلوں سے اٹھنے والے شعلے بہت بلند تھے اور انہوں نے تقریباً پوری فصل کا احاطہ کر لیا تھا۔ ساشا اور اس کے نگران چٹان سے نیچے موجود تھے۔ ساشا نے مجھے دیکھتے ہی تڑپ کر کچھ کہنا چاہا مگر اس کا منہ بند تھا۔ اس کے جسمانی ردِعمل سے میں نے بھانپ لیا۔ میں نے ربیک کو اشارہ کیا کہ اس کی بات سنے اور خود چٹان پر چڑھ گیا۔ روشنی یہاں تک آ رہی تھی اس لیے میں احتیاطاً لیٹ گیا۔ اگرچہ منظر تباہی کا تھا اور میں بھی تباہی پسند نہیں رہا۔ مگر اس وقت اس منظر نے مجھے خوش کر دیا تھا۔ آگ آرگون کے بعض باغات تک بھی پہنچ گئی تھی۔
ریناٹ کی سپاہ کے پڑاؤ میں شدید ہیجان کے آثار نظر آ رہے تھے۔ سپاہی اور ان کے کمانڈر بھاگ دوڑ کر رہے تھے مگر ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ عارضی طور پر آرگون سے ان کا رابطہ ختم ہو گیا تھا۔ مجھے مرکزی قلعے کی فصیل پر بھی ہل چل نظر آ رہی تھی۔ یقیناً وہاں سے بھی آگ دیکھ لی گئی تھی۔ میں دل میں دعا کر رہا تھا کہ سامیرا اس وقت اپنی فوج کو حرکت میں لائے اور ریناٹ کی فوج پر ایک مختصر لیکن بہت تیز حملہ کرے۔ ان کو جنگ پر اکسانے کے لیے یہ حملہ ضروری تھا۔ مگر میں صرف اُمید کر سکتا تھا کہ سامیرا ایسا کرے گی۔ کاش کہ میرے پاس اس سے رابطے کا کوئی ذریعہ ہوتا۔ ربیک بھی میرے ساتھ اوپر آ گیا تھا اور وہ اوندھا لیٹا ہوا دیکھ رہا تھا۔ سب سے پہلے اسی نے وہ آگ دیکھی اور مضطرب ہو کر مجھ سے کہا۔ ''وہ دیکھیں۔''
میں نے دیکھا کہ آگ زیادہ جنوب کی طرف آ گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی طرح اس نے نومینز لینڈ پار کر کے قلعوں کی فصل تک رسائی حاصل کر لی تھی مگر یہ بات واضح نہیں تھی کیونکہ وہ جگہ یہاں سے خاصے فاصلے پر تھی۔ میں بھی فکرمند ہو گیا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے آگ از خود یہاں تک نہیں آ سکتی۔''
''یہ لوگ پہنچا سکتے ہیں۔'' ربیک بولا۔ ''مگر دیکھا جائے تو ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا ہے اب آگ ان کے پڑاؤ کی طرف بھی آ سکتی ہے۔''
میں خطرہ مول لیتے ہوئے کھڑا ہوا اور اس بار مجھے زیادہ بہتر نظر آیا۔ ہمارا خدشہ درست تھا آگ قلعوں کی زمین تک آ چکی تھی اور اب اس کی کھڑی فصل کو چاٹ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ اگر

آگ پڑاؤ تک آجاتی تو وہ منطقی طور پر مغرب کی طرف پسپا ہوتے اور یہاں ہم موجود تھے۔ اس صورت میں ہمیں فوری یہاں سے نکلنا ہوتا۔ میں نے سب کو ہوشیار کر دیا۔ اب ہم ایک سیکنڈ کے نوٹس پر یہاں سے پسپا ہونے کے لیے تیار تھے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر ہمیں پسپا ہونا پڑا تو ہم باغات میں ہی رہیں گے۔ کیونکہ باغات سے نکلنے کی صورت میں ہمیں قلعوں سے دور جانا پڑتا اور فی الحال میں اس جگہ سے زیادہ دور نہیں جانا چاہتا تھا۔ میرا اس وقت تک یہاں رہنا لازمی تھا جب تک کہ جنگ کا آغاز نہ ہو جاتا۔ مگر ابھی تک سامیرا کی طرف سے کسی ردعمل کا اظہار نہیں ہوا تھا اور ریناٹ کی فوج کو اپنی پڑی تھی۔

پھر وہ ہوا جس کی میں خواہش رکھتا تھا۔ اچانک ہی مرکزی قلعے کا دروازہ کھلا اور اس سے سامیرا کی فوج نکلنا شروع ہوئی۔ آگے بڑی ڈھالوں والے نیزہ بردار سپاہی تھے جو آنے والے تیروں سے بھی بچاؤ کرتے۔ ان کے پیچھے یقیناً تیرانداز تھے۔ وہ ایک نیم دائرے میں دروازے کے آگے پھیل گئے۔ نیزے برداروں نے ڈھالیں یوں آگے کر رکھی تھیں کہ ان کے پیچھے چھپے تیرانداز ریناٹ کی فوج کو نظر نہیں آ رہے تھے۔ مگر وہ مجھے یہاں سے دکھائی دے رہے تھے۔ تیراندازوں نے اپنے تیر کمانوں میں لگائے اور ایک آدمی مشعل سے تیزی سے ان کو آگ دکھاتا ہوا ایک سرے سے دوسرے سرے تک گیا اور جیسے ہی تمام تیروں کو آگ لگی۔ انہیں ایک ساتھ چھوڑ دیا گیا۔ بیک وقت درجنوں تیر ہوا میں بلند ہوئے اور پڑاؤ کی طرف لپکے۔ ابھی وہ تیر اپنی منزل تک بھی نہیں پہنچے تھے کہ تیراندازوں نے دوسرے تیر کمانوں پر چڑھا لیے۔ آگ دکھانے والے نے انہیں آگ دکھائی اور وہ بھی ہوا میں بلند ہوئے۔ اس دوران میں آتشیں تیروں کی پہلی برسات پڑاؤ پر برس چکی تھی۔ مجھے وہاں کئی جگہوں پر آگ لگتی دکھائی دی۔ دوسری برسات نے ایک تیر برسانے والی مشین کو نشانہ بنایا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ آگ کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔ یہ سب دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہو گیا۔

آغاز میں بدحواس ہو جانے والے ریناٹ کے سپاہی اب سنبھل رہے تھے ان میں سے کچھ آگ بجھانے کی کوشش کر رہے تھے اور باقی جوابی کارروائی کی تیاری کر رہے تھے۔ مگر ان کی طرف سے کی جانے والی تیروں کی بوچھاڑ غیر منظم تھی اور نشانہ کے بغیر تھی۔ اس دوران میں جلتے تیروں کی تیسری برسات بھی ہو چکی تھی اور کئی سپاہی جو تیروں کا نشانہ بنے تھے ان کی لکڑی کی زرہیں آگ پکڑ رہی تھیں۔ یہ دوہری مصیبت تھی۔ باہر آنے والے سامیرا کے سپاہیوں کی تعداد پچاس ساٹھ سے زیادہ نہیں تھی ان میں تیرانداز اور نیزہ بردار مساوی تعداد میں تھے۔ نیزہ بردار صرف تیراندازوں کا تحفظ کر رہے تھے۔ جو ان کی آڑ سے آتشیں تیر برسا رہے تھے۔ ہر تیر باری کے بعد پڑاؤ میں لگنے والی آگ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ آگ پکڑنے کے لیے وہاں خیمے تھے۔ لکڑی کا بے شمار ساز و سامان تھا۔ جلتے تیروں کے لیے ہداف کی کمی نہیں تھی وہ جہاں گرتے ان کو آگ لگانے کو کچھ نہ کچھ مل جاتا تھا۔ یہ سب کچھ میری سوچ اور منصوبے کے عین مطابق ہو رہا تھا۔

مگر اب ریناٹ کے سپاہی آگے بڑھنے کے لیے پر تول رہے تھے اور ان کی طرف سے تیر باری میں شدت آ گئی تھی اس لیے سامیرا کی سپاہ جیسے اچانک اندر سے نمودار ہوئی تھی اسی طرح وہ ترتیب سے سمٹی اور تیزی سے واپس دروازے میں چلی گئی۔ آخری سپاہی کے اندر جاتے ہی دروازہ بند ہو گیا۔ اب ریناٹ کی سپاہ پڑاؤ میں لگنے والی آگ بجھانے کی کوشش کر رہی تھی اور دوسری طرف فصل میں لگنے والی آگ بھی پڑاؤ کے نزدیک آ رہی تھی۔ فصل کے پودے اگرچہ خشک ہو چکے تھے مگر میں نے سوچا نہیں تھا کہ وہ اتنی تیزی سے آگ پکڑ لیں گے اور اب یہ آگ ہر طرف سے فصلوں کو چاٹ رہی تھی۔ دیکھا جائے تو بہت ہی اندوہناک صورت حال بن رہی تھی آنے والے سرما میں وادی کے لوگوں کی خوراک تباہ ہو رہی تھی اور یقیناً اب انہیں بہت سخت حالات کا سامنا کرنا پڑتا۔ مگر ان لوگوں کو جو اس خانہ جنگی سے بچ جاتے۔

ریناٹ کی سپاہ اپنے ساتھ تیر برسانے والی جو بھاری مشینیں لائی تھیں اس میں تین آگ کی لپیٹ میں آ چکی تھیں اور شعلے انہیں پوری طرح اپنی گرفت میں لے چکے تھے۔ ان کی آگ بجھانے کی کوششیں ناکام ثابت ہو رہی تھیں۔ اسی طرح خیموں میں لگنے والی آگ بھی پھیل رہی تھی۔ پڑاؤ میں افراتفری اب چیخ و پکار میں بدل گئی تھی۔ جب سامیرا نے مجھے برف والے کا پیغام بھیجا کہ میں جنگ ہونے تک یہیں رکوں۔ تب مجھے اس حکم کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ مگر اب میں سمجھ گیا تھا کہ یہ حکم کیوں دیا گیا تھا۔ جنگ کا آغاز مجھے ہی کرنا تھا۔ ورنہ ریناٹ کی سپاہ تو محاصرہ کر کے آرام سے

بیٹھنے کے لیے آئی تھی۔ یہ حقیقت بھانپ لینے کے بعد میں نے یہ تدبیر کی اور ریناٹ کی چال الٹ دی۔ وہ جس فصل پر قبضے کا منصوبہ بنا کر سامیرا کو شکست تسلیم کرنے پر مجبور کرنا چاہ رہا تھا وہ فصل اب تقریباً تباہ ہو چکی تھی۔ آرگون کے کھیت تو مکمل نذر آتش ہو چکے تھے اب سامیرا کی طرف کے کھیت بھی آگ میں یوں گھر چکے تھے کہ چند گھنٹوں بعد یہاں سوائے راکھ کے اور کچھ باقی نہ رہتا۔ میں نے ایرٹ اور ربیک سے کہا۔ ''میرا خیال ہے وقت آگیا ہے ہمیں آرگون کی طرف جانا ہے۔''

وہ پُرجوش ہو گئے۔ ''ہم تیار ہیں جناب۔''

فصل میں لگی آگ سے بچنے کے لیے ریناٹ کی سپاہ عارضی طور پر محاصرہ بھول کر باغات کی طرف پسپا ہو رہی تھی۔ اس لیے بھی ہمارا اس جگہ سے نکل جانا لازمی تھا۔ کچھ دیر بعد ہم اپنا سامان اور ہتھیار اٹھائے باغات سے گزر رہے تھے۔ اس وقت آرگون کے باغات سے گزرنا خطرناک ہو سکتا تھا۔ اس کا امکان تھا کہ آرگون کی طرف سے کوئی امدادی فوج آرہی ہو اور ہمارا اس سے سامنا ہو جائے۔ فصل میں آگ لگنے کے بعد وہ باغات کا طویل راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ مگر آرگون کی فصیل کے آخری حصے میں ہمیں اس کے باغات کے ساتھ سے گزرنا ہی پڑا تھا۔ یہاں تک پہنچنے میں ہمیں ایک گھنٹا لگا تھا اور شعلے اتنے بلند تھے کہ ان کی روشنی یہاں سے بھی نظر آرہی تھی۔ ربیک نے مجھ سے کہا۔ ''ہم نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آگ اتنی تیزی سے پھیل جائے گی۔''

''ایسا لگ رہا ہے کہ دونوں طرف کی ساری فصلیں تباہ ہو جائیں گی۔'' ایرٹ نے کہا۔

''مجھے اب اس کی فکر ہو رہی ہے کہ آنے والے سرما میں وادی کے لوگوں کو فاقہ کشی کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

وہ دونوں بھی فکر مند ہو گئے اب تک جوش میں انہیں احساس نہیں تھا۔ ایرٹ نے سر ہلایا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مگر جنگ میں ایسا ہوتا ہے۔''

میں نے سرد آہ بھری۔ ''ہمارے ہاں بھی کہا جاتا ہے کہ جنگ اور محبت میں سب جائز ہے۔''

کچھ دیر بعد ہم باغات کی بھی آخری حد تک پہنچ گئے تھے۔ ہمارے دائیں طرف آرگون کی فصیل تھی اور اس کے ساتھ جنگل اور ویرانہ تھا۔ اس ویرانے میں ہارن تھے۔ اسمار تھے اور گونز تھے۔ یہ تمام جانور ہمارے لیے خطرناک تھے اور ان سے بچاؤ کے لیے ہمارے پاس مشروب تھا۔ سب نے یہ مشروب پیا کچھ دیر آرام کے لیے رک گئے۔ آرام کے ساتھ ساتھ اتنی دیر میں ہمارے جسموں سے بُو آنے لگتی اور پھر آگے روانہ ہو جاتے۔ آرام کے اس وقفے میں، میں نے ایرٹ سے پوچھا۔ ''روغن جمع کرنے کے دوران جانور ملے تھے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''دو بار جناب۔ مگر ہمارے پاس سے آتی بُو کی وجہ سے وہ نزدیک نہیں آئے تھے۔''

''مگر ہمیں پھر بھی ہوشیار رہنا چاہیے۔ ہارن خطرناک ہے۔ وہ گوشت خور نہیں ہے اس کے باوجود انسانوں سے بہت زیادہ دشمنی رکھتا ہے۔'' میں نے انہیں خبردار کیا۔

''شاید اس لیے کہ وہ اس وادی میں انسانوں کو اپنا حریف سمجھتا ہے۔'' ایرٹ نے کہا۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ دیکھا جائے تو انسان کے بعد وہی اس وادی کا سب سے طاقتور اور خطرناک جانور تھا۔ جسمانی قوت میں انسان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا مگر جہاں تک عقل کا تعلق ہے وہ انسان کے سامنے بے بس تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وادی کی حکمرانی اس سے چھن گئی تھی اور ردِعمل میں وہ انسانوں سے صرف نفرت کر سکتا تھا یا جہاں موقع ملتا وہ انسانوں کو فنا کے گھاٹ اتار کر اپنی تسکین کرتا تھا۔ مگر وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اب ہم جنگل میں داخل ہو گئے تھے اور یہاں سے اس کے عقبی حصے تک پہنچنے میں ہمیں دو گھنٹے لگ سکتے تھے۔ ہم نے روشنی کے لیے ایک چھوٹی مشعل جلائی تھی اور اس کی روشنی نمایاں کرنے سے گریز کر رہے تھے۔ روشنی دیکھ کر جانور ہماری طرف متوجہ ہو سکتے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ رات کے دو بجے یا اس سے ذرا اوپر کا وقت تھا۔ روشنی ہونے میں ابھی چار گھنٹے کا وقت تھا۔ اگر ہم چار بجے تک سرنگ کے خفیہ راستے تک پہنچ جاتے تو ہمارے پاس آگے کارروائی کے لیے دو گھنٹے بچتے۔ اس قسم کی کارروائی تاریکی میں ہی کامیاب ہو سکتی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ دو گھنٹے ناکافی تھے۔ ہمیں صرف اندر ہی نہیں گھسنا تھا بلکہ ریناٹ تک پہنچنا تھا۔ ساشا نے جو بتایا تھا وہ ایک بہ ظاہر ناقابلِ تسخیر قسم کے حصار میں محفوظ تھا۔ اس تک رسائی یقیناً آسان نہیں تھی۔ ایک بار شہر میں ہماری موجودگی کا راز قبل از وقت فاش ہو جاتا تو ہمارے لیے جان بچانا بھی مشکل ہو جاتا۔ وہاں باقاعدہ فوج نہیں تھی۔ لیکن باقاعدہ فوج سے

زیادہ تربیت یافتہ ریناٹ کے خاص محافظ تھے اور ان کی تعداد بھی سیکڑوں میں تھی۔ میں نے ایک گھنٹے بعد آرام کے وقفے میں ربیک اور ایرٹ سے مشورہ کیا۔ ایرٹ نے کہا۔

''جناب یہی بات ہے ہم اس بارے میں کچھ نہیں جانتے مگر مجھے بھی لگ رہا ہے کہ صبح ہونے کا وقت قریب ہے اور اتنی سی دیر میں ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ہمیں طویل وقت درکار ہے۔''

''مگر اس صورت میں ہم باہر کہاں رکیں گے؟'' ربیک نے نقطہ اٹھایا۔ ''اس علاقے میں خطرات بہت زیادہ ہیں۔ دوسرے کل تک یقیناً آگ بجھ جائے گی۔ اس کا بھی امکان ہے کہ ریناٹ کی فوج خوفزدہ ہو کر شہر میں واپس آجائے۔''

''فوج کی واپسی کا امکان کم ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس کا آرگون کی عوام اور خود فوج پر بہت برا اثر پڑے گا۔ میرا نہیں خیال کہ ریناٹ فوج واپس بلائے گا۔''

ایرٹ نے تائید کی۔ ''دیکھا جائے تو اس کا کوئی خاص نقصان نہیں ہوا ہے۔ چند سپاہی مرے ہیں اور آگ سے سامان کو نقصان ہوا ہے۔ کل تک وہ سب ٹھیک کر لیں گے۔''

''اس لیے فوج کی واپسی کا امکان بہت کم ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بلکہ ممکن ہے کہ شہر میں اگر کچھ اضافی دستے ہوں تو اس پہلی شکست کے بعد ریناٹ انہیں بھی فوج کے پاس بھیج دے۔''

''ایسا ہو جائے تو اور اچھا ہوگا۔''

آرام کے مختصر وقفے کے بعد ہم آگے بڑھے۔ اب عقب میں نظر آتی آگ کی روشنی نظر نہیں آرہی تھی مگر دور وادی کی دیواروں پر اس کا ہلکا سا انعکاس محسوس ہو رہا تھا۔ فصلوں میں لکڑی نہیں ہوتی ہے اور آگ بہت تیزی سے انہیں جلا کر راکھ کردے گی، دوسرے ان میں سبزہ تھا اس لیے دھواں بہت اٹھتا۔ مگر یہ بات یقینی تھی کہ آگ صبح تک بجھ جائے گی۔ البتہ اس کے اثرات باقی رہیں گے جیسے زمین سے تپش اٹھتی رہے گی اور دھواں دیر تک برقرار رہے گا۔ یہاں ہوا نہیں چلتی ہے جو دھواں اڑا کر لے جائے۔ سامیرا کی طرف آگ کا باغات تک پہنچنے کا امکان نہیں تھا اس سے پہلے ہی ریناٹ کے سپاہ اس کا تدارک کر لیتے کیونکہ ان کے پڑاؤ کے بعد تو باغات تھے۔ بلکہ کھیت اس کے بعد بھی تھے مگر ان کی تعداد کم ہو گئی تھی۔ دوسری طرف آرگون کے باغات کو بھی بچانے کی کوشش کی جارہی ہوگی۔ کیونکہ ایک فصل کے مقابلے میں یہ باغات کہیں زیادہ قیمتی تھے اور ان کے درخت برسوں میں جا کر پھل دینے کے قابل ہوتے۔ جب کہ نئی فصل چند دن بعد بھی کاشت کی جاسکتی تھی اور سردیاں آنے سے پہلے وہ تیار ہو جاتی۔

یقیناً ریناٹ کے آدمیوں کی توجہ اس وقت کہیں زیادہ منقسم ہوگی۔ سب سے کم توجہ شہر پر ہوگی، اس کے باوجود ہمارے لیے آرگون کی مہم آسان نہیں تھی۔ اب ہم آرگون کی فصیل کے تقریباً آخری حصے تک پہنچ گئے تھے اور ہمیں گھوم کر اس کے عقب میں جانا تھا جہاں سے معبد کو جانے والی سرنگ گزرتی تھی۔ ہم ایسے جنگل سے گزر رہے تھے جس میں کہیں کہیں چٹانیں اور جھاڑیاں بھی تھیں۔ میں پہلی بار اس طرف آیا تھا اور میرے لیے نشانی وہ ٹیلہ نما پہاڑی تھی جس پر چڑھ کر میں نے اور روبیر نے پہلی بار سرنگ کے ہوائی دخول کے راستے دیکھے تھے۔ وہ پہاڑی ابھی دور تھی اور اس جگہ سے نظر نہیں آرہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ اس ہی قسم کی جھاڑیوں میں وہ خوش رنگ پرندہ تھا جو پروں سے زہریلے کانٹے برساتا تھا اور روبیر نے مجھے بتایا تھا کہ اس سے ہارن جیسا خوفناک جانور بھی بھاگتا ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو خبردار کیا۔ ربیک نے کہا۔

''وہ دس قدم کے فاصلے سے خطرناک ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ فاصلہ ہو تو کانٹے اثر نہیں کرتے ہیں۔''

''پھر بھی محتاط رہو اور تیر کمان سنبھال لو نظر آتے ہی اسے نشانہ بنانے کی کوشش کرنا۔'' میں نے حکم دیا تو انہوں نے تیر کمان سنبھال لیے تھے اور ہم احتیاطاً جھاڑیوں سے دور ہو کر گزر رہے تھے۔ یہاں زمین سخت اور پتھریلی تھی۔ صرف وہیں سبزہ تھا جہاں مٹی تھی۔ شاید اسی وجہ سے اس جگہ سبزہ زیادہ نہیں تھا اور جو تھا وہ بھی خشک سا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ موسم گرم اور حبس والا ہو رہا تھا۔ شاید وسیع رقبے پر لگنے والی آگ کا اثر تھا جو یہاں رات سرد اور خنک نہیں ہوئی تھی جیسا کہ ہو جاتی تھی۔ اوپر آسمان صاف تھا اور ستارے نظر آرہے تھے۔ میری کوشش تھی کہ صبح سے پہلے پہلے ہم اس ٹیلے تک پہنچ جائیں اور پھر سارا دن وہیں رہیں۔ شام کے بعد ہی ہم سرنگ میں داخل ہونے کی کوشش کرتے۔ ٹیلے تک پہنچنا یوں بھی ضروری تھا کہ اس کے بعد ہم یہاں پائے جانے والے خطرناک جانوروں کی نظروں سے محفوظ ہو جاتے۔

اگر کوئی ہارن ہمیں دیکھ لیتا اور نزدیک نہ بھی آپاتا تب بھی وہ ہمارے آس پاس ہی رہتا اور اگر زیادہ ہوتے تو ہمارے گرد گھیرا ڈال لیتے جیسا کہ انہوں نے کنویں والی چٹان کے پاس کیا تھا۔ میں اس کینہ پرور مخلوق سے ممکنہ حد تک دور رہنا چاہتا تھا کہ اسی میں ہماری بچت تھی۔ بالآخر مجھے پہاڑی کا ہیولہ نظر آیا اور میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ہمیں اس کی طرف جانا ہے۔ اجنبی علاقہ ہونے کی وجہ سے راستہ تلاش کرنے میں دشواری پیش آرہی تھی اور ہمیں جھاڑیوں کے درمیان بھٹکنا پڑ رہا تھا۔ میں اور ربیک سب سے آگے تھے۔ ایک جگہ راستہ دو جھاڑیوں کے درمیان سے گزر رہا تھا اور ہم سب قطار بنا کر اس کے درمیان سے گزرنے لگے تھے۔ دائیں طرف کی جھاڑی میں ہلکی سی حرکت ہوئی اور میں چوکنا ہو گیا۔ میں نے ہاتھ بلند کر کے سب کو رکنے اور ساکت ہونے کا اشارہ کیا تو وہ اپنی اپنی جگہ ٹھہر گئے۔ ربیک کے پیچھے موجود ایرٹ نے تیر کمان کا رخ جھاڑی کی طرف کر دیا تھا۔ اچانک جھاڑی سے وہی خوش رنگ مگر زہریلے کانٹوں والا پرندہ نکلا اور نکلتے ہی اس نے رقص کے انداز میں اپنے پر پھڑپھڑانا شروع کر دیے۔ میں چلایا۔

''پیچھے ہٹو۔''

سب سے آگے میں اور ربیک تھے۔ اتفاق سے ہم دونوں کے ذہن میں ایک ہی ترکیب آئی تھی۔ ہم اپنے کرتے لہراتے ہوئے دوسری طرف مڑ گئے تھے اور اسی لمحے ایرٹ نے تیر مارا۔ پرندے نے کریہہ سی آواز نکالی اور تیر کھا کر واپس اسی جھاڑی میں گھس گیا۔ باقی سب عجلت میں پیچھے بھاگے تھے۔ پرندے کے غائب ہوتے ہی میں اور ربیک بھی بھاگے۔ ربیک پیچھے تھا مگر وہ آگے نکل گیا کیونکہ چند قدم اٹھاتے ہی مجھے چکر سا آیا اور ایسا لگا جیسے تاریک رات اور تاریک ہو گئی ہو۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آیا تھا۔ میں نے اندھوں کی طرح چند قدم اٹھائے اور سر جھٹکا تو اندھیرا چھٹا تھا مگر چکر اب بھی آرہے تھے اور منظر نظروں کے سامنے لہرا رہا تھا۔ تب مجھے اپنے بائیں بازو میں چبھی کسی چیز کا احساس ہوا۔ میں نے ہاتھ پھیرا اور اس گلاب کے کانٹے جیسی چیز کو نکال دیا جو کھال میں پیوست تھی۔ یہ اسی پرندے کا زہریلا کانٹا تھا جو میرے بازو میں پیوست ہوا تھا۔ میرے ساتھیوں کو ذرا دیر سے احساس ہوا۔ اس دوران میں وہ جھاڑیوں سے نکل گئے تھے اور میں ابھی جھاڑیوں کے درمیان تھا۔ ایرٹ کو پہلے احساس ہوا اور وہ پلٹ کر آیا۔

''کیا ہوا جناب آپ ٹھیک ہیں؟''

''مجھے زہریلا کانٹا لگا ہے۔'' میں نے ڈوبتی آواز میں کہا۔ اب میرے لیے کھڑے رہنا بھی مشکل ہو رہا تھا میں وہیں بیٹھ گیا۔ وہ سب میرے گرد جمع ہو گئے تھے۔ مگر یہاں خطرہ تھا۔ وہ پرندہ زیادہ دور تک نہیں نکلا تھا اور یہاں شاید اس کا گھر تھا۔ اس نے ہمیں مداخلت کار سمجھ کر حملہ کیا تھا۔ ہمارا یہاں سے نکل جانا ضروری تھا۔ ممکن ہے وہاں اور پرندے ہوتے اور وہ حملہ کرتے تو اس سے بچنا محال ہو جاتا۔ اس وقت بھی سب اس لیے بچ گئے تھے کہ ہم ایک قطار میں تھے۔ ربیک کی خوش قسمتی نے اسے محفوظ رکھا تھا مگر میں اتنا خوش قسمت ثابت نہیں ہوا۔ میں خود پر جبر کر کے اٹھا اور ان سے کہا۔ ''یہاں سے ہٹو...... یہاں خطرہ ہے۔''

ان کو بھی ہوش آیا۔ ایرٹ اور ربیک نے مجھے دائیں بائیں سے سہارا دے کر اٹھایا اور جھاڑیوں سے ہٹ گئے۔ یہ سلانے اور غنودگی لانے والا زہر تھا۔ کیونکہ میں نہ تو درد اور نہ ہی کسی قسم کی بے چینی محسوس کر رہا تھا بس دل چاہ رہا تھا کہ یہیں لیٹ کر سو جاؤں۔ بعض اقسام کے سانپوں کا زہر بھی یہی خاصیت رکھتا ہے۔ وہ جسے ڈس لیں وہ سو جاتا ہے اور اسی نیند میں موت خاموشی سے انسان کو ساتھ لے جاتی ہے۔ میں غنودگی سے لڑنے لگا۔ وہ لوگ مجھے جھاڑیوں سے دور لے آئے۔ ربیک پوچھ رہا تھا کہ میں کیسا محسوس کر رہا ہوں اور مجھے اس کا سوال کئی بار پوچھنے پر سمجھ میں آیا۔ میں اپنے اندر ایک جنگ لڑ رہا تھا اور میری توجہ باہر کی طرف کم ہو گئی تھی۔ میں نے اسے بہ مشکل بتایا کہ میں کیا محسوس کر رہا ہوں۔ اس نے دواؤں والے تھیلے سے ایک سفوف نکالا اور پانی میں ڈال کر مجھے پلایا۔ اس نے کہا۔

''یہ زہر کا توڑ ہے۔''

اس توڑ کا اثر ہوا تھا اور میں چند منٹ بعد غنودگی کی کیفیت میں کمی محسوس کرنے لگا۔ اب چکر آنا بند ہو گئے اور لیٹ کر سو جانے کی خواہش بھی پہلے جیسی بے قابو نہیں رہی تھی۔ اگر مجھے خود پر قابو پانے کی مشق نہ ہوتی تو شاید میں سو ہی جاتا۔ کیفیت بہتر ہوتے ہی میں کھڑا ہو گیا۔ میں جتنا متحرک رہتا زہر کا اثر اتنا ہی کم ہوتا جاتا۔ میں نے حکم دیا۔ ''ٹیلے کی طرف چلو اس سے پہلے کہ کوئی اور مصیبت نازل ہو جائے۔''

وہ سمجھتے تھے اس لیے کسی نے اعتراض نہیں کیا اور مجھے سہارے کی ضرورت نہیں تھی مگر ربیک میرے ساتھ رہا اور ہم کچھ دیر میں ٹیلے تک پہنچ گئے۔ مجھے یاد تھا کہ اوپر جانے کا راستہ کہاں ہے۔ میں نے ان کو بتایا اور وہ باری باری اوپر جانے لگے۔ پھر مجھے سہارا دے کر چڑھایا۔ سفوف کا اثر ہر گزرتے منٹ مجھے بہتر کر رہا تھا۔ یہ تیر بہ ہدف قسم کا تریاق تھا اور میرا خیال تھا کہ اسے بھی اورگان نے بنایا ہوگا۔ جس نے جانوروں سے بچانے والا محلول تیار کیا تھا۔ جب ہم ٹیلے پر چڑھے اور محفوظ بلندی تک پہنچ گئے تو انہوں نے میرے لیے ایک جگہ بنائی جہاں میں آرام سے بیٹھ سکوں۔ باقی جس کو جہاں جگہ ملی وہیں بیٹھ گیا۔ میں نے پہلی بار مشعل کی روشنی میں اپنے بازو کا جائزہ لیا جہاں کانٹا گھسا تھا۔ وہاں پانچ روپے کے سکے جتنا نیلگوں دائرہ بن گیا تھا مگر اس میں تکلیف نہیں تھی۔ میں نے تیر لے کر اس کی نوک اس جگہ چبھوئی اور وہاں سے سیاہی مائل گاڑھا سا خون بہنے لگا تھا۔

یقیناً یہ زہریلا خون تھا۔ میں نے اسے بہنے دیا۔ کچھ دیر بعد خون سرخ ہونے لگا۔ تب میں نے انگوٹھے سے دبا کر خون روک دیا۔ خون نکلنے سے سیاہ دائرہ مدھم پڑ گیا تھا۔ اب میں زیادہ بہتر محسوس کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے انگوٹھا ہٹایا تو خون رک گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ربیک اور دوسرے کچھ حیرت زدہ تھے۔ ربیک نے کہا۔ ”آپ خوش قسمت ہیں کہ اس کے زہر نے اثر نہیں کیا ورنہ اس کے کانٹے کا شکار ہونے والا مشکل سے ہی بچتا ہے۔“

”ہاں میں خوش قسمت ہوں۔“ میں نے اقرار کیا۔ ماضی میں بھی میں زہر کا شکار ہو کر بچ گیا تھا اور اس کی وجہ اللہ کی مہربانی کے بعد وہی دوائیاں تھیں جو حکیم قادس نے مجھے دی تھیں اور جن کا جزو اعظم اس وادی سے آنے والا ایک پتھر کا سفوف تھا۔ زہریلے ترین کوبرا کے کاٹنے کے باوجود میں بچ گیا تھا۔ بلکہ میرے خون میں کچھ ایسی خصوصیت پیدا ہو گئی تھی کہ اس سے بڑے کنور کے ناقابل علاج مرض کا علاج بھی ممکن ہو گیا تھا۔ مگر یہ علاج اس کی قسمت میں نہیں تھا۔ اگر وہ انسانیت کے نام پر یا سادھنا کے واسطے مجھ سے خون چاہتا تو شاید میں مان بھی جاتا مگر اس نے جبراً میرے جسم سے خون کشید کرنا چاہا تھا اور اسی کشمکش میں وہ ناکام رہا۔ بہرحال میرے خون میں یہ اثر اب بھی موجود تھا کہ پرندے کا مہلک زہر مجھے ہلاک کرنے میں ناکام رہا تھا۔

مجھے ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ خوش رنگ پرندے کا زہر بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔ ہماری دنیا میں خطرناک ترین حیاتیاتی زہر ان جانوروں کے جسم میں ہوتے ہیں جو بہ ظاہر بہت بے ضرر دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے مچھلی، جیلی فش، پلاٹی پس اور رے شارک وغیرہ۔ سانپ بچھو تو بس بدنام ہیں ورنہ زہریلے ترین سانپ کا زہر بھی آدمی کو آدھے گھنٹے سے پہلے ہلاک نہیں کر سکتا ہے۔ ہاں خوف سے وہ مر جائے تو الگ بات ہے لیکن ایک قسم کی مچھلی کا زہر اتنا خطرناک ہوتا ہے کہ اگر وہ کاٹ لے تو انسان چار سیکنڈ میں مر جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ قدرت نے اس مچھلی کو کاٹنے کی جبلت ہی نہیں دی ہے۔ اسی طرح جیلی فش کا زہر اگر زیادہ مقدار میں جسم میں آئے تو سانس رکنے سے چند منٹ میں موت واقع ہو جاتی ہے۔ پتنگ نما رے شارک کا زہر بھی بہت خطرناک ہوتا ہے۔ یہ پرندہ بھی ایسے ہی بے ضرر دکھائی دینے والے زہریلے جانوروں میں شامل تھا۔

روشنی ہونے سے پہلے ربیک نے وہی سفوف دوبارہ پانی میں گھول کر دیا۔ میں تقریباً نوے فیصد ٹھیک ہو گیا تھا۔ بازو کا سیاہ دائرہ خاصا مدھم پڑ گیا تھا مگر ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوا تھا۔ میں نے بازو استعمال کر کے دیکھا اور مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ غنودگی والی کیفیت مکمل ختم ہو چکی تھی اور خاصی دیر سے جاگنے کے باوجود میں چاق و چوبند تھا۔ باقی سب آرام کر رہے تھے اور اونگھ رہے تھے۔ ان لوگوں کو خاصی دیر کے بعد اطمینان کا موقع ملا تھا اور یہ مہلت عارضی تھی۔ وہ اس وقفے میں جتنا آرام کر لیتے اتنا ہی اچھا تھا۔ میں نے کہا۔ ”دن میں سب آرام کریں گے اور رات میں ہم آرگون میں داخل ہوں گے۔“

”کس راستے سے جناب؟“ ربیک نے پوچھا۔

”وہ دیکھ رہے ہو چھوٹی سی کون جو ہر تھوڑی دور بعد زمین سے اٹھی ہوئی ہیں۔“ میں نے ہوائی دخول کے راستوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ معبد اور آرگون کو ملانے والی سرنگ کے ہوائی دخول کے دہانے ہیں۔ ان میں سے ایک میں اندر جانے کا راستہ ہے لیکن ہم اسے اسی وقت استعمال کر سکتے ہیں جب اندر کوئی نہ ہو۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ رات کے وقت؟“

”بالکل میری معلومات کے مطابق اس سرنگ کو رات میں صرف ہنگامی حالات میں استعمال کیا جاتا ہے۔“

ربیک کون گن رہا تھا۔ ”یہ تو بہت ہیں۔“

''وہ جو شہر کی طرف سے چوتھی کون ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''یہاں سے سب سے نزدیک وہی ہے۔''
''کبھی آپ اس جگہ تک آئے ہیں؟''
''نہیں یہ اتفاق ہے کہ وہ یہاں سے نزدیک ہے۔ یہاں آنے کی وجہ ہارن ہیں۔ ان کا مسکن یہاں سے نزدیک ہی ہے۔ ان سے بچنے کے لیے یہاں اور کوئی جگہ نہیں ہے سوائے اس ٹیلے کے۔''
''اس کے باوجود اگر ہم ان کی نظروں میں آگئے تو وہ یہاں بھی گھیر لیں گے۔''
''اس لیے اب خود کو چھپاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''ہمیں نمایاں اور اکٹھے نہیں ہونا چاہیے۔''
ہم سب ٹیلے پر اوپر نیچے اس طرح بکھر گئے کہ مختلف پناہ گاہوں میں روپوش ہو گئے اور الگ بھی ہو گئے۔ اس طرح نمایاں نہیں رہے تھے۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی اس لیے میں نے اپنے تھیلے سے میٹھی ٹکیاں نکالی اور انہیں کھا کر چند گھونٹ پانی پیا تھا۔ یہاں پانی کا منبع نامعلوم تھا اس لیے سب کو احتیاط سے پانی استعمال کرنے کو کہا تھا۔ میں ایک اندر کی دھنسی ہوئی چٹان کے خلا میں گھس کر بیٹھا ہوا تھا اور اس کی ساخت ایسی تھی کہ یہ جسم کو سہارا دے رہی تھی مگر احتیاطاً میں سونے سے گریز کر رہا تھا۔ ربیک کچھ دیر ایک جھاڑی کی جڑ سے ٹکا ہوا تھا اور ایرٹ ذرا اوپر تھا۔ میں زمین سے کوئی تیس فٹ کی بلندی پر تھا۔ یہاں سے سامنے جنگل کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ اچانک ہی جھاڑیوں میں ہل چل سی ہوئی اور اس میں سے دو عدد ہارن نکلے۔ انہیں دیکھتے ہی سب ایک دوسرے کو خبردار کرنے لگے اور جو جہاں تھا وہاں زیادہ دبک گیا۔ مگر ہارن ہماری طرف نہیں آئے بلکہ وہ دائیں طرف ذرا گھنی جھاڑیوں میں چلے گئے اور کچھ دیر بعد ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ محبت کے مراحل طے کر رہے تھے۔ کسی قدر دوری سے ان کی حرکات اور مسرت بھری غراہٹوں سے تو ایسا ہی لگ رہا تھا۔ ربیک مسکرانے لگا۔
''ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔''
''جب تک ہم نظر نہیں آتے۔'' میں نے کہا۔ ہارن کا یہ جوڑا تقریباً پندرہ بیس منٹ وہاں رہا اور پھر دوڑتا ہوا اندر گھنے جنگل کی طرف چلا گیا۔ وہ یہاں اسی کام کے لیے آیا تھا۔ اب تک میں نے ہارن کو خوفناک روپ میں ہی دیکھا تھا یہ پہلا موقع تھا کہ میں اسے ذرا مختلف روپ میں دیکھ رہا تھا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ مغرب کی دیو مالائی کہانیوں میں ہارن جیسے ایک کردار کا ذکر ملتا ہے۔ جس کا دھڑ گھوڑے جیسا اور اوپری جسم انسانوں جیسا ہوتا ہے۔ وہ تیر کمان لے کر گھنے جنگلوں میں سفر کرنے والے عام انسانوں کی بلاؤں اور خطرناک مخلوقات سے حفاظت کرتا ہے۔ وہ انسانوں جیسی عقل رکھتا ہے اور بولتا بھی ہے۔ مگر یہاں جو مخلوق پائی جاتی تھی وہ قطعی حیوان تھی اور انسانوں کی شدید دشمن تھی۔ اس کی دشمنی کا روپ میں دیکھ چکا تھا کہ وہ انسان کو مارنے کے لیے خود بھی مرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔
ہارن کے جانے کے بعد سب پھر سے ریلیکس ہو گئے تھے۔ مجھے نیند آ رہی تھی اور میں نے سوچا کہ کچھ دیر آرام کر لیا جائے۔ میں اسی کھوہ میں گھسا ہوا او نگھنے لگا اور کچھ دیر بعد سو گیا۔ آرام سے پہلے میں نے ربیک کی ڈیوٹی لگا دی تھی کہ وہ جاگتا رہے۔ اگر خود آرام کرے تو کسی اور کی ڈیوٹی لگا دے۔ ایک ہی پوزیشن میں زیادہ دیر سونا ممکن نہیں تھا اس لیے جب جسم بے آرام ہوا تو خود بہ خود میری آنکھ کھل گئی اور میں کھوہ سے نکل آیا۔ موسم آج بھی گرم اور مرجبس تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ آگ کا اثر ابھی وادی کی فضا میں باقی تھا۔ ویسے بھی یہ محدود جگہ تھی اور یہاں کوئی بھی موسمی تبدیلی بہت زیادہ محسوس کی جا سکتی تھی۔ گرمی اور حبس کی وجہ سے بار بار پیاس لگ رہی تھی اور اس لیے سب ہی معمول سے زیادہ پانی پی رہے تھے مگر ہمارے پاس خاصی مقدار میں پانی تھا اور اس کا خطرہ نہیں تھا کہ پانی بالکل ہی ختم ہو جائے گا۔ یہ چوبیس گھنٹے آرام سے چل سکتا تھا۔ اس کے باوجود ہم احتیاط کر رہے تھے اور جب پیاس بڑھ جاتی تب ہی پانی پیتے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ آرگون کا جائزہ لینا چاہیے اور میں نے ایرٹ سے کہا۔
''اوپر چلتے ہیں وہاں سے آرگون شہر نظر آتا ہے۔''
ربیک اب آرام کر رہا تھا۔ ایرٹ اور میں اوپر کی طرف روانہ ہوئے۔ ٹیلے کی بلندی سو فٹ کے لگ بھگ تھی اور یہاں سے کئی میل کی دوری تک دیکھا جا سکتا تھا۔ آرگون کی عقبی فصیل یہاں سے کوئی نصف میل کے فاصلے پر تھی۔ جو حصہ نظر آ رہا تھا وہ شہر کا اہم ترین حصہ تھا یعنی شاہی علاقہ پھر سرکاری علاقہ اور اس کے آس پاس امرا کی رہائش گاہیں تھیں۔ اگرچہ اتنی دور سے وہاں ہونے والی سرگرمیاں دیکھنا ممکن نہیں تھا مگر مجھے اور ایرٹ کو لگا کہ وہاں بہت زیادہ چہل پہل ہے۔ شاید حفاظتی انتظامات کو از سر نو منظم کیا جا رہا تھا۔ بہت دور جنوب میں ماحول دھندلا سا تھا جیسے وہاں اب بھی

دھویں کا اثر ہو۔ لازمی بات ہے اگر آگ باغات تک نہیں پہنچی تھی تو وہ فصل چاٹ کر بجھ چکی تھی۔ ایرٹ نے کہا۔ ''ایسا لگ رہا ہے یہاں کوئی جلسہ ہو رہا ہے۔''

میں نے اتفاق نہیں کیا۔ ''اس موقع پر جلسے کی تک سمجھ میں نہیں آرہی میرا خیال ہے یہاں حفاظتی انتظامات پھر سے ترتیب دیے جا رہے ہیں ہمیں نظر آنے والی سرگرمی اسی سے متعلق ہے۔ یا پھر شہر میں کوئی ہنگامی صورتحال درپیش ہے۔''

ایرٹ نے میری طرف دیکھا۔ ''اس صورت میں ہمارا اندر گھسنا مناسب ہوگا؟''

''یہ تو اسی وقت پتا چلے گا جب ہم اندر پہنچ جائیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''ہمیں آج رات اندر گھسنا ہے البتہ کارروائی کرنی ہے یا نہیں اس کا فیصلہ ہم اندر جانے کے بعد ہی کریں گے۔ ممکن ہے حالات سازگار نہ ہوں تو ہم جیسے اندر گئے ہوں گے اسی طرح واپس بھی آجائیں گے۔ ایک بات ذہن نشین کرلو ہم خودکشی کرنے نہیں جا رہے ہیں ہر قدم سوچ سمجھ کر اور دیکھ بھال کر اٹھانا ہے۔''

ایرٹ نے سر ہلایا۔ ہم خاصی دیر اوپر رہے اور رفتہ رفتہ آرگون میں نظر آنے والی سرگرمی مدھم پڑ گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جس مقصد کے تحت یہ سرگرمی جاری تھی وہ پورا ہو گیا تھا۔ ہم نیچے اترے تو شام قریب تھی۔ ساشا ایک طرف بیٹھی اپنے طویل سنہری مائل بھورے بال سنوار رہی تھی۔ میں نے یہاں عورتوں کے بال عام طور سے سنہری، سرخ یا کسی براؤن رنگ کے دیکھے تھے۔ بہت کم ایسی تھیں جن کے بال سیاہ یا گہرے رنگ کے ہوں۔ ہمارے درمیان وہ واحد فرد تھی جس نے سفید لباس پہنا ہوا تھا۔ میں اس کے پاس آیا۔ ''تمہیں لباس بدلنا ہوگا۔''

''میرے پاس اور لباس نہیں ہے۔''

''ہمارے پاس ہے۔'' میں نے کہا اور آرگون کی فوجی وردیاں نکال کر اس کے سامنے ڈھیر کر دیں۔ ''اس میں سے دیکھ لو جو تمہیں پورا آئے وہ پہن لو۔''

اس نے میری طرف دیکھا۔ ''کیا تم لوگ آرگون میں داخل ہوگے؟''

''بالکل ہم اسی لیے یہاں آئے ہیں۔''

''اور مجھے بھی ساتھ لے جاؤ گے؟''

''ظاہر ہے ورنہ تمہیں یہاں کیوں لاتے؟''

''میں جو جانتی ہوں تمہیں بتا چکی ہوں پھر مجھے ساتھ رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔''

''جواز ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''میرا خیال ہے تم جتنا جانتی ہو تم نے اتنا بتایا نہیں ہے۔''

وہ کچھ دیر مجھے گھورتی رہی پھر اس نے وردیوں میں سے اپنے سائز کی وردی تلاش کی اور اسے لے کر ٹیلے کے ایک ایسے حصے میں چلی گئی جہاں وہ لباس بدل سکتی تھی۔ میں جب اسے دیکھتا مجھے روبیر کا خیال آتا اور میرا دل یہ سوچ کر بوجھل ہو جاتا کہ ریناٹ اور اس کے ظالم آدمیوں کی قید میں نہ جانے اس پر کیا گزر رہی ہوگی؟ مگر فی الحال اس کے لیے میں یا کوئی بھی دوسرا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ تقدیر کے حوالے تھی۔ اگر اس کے نصیب میں زندگی اور رہائی تھی تو یہ اسے ضرور ملے گی۔ صرف وہی نہیں بلکہ آرگون کے ہزاروں شہری زندگی اور رہائی کی اُمید میں بیٹھے تھے۔ ساشا لباس بدل کر آئی تو اب وہ ہماری جیسی لگ رہی تھی۔ سفید رنگ کے لباس میں وہ الگ اور نمایاں تھی۔ اگرچہ ریناٹ اور سرکاری حکام کے لیے مخصوص حصے میں جو پہریدار تھے ان کی وردی سرمئی رنگ کی تھی اور ہم عام سرخ فوجی وردی میں تھے مگر پھر بھی ہمیں اجنبی سمجھنا دشوار تھا۔ جب تک ہم پر شک نہ ہوتا کوئی ہمیں نہ روکتا۔

اگر ہمارے لیے ریناٹ اور سرکاری حکام کے لیے علاقے میں گھسنا دشوار ہوتا تو ہم شہر کی طرف جاسکتے تھے اور وہاں کہیں پناہ حاصل کرسکتے تھے۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہ مہم اتنی آسان نہیں ہوگی اور ایسی عجلت جس میں ہمارا راز فاش ہو جائے ناکامی کا سبب بن جائے گی۔ صرف ایک درجن افراد کے ہمراہ سینکڑوں اور ہزاروں مسلح افراد کا مقابلہ دیوانے کا خواب تھا۔ ایک ایسی مہم جس کی ناکامی کا امکان دیکھا جائے تو ننانوے فیصد سے بھی زیادہ تھا اور کامیابی کا امکان ہزار میں ایک بھی نہیں تھا۔ اس لیے اسے دیوانے کا خواب کہا جاسکتا تھا۔ مگر میں اوپر والے کے بھروسے پر جا رہا تھا۔ مجھے اُمید تھی کہ جیسے اس نے پہلے بے شمار مواقعوں پر ناقابلِ یقین کامیابی دی تھی اسی طرح اس مہم میں بھی کامیاب کرے گا۔ اور سورج ڈھلتے ہی نیچے تاریکی چھانے لگی تھی۔ ہم نے کچھ مشعلیں جلالیں مگر اس طرح کہ ان کی روشنی براہِ راست دور سے نہ دیکھی جاسکے اور آس پاس اجالا رہے۔ دن ڈھلا اور گرمی میں کمی آئی تو سب اٹھ گئے تھے۔ خوش گپیوں کے ساتھ کھانے پینے کا سلسلہ جاری تھا۔ وہ سب نوجوان تھے اور ان کی گفتگو کا مرکز

لڑکیاں تھیں۔ تقریباً سب کی کوئی نہ کوئی پسند تھی۔ ربیک میرے ساتھ تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔
''تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے؟''
اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نے کبھی اس بارے میں سوچا ہی نہیں۔''
''ان سب کو تو کوئی نہ کوئی پسند ہے۔''
''مجھے بھی شاید کوئی پسند آجائے۔'' اس نے کہتے ہوئے دزدیدہ نظروں سے ساشا کی طرف دیکھا۔ یہ ایک لمحاتی نظر تھی مگر مجھے اس میں پسند کا رنگ دکھائی دیا۔ وہ ایک پتھر سے یوں ٹیک لگا کر بیٹھی تھی کہ اس کی کمر کمان ہو گئی تھی اور کسی قدر فلرٹنگ کے کرتے میں اس کا یہ پوز بہت نظر نواز تھا۔ ربیک اب الاؤ جلا رہا تھا تاکہ کھانا تیار کیا جائے۔ کئی وقت سے خشک اور تیار اشیا پر گزارا ہو رہا تھا۔ انہوں نے ایک تو دلیہ نما چیز کی تیاری شروع کی اور اس کے ڈول ڈالا۔ یہاں ڈول نما برتن تھے جن میں کچھ پکایا جا سکتا تھا۔ پھر انہوں نے خشک کی ہوئی سبزیوں اور خشک گوشت کی ایک ڈش کے لیے سامان نکالا۔ الاؤ بھی اس طرح جلایا تھا کہ اس کی روشنی دور سے نظر نہ آئے۔ ایک گھنٹے میں کھانا تیار ہو گیا اور سب نے کھا بھی لیا۔ میں نے دلیہ لیا تھا کیونکہ دوسری ڈش میں گوشت تھا۔

میری ہدایت پر سب نے سیر ہو کر کھایا کیونکہ آگے کچھ پتا نہیں تھا کہ کیا ملے اور کیا نہ ملے۔ کھانے کے بعد باقی سب آرام کرنے لگے اور میں ربیک اور ایرٹ کے ساتھ میٹنگ میں لگ گیا۔ ایمار اور مارٹ کچھ فاصلے پر موجود تھے۔ مگر وہ صرف سن رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ''ایک بات ذہن میں رکھو کہ ہم ایک بہت ہی مشکل مہم پر جا رہے ہیں جہاں سے زندہ واپسی یا کامیابی کا امکان بہت کم ہے۔''
''ہم سمجھتے ہیں جناب۔'' ایرٹ نے کہا۔
''دوسرے ہم صرف ہتھیار اور پانی ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ باقی سارا سامان یہیں چھوڑ کر جانا ہوگا جس میں خوراک بھی شامل ہے۔''
''اسی لیے تو سب نے آپ کے حکم پر ڈٹ کر کھا لیا ہے۔'' ربیک ہنسا۔ ''آگے کا کچھ پتا نہیں ہے اور یہ بات سب سمجھتے ہیں۔''
''ہمیں ایک دستے کی صورت میں اندر گھسنا ہوگا۔ کیونکہ ہمیں شہر کی طرف جانا ہے اس لیے اگر وہاں کسی نے روکا تو ہمارا بہانہ ہوگا کہ دوپہر میں ہم کچھ خاص سامان لے کر معبد گئے تھے اور اب واپس آئے ہیں۔''
''اگر کسی نے پوچھ لیا کہ ہم تو جاتے نظر نہیں آئے؟'' ربیک نے سوال کیا۔
''فرض کرو تم سے یہ سوال کیا جائے تو تمہارے پاس کیا جواب ہوگا؟''
''یہی کہ ہم تقریباً صبح کے وقت گئے تھے۔ لازمی بات ہے اس دوران میں پہرہ دینے والوں کی تبدیلی ہوئی ہوگی۔''
''بہترین جواب ہے اور اسی لیے تم ہمارے سربراہ ہو گے۔'' میں نے کہا۔ ''میں بول نہیں سکوں گا اس لیے اگر کسی نے مجبور کیا تو میں گونگا بن جاؤں گا۔''
ربیک ہچکچایا مگر پھر مان گیا۔ ''ٹھیک ہے جیسا آپ کہیں۔''
''ہمارا تعلق شہر کے اندر پہرہ دینے والی فوج سے ہوگا۔ ہم اندر ہی تعینات ہیں۔''
''یعنی باہر ہونے والی جنگ سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔'' ایرٹ نے سر ہلایا۔ ''یہ مناسب حکمتِ عملی ہے ورنہ باہر موجود سپاہ کی شہر میں موجودگی کا کوئی جواز نہیں ہوگا۔''
''سب چیزیں طے کر لی جائیں تاکہ ہر شخص ایک ہی بات کرے۔'' میں نے کہا۔ ''ہماری تعیناتی مشرقی سمت میں ہوگی۔''
''ایک سوال ہے۔'' ایرٹ نے ہاتھ اوپر کیا۔ ''اگر ہم کسی وجہ سے بچھڑ جائیں تو......''
''اس صورت میں سب شہر کے وسط میں جمع ہونے کی کوشش کریں گے۔ جہاں عام لوگوں کی رہائش ہو۔ امرا، سرکاری اور شاہی علاقے سے دور نکلنے کی کوشش کریں گے کیونکہ وہاں سب سے زیادہ خطرہ ہے۔ کسی بھی مشکل صورتِ حال میں سب اپنی جان بچانے کی کوشش کریں گے۔''

رفتہ رفتہ ہم نے بہت سی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی طے کر لیں کہ کس صورت میں ہمیں کیا کرنا تھا۔ اس میں خاصا وقت لگا تھا مگر اب ایک مکمل پلان ہمارے سامنے موجود تھا۔ ہم تینوں دن میں آرام کر چکے تھے اور اب ہمیں آرام کی خاص ضرورت نہیں تھی۔ پیٹ بھرنے سے خمار کا جو وقت ہوتا ہے وہ ہم نے گفتگو کر کے گزار دیا تھا اور چاک و چوبند ہو گئے تھے۔ نصف رات سے پہلے سب تیار تھے۔ روانگی سے پہلے ربیک نے سب کو تفصیل سے اپنا پلان

بریف کیا۔ اس مہم کا کمانڈر میں تھا لیکن اگر ہمارا سامنا اندرونی پہرے داروں سے ہوتا تو ربیک کمانڈر بن جاتا۔ بریفنگ کے بعد سب ٹیلے سے اترے۔ اپنا سارا ہی سامان ہم نے ٹیلے پر ایک جگہ محفوظ کر دیا تھا۔ اب سب کے پاس ہتھیار تھے اور پانی کی چھاگلیں تھیں۔ ہاں سب نے سفید کرتے اور پاجامے پر مشتمل اپنا عام لباس بھی ساتھ رکھ لیا تھا تاکہ ضرورت پڑنے پر ہم عام آدمی کا روپ دھار سکیں۔ ربیک نے دواؤں والا تھیلا بھی ساتھ لے لیا تھا کہ اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ ہم نے تین عدد مشعلیں جلا لی تھیں۔

''جھاڑیوں سے دور رہنا ہے۔'' میں نے خبردار کیا۔ ''اگر پرندہ نظر آئے تو سب اپنی ڈھالوں کے پیچھے پناہ لیں گے۔''

ہمارے پاس چھ عدد ڈھالیں بھی تھیں۔ مگر شہر میں داخل ہونے کے بعد ہم ان ڈھالوں کو چھوڑ دیتے کیونکہ ان کا کام تو صرف میدانِ جنگ میں یا شہر سے باہر ہوتا تھا۔ شہر میں سپاہی ڈھال لے کر نہیں گھومتے ہوں گے۔ مگر اس کا فیصلہ ہم اندر جانے کے بعد ہی کر سکتے تھے۔ ٹیلے سے اتر کر ہم چوتھی کون تک آئے۔ جب اس کے نزدیک پہنچے تو اس کی اصل جسامت واضح ہوئی اور میرے ساتھی حیران ہوئے تھے کہ اس ویرانے میں یہ بیس بائیس فٹ اونچی تعمیر کیسے کی گئی ہوگی۔ یہ پکی ہوئی اینٹوں سے بنی ہوئی اتنی مضبوط تعمیر تھی کہ بے شمار سال گزر جانے کے بعد یہ ذرا بھی شکست و ریخ سے محفوظ تھیں۔ بلکہ اس کے اوپر گرد جم گئی تھی اور پلاسٹر کا کام دے رہی تھی جو اصل تعمیر کو موسم کی شکست و ریخ سے محفوظ رکھتی۔ ربیک نے اوپر کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''ہم اوپر تک نہیں جا سکتے ہیں۔''

ایرٹ نے اس کی تائید کی۔ ''ہاں یہ تو بالکل سیدھی ہے کہیں ذرا سا بھی خلا نہیں ہے۔''

''اسے اسی لیے ایسا بنایا گیا ہے کہ کوئی جانور اور پرندہ چڑھ سکے اور سوراخ سے اندر نہ جا سکے۔ اگر وہ اندر جائے گا تو بلندی اتنی ہے کہ نیچے گرنے والا جانور مر جائے گا یا شدید زخمی ہوگا۔ مگر ہم نے اس پر چڑھنا نہیں ہے۔''

''تب نیچے کیسے اتریں گے؟''

میں نے ایک مشعل لے کر جھاڑیاں ہٹائیں اور کون میں بنا ہوا خفیہ دروازہ سامنے آ گیا۔ ''دروازہ......'' ربیک نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ''یہ کس نے بنایا ہے؟''

''کیرٹ نے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اسی نے مجھے اس بارے میں بتایا تھا۔''

''آپ نے پہلے بھی اسے دیکھا ہے؟'' ربیک نے پوچھا۔

''ظاہر ہے ورنہ میں تم لوگوں کو سیدھا یہاں کیسے لاتا۔ میں روبیر کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ کیرٹ نے نہ جانے کیسے اسے بنوایا اور یہاں سے نیچے اترنے کا مکمل انتظام بھی کیا۔'' میں نے انہیں رسیوں کے بنڈل دکھائے جو یہاں موجود تھے۔ اگرچہ ہمیں ان کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ہمارے پاس بھی خاصی رسی تھی۔ اپنے باپ کا نام سن کر ساشا آگے آئی۔ اس نے خفیہ دروازہ دیکھا۔

''یہ بابا نے بنوایا ہے؟''

''ہاں یہ کیرٹ نے بنوایا ہے۔ صرف یہی نہیں اس نے اپنے لوگوں کی آزادی کے لیے اور بھی بہت کچھ کیا ہے۔''

''اپنی جان تک دے دی۔'' ساشا بولی۔

''ہاں انسانوں میں سب سے عظیم وہی مانا جاتا ہے جو دوسروں کے لیے اپنی جان دیتا ہے اور کیرٹ نے یہ عظمت حاصل کر لی ہے اب ہمیں اس کے نقشِ قدم پر چلنا ہے۔ اس وادی کی آنے والی نسلوں اور ان کی آزادی کے لیے ضرورت پڑنے پر اپنی جان بھی قربان کرنی ہے۔''

میری اس بات پر ساشا مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی اس نے آہستہ سے کہا۔ ''تمہارا تعلق یہاں سے نہیں ہے۔''

''میرے نزدیک سب انسان ایک سے ہیں۔''

ربیک نے اندر گھس کر احتیاط سے دروازہ کھولا۔ پچھلی بار یہ بہت مشکل سے کھلا تھا مگر اس بار آسانی سے کھل گیا۔ اس نے اندر جھانکا اور پھر پلٹ کر بولا۔ ''سرنگ میں روشنی ہے۔''

''سرنگ میں ہمہ وقت روشنی ہوتی ہے کیونکہ یہاں دن میں بھی تاریکی ہوتی ہے۔'' میں نے بتایا اور آگے آیا۔ کچھ دیر دیکھتا رہا مگر اندر کوئی حرکت نظر نہیں آئی۔ اگر یہاں پہرہ تھا تو کوئی پہرے دار اس حد تک نہیں آ رہا تھا۔ میں نے پہلے خود جانے کا فیصلہ کیا۔ رسی کو ذرا فاصلے پر موجود ایک مضبوط درخت کے تنے سے باندھ دیا تھا۔ میں نے اپنے تمام ہتھیار اتار دیے۔ رسی کو مخصوص انداز میں اپنے بازو کے گرد لپیٹا اور پھر اس کا ایک حصہ پاؤں

میں لپیٹنا۔ وہ غور سے مجھے دیکھ رہا تھا کہ میں یہ کیا کر رہا ہوں؟ میں نے رسی نیچے پھینکی اور پھر خود بھی اچانک ہی سر کے بل نیچے گیا۔ مجھے یوں گرنے کے انداز میں جاتے دیکھ کر ان لوگوں کے منہ سے اضطراری آوازیں نکلی تھیں اور بیک وقت کئی سرکون کے خفیہ دروازے پر نمودار ہوئے تھے۔ مگر جب انہوں نے مجھے الٹا لٹکتے پایا تو اطمینان کا سانس لیا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”کوئی اور اس طرح نہ آئے اور اگر میں ہاتھ دائرے میں لہراؤں تو رسی اوپر کھینچنا۔“

میں کہتے ہوئے نیچے سرکنے لگا۔ ایک پاؤں پر رسی لپٹی تھی اور دوسرے جوتے کی نوک سے اسے کھلنے سے روک رہا تھا۔ جب میں بیک وقت نوک اور ہاتھوں کی گرفت نرم کرتا تو نیچے پھسلنے لگتا تھا۔ بہ ظاہر یہ بڑا خطرناک تھا مگر رسی سے نیچے جانے کا سب سے آسان طریقہ تھا کیونکہ آپ کا سر نیچے ہوتا ہے اور آپ سب دیکھ رہے ہوتے ہیں اگر میں سیدھا جاتا تو پہلے میرے پاؤں ظاہر ہوتے اور میں نہیں دیکھ سکتا تھا کہ سرنگ میں کوئی ہے جو مجھے دیکھ سکتا ہے۔ اب پہلے میں دیکھتا اور پھر کسی کو نظر آتا۔ رفتہ رفتہ رسی چھوڑتے ہوئے میں نیچے تک آیا۔ میں نے نیچے اتنی ہی رسی پھینکی تھی جو سرنگ کے فرش سے ذرا اوپر ختم ہو جائے بالکل نیچے تک نہ جائے۔ یہ فرش سے کوئی پانچ فٹ اوپر تھی۔ ایک منٹ بعد میرا سر سرنگ کی چھت تک پہنچ گیا۔ میں نے گردن گھما کر دونوں طرف دیکھا۔

اگرچہ درخت کے بڑے تنوں سے بنی تکونی شکل کی آرچ جس نے چھت کو سہارا دیا ہوا تھا وہ نظروں میں حائل تھیں مگر دس گز تک زمین صاف نظر آ رہی تھی اور یہاں کوئی فرد نہیں تھا۔ احتیاطاً میں مزید نیچے ہوا۔ دونوں طرف سرنگ دور تک صاف اور خالی تھی۔ ہر دس قدم کے بعد دونوں طرف دیوار میں مشعلیں روشن تھیں۔ میں نے رسی سے پاؤں نکالا اور اب میں سیدھا جھول رہا تھا۔ فرش میرے پیروں سے کوئی چار فٹ نیچے تھا مگر میں سیدھا نہیں اترا بلکہ ذرا سا جھولا لیا اور آرچ کے ستون کی آڑ میں کودا تھا۔ ستون کوئی دو فٹ موٹا اور مضبوط ترین لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ اس کے اوپر تختے لگے تھے جو اصل میں مٹی کو نیچے آنے سے روکنے کے لیے تھے۔ سرنگ کا فرش اور دیواریں پکی ہوئی اینٹوں کی بنی ہوئی تھیں۔ رسی چھت سے نیچے آ رہی تھی میں نے اسے بھی سمیٹ کر کنارے کر لیا۔ اگرچہ یہاں کوئی نہیں تھا مگر آنے کا احتمال بھی تھا اور ہم جتنا نظروں سے بچتے اتنا

محفوظ رہتے تھے۔

میں نے جھانک کر اوپر اشارہ کیا تو پہلے ایرٹ آیا۔ وہ بھی نیچے اترتے ہی ستون کی آڑ میں ہو گیا۔ اس کے بعد ایمار آیا تھا۔ باری باری سب نیچے آتے رہے اور ستونوں کی آڑ میں ہوتے رہے۔ دس منٹ میں سب نیچے آ گئے تھے۔ پھر ایرٹ اور ایمار نے ایک کام کیا۔ ایمار ہلکے جسم کا تھا۔ وہ ایرٹ کے شانوں پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہوا اور اس نے رسی کو لپیٹ کر ستون کے اوپری حصے میں یوں چھپا دیا کہ نیچے کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ رسی اوپر سے کون کی اندرونی دیوار کے ساتھ چپکی ہوئی تھی اس لیے نیچے سے نظر نہیں آ رہی تھی آخر میں ربیک آیا تھا جو دروازہ بند کرتا آیا تھا۔ اب ہم اس راستے کو واپسی کے لیے استعمال کر سکتے تھے لیکن میری خواہش تھی کہ ہماری واپسی نہ ہو اور ہم یہیں کامیاب ہو کر رہیں۔ ساشا درمیان میں آئی تھی اور میں اسے دیکھ کر حیران ہوا تھا کیونکہ اس نے سر پر ایک اسکارف نما کپڑا باندھ لیا تھا تاکہ اس کے بال چھپ جائیں اور چہرے پر ہلکی سی مٹی مل لی تھی جس سے اس کی جلد کی ملائم پن اور نرمی چھپ رہی تھی۔ یہ احتیاط ربیک نے بھی کی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”کسی سے سامنا ہونے کی صورت میں سامنے مت آنا۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں سمجھتی ہوں۔“

ہم دیواروں سے لگے لگے اور ستونوں کی آڑ لیتے ہوئے سرنگ کے دہانے کی طرف بڑھے۔ یہاں سے آرگون میں نکلنے والا دہانہ زیادہ دور نہیں تھا۔ کیونکہ سرنگ آخری حصے میں اوپر اٹھ رہی تھی اور یہ والا حصہ نیچا تھا اس لیے سرنگ کا دہانہ بالکل نزدیک جانے پر نظر آیا۔ اس سے ہمیں بھی آسانی رہی کہ کوئی ہمیں وہاں سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہم دس منٹ میں دہانے تک پہنچ گئے اور پہلے میں نے دیوار سے لگ کر باہر دیکھا۔ اس وقت باقی سب پیچھے تھے۔ سامنے وسیع میدان تھا۔ میں اس جگہ سے گزر چکا تھا۔ اس لیے یہاں کا نقشہ میرے ذہن میں تھا۔ یہ میدان بیک وقت شاہی محل، سرکاری دفاتر اور کسی قدر امرا کے محلات کے ساتھ لگتا تھا۔ مگر یہاں آمد و رفت کے دو راستے تھے۔ ایک راستہ جو براہِ راست شاہی محل سے آتا تھا۔ دوسرا سرکاری عمارتوں کی طرف سے آتا تھا۔ ہمیں اسی طرف سے جانا تھا۔ کیونکہ یہیں سے گزر کر ہم شہر تک رسائی حاصل کر سکتے تھے۔

پہلے میرا ارادہ تھا کہ شاہی محل پر براہِ راست دھاوا بولا جائے مگر جب ساشا نے اس کے حفاظتی انتظامات کے بارے میں بتایا تو میں نے ارادہ ترک کر دیا۔ اب ہمیں شہر میں پہلے ان مددگار گروہوں تک رسائی حاصل کرنی تھی جو پورے شہر میں پھیلے ہوئے تھے اور کیرٹ نے نقشے پر ان کی نشان دہی کی تھی۔ مگر اس نے مزید یہ نہیں بتایا تھا کہ میں ان تک رسائی کیسے حاصل کروں گا۔ آرگون بہت بڑا شہر نہیں ہے۔ ہمارے حساب سے یہ ایک معمولی سا قصبہ کہلا سکتا ہے۔ اس کی آبادی تیس ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ مگر کسی کو تلاش کرنے کے لحاظ سے یقیناً یہ خاصا بڑا شہر تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ ریناٹ کے خلاف بغاوت کرنے والوں کا کوئی اتا پتا نہیں تھا اور ہم دروازے بجا کر لوگوں سے ان کے بارے میں نہیں پوچھ سکتے تھے۔ معلوم نہیں کیوں کیرٹ نے اتنا اہم نقطہ نظر انداز کر دیا تھا۔ اس وقت میں نے بھی اس پر توجہ نہیں دی تھی۔

مگر اب ہم شہر میں تھے اور باغیوں سے رابطہ کرنا از حد ضروری ہو گیا تھا کہ وہی میری اصل مدد کر سکتے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ہمیں سرکاری علاقے کے بجائے کسی اور راستے سے آگے جانا چاہیے مگر میں کسی ایسے راستے سے لاعلم تھا اور میرے ساتھی تو پہلی بار اس شہر میں آئے تھے۔ صرف ایک ساشا تھی جو اس شہر سے اچھی طرح واقف تھی۔ میں نے اشارے سے ساشا کو آگے بلایا اور اس سے کہا۔ ”وہ دیکھو عام شہر کی طرف جانے کے لیے وہ ایک راستہ ہے کیا تمہارے علم میں کوئی دوسرا راستہ ہے؟“

”ہے۔“ اس نے خلافِ توقع کہا۔ ”وہ امرا کے محلات کے درمیان سے گزرتا ہے مگر وہاں بھی سخت پہرہ ہوتا ہے اور عام لوگ یا فوج اس راستے سے نہیں گزرتی ہے صرف امرا اور ان کے ملازمین یہ راستہ استعمال کرتے ہیں۔“

”کیا یہ فصیل تک جانے کے لیے مختصر پڑتا ہے؟“

”ہاں اس راستے سے کم ہے۔“ ساشا نے سر ہلایا اور سرکاری دفاتر کے درمیان سے گزرنے والے راستے کی طرف اشارہ کیا۔ میں ساشا کے ہمراہ واپس آیا۔ ایرٹ اور ربیک کے سامنے صورتِ حال رکھی۔

”سرکاری دفاتر والے راستے پر فوجی دستے ملنے کا پورا امکان ہے۔ اگر انہوں نے روک لیا اور ہم کسی سوال کا تسلی بخش جواب نہ دے سکے تو راز فاش ہو جائے

اصلاح پسند

(Reformist)

اس اصطلاح کا اطلاق ایران میں امریکا کے حامیوں پر ہوتا ہے اور یہ اصطلاح اس وقت سامنے آئی جب 1997ء میں ایران میں انتخابات کا انعقاد عمل میں آیا۔ ایرانی انتخابات سے پہلے سی آئی اے نے کانگریس سے درخواست کی کہ اسے سالانہ بجٹ کے علاوہ 20 ملین ڈالر کی مزید رقم دی جائے تاکہ وہ یہ رقم ایران میں اپنے حامیوں کی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لیے استعمال کر سکیں۔ امریکی جس ملک میں اور جہاں کچھ خرچ کرتے ہیں ان کا صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ وہ امریکی مصنوعات کا دائرہ متعلقہ ملک تک بڑھا دیں۔ ایران میں اصلاح پسندوں کے لیے 20 ملین ڈالر کی رقم مختص کرنے کا بھی یہی مقصد اور مدعا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جینز پہننے لگے اور نوجوان لڑکیوں نے حجاب اتار دیے۔ مئی 2004ء میں ایران کے اصلاح پسند ارکان پارلیمنٹ نے عورتوں کو مردوں کے مساوی وراثت دینے کا مسودۂ قانون منظور کرا لیا جس کے نتیجے میں دوسرے وارث نہ ہونے کی صورت میں بیوہ اپنے خاوند کی تمام جائیداد کی وارث ہو گی جب کہ 75 سال پہلے منظور ہونے والے قانون کے تحت اس وقت بیوہ کو نصف جائیداد ملتی تھی اور نصف ریاست کے پاس چلی جاتی ہے۔ عورت کی وفات کی صورت میں اس کے خاوند کو اس کی پوری جائیداد مل جاتی مگر اسلامی انقلاب کے بعد اصلاح پسند پوری طرح منظر نامے سے غائب ہو گئے۔

مرسلہ: اقرار الحسن سومرو۔ خیر پور میرس

گا۔ دوسری طرف امرا کے علاقے سے عام لوگوں اور فوج کو گزرنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''یہ جنگ کا وقت ہے۔'' ایرٹ نے کہا۔ ''ایسے میں فوج کو سب کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔''

''ہم دیکھ چکے ہیں کہ ریناٹ نے سپاہیوں کو کس حد تک آزادی دی ہوئی ہے۔'' ربیک بولا۔ ''اس لیے اگر ہم امرا کے علاقے سے جائیں تو کوئی نہیں روکے گا۔''

مختصر بحث کے بعد امرا کے محلات کے درمیان سے گزرنے والا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ ہوا اور ہم روانہ ہوئے۔ سرنگ سے نکلتے ہی ہم نے دستے کا روپ دھار لیا اور اپنی چال ڈھال بھی سپاہیوں جیسی کر لی۔ ہم دھیمی رفتار سے دوڑ رہے تھے۔ ساشا کو درمیان میں اس طرح رکھا تھا کہ وہ کسی کو نظر نہ آئے۔ میدان میں شاہی محل کی فصیل کے ساتھ ساتھ ہر چند قدم کے فاصلے پر سپاہی موجود تھے اور انہوں نے سرمئی رنگ کی وردی پہن رکھی تھی۔ انہوں نے ہمیں دیکھ لیا تھا، مگر انہوں نے نہ تو ہماری طرف توجہ دی اور نہ ہی کسی نے ہمیں روکا۔ ہم آرام سے امرا کے محلات کے درمیان سے گزرنے والی شاہراہ پر آ گئے۔ یہ صاف ستھری شاہراہ پتھروں سے بنی تھی اور اس کے دونوں کناروں پر باقاعدہ فٹ پاتھ بنے ہوئے تھے۔ جن کے ساتھ بارش کے پانی کی نکاسی کے لیے نالیاں تھیں۔ یہاں عالی شان عمارتوں پر پہریدار دکھائی دے رہے تھے۔ پوری سڑک پر کنارے لگے کھمبوں پر روشن لیمپ لگے ہوئے تھے۔ یہ تیل سے جلنے والے دیئے تھے۔ ہر چیز سے یہ پوش ترین علاقہ لگ رہا تھا۔

پورا آرگون شہر تقریباً چار کلو میٹرز طویل تھا جو طوالت جنوب سے شمال کی طرف تھی اور اس کی چوڑائی مشرق سے مغرب کی طرف تین کلو میٹرز تھی۔ رقبے کے لحاظ سے یہ خاصا بڑا شہر تھا۔ یہاں جگہ جگہ میدان تھے۔ شاہراہیں بہت چوڑی اور صاف ستھری تھیں۔ اسی طرح مکانات کا سائز بھی بڑا تھا۔ عام افراد کے لیے بھی مکان خاصے بڑے اور پختہ تعمیر کیے گئے تھے۔ شمال کا پورا حصہ خاص تھا۔ یہاں شاہی محل جو اصل میں پورا ایک کمپلکس تھا۔ پھر سرکاری دفاتر اور گودام تھے۔ یہیں وہ کارخانے تھے جو ضروریاتِ زندگی کی اشیا تیار کرتے تھے۔ شاہی محل شمال مشرقی سمت تھا جب کہ دفاتر اور گودام وغیرہ شمال کی طرف کسی قدر وسط اور جنوب میں تھے۔ امرا کے محلات شمال مغرب میں تھے اور ان کا ایک چھوٹا سا حصہ سرنگ والی میدان کے ساتھ لگتا تھا۔ اس سرنگ کے ساتھ لگنے والا سرکاری علاقہ اصل میں گوداموں اور اشیا بنانے والے کارخانوں پر مشتمل تھا۔ ابھی تک ہمیں کسی نے نہیں روکا تھا اور عمارتوں کے پہریدار ان کے دروازوں تک محدود تھے۔ مجھے کوئی فوجی دستہ بھی نظر نہیں آیا تھا۔

''دن میں یہاں بہت سرگرمی تھی لیکن اس وقت یہاں سناٹا ہے فوجی دستے تک نہیں ہیں۔'' ایرٹ نے میرے ساتھ دوڑتے ہوئے کہا۔ ربیک سب سے آگے تھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے دیکھا کہ شاہی محل کی فصیل کے ساتھ بھی سپاہی موجود ہیں پہلے یہ یہاں نہیں تھے۔ جب میں یہاں لایا گیا تو سپاہی صرف فصیل پر تھے۔ احاطے کے اندر بھی سپاہی صرف عمارتوں پر تھے۔ مگر اب ایسا لگ رہا ہے جیسے ریناٹ اور شاہی محل کی حفاظت بہت زیادہ بڑھا دی گئی ہے۔''

ہم جس رفتار سے چل رہے تھے دس منٹ بعد ہم امرا کے علاقے سے نکل آئے اور عام شہری علاقے میں داخل ہوئے۔ یہاں ایک چوڑی دیوار تھی جو دونوں علاقوں کو جدا کر رہی تھی۔ مگر دیوار کے راستے پر کوئی پہرہ نہیں تھا یہاں کوئی گیٹ بھی نہیں تھا صرف راستہ بنا ہوا تھا۔ اب تک ہمیں کوئی فوجی دستہ نہیں ملا تھا۔ عام آبادی والے علاقے میں بھی ویرانی اور سناٹا تھا۔ لوگ اپنے گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔ بہت کم گھروں سے روشنی جھلک رہی تھی۔ یہاں گلیوں میں روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ میں نے دیکھا وہاں اب گندگی اور کچرے کا راج تھا ایسا لگ رہا تھا کہ اس علاقے کی صفائی ستھرائی چھوڑ دی گئی تھی۔ جب کہ پہلے عام افراد کی آبادی بھی صاف ستھری اور تمام بنیادی سہولتوں سے آراستہ تھی۔ ریناٹ کی طرزِ حکمرانی کی ایک جھلک اس علاقے کی حالتِ زار پیش کر رہی تھی۔

جب اوپری اور حکمران طبقے میں بدعنوانی آ جائے تو عام آدمی کی حالت میں ایسا ہی تغیر آتا ہے۔ جیسا کہ آرگون کے اس عام آبادی والے علاقے میں دکھائی دے رہا تھا۔ وجہ سادہ تھی کہ وسائل کا بیشتر حصہ حکمران طبقے پر خرچ کیا جا رہا تھا اور عام افراد کے لیے بہت کم حصہ رہ جاتا تھا۔ ایک جگہ چھوٹا سا پارک تھا جس کی دیکھ بھال نہ ہونے سے اس کی گھاس بڑھ گئی تھی اور دوسرے غیر ضروری پودے اُگ آئے تھے۔ چھٹائی نہ ہونے سے درخت بے ہنگم ہو رہے تھے۔ مجھے یہ جگہ عارضی پناہ کے لیے مناسب لگی اور ہم

پارک میں آگئے۔ اس کے گرد چار فٹ اونچی چار دیواری تھی اور دو طرف سے راستے تھے۔ پارک کی حالت سے لگ رہا تھا کہ کسی نے مہینوں سے یہاں کا رخ نہیں کیا ہے۔ اس لیے اب بھی کسی کے آنے کا امکان نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ ”سب یہیں رکیں میں اور ربیک باہر کا جائزہ لے کر آتے ہیں۔“

”میں بھی چلوں؟“ ایرٹ نے التجا کی۔

”نہیں تم یہاں دیکھو گے اب یہ سب تمہارے سپرد ہیں اگر کوئی ہنگامی صورتِ حال پیش آئے یا ہم واپس نہ آئیں تو تم اپنے طور پر فیصلہ کرو گے۔ اوّلین ترجیح یہاں سے بہ حفاظت واپسی کی ہوگی۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اگر آپ نہ آئے تو میں آپ کی تلاش میں نکلوں گا۔“

”نہیں۔“ اس بار میرا لہجہ سخت تھا۔ ”جیسا میں نے کہا ہے ویسا کرنا ہے۔ اب سب کی ذمے داری تم پر ہوگی یہ سوچ کر ہر فیصلہ کرنا۔“

ایرٹ نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے میں ایسا ہی کروں گا۔“

میں اور ربیک پارک سے باہر آئے اور اب ہمارا رخ آرگون کے وسطی حصے کی طرف تھا۔ ہم ابھی تک عام آبادی سے گزر رہے تھے۔ یہاں بھی ویرانی تھی۔ بہت کم گھروں سے روشنی جھلک رہی تھی۔ درحقیقت بلیک آؤٹ کا ماحول تھا حالانکہ یہاں کی جنگ میں اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم مرکزی شاہراہ تک پہنچے جو سرکاری دفاتر اور گوداموں والے علاقے سے آرہی تھی۔ یہ شاہراہ سیدھی آرگون کی فصیل کے مرکزی دروازے تک جاتی تھی۔ یہاں سے وہ میدان دکھائی دے رہا تھا جو فصیل کے ساتھ تھا اور اس کے دائیں طرف یعنی جنوب مشرق سمت فوجی دستوں کی رہائش گاہیں اور فوجی دفاتر تھے۔ وہاں مشق کے لیے میدان بھی تھے جہاں سپاہی تیر اندازی اور دوسرے طریقوں سے لڑائی کی مشق کرتے تھے۔ وہاں روشنی تھی اور سب صاف دکھائی دے رہا تھا۔ حیرت انگیز بات تھی کہ یہاں بھی اِکا دُکا لوگ نظر آرہے تھے اور وہ سپاہی تھے۔ اب تک ہمیں ایک بھی عام فرد نظر نہیں آیا تھا۔ ان کو شاید سختی سے گھروں تک محدود کر دیا گیا تھا۔ ساشا نے بتایا تھا کہ کرفیو کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزا دی جارہی تھی۔ اس شاہراہ کے پار مشرقی سمت میں بھی کچھ عام آبادی تھی۔ اچانک وہاں ایک گلی سے شور سنائی دیا اور روشنی بھی نظر آرہی تھی۔ ربیک نے اشارہ کیا۔

”وہاں کچھ ہو رہا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”آؤ دیکھتے ہیں لیکن جب تک میری طرف سے اشارہ نہ ہو معاملے میں دخل مت دینا اور کمانڈر اب تم ہو گے۔“

ہم گلی کی طرف بڑھے۔ اس میں داخل ہوتے ہی معاملہ سمجھ میں آگیا۔ چار سپاہیوں نے ایک آدمی کو نیچے گرایا ہوا تھا اور اسے بے دریغ ٹھوکروں سے مار رہے تھے۔ اس کے ساتھ ایک عورت کھڑی تھی جس نے چھوٹا سا بچہ گود میں اٹھایا ہوا تھا اور دوسرا اس کا کرتہ تھامے کھڑا تھا۔ وہی شور کر رہی تھی اور دہائیاں دے رہی تھی کہ اس کے شوہر کو نہ مارا جائے۔ مگر سپاہی اس کی چیخ و پکار سے بے نیاز اس کے شوہر کو مار رہے تھے۔ میں نے آہستہ سے ربیک سے کہا۔ ”ان سے ذرا بے نیازی سے پوچھو کہ آدمی کا قصور کیا ہے؟“

ربیک آگے بڑھا اور اس نے یوں کہا جیسے اسے اس معاملے سے خاص دل چسپی نہ ہو۔ ”اسے کیوں مار رہے ہو؟“

”یہ رات کے وقت باہر نکلا ہے۔“ ایک سپاہی نے جواب دیا۔ وردی کی وجہ سے وہ ہمیں بھی سپاہی سمجھ رہا تھا۔

”میرے بچے کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ہمیں حکیم کے پاس جانا ہے۔“ عورت بولی۔ ”ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔“

”قصور کیوں نہیں ہے۔“ سپاہی دستے کا سربراہ ایک پستہ قد مگر گٹھے جسم والا آدمی تھا۔ وہ عورت کو حریص نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے بتایا کہ یہاں تقریباً تمام ہی عورتیں اور لڑکیاں حسن کے مروجہ پیمانوں پر پوری اترتی تھیں اور وہ بہت طویل عرصے تک جوان رہتی تھیں۔ سامیرا کی مثال میرے سامنے تھی جو ستر برس سے اوپر کی ہو کر بھی جوان لگتی تھی۔ یہ عورت بھی خوب صورت تھی اگرچہ دو بچوں کی ماں تھی مگر چہرے اور جسامت سے لڑکی جیسی لگ رہی تھی۔ مار کھانے والا اس کا شوہر بھی لڑکا سا تھا۔ ربیک نے سپاہیوں سے کہا۔

”اسے کھڑا کرو۔“

سپاہیوں نے مارنا چھوڑ کر اسے بازوؤں سے پکڑ کر سیدھا کھڑا کیا۔ وہ جھول رہا تھا۔ ربیک نے اس سے پوچھا۔ ”یہ عورت ٹھیک کہہ رہی ہے؟“

”یہ میری بیوی...... ہے۔“ اس نے بہ مشکل

کہا۔ ''ہمارا چھوٹا بیٹا...... بیمار ہے۔''
''تمہیں معلوم ہے کہ رات کے وقت باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے تمہیں صبح تک انتظار کرنا ہوگا۔''
''اب اسے سزا ملے گی۔'' دستے کے سردار نے کہا۔ ''گرفتار کرلو انہیں۔''
''نہیں بس کافی سزا مل گئی ہے۔'' ربیک نے کہا۔ ''انہیں جانے دو۔''
''تمہارا اس معاملے سے تعلق نہیں ہے۔'' سردار رعونت سے بولا۔
''میرا تعلق ہے کیونکہ میرا تعلق شہر کی فوج سے ہے اور میں تم سے کہیں بڑا افسر ہوں۔''
پستہ قد نے غور سے ربیک کو دیکھا۔ ''اگر ایسا ہے تو تمہارے نشانات کہاں ہیں اور پٹکا کہاں ہے؟''
''میرا لباس خراب ہوگیا تھا اور میں اس وقت عام لباس میں ہوں اگر تم میرے ساتھ چلو تو میں تمہاری تسلی کرا سکتا ہوں۔'' ربیک نے بلف کیا اور پھر خاندان کی طرف اشارہ کیا۔ ''ان کو بھی لے چلو۔ وہاں میں انہیں بھی اپنے افسر کے سامنے پیش کردوں گا۔''
''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' سردار نے فوری فیصلہ کرلیا۔ ''ویسے بھی اس وقت جیل پوری طرح بھر گئی ہے۔ کل رات بھی ہم نے بہت سے لوگوں کو پکڑا تھا۔''
ربیک اور میں چونکے مگر اس سے سوال نہیں کرسکتے تھے ورنہ وہ مشکوک ہوجاتا۔ کل رات بہت سے لوگوں کو کیوں پکڑا گیا تھا؟ ربیک نے حاضر دماغی سے کام لیا۔ ''اسی لیے تمہیں گرفتار کرنے سے منع کررہا ہوں۔ جیل میں بالکل بھی جگہ نہیں ہے۔''
''انہیں تو میں......'' سردار بولتے بولتے رک گیا مگر میں سمجھ گیا تھا کہ وہ انہیں اپنی تحویل میں رکھتا اور اس کی نیت عورت پر خراب تھی۔ مگر ہمارے آنے سے اس کے متوقع رنگ میں بھنگ پڑ گیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور وہ چاروں وہاں سے جانے لگے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے آدمی سے کہا۔
''تم کہاں رہتے ہو؟''
''یہ سامنے میرا مکان ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ اب وہ بہتر نظر آرہا تھا۔ جان بچنے اور گرفتار نہ ہونے پر وہ خوش تھا۔ ''میں آپ کا شکرگزار ہوں کیا آپ کچھ دیر کے لیے میرے مہمان بنیں گے۔''

''کیوں نہیں۔'' ربیک نے میرا اشارہ سمجھ کر سر ہلادیا۔ کچھ دیر میں ہم اس چھوٹے لیکن صاف ستھرے اور سجے ہوئے مکان میں تھے۔ یہاں فرش پر اون سے بنے ہوئے نمدے نما قالین تھے مگر یہ آرام دہ تھے۔ ہم اپنا اسلحہ اتار کر بیٹھ گئے۔ آدمی اندر گیا اور پہلے پانی لے آیا۔ اس کا لباس نیچے گرنے سے خراب اور زخموں کی وجہ سے خون آلود ہورہا تھا۔ ربیک نے اس سے کہا۔ ''تم جاکر لباس بدل لو اور اپنے زخم بھی دیکھ لو۔''
وہ سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔ کچھ دیر بعد عورت پیالیوں میں مقامی چائے اور بسکٹ نما میٹھی ٹکیاں لے آئی۔ وہ بچ بچ بہت کمسن اور معصوم سی تھی۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کتنے بڑے خطرے سے بچی تھی اگر سپاہی اسے اور اس کے شوہر کو گرفتار کرکے لے جاتے تو اس کے ساتھ بہت برا ہوتا۔ اس وقت بھی وہ ہمارے سامنے اپنی پوری معصومیت کے ساتھ موجود تھی یہ سوچے بغیر کہ ہم بہ ظاہر اسی فوج سے تعلق رکھتے تھے جو کچھ دیر پہلے اس کے شوہر پر تشدد کررہی تھی۔ درحقیقت یہ لوگ جانوروں کی طرح سادہ ذہن رکھتے تھے اور ان میں خطرہ بھانپنے کی وہ صلاحیت نہیں تھی جو اس وادی سے باہر انسانوں میں پائی جاتی ہے۔ ربیک نے اس سے پوچھا۔ ''تمہارے بچے کو کیا ہوا ہے؟''
''اسے بخار ہے اور بہت کھانس رہا ہے۔''
''اسے لے کر آؤ۔'' ربیک نے کہا اور دواؤں کا تھیلا نکالا۔ عورت بیٹے کو لے آئی۔ یہ سنہری بالوں اور نیلگوں آنکھوں والا بہت پیارا سا بچہ تھا اس کی عمر چھ سات مہینے سے زیادہ نہیں تھی۔ مگر صحت اچھی تھی۔ ربیک نے اسے دیکھا اور پھر ایک لکڑی کی ڈبیا نکال کر اس میں موجود بام بچے کے سینے پر ملا اور دوسری ڈبیا سے خمیرہ نما چیز نکال کر اسے انگلی سے چٹائی۔ بچہ مزے سے اس کی انگلی چوسنے لگا۔ ربیک نے عورت سے کہا۔ ''ابھی اسے دودھ مت دینا اور اسے کپڑے میں لپیٹ دو مگر زیادہ گرم کپڑا نہ ہو بس اسے ہوا نہ لگے۔''
عورت بچے کو اندر لے گئی۔ اس دوران میں اس کا شوہر آگیا۔ اس نے اپنے زخم صاف کرکے کپڑے بدل لیے تھے۔ ہمیں تنہائی کے جو چند لمحے ملے اس میں میں نے ربیک سے کہا کہ وہ کل ہونے والے ہنگامے کی ان سے پوری رپورٹ لے مگر اس طرح کہ انہیں محسوس نہ ہو۔ مرد کے آنے پر میں خاموش ہوگیا۔ وہ بہت احسان مند تھا اور

بار بار اس کا ذکر کر رہا تھا۔ مرد کا نام راٹر تھا جب کہ اس کی بیوی کا نام رینور تھا۔ ربیک نے اس کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ لکڑی کا کام کرتا تھا اور آرگون کے سب سے بڑے کارخانے میں سپر وائزر تھا۔ رینور گھریلو عورت تھی۔ وہ بچوں کی دیکھ بھال کرتی تھی مگر چند دن پہلے تک وہ باغات میں کام کرنے جاتی تھی کیونکہ آرگون کی تمام ہی نوجوان آبادی کو جبری فوجی قانون کے تحت بھرتی کرلیا گیا تھا اور انہیں ان کے گھر والوں سے دور فوجی بیرکوں میں رکھا جارہا ہے۔ راٹر صرف اس لیے بچ گیا تھا کہ وہ ہتھیار سازی کے شعبے میں کام کرتا تھا ورنہ اسے بھی جبری بھرتی کرلیا جاتا۔ یہ اس نے بعد میں بتایا۔ ربیک نے ہوشیاری سے اس سے سوالات شروع کیے اور پھر اسے کل والے واقعے پر لے آیا۔ اس نے کہا۔

''ہم پرسوں سے شہر سے باہر تھے۔ کل یہاں کیا ہوا تھا؟''

راٹر نے چونک کر ہمیں دیکھا اور پھر ہچکچا کر بولا۔ ''آپ کو پتا ہوگا جناب آپ کا تعلق فوج سے ہے۔''

''میں نے بتایا نا کہ ہم پرسوں سے گئے ہوئے تھے اور ابھی واپس آئے ہیں۔ تم بے فکر ہوکر بتاؤ۔''

اس نے کہنا شروع کیا۔ ''کل اچانک ہی فوج نے شہر کے سات آٹھ مقامات پر صبح سے چھاپے مارنا شروع کیے اور بہت سے لوگوں کو پکڑ کرلے گئے۔''

''کیوں؟'' ربیک نے پوچھا۔

''پتا نہیں جناب۔'' وہ جلدی سے بولا۔

ربیک نے اس کے چہرے پر نظر جما کر کہا۔ ''تمہیں معلوم ہے اور تم جانتے ہو ہمیں معلوم ہو جائے گا اس لیے تمہارے نہ بتانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

راٹر مشکل میں دکھائی دے رہا تھا ہم اس کے محسن تھے اور وہ یہ بات اچھی طرح سمجھتا تھا کہ ہم نے کس موقع پر اس کی مدد کی تھی۔ اگر ہم مداخلت نہ کرتے تو سپاہی اسے اور اس کی بیوی کو لے جاتے۔ اس کی بیوی کے ساتھ جو ہوتا وہ یہاں متعدد عورتوں کے ساتھ ہو چکا تھا اور راٹر بھی اس سے بے خبر نہیں ہوگا۔ اس نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ ''مجھے ٹھیک سے نہیں معلوم مگر سنا ہے کہ چھاپوں میں باغی پکڑے گئے ہیں جو شاہ معظم کے خلاف دشمنوں کا ساتھ دے رہے تھے۔''

اب سمجھ میں آگیا کہ صبح ہمیں ٹیلے سے آرگون میں زبردست سرگرمی کیوں دکھائی دی تھی یقیناً باغیوں کو گرفتار کرکے وہاں لایا جارہا تھا اور جیسا کہ راٹر پر تشدد کرنے والے دستے کے سردار نے کہا تھا کہ جیل میں گنجائش ختم ہوگئی ہے۔ کیرٹ نے جن مددگار گروپوں کا ذکر کیا تھا وہ سب پکڑے جاچکے تھے یا ان میں اکثریت اب جیل میں تھی۔ گویا شہر میں اس وقت کوئی ہماری مدد کرنے والا باقی نہیں رہا تھا یا اگر تھا تو وہ خود چھپتا پھر رہا ہوگا اور اسے خود مدد کی ضرورت ہوگی۔ ربیک نے پوچھا۔ ''کتنے لوگ پکڑے گئے ہیں۔''

راٹر حساب کتاب سے نا آشنا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو پھیلا کر کہا۔ ''یہ جتنی انگلیاں ہیں اتنی ہی بار اور پھر پانچ بار اور۔''

ربیک نہیں سمجھا تھا مگر میں سمجھ گیا۔ اس کا مطلب تھا دس ضرب دس ضرب پانچ برابر پانچ سو۔ یعنی پانچ سو کے قریب افراد گرفتار ہوئے تھے۔ کیرٹ نے بتایا تھا کہ باغی تعداد میں زیادہ نہیں تھے اور اگر پانچ سو بندے پکڑے گئے تھے تو تقریباً سارے باغی اس وقت جیل میں تھے۔ وہ صرف قید نہیں تھے ان کی جان کو بھی خطرہ تھا۔ ریناٹ انہیں بخشتا نہیں۔ اس دوران میں رینور بھی آکر وہاں بیٹھ گئی تھی اس نے ربیک کو بتایا کہ اب بچہ سکون میں تھا اور اس کا بخار بھی کم ہوگیا تھا۔ کھانسی بند ہونے سے اسے نیند آگئی تھی۔ راٹر نے سنا کہ ہم نے اس کے بچے کا علاج بھی کردیا ہے تو وہ مزید شکر گزار ہوگیا۔ اس نے کہا۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ فوج میں ایسے آدمی بھی ہوں گے......'' بولتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہ کیا کہہ گیا ہے تو اس نے بوکھلا کر کہا۔ ''میرا مطلب ہے......''

''میں سمجھتا ہوں تمہارے احساسات۔'' ربیک نے ہاتھ اٹھا کر کہا وہ بہت عقل مندی سے بات کررہا تھا۔ ''مت بھولو کہ میرا تعلق بھی تم لوگوں سے ہے میں اسی طبقے کا ایک فرد ہوں اور یہاں ہونے والا بہت کچھ مجھے پسند نہیں ہے۔''

راٹر نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''شکریہ جناب ورنہ آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں پھر مشکل میں پڑ جاتا۔''

''جن جگہوں پر چھاپہ پڑا ان میں سے یہاں کی کوئی جگہ بھی ہے؟'' ربیک نے ایک پھر وہی سوال کیا جو میرے دل میں تھا۔

اس کا جواب رینور نے دیا۔ ''ہماری پچھلی گلی میں

چار گھروں سے لوگ پکڑے گئے۔ میں نے شور ہونے پر پچھلی دیوار سے جھانک کر دیکھا تھا۔ سپاہی اتنے لوگ پکڑ کر لے گئے۔''

رینو نے انگلیاں پھیلا کر انہیں تین بار کھولا اور بند کیا۔ یعنی سپاہی تیس کے قریب افراد لے گئے تھے۔ اب ربیک نے رینور سے سوالات شروع کیے اور اس سے جو تصویر سامنے آئی وہ کچھ یوں تھی کہ صبح کے وقت جب مرد کاموں پر جا چکے تھے۔ سپاہیوں نے اس گلی کو اور اس سے آگے پیچھے والی گلی کو گھیر لیا اور پھر مخصوص گھروں میں گھسے تھے۔ چار گھروں میں موجود ہر فرد کو انہوں نے گرفتار کر لیا۔ ان میں چھ سات عورتیں بھی تھیں۔ صبح کا وقت اس لیے منتخب کیا گیا کہ اس وقت لازمی سب مردوں عورتوں کو کام پر ہونا چاہیے تھا مگر وہ گھروں میں پائے گئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اتنی عیاری صرف ڈیوڈ شاد کھا سکتا ہے یقیناً ریناٹ کے پیچھے اس کا دماغ کام کر رہا تھا۔ اسی نے شہری آبادی کے خلاف یہ پلان تیار کیا تھا کہ جبری بھرتی اور عورتوں کو مشقت پر لگا کر کسی بھی ممکنہ بغاوت کا سدباب کیا جائے۔ اس طرح باغیوں کو میل ملاقات اور میٹنگوں سے بھی روکا جا سکتا تھا۔

ربیک سوال کر رہا تھا۔ راٹر اور رینور جواب دے رہے تھے اور میں ان کا تجزیہ کر رہا تھا۔ رفتہ رفتہ شہر کی ایک مجموعی تصویر سامنے آ رہی تھی کہ بہت سے گھروں میں کیوں تاریکی تھی اور یہاں اتنا زیادہ سناٹا اور ویرانی کیوں تھی؟ ریناٹ اور اس کے ٹولے کا جبر و تشدد صاف دکھائی دے رہا تھا۔ حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ شہر میں اب روایتی فوج کم رہ گئی تھی مگر شاہی اور سرکاری علاقے کی حفاظت کے لیے نہایت تربیت یافتہ گارڈز ضرور موجود تھے۔ میں ایک سوال کرنا چاہ رہا تھا مگر ان لوگوں کے سامنے نہیں کر سکتا تھا ورنہ وہ میری زبان سن کر چونک جاتے۔ میں نے اشارے سے ربیک کو باہر چلنے کو کہا۔ ربیک سمجھ گیا اس نے ان دونوں سے وہیں ٹھہرنے کو کہا اور میرے ساتھ باہر آیا میں نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔ ''رینور سے پوچھو کہ چھاپہ مارنے والی فوج نے کیسی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ راٹر کو بھی کریدو کہ شہر میں فوج کی کیا پوزیشن ہے اور باہر فوجی کتنی تعداد میں دکھائی دیتے ہیں؟''

ربیک نے سر ہلایا اور ہم واپس اندر آئے۔ ربیک نے فوری سوال نہیں کیا اور گپ شپ کے انداز میں بات کرتا رہا۔ اس نے شرارت بھرے انداز میں رینور کی تعریف کی اور راٹر سے کہا۔ ''تم خوش قسمت ہو جو اتنی حسین بیوی کے شوہر ہو۔''

رینور شرما گئی اور راٹر مسکرانے لگا اس نے برا نہیں منایا تھا۔ ''آپ نے ٹھیک کہا میں سینتور کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔''

''میں تم لوگوں کے لیے کھانے کو کچھ لاؤں؟'' رینور نے پوچھا۔

''نہیں مجھے معلوم ہے تم لوگوں کے پاس خود اپنے لیے کم ہے اس لیے زحمت مت کرو۔'' ربیک نے منع کر دیا اس نے چائے اور میٹھی ٹکیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ بھی بہت ہے۔''

وہ دونوں شرمندہ نظر آنے لگے۔ رینور نے کہا۔ ''جو آپ نے ہمارے لیے کیا ہے اس کے مقابلے میں یہ کچھ بھی نہیں ہے۔''

''مگر اس شہر میں جو عام لوگوں کے ساتھ ہو رہا ہے اس پر مجھے بہت شرمندگی ہے۔'' ربیک نے بات آگے بڑھائی۔ ''یہاں چھاپہ مارنے والے کیا فوجی وردی میں تھے؟''

رینور نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ سرمئی وردی میں تھے۔''

''خاص سپاہی۔'' راٹر نے آہستہ سے کہا۔ ''عام فوج شہر میں بہت کم رہ گئی ہے اور تمام ذمے داریاں خاص فوج نے سنبھال لی ہیں۔''

''مگر تم پر تشدد کرنے والے تو عام فوج کے لوگ تھے۔''

''ہاں مگر انہیں دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔ ورنہ ان گلیوں میں اب عام فوج کا کوئی سپاہی مشکل سے ہی نظر آتا ہے۔ میرا خیال ہے وہ کسی خاص......'' راٹر ایک بار پھر بولتے بولتے رک گیا۔

''تم مکمل کر بات کرو۔'' ربیک نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ''مجھے معلوم ہے کہ عام فوج کو آج کل کھلی چھوٹ دی ہوئی ہے اور وہ لوگوں کے ساتھ زیادتی کر رہی ہے۔''

راٹر نے گہری سانس لی۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہ اپنے مقصد کے تحت یہاں آتے ہیں۔ عام طور سے اکیلی رہ جانے والی عورتیں ان کا نشانہ بنتی ہیں۔ یہ اسی لیے یہاں آئے تھے اور بدقسمتی سے ہم اپنے بچے کی وجہ سے باہر نکلے اور ان کے ہاتھ آ گئے۔''

''ہمیں فصیلوں تک محدود رہنے کا حکم ہے۔'' ربیک نے کہا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو آبادی میں آنے والے بدنیتی کی وجہ سے آتے ہیں۔''

رینور نے پہلی بار میری طرف اشارہ کیا۔ "آپ ہی بول رہے ہیں یہ تو کچھ بول ہی نہیں رہے؟"

"یہ میرا ماتحت ہے اور میرے سامنے بات نہیں کرتا۔" ربیک نے جواب دیا۔ "میرا ایک مشورہ ہے تم دونوں یہاں سے چلے جاؤ۔"

"کہاں؟" راٹر پریشان ہوگیا۔

"کیوں؟" رینور نے پوچھا۔

"تم لوگ سپاہیوں کی نظر میں آ چکے ہو۔ وہ ابھی میری وجہ سے چلے گئے مگر وہ پھر آ سکتے ہیں اور اس وقت بھی آ سکتے ہیں جب راٹر کام پر ہو۔"

"ہم کہاں جائیں؟" وہ پریشان ہو گئے تھے۔ ربیک کا خدشہ انہوں نے فوراً تسلیم کر لیا تھا۔

"کسی رشتے دار کے ہاں۔" ربیک نے کہا۔ "جب تک جنگ کے حالات ہیں تم لوگ احتیاط کرو۔ لوگوں کے اندر موجود شیطان حالات کی وجہ سے باہر آ گئے ہیں۔"

اس دوران میں میں سوچ رہا تھا کہ کیا ہم راٹر پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ وہ خود بھی ریناٹ کی فوج کا ستایا ہوا تھا اگر ہم نہ آتے تو اس کے خاندان پر بہت بڑا سانحہ بھی گزر سکتا تھا۔ میں نے ربیک کو پھر اشارہ کیا اور ہم باہر آئے۔ میں نے اسے اپنے خیال کے بارے میں بتایا۔ "میرا خیال ہے ہم ان پر اعتماد کر سکتے ہیں۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ ہم ان کی مدد سے بچ جانے والے باغیوں تک پہنچیں؟"

"بالکل میرا یہی خیال ہے ہمیں اس وقت آرگون میں ٹھکانے اور مدد کی ضرورت ہے۔"

ربیک ہچکچایا۔ "جناب ان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے لیکن اگر یہ پکڑے گئے تو ہمارے بارے میں اگلنے میں زیادہ دیر نہیں لگائیں گے۔"

میں نے سر ہلایا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ہم خطرہ مول لے سکتے ہیں۔ اس شہر میں ایسا فرد تلاش کرنا جس پر ہم بھروسا کر سکیں اس وقت بہت مشکل ہے۔"

ربیک اب بھی ہچکچا رہا تھا۔ "خطرہ بہت زیادہ ہے جناب۔"

"اب خطرہ مول لیے بغیر چارہ نہیں ہے۔"

ربیک نے سر ہلایا۔ "جیسے آپ کہیں......"

ہم اندر کی طرف بڑھے تھے کہ کسی نے بیرونی دروازہ بجایا اور بجانے کا انداز خطرے کی گھنٹی بجا رہا تھا۔ انداز بہت جارحانہ تھا۔ پھر کوئی چلایا۔ "شاہ معظم کے نام پر دروازہ کھولنے کا حکم دیا جاتا ہے۔"

راٹر اور رینور بیک وقت باہر آئے۔ یہ دو کمرے کا مختصر سا مکان تھا جس میں سامنے اور عقبی سمت صحن تھا۔ راٹر کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ "یہ وہی لوگ ہیں پھر آئے ہیں۔"

مگر میں جان گیا تھا اس بار وہ راٹر اور رینور کے لیے نہیں بلکہ ہمارے لیے آئے تھے۔ ربیک بھی سمجھ گیا تھا اس نے کہا۔ "یہ تمہارے لیے نہیں ہمارے لیے آئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" راٹر چونکا۔

ربیک نے جواب دیا۔ "ہم ریناٹ کی فوج سے نہیں ہیں۔ ہمارا تعلق سامیرا سے ہے۔"

راٹر دم بخود رہ گیا تھا۔ مگر رینور نے حاضر دماغی کا ثبوت دیا۔ اس نے سرگوشی میں راٹر سے کہا۔ "تم ان لوگوں کو روکو۔"

پھر اس نے مجھے اور ربیک کو ساتھ آنے کو کہا اور ہمیں لے کر عقبی صحن میں آئی۔ اس دوران میں دروازہ بجانے کا عمل شدت اختیار کر گیا تھا۔ رینور نے ہمیں اشارے سے دیوار پھلانگ کر عقبی گلی میں جانے کو کہا۔ میں نے اچھل کر سات فٹ اونچی دیوار پر ہاتھ جمائے اور جسم اوپر اٹھایا تھا۔ ربیک نے نیچے سے مجھے ہتھیار پکڑائے اور خود بھی اچھل کر دیوار پر چڑھا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم نیچے کودتے مکان کے اگلے صحن سے راٹر کی دردناک چیخ سنائی دی۔ رینور تڑپ کر بھاگی تھی اور پھر اس کی چیخ سنائی دی تو میں نے گلی میں کودنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ربیک نے میری طرف دیکھا وہ بھانپ گیا تھا کہ میں باہر کودنے پر آمادہ نہیں ہوں۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ "ہمیں نکل جانا چاہیے۔"

"نہیں ہمیں ان کی مدد کرنی چاہیے۔" میں نے جواب دیا اور واپس صحن میں کود گیا۔ مجبوراً ربیک بھی واپس کودا۔ اس نے تیر کمان اور میں نے نیزہ سنبھال لیا۔ آگے جانے کی ضرورت نہیں تھی ہماری تلاش میں آنے والے جلد یا بدیر اسی طرف آنے والے تھے اور ان کی آوازیں بتا رہی تھیں کہ وہ اسی سمت آ رہے تھے۔ راٹر اور رینور کی اولین چیخوں کے بعد ان کی آوازیں دوبارہ نہیں آئی تھیں۔ ہمیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ موت کے ہرکارے نمودار ہوئے تھے۔

(جاری ہے)

بیت بازی

قرینہ

(عبدالجبار رومی لاہور کا جواب)

نازش ملتانی........ملتان

یوں کسی سا پتا دیتا ہے احساسِ قیام
جیسے گھر سے کہیں ہمسائے چلے جاتے ہیں

اشرف علی........لاہور

یوں لٹا خانۂ دل یاس کے ہاتھوں ہمدم
کوئی حسرت نہ رہی کوئی بھی ارماں نہ رہا

موسٰی خان........لاہور

یا مجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

(خرم علی راؤ کراچی کا جواب)

اشرف علی خان........ کراچی

نیند میں اٹھ کے جیسے کوئی چلے
جارہا ہوں کدھر خدا معلوم

(سید امتیاز حسین بخاری سرگودھا کا جواب)

اشرف علی........لاہور

یہ دو آنکھیں تو آخر کتنے منظر دیکھ پائیں گی
کسے معلوم دنیا میں بھی تو اور کیا کیا ہو

نصرت علی........ جہلم

یاد پون کی بھیگی نرم پھواروں میں
تیری یاد کا صفحہ اکثر لوٹ گیا

شیریں بانو........سیالکوٹ

یہ دل ہے اور یہ زخم یہ آنکھیں ہیں اور یہ تم
یہ شہر دیکھ لو تو یہ بازار دیکھنا

(ناہید بٹ شیخوپورہ کا جواب)

نیلوفر شاہین........اسلام آباد

اے میرے جاں نثار وہ وعدے کدھر گئے
اب کے بھی دن پیار کے یونہی گزر گئے

ظفر علی خان........ گجرات

آنگن میں دیوار اٹھانے کی کچھ ایسی ریت چلی
اپنی آگ میں جل جاتے ہیں اک دوجے سے او جھل لوگ

(نیلوفر شاہین اسلام آباد کا جواب)

عبدالحکیم........ کراچی

اس عمررواں کے دھارے پرا ے اشکِ مسلسل بہتا جا
جو ڈوب گئے سو ڈوب گئے مڑ مڑ کے انہیں کیا تکتا ہے

(منشی عزیز مئے وہاڑی کا جواب)

عبدالحکیم ثمر........اورنگی کراچی

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

عشرت صدیقی........ کراچی

یوں ہوا دل میں مرے یار کا پیکاں عزیز
جس طرح آیا ہو گھر میں کوئی مہمان عزیز

فیصل علی........لاہور

یہ کس کی چشم کی گردش نے اس کو دی گردش
کہ آسمان نہ گردش سے اک ذرا ٹھہرا

نیلم........ کراچی

یوں تو پروانہ بھی جل جائے ہے پر مشکل ہے
عشق میں میری طرح سوختہ جاں ہو جانا

(بادیہ ایمان ہارون آباد کا جواب)

کائنات علی انصاری........ حیدرآباد

راہ ناہموار بھی موسم ہے ژالہ بار بھی
تا کجے اے دوست گر گر کر سنبھلتا جاؤں میں

اشرف صبیح........ فیصل آباد

رچی ہوئی ہے بدن میں مسافتوں کی تھکن
کچھ احتیاط سے اب تو گلے لگائیں گے

کلیم الرحمٰن........ حیدرآباد

رات کا پچھلا پہر جاری ہے
اب مرے جاگنے کی باری ہے

(زاہد سلطانی کراچی کا جواب)

مریم کاشف........ حیدرآباد

زندگی کے حسین ترکش میں
کتنے بے رحم تیر ہوتے ہیں

ناعمہ تحریم........ کراچی
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جیسے
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں
(منظر علی خان لاہور کا جواب)

عنایت مسیح........ کراچی
یہ سمجھ لینا کوئی مشکل نہ تھا میرے لیے
درد کی پہچان کا رشتہ ہے کیا میرے لیے

تسلیمہ اکبر........ کوہاٹ
یہ باب ہنر ہے یہاں جو کچھ بھی کہا کر
اک ہاتھ میں چاند ایک میں سورج کو رکھا کر

افسر الدین بھٹ........ میر پور (اے کے)
یہ سوچتے سر گرداب آگئے ہم لوگ
ہوا چلے گی تو پھر بادبان کھولیں گے

انیس احمد........ اوسلو (ناروے)
یہ کیا کہ انجمن ذات ہی میں روشن ہو
کبھی تو شمع ہواؤں کے روبرو کی جائے
(عنایت خان دبئی یو اے ای کا جواب)

عارف روحیلہ........ کراچی
وہ روشنی ہے کہ ہر شے نظر سے اوجھل ہے
یہ روشنی ہے تو پھر اور تیرگی کیا ہے

سلیم حقی........ کراچی
وقت رک سا گیا ہے آنکھوں میں
اور ترا انتظار جاری ہے
(ندیم مرزا اسلام آباد کا جواب)

عارفہ شاہین تبسم........ اسلام آباد
شکریہ وعدے کا لیکن یہ تو فرما دیجیے
یاد رکھنا چاہیے یا بھول جانا چاہیے

ناہید سلطانہ........ لاہور
شکستہ روح بجھے ذہن، سوختہ احساس
دمکتے چہروں کے پیچھے بھی کچھ کھنڈر ہیں ابھی

فراز احسن........ ساہیوال
شفاف آئینے کی طرح تھا ہمارا دل
رسوائی نگاہ تو قسمت کی بات تھی
(ارباز علی کوئٹہ کا جواب)

نگار سلطانہ........ کراچی
اب یہ صورت ہے کہ ٹھہروں بھی تو لمحہ لمحہ
دور کے نقش قریب آئے چلے جاتے ہیں

انیس احمد........ راولپنڈی
آزاد دوستی بھی کرتے ہیں لوگ لیکن
پردے میں دوستی کے پتھر بھی مارتے ہیں

شائستہ جبیں........ میر پور خاص
آگ کا ہالا ہے میرے پاؤں میں
چل رہا ہوں میں زدا داروں کے بیچ
(عارف حسن شہزاد کوہاٹ کا جواب)

محمد فیضان بخاری........ ملتان
بے اثر لاکھ محبت ہو یہ رہتا ہے گماں
آج اثر، آج اثر، آج اثر ہو شاید

فراست حیدر........ جہلم
بتائیں یا نہ بتائیں اب اس کی وہ تعبیر
اسیرِ غم، غمِ پنہاں کا خواب دیکھ چکے
(ارم سلطانہ کا جواب)

سیف اللہ........ ملک وال
لگا دو ہاتھ جنازے کو پھر سنور لینا
پڑا ہے دیر سے مٹی خراب ہوتی ہے
(ایمان افروز سید لاہور کا جواب)

نازش احمد........ لاہور
جب چھٹی وہ گلی حواس تھے گم
کس نے کیا کیا کہا خدا معلوم

ناہید علی سید........ لاہور
جس کے تاروں میں چاند سورج تھے
میرے حصے کی اب وہ رات نہیں

نوشین علی........ لاہور
جان جاتی ہے آشیانے پر
اور کمبخت یہ جلا ہے بہت

احمد توفیق........ حیدر آباد
جانے والے کبھی یاد چلے آتے ہیں
ٹھنڈکیں دے کے کدھر سائے چلے جاتے ہیں

☆☆☆

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔



میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔

نام: ....

پتا: ....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے

کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 نومبر 2015ء تک علمی آزمائش 120 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

مقابلہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ ''بیت بازی'' شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام ....

پتا ....

....

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شاملِ اشاعت کر لیں (شعر الگ کاغذ پر ہے) 80

مقابلہ بیت بازی

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

علمی آزمائش۔ 120

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک علمی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 نومبر 2015ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

جنوبی ہندوستان کے تخت پر باپ کے بعد بیٹھا۔ انگریزوں نے اس کے اقتدار کو ختم کرنے کے لیے کئی حملے کیے۔ ناکام ہو جانے کے بعد ایک انگریز کو صوفی درویش کے بھیس میں اس کی ریاست میں بھیجا۔ اس نے تبلیغ دین کے نام پر لوگوں کو حکومتی اہلکاروں کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا اور کئی اہم وزیروں کو رشوتیں دے کر اس کے خلاف کر دیا۔ جب بغاوت کی زمین تیار ہوئی تو پڑوس کی ریاستوں سے چڑھائی کرا دی۔ اس جنگ میں وہ شہید ہو گیا لیکن آج بھی وہ عوام کے دلوں میں زندہ ہے۔

علمی آزمائش 118 کا جواب

عبیداللہ سندھی کے والد کا نام رام سنگھ تھا۔ کٹر سکھ مذہبی گھرانے سے تعلق تھا۔ باپ کے فوت ہونے پر والدہ ننھیال لے آئیں۔ 1878ء سے جام پور اردو مڈل اسکول میں تعلیم شروع ہوئی۔ تیسری جماعت میں تھے کہ دل میں اسلام کی چاہت پیدا ہوئی اور 15 اگست 1887ء میں گھر سے فرار ہو کر سیالکوٹ آ گئے۔ 9 ذی الحجہ 1304ھ کو سنت تطہیر ادا ہوئی۔ اسی دوران خبر ملی کہ رشتے دار تعاقب میں ہیں تو وہ وہاں سے فرار ہو کر سندھ آ گئے۔ دیوبند سے بھی تعلیم حاصل کی۔ اپنے وقت کے جید عالم دین قرار پائے۔ آج بھی ان کا نام عزت سے لیا جاتا ہے۔

انعام یافتگان

1- عابد علی راہی، سکھر 2- نوشین فراز، کوٹ ادو 3- تبریز شمسی، ملتان

4- نصیر احمد، لاہور 5- فیضان مصطفی، فیصل آباد

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے فہیم الدین صدیقی، سید عزیز الدین، ناصر حسین، فیض حسین بھٹی، افشاں بھٹی، ذوہیب رند، کوثر خان، لیاقت حسین، رانا لیاقت، رفیق خانزادہ، افضل خان، اصغر حسین، نادر پرویز، اثر حسین، اطہر علی سید، مالک خان، رفیق مغل، ملک اعجاز حسین، پروین سلطانہ، فرحت ندیم، اشفاق حسین، اشتیاق قمر، بابو دین، سلطان سومرو، فرحت الٰہی، نعیم صوفی، وقار الحسن، کائنات جمیل، اطہر حسین، اظہر علی باقری، کلثوم بی بی، فائق علی سید۔ لاہور سے منظر علی خان، مسرت اسلم، نادر احمد نوشاہی، جعفر علی خان، زریاب علی خان، عدیل الرحمن، معراج علی سید، نیاز اختر، امجد فاروق، ملک اشفاق، فارغ علی، زریاب علی خان، کاشف عباس، فاریہ ملک، زینب جوکھیو، فرزانہ رفیق، گل آپی، نعیم بٹ، خالد کاکڑ، محمد علی۔ ملتان سے مجید احمد جائی، زاہد علی چنگیزی، ناصر بیگ، فرحت مرزا، سلطان خان، نگار افروز، عباس حیدر زیدی، نعمان ربانی، خورشید حیات، صفدر کاظمی۔ راولپنڈی سے ڈاکٹر سعادت علی خان، استراج خان (گلشن آباد)، رفیق خاکانی، افتخار الاسلام، سید محمد علی زیدی، راحیل علی خان، ملک نوروز، عباس بھرگڑی، سلطان اسلم بھٹی، عنایت علی حسینی، فرحت پروین، سلطان نصیر۔ اسلام آباد سے نیلوفر شاہین، انور یوسف زئی، سیف الرحمن خان، راؤ امتیاز، شیخ نظامت علی، فاروق پراچہ، حسن علی، عبدالجبار، فہمیدہ تسلیم، امتیاز شیخ، ممتاز علی، ندیم اسلم شیخ، اعجاز حسین بھٹی۔ پشاور سے شیر نواز گل (گلبہار 3)، عباس علی، کلثوم گل، زاہد علی، اشرف عباس، زریاب گل، عابد علی، نگار گل، فرحت مسیح، اشفاق حسین زیدی، راحیل شاہ، جابر سلیم، ارشد خان، امیمہ، کلب عباس زیدی، اشرف شاہ۔ میر پور خاص سے محمد علی (سیٹلائٹ ٹاؤن)، رفیق احمد، محمد جہانگیر، فیض الحسن، معظم علی سید، انعام الدین خان، محمد جنید، اکبر خان، ثمین احمد اچکزئی، ذکیہ اشرف، کامل احمد، نادر علی انصاری، فصاحت عباس شاہ۔ ٹنڈو محمد سے تھری امولکھ۔ حیدرآباد سے: زریاب فرحان، اقرا مظاہر۔ لطیف آباد، حیدرآباد سے: طٰہٰ یاسین، نسرین رانا، توقیر جمالی، نزہت پروین، مسکان بھٹو۔ پشاور سے: محمد شہزاد اعظم، کشمالہ مفتی، گلباز خان، مفتی اکبر خان، عمران وردگ، فہیم احسان زئی، ڈاکٹر نعمان شہزاد خان۔ لاہور سے: امروز اسلم ملک، ثاقب سجاد، محمد عاقب جنید، سید محمد احسن نواز، عبدالخالق چوہدری، عبدالقادر، یاسمین ملک، فرزانہ مصطفیٰ، کائنات مرزا، شاہینہ اسلم چوہدری، روایت خان، کلثوم شہزاد، سرفراز اکرم خان، عنبرین شاہد، محمد اسلم۔ لالہ موسیٰ سے: بشریٰ اصغر، صفدر ملک، ارشد محمد ولی، صبیحہ نواز۔ کھاریاں سے: شعیب اقبالی۔ طاہر پورہ، بہاولپور سے: شاہ رخ ہاشمی۔ کوٹلی، آزاد کشمیر سے: لیاقت علی۔ بھمبر، آزاد کشمیر سے: پروفیسر خالد جاوید۔ رحیم یار خان سے یاسر ملک، فلک شیر ملک (شاہ گڑھ)، خالد ظہور (سیٹلائٹ ٹاؤن)۔ کوہاٹ سے عجب خان، محمد سلیم خان، ضیاء عباس، ادریس شاہ، ممتاز حسن۔ پاک پتن سے علی (حسن پورہ)۔ کھاناں سے سلیم کا مریڈ۔ گوٹھ غلام شاہ سے ایس ڈی ساغر، ڈاکٹر ایم رمضان۔ راجن پور سے ملک محمد ظفر اللہ۔ حیدرآباد سے ماہ رخ، احمد علی، نوشین انصاری، گل باز خان، ذکیہ وقار، نرگس چغتائی، موسن خان، تقی حیدر رضوی، فلک شاہ، صفیہ بلوچ، شعیب عباس، ممتاز علی، سانول بھیو، عابد حسن، اشرف قادری، نعمان علی، خاقان قادری۔ جام شورو سے نازنین۔ خانیوال سے: گل لیاقت، اسما توحید، ملک فیروز، اعجاز حسین محمد اقبال۔ ملتان سے: سید فیض الحسن شاہ گیلانی، کبنیٰ ارشاد، امام بخش ملک، اویس سلمان، محمد معین چشتی، نازش فاروقی، خواجہ محمد حسین، محمد شفیق بھٹی۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے: آصف اقبال، ڈاکٹر ایس اے اختر۔ سوئی ضلع ڈیرہ بگٹی سے: محمد اکمل خان۔ نوشہرو فیروز سے: نعمت اللہ سومرو۔ فرید ٹاؤن، ساہیوال سے: محمد افضل۔ اٹک سے: محمد نصیر۔ سرگودھا سے: علی اصغر گوجر، محمد سعید قریشی۔ ساہیوال سے عبدالستار (طارق بن زیاد کالونی)، محمد افضل (فرید ٹاون)۔ سیالکوٹ سے نوید شہزاد خواجہ (خادم علی روڈ)، عارف علی، منصور حسن، خواجہ انعام علی، زین العابدین، فرحت علی، عباس حیدر، شاہ رخ خان، حسن علی فرحت، نیاز علی، نذر الاسلام بھٹی، نصیر احمد، زاہد شیخ۔ مظفر گڑھ سے محمد ابوبکر صدیق (مونڈکا)، ارشد علی، فہیم الدین، کرم اللہ، حیدر علی، سلطان شاہ، فرزانہ ملک، نصرت حسن، محمد فیضان، سلطانہ ملک، احمد قریشی، فلک شیر، توقیر حسن، عمران عباسی۔ ڈی جی خان سے شہزادی ارم رفیق، رفیق احمد ناز۔ مالاکنڈ سے عبدالمعید والی (تاگرال)۔

ممالک غیر سے پاکیزہ خان (دبئی)، سلیم شیخ (اونٹاریو کینیڈا)، جمال علی خان (جرمنی)، اشرف قدوائی (یو کے)، سلیم شیخ (اٹلی)۔

موقع

محترمہ عذرا رسول
سلام تہنیت
میری زندگی بھی ایک کہانی ہے۔ اپنے حالات لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ پلیز کسی اچھے رائٹر سے اسے دوبارہ لکھوا لیں۔ پڑھنے والے کو یقیناً بہت مزہ آئے گا اور لوگ سبق حاصل کریں گے۔ اس وقت لوگ دوسروں کو ٹھگنے کے کیسے کیسے طریقے استعمال کرتے ہیں۔ اس کا علم ہونا ضروری ہے تاکہ ان پھندوں سے بچا جاسکے۔ تقریباً پندرہ سال قبل میں جس بس سے سفر کررہا تھا اس میں کچھ انوکھے ڈاکوگھس آئے۔ ان لوگوں نے ڈاکا ڈالنے کے لیے سائنٹیفک طریقہ اختیار کیا تھا جس نے میری زندگی میں انقلاب برپا کردیا۔

جلیل
(حیدرآباد، سندھ)

"اڑے جلیل ۔" سیٹھ احسان چانڈیو نے کہا۔ "بابا کب سے فارغ بیٹھا ہے ادھر یہ تھان کھلا ہے، تیرا باپ لپیٹے گا؟"

میں نے دل میں سوچا کہ باپ ہوتا تو تمہاری غلامی کیوں کرتا؟ اور منہ سے بولا۔ "سیٹھ ابھی کرتا ہوں۔ یہ تھان ابھی اور کھلیں گے۔"

سکھر کے گھنٹا گھر بازار میں کپڑے کی سب سے بڑی دکان سیٹھ احسان کی تھی۔ کوئی سو گز کی جگہ تھی اور دکان میں سیٹھ احسان کے علاوہ چھ ملازم تھے جن میں سے ایک میں بھی تھا اور مجھے یہاں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ چوتھا مہینا تھا مگر مجھے لگ رہا تھا کہ میں چار صدیوں سے یہ غلامی جیسی نوکری کر رہا تھا۔ میں شاید ایک مہینے میں چھوڑ کر چلا جاتا مگر جس مجبوری نے مجھے یہاں تک پہنچایا تھا اسی مجبوری نے مجھے ملازمت جاری رکھنے پر بھی مجبور کیا۔ سیٹھ احسان جتنا دولت مند تھا اتنا ہی خسیس بھی تھا اور جتنا خسیس تھا اتنا ہی کمینہ اور گھٹیا بھی۔ صرف میرے ساتھ ہی نہیں بلکہ تمام ملازموں کے ساتھ اس کا سلوک ایسا ہی تھا۔ ہم سب صبح نو بجے آجاتے تھے اور رات نو بجے تک کام کرتے تھے۔ اس دوران میں کھانے اور دوسری حاجات کے لیے بھی بہ مشکل جانے کی اجازت ملتی تھی۔ سیٹھ احسان کا بس نہیں چلتا تھا کہ کسی طرح سے دوران ڈیوٹی ہماری یہ حاجات بند کرادے۔

میرا گاؤں سکھر کے نزدیک ہی ہے۔ آنکھ کھولی تو گھر میں ماں نہیں تھی۔ مجھ سے بڑی دو بہنیں تھیں جواب گھر کے ساتھ مجھے بھی سنبھالتی تھیں۔ میری پیدائش کے بعد اماں بیمار رہنے لگی تھی اور میں سال کا بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ بہنیں مجھ سے تین اور چھ سال بڑی تھیں۔ نسرین سات سال کی عمر میں مجھے دیکھتی تھی جب کہ وہ خود بچی تھی۔ حرین خود کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ بابا بکریاں چراتا تھا۔ کچھ اس کی اپنی تھیں اور کچھ اجرت پر چراتا تھا۔ ہم چھوٹے تھے اور وہ ہمیں اکیلا چھوڑ کر کام پر جاتا تو اسے پریشانی ہوتی تھی۔ مگر کام پر جانا بھی لازمی تھا ورنہ ہم کھاتے کہاں سے؟ رشتے کی ایک خالہ ہمیں دیکھتی تھی۔ مگر اس طرح کہ دن میں دو تین بار گھر میں آکر جھانک جاتی تھی۔ اس سے بھی بابا کو ڈھارس



رہتی تھی کہ ہماری دیکھ بھال ہو رہی ہے۔

میں چار پانچ سال کا ہوا تو بابا نے مجھے اسکول میں داخل کرا دیا۔ میری بہنوں نے اسکول کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ مگر نہ جانے بابا کو کیسے خیال آگیا کہ مجھے اسکول داخل کرائے۔ گاؤں میں پرائمری تک اسکول تھا اور اتفاق سے اس کا اکلوتا ماسٹر ایک اچھا آدمی تھا جو سرکاری ملازم ہوتے ہوئے بھی گھر بیٹھ کر تنخواہ لینے کی بجائے روز اسکول آتا اور بچوں کو پڑھاتا تھا۔ اس کی وجہ سے میں کسی قابل ہوا۔ پانچویں پاس کی تو نسرین کی شادی ہوگئی۔ گاؤں میں لڑکیوں کو جوان ہوتے ہی بیاہ دیا جاتا ہے۔ نسرین کی عمر سولہ سال تھی۔ شکل صورت کی اچھی تھی اس لیے رشتہ بھی اچھا مل گیا۔ اس کا شوہر سکھر میونسپلٹی میں ملازم تھا۔ پرائمری کے بعد میرا خیال تھا کہ بابا مجھے اپنے ساتھ کام پر لگا لے گا۔ مگر اس نے مجھے گاؤں کے نزدیک ایک مڈل اسکول میں داخل کرا دیا۔ میں صبح اسکول جاتا اور وہاں سے آکر بابا کے ساتھ بکریاں چراتا تھا۔

بابا کے ساتھ کام بھی میں نے خود اصرار کر کے شروع کیا تھا ورنہ بابا تو چاہتا ہی نہیں تھا کہ میں یہ کام کروں۔ اس نے خود ساری عمر بکریاں چرائی تھیں اور اس کی خواہش تھی میں پڑھ لکھ کر کوئی سرکاری ملازمت کروں جیسا کہ کچھ عرصے میں بے شمار مقامی نوجوان کر چکے تھے۔ جب لوگوں کو ملازمتیں ملیں تو ان میں تعلیم کا شعور آیا یہی وجہ تھی کہ اب لوگ اپنے بچوں کو پڑھا رہے تھے۔ جو پیسے والے تھے وہ نجی اسکولوں میں پڑھا رہے تھے اور جو پیسا نہیں رکھتے تھے وہ سرکاری اسکولوں میں اپنے بچے بھیج رہے تھے۔ بابا کی اتنی حیثیت نہیں تھی کہ نجی اسکول میں پڑھاتا اس لیے اس نے مجھے سرکاری اسکول میں داخل کرا دیا۔ مڈل اسکول بھی سرکاری تھا اور اس کی حالت بالکل سرکاری اسکولوں والی تھی۔ یہ زیادہ بڑا اسکول تھا اور یہاں درجن سے بھی اوپر استاد تھے مگر اسکول مشکل سے تین چار آتے تھے اور جو آتے وہ بھی بس ایسے ہی کلاسیں بھگتا کر زیادہ وقت گپ شپ میں گزارتے تھے۔

خوش قسمتی سے میری بنیاد مضبوط بنی تھی اس لیے مجھے خود سے آگے پڑھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ورنہ میرے کلاس فیلوز تو چھوڑیں جو لڑکے مڈل میں پڑھ رہے تھے ان کی تعلیمی حالت نہایت خراب تھی اور ان سے زیادہ مجھے آتا تھا۔ تین سال تک میں یہاں پڑھتا رہا اور جب میں نے مڈل کیا تو بابا نے حمرین کی شادی بھی کردی تھی۔ اس کی شادی نسرین کے دیور سے ہوئی تھی۔ یعنی دونوں بہنیں ایک ہی گھر میں بیاہ کر گئی تھیں۔ حمرین کا شوہر آٹو پارٹس کی دکان چلا رہا تھا۔ دکان اصل میں میری بہنوں کے سسر کی تھی دوسرا بہنوئی کیونکہ ملازمت نہیں کرتا تھا اس لیے باپ کے ساتھ کام کرتا تھا۔ کھاتے پیتے لوگ تھے اور اپنا مکان تھا۔ میری بہنیں خوش تھیں اور اس لیے ہم بھی خوش تھے۔ مڈل کے بعد بابا نے مجھے ایک اور اسکول میں داخل کرایا جو میٹرک تک تھا مگر یہ گاؤں سے خاصا دور تھا اور مجھے بس میں آنا جانا پڑتا تھا۔

روز دو گھنٹے سفر کر کے میں نے دو سال میں میٹرک کر لیا۔ میرا خیال تھا کہ اب بابا مجھے کام پر لگائے گا۔ اس کا کام بڑھ گیا تھا۔ کچھ عرصے سے بکروں کی مانگ میں اضافے کی وجہ سے قیمتیں بڑھی تھیں اور بابا اور دوسرے لوگ اب اس کا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ بابا نے اپنا گلہ بڑھا لیا تھا اور اپنی مدد کے لیے ایک ملازم رکھ لیا تھا۔ میں نے بابا سے کہا۔ ”میرے ہوتے ہوئے ملازم رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔“

”جلیل بابا تو پڑھ، اس کام کے چکر میں نہ پڑ، ابھی تجھے اور پڑھنا ہے اور آگے سرکاری ملازمت کرنی ہے۔ میں نے وڈیرے سے بات کر لی ہے۔ تو چودہ جماعتیں پڑھ لے گا تو وہ تجھے افسر والی نوکری لگوا دے گا۔“

سندھ کے گاؤں دیہات میں وڈیرے کی حیثیت خدا جیسی ہے۔ لوگ اللہ سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا وڈیرے سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے آگے اتنا نہیں گڑگڑاتے جتنا وڈیرے کے آگے گڑگڑاتے ہیں۔ بابا نے اتنے یقین سے کہا کہ جیسے میری نوکری بس تیار ہے۔

اس نے مجھے سکھر بھیج دیا۔ یہاں ایک کالج میں داخلہ ہوا۔ میں نے کامرس لی تھی۔ میری بہنوں نے کہا کہ میں ان کے پاس رکوں مگر مجھے یہ اچھا نہیں لگا کہ میں بہنوں کے گھر رہوں میں نے چند لڑکوں کے ساتھ ایک کمرا کرائے پر لے لیا۔ اسکولوں کے بعد سرکاری کالج بھی ویسا ہی ملا تھا اور یہاں ہمیں کلاسوں میں برائے نام ہی پڑھایا یا کچھ بتایا جاتا تھا۔ جو لڑکے پڑھنا چاہتے تھے وہ ٹیوشن کرتے تھے یا خود محنت کرتے تھے۔ میری اتنی استعداد نہیں تھی کہ ٹیوشن پڑھتا۔ بابا نہ جانے کس طرح سے میرے شہر میں رہنے کے اخراجات برداشت کر رہا تھا۔ میں اس پر مزید ٹیوشن کا بوجھ نہیں ڈال سکتا تھا۔

میں خود سے کوشش کرتا اور جو لڑکے ٹیوشن پڑھتے تھے ان سے مدد لیتا رہتا تھا۔ پھر میری محنت اور ذہانت بھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دو سال بعد جب فائنل کا امتحان دیا تو میں نے پورے کالج میں ٹاپ کیا تھا۔ میرا اے گریڈ بن رہا تھا۔ جس روز نتیجہ آیا میں گاؤں میں تھا اور مجھے میرے بہنوئی نے کال کر کے بتایا کہ میرا کیا نتیجہ آیا ہے۔ بابا جانور لے کر گیا ہوا تھا اور وہ ایک دن بعد واپس آتا۔ میں اتنا صبر نہیں کر سکتا تھا اس لیے خود اس کے پیچھے چلا گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ بابا جنگل میں کہاں بکریاں چراتا تھا۔ دوسروں سے پوچھتا ہوا میں اس تک پہنچ ہی جاتا۔ مگر جب میں جنگل کے علاقے میں پہنچا تو وہاں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ پولیس نے گھیرا ڈالا ہوا تھا اور بکتر بند گاڑیوں میں مزید پولیس کی نفری وہاں آ رہی تھی۔ بہت کوشش کے بعد معلوم ہوا کہ کچھ بڑے ڈاکوؤں کو پولیس نے یہاں گھیر لیا ہے اور ان کو گرفتار کرنے کی تیاری ہے۔

میں فکر مند ہو گیا کہ بابا بھی یہیں تھا اگر پولیس اور ڈاکوؤں میں مقابلہ ہوتا تو اسے بھی نقصان ہو سکتا تھا میں اس کے پاس جانا چاہتا تھا مگر پولیس کسی کو آگے جانے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ دوسرے چرواہے جو وہاں تھے وہ صورتِ حال دیکھتے ہی نکل آئے تھے۔ مگر بابا ابھی تک جنگل میں ہی تھا۔ میں نے دوسروں سے پوچھا تو ایک چرواہے خیرو بابا نے بتایا کہ میرا بابا جنگل کے آخری حصے میں تھا جہاں سے نہر گزرتی تھی اور وہ بکریوں کو پانی پلانے اس طرف لے گیا تھا۔ اسی نے بتایا کہ ڈاکو بہت سارے تھے اور وہ پوری طرح مسلح تھے۔ میری فکر میں اضافہ ہو گیا۔ کچھ ہی دیر میں پولیس کی بکتر بند گاڑیاں جنگل میں داخل ہو گئیں اور فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ باہر موجود پولیس نے احتیاط کی وجہ سے عام لوگوں کو یہاں سے جانے کا حکم دیا۔ میں بابا کی وجہ سے جا نہیں سکتا تھا مگر مجبوری تھی۔

میں سڑک تک آ گیا جہاں پولیس کا کیمپ لگا ہوا تھا۔ میں نے وہاں موجود ڈی ایس پی کو بتایا کہ میرا بابا جنگل میں موجود ہے۔ اس نے مجھے تسلی دی کہ وہ ٹھیک ہو گا کیونکہ اس کا پولیس یا ڈاکوؤں سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے کوئی اسے کچھ نہیں کہے گا۔ اس کے باوجود مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ پولیس کی کارروائی جاری تھی اور یہاں کیمپ میں اس کی ریڈیو پر اطلاع آ رہی تھی۔ پولیس والوں نے مجھے وہاں سے جانے کو نہیں کہا اس لیے میں بھی سن رہا تھا۔ رات گئے اطلاع ملی کہ مقابلے میں اکثر ڈاکو مارے گئے تھے اور کچھ بچ کر فرار کی کوشش کر رہے تھے اور پولیس کے دستے ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ مارے جانے والے ڈاکوؤں کی لاشیں یہاں کیمپ میں لائی جا رہی تھیں۔ مجھے بابا کی فکر تھی اور اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔ شریف ڈی ایس پی نے میری خاطر کئی بار وائرلیس پر بابا کا پوچھا مگر دوسری طرف موجود پولیس والوں کو اس کا کچھ علم نہیں تھا۔

صبح کے قریب ایک بکتر بند میں ڈاکوؤں کی لاشیں

وہاں لائی گئیں اور انہیں نکال کر سڑک کے کنارے لائن سے ڈالا جانے لگا تاکہ میڈیا ان کی تصویریں اور ویڈیو بنا سکے۔ یہ اہم آپریشن تھا اس لیے میڈیا کے بہت سے لوگ وہاں موجود تھے۔ میں نے اس وقت توجہ نہیں دی تھی۔ مگر جب فوٹو گرافر تصویریں لینے لگے تو میں چونکا۔ ڈاکوؤں کے درمیان خون میں لت پت اور مٹی میں لتھڑا ہوا ایک وجود مجھے جانا پہچانا لگا تھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ آگے آیا۔ چہرہ خون آلود تھا اس کے باوجود میں نے پہچان لیا اور چیخ مار کر بابا کی لاش پر گرا تھا۔ میں دھاڑیں مار کر رو رہا تھا کہ دو پولیس والوں نے پہلے مجھے کھینچ کر لاش سے الگ کیا اور جب میں نے اعلان کیا کہ یہ میرے باپ کی لاش ہے تو فوری طور پر مجھے ہتھکڑیاں لگا دی گئی تھیں کہ میرا باپ ایک ڈاکو تھا۔

یہ معاملہ صاف ہونے میں پورا دن لگ گیا کہ میرا باپ ڈاکو نہیں تھا اور وہ اتفاق سے وہاں موجود تھا جہاں ڈاکو مورچہ بند ہو کر پولیس پر فائرنگ کر رہے تھے۔ جوابی فائرنگ سے ڈاکوؤں کے ساتھ وہاں موجود بابا بھی مارا گیا اور جب پولیس نے ڈاکوؤں کی لاشیں جمع کیں تو بابا کو بھی ان میں شامل کر دیا۔ شام تک بابا کو ڈاکو ہونے کی تہمت سے اور مجھے ہتھکڑی سے نجات ملی اور بابا کی لاش لے جانے کی اجازت ملی۔ ابھی بابا کی لاش دفنا کر اس کا سوگ بھی نہیں منا سکا تھا کہ ان لوگوں نے اپنے جانوروں کا مطالبہ شروع کر دیا جن کو لے کر بابا چرانے جاتا تھا۔ پولیس مقابلے میں نہ جانے یہ جانور کہاں چلے گئے تھے اور اب ان کی بازیابی کی کوئی امید بھی نہیں تھی۔ اس کے باوجود میں جنگل میں گیا اور خالی ہاتھ لوٹ آیا۔ لوگوں کا قرض چکانے کے لیے میں نے آبائی مکان فروخت کر دیا اور ہمیشہ کے لیے گاؤں سے نکل گیا تھا۔

☆☆☆

سیٹھ احسان چالیس پچپن برس کا اور سیاہی مائل رنگت موٹے نقوش والا آدمی تھا۔ اس کے وجود میں سب سے نمایاں چیز اس کا پیٹ تھا۔ سینہ اور ٹانگیں عام سی تھیں اس لیے جب وہ کھڑا ہوتا تو لگتا کہ جسم کے وسطی حصے میں چھوٹی دیگ رکھی ہے۔ حالانکہ پیٹ بھی زیادہ بڑا نہیں تھا مگر باقی جسم چھوٹا ہونے کی وجہ سے نمایاں اور بڑا لگتا تھا۔ اس کے گول بڑے سر پر برائے نام بال تھے اور وہ خشخشی داڑھی رکھتا تھا۔ میری بہنوں کے سسر سے اس کے اچھے تعلقات تھے اور اسی کے توسط سے مجھے سیٹھ احسان کی دکان پر نوکری ملی تھی۔ ایک بار پھر میری بہنوں اور بہنوئیوں نے مجھے اپنے ساتھ رہنے کو کہا۔ مگر مجھے اچھا نہیں لگا کہ بہنوں کے گھر کی روٹی کھاؤں۔ اس لیے میں نے پرانے دوستوں کے ساتھ رہتے ہوئے نوکری کی تلاش شروع کر دی جو بالآخر سیٹھ احسان تک لے آئی۔

چھ سال پہلے میری تنخواہ ڈھائی ہزار طے ہوئی تھی اور مجھے بارہ گھنٹے کام کرنا تھا۔ دکان کے کئی حصے تھے۔ ہر حصے پر الگ ملازم تھا جو وہاں آنے والے گاہک کو کپڑے دکھاتا تھا۔ دکان تقریباً ساری لیڈیز کپڑے کی تھی اور مردانہ کپڑوں کا صرف ایک پورشن تھا جو سیٹھ احسان خود دیکھتا تھا۔ کیونکہ یہاں شاذ ہی کوئی گاہک آتا تھا۔ زیادہ تر عورتیں آتی تھیں یا پھر عورتوں کے لیے کپڑے لینے مرد آتے تھے۔ اس لیے ہم چھ ملازم صبح نو سے اور رات نو بجے تک تو ایسے مصروف رہتے تھے کہ سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں ملتی تھی۔ میں نے زندگی میں کبھی یہ کام کیا ہی نہیں تھا اس لیے شروع میں کچھ مشکل ہوئی لیکن پھر میں سیٹ ہو گیا۔ میرا خیال تھا تین چار مہینے بعد میری تنخواہ بڑھ جائے گی۔ کیونکہ دوسرے ملازموں کو سیٹھ احسان تین اور ساڑھے تین ہزار دے رہا تھا۔ اب میں ان جتنا ماہر ہو گیا تھا مگر جب میں نے تنخواہ بڑھانے کا کہا تو اس نے جواب دیا۔

”بابا جب تو ان کے برابر سیل کرے گا تو تیری تنخواہ بھی ان کے برابر ہو جائے گی۔“

”میں ان کے برابر ہی سیل کرتا ہوں سیٹھ۔“ میں نے احتجاج کیا۔ اس پر اس نے اپنا رجسٹر نکالا جس میں وہ سارا سیل کا حساب لکھتا تھا۔

”دیکھ بابا تو نے پچھلے چار مہینے میں سیل کی ایک لاکھ ستر ہزار کی جو سب سے کم ہے۔ تیرے سے اوپر جمعہ نے سیل کی ایک لاکھ نوے ہزار کی۔“

کچھ حساب میں بھی رکھ رہا تھا میں نے کہا۔ ”پر سیٹھ اس مہینے میں نے ستر ہزار کی سیل کی ہے جو سب سے زیادہ ہے۔“

”بابا میں چھ چھ مہینے کا حساب رکھتا ہوں۔ چھ مہینے بعد اگر تیری سیل آخری سے پہلے نمبر پر آ گئی تو میں تیری تنخواہ تین ہزار کر دوں گا۔“

اب مجھے پتا چلا کہ سیٹھ کیا کرتا تھا جو تین ملازم سب سے زیادہ سیل کرتے تھے ان کی تنخواہ اس نے ساڑھے تین

ہزار کی ہوئی تھی اور جو آخر کے تین تھے وہ تین ہزار لیتے تھے۔ میرے لیے ضروری تھا کہ آخر کے تین میں شامل ہونے کے لیے کم سے کم آخری سے اوپر آجاؤں۔ میں ابھی تک ان ہی لڑکوں کے ساتھ اس ایک کمرے کے مکان میں رہ رہا تھا۔ ہم کل چار لڑکے تھے۔ باقی تین ابھی پڑھ رہے تھے اور میں ملازمت کر رہا تھا۔ مکان کا کرایہ بلوں سمیت دو ہزار تھا اور سب کے حصے میں پانچ پانچ سو آتے تھے۔ کھانا پینا سب کا الگ الگ تھا۔ مکان میں چھوٹا سا کچن بھی تھا مگر اس میں ہم چائے وغیرہ ہی بناتے تھے باقی تینوں وقت باہر سے کھاتے یا لے آتے۔ کھانے میں بہت احتیاط کے باوجود پندرہ سولہ سو لگ جاتے تھے اور جو باقی بچتے اس میں دوسری ضروریات بھی بہ مشکل ہی پوری ہوتی تھیں۔

میری خواہش تھی کہ میں آگے پڑھوں اور بی کام کر کے وڈیرے کے پاس جاؤں کہ وہ میری نوکری لگوانے کا وعدہ پورا کرے۔ مگر اس سے پہلے دو سال پڑھنا لازمی تھا۔ اس کے لیے پیسے کے ساتھ ساتھ وقت کی ضرورت بھی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ ملازمت کر کے ایک دو سال میں اتنا بچا لوں گا کہ کالج میں داخلہ لے کر پارٹ ٹائم کام کرتے ہوئے پڑھتا بھی رہوں۔ مگر اس تنخواہ میں تو خرچا پورا نہیں ہو رہا تھا بچاتا کہاں سے۔ ایک اُمید تھی کہ تنخواہ تین ہو جائے گی اور ابھی میرے پاس دو مہینے تھے اور میں نے جان مارنا شروع کر دی۔ اللہ نے شکل صورت اچھی دی ہے۔ بات کرنے کا سلیقہ ہے اور سیٹھ کے آدمیوں میں سب سے پڑھا لکھا میں ہی تھا۔ باقیوں میں صرف دو میٹرک پاس تھے۔ دو نے مڈل کیا تھا اور ایک نے پرائمری کے بعد اسکول کی صورت ہی نہیں دیکھی تھی۔

میری محنت رنگ لائی اور چھ مہینے بعد جب سیٹھ احسان نے حساب لگایا تو میں سیل کے لحاظ سے چوتھے نمبر پر آ گیا تھا اور اگر پچھلے تین مہینے کی کارکردگی دیکھی جاتی تو میں سرفہرست تھا۔ اس نے حسب وعدہ میری تنخواہ تین ہزار کر دی تو مجھے کچھ سکون ملا تھا۔ سیٹھ احسان خود معمولی پڑھا لکھا آدمی تھا۔ مگر جدی پشتی کپڑے کا کاروبار کر رہا تھا۔ صرف سیٹھ احسان ہی نہیں اس کا پورا خاندان کاروباری تھا اور ان میں سنار بھی بہت تھے۔ سیٹھ احسان بارہ برس کی عمر سے دکان پر بیٹھ رہا تھا اور اپنے باپ کے بعد گزشتہ دس سال سے یہ دکان چلا رہا تھا۔ وہ زیادہ تر کپڑا فیصل آباد، کوئٹہ اور حیدر آباد سے منگواتا تھا۔ فیصل آباد اور کوئٹہ سے کپڑا ایجنٹس لاتے تھے۔ مگر حیدر آباد سے مال لینے وہ خود جاتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ کسی ایک سیلز مین کو لے جاتا۔ وہ بس سے جاتا اور مال کے ساتھ پک اپ کرا کے خود بھی اسی میں آجاتا تھا۔ یوں ایک طرف کا کرایہ بچا لیتا۔ وہ صبح سویرے نکلتا اور دوپہر سے پہلے حیدر آباد پہنچ جاتا۔ وہاں سے مال لے کر تین چار بجے نکلتا اور رات سے پہلے واپس سکھر آجاتا۔

وہ مہینے میں دو بار حیدر آباد جاتا اور ہر بار لاکھوں کا مال لاتا تھا۔ وہ سیلز مین کو ساتھ ضرور لے جاتا تھا مگر خریداری کے معاملات میں اسے الگ رکھتا تھا اس لیے کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ ادائیگی کیسے کرتا تھا اور کتنی کرتا؟ مال کی مالیت کا اندازہ یوں ہو جاتا کہ ہم سیلز مین جانتے تھے کہ کون سا تھان کتنے میں بک جاتا ہے اور وہ کتنے تھان لاتا ہے۔ یوں ایک مالیت خود بہ خود ذہن میں آجاتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ سیٹھ احسان کیش لے جانے کا خطرہ مول نہیں لیتا ہوگا وہ لازمی چیک یا بینک ڈرافٹس سے ادائیگی کرتا ہوگا۔ سکھر اور اس کے آس پاس کا سارا علاقہ ڈاکوؤں کی جنت ہے اور یہاں آئے دن بسوں میں سفر کرنے والے لٹتے ہیں۔ سکھر سے بدین تک کا سفر خطرے میں ہوتا ہے اور یہاں سفر کرنے والے اپنے پاس رقم یا قیمتی اشیا رکھنے سے گریز کرتے ہیں۔

ورنہ لٹنے کا بہت زیادہ امکان ہوتا ہے۔ خود سیٹھ احسان بس میں سفر کرتا ہوا دو بار لٹ چکا تھا مگر اس نے بھی بتایا نہیں کہ اس کا کتنا مال گیا تھا۔ مگر ملازموں کا خیال تھا کہ اس کا زیادہ مال نہیں گیا تھا ورنہ وہ واویلا بہت مچاتا۔ اب تک سیٹھ احسان کے ساتھ سب سے سینئر سیلز مین جواد جاتا تھا۔ ایک دو بار کسی وجہ سے وہ جواد کو نہیں لے کر گیا تو منصور کو لے جاتا تھا۔ ان دو کے علاوہ وہ کسی پر اعتبار نہیں کرتا تھا اس لیے جب اس نے اچانک مجھ سے کہا۔ ”بابا جلیل اس بار تو نے حیدر آباد چلنا ہے۔“

مجھے بہت خوشی ہوئی۔ ”کیوں نہیں سیٹھ جو تمہارا حکم۔“

اس نے حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے کہا۔ ”بابا میں نے سوچا تو نے سکھر سے آگے کچھ دیکھا ہی نہیں ہے تجھے حیدر آباد دکھاتے ہیں کیا شہر ہے بابا۔“

”پر شہر تو اصل میں کراچی ہے۔“

”بابا کراچی شہر ہے۔ ادھر کیا اس کا مقابلہ دنیا میں

ہوتا ہے پر ہمارے لیے تو حیدرآباد بھی بہت بڑا ہے۔''
سیٹھ احسان ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں نے ان شہروں کے بارے میں ایسا ہی سنا تھا۔ اب تو حیدرآباد بھی بہت بڑا ہوگیا تھا اور اس کا شمار بڑے شہروں میں ہونے لگا تھا۔ سکھر البتہ اتنی تیزی سے نہیں بڑھا تھا اور سندھ کا تیسرا بڑا شہر ہونے کے باوجود اس کا شمار چھوٹے شہروں میں ہوتا تھا۔ میں نے گاؤں سے ہٹ کر یہ دو شہر یعنی سکھر اور روہڑی دیکھے تھے۔ وہ بھی اس لیے کہ یہ دریائے سندھ کے دونوں طرف آمنے سامنے آباد ہیں۔ ایک طرح سے یہ جڑواں شہر ہیں۔ ان سے باہر نکلنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ اب سیٹھ احسان لے جارہا تھا تو میں خوش تھا کہ حیدرآباد دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ یہ سردیوں کے دن تھے۔ سکھر اور اس کے آس پاس کا سارا علاقہ شدید سرد ہواؤں کی لپیٹ میں تھا۔ سیٹھ احسان ہمیشہ جمعے والے دن جاتا تھا کیونکہ اس دن دکان جمعے کی نماز کے بعد کھلتی تھی بلکہ پوری مارکیٹ ہی جمعے کے بعد کھلتی اور اس دن زیادہ کاروبار نہیں ہوتا ہے۔
کراچی اور حیدرآباد جانے والی بسیں عام طور سے رحیم یار خان اور صادق آباد سے آتی تھیں مگر وہ روہڑی سے گزرتی تھیں۔ سکھر سے اس طرف جانے کے لیے براہِ راست کوچز چلتی تھیں یا پھر یہ جیکب آباد سے آتی تھیں۔ سیٹھ احسان نے صبح چھ بجے چلنے والی ایک بس کا انتخاب کیا۔ جب ہم بس اڈے پہنچے تو فجر کی نماز ہونے والی تھی اور ابھی سورج نکلنے میں خاصا وقت تھا۔ بس روانہ ہوئی تو اس میں زیادہ مسافر نہیں تھے۔ چند ایک آگے بیٹھے تھے اور چند ایک پیچھے تھے۔ یہ بڑی کوچ تھی۔ جب ہم اندر آئے تو میں نے ایک نظر مسافروں کو دیکھا۔ میری توجہ سب سے آخر میں ایک چادر پوش معمر شخص پر گئی اس کا سرخ و سفید چہرہ بس کے دھندلے ماحول میں چمک رہا تھا اور وہ مسلسل ہاتھ میں موجود تسبیح کے دانے گرا رہا تھا۔
میں اور سیٹھ احسان ذرا پیچھے والی نشستوں پر تھے۔ سردی کی مناسبت سے ہم دونوں نے گرم لباس پہن رکھا تھا۔ میں نے پینٹ شرٹ کے اوپر جیکٹ پہنی ہوئی تھی جب کہ سیٹھ احسان نے گرم کپڑے کے شلوار سوٹ کے اوپر سوئیٹر پہن رکھا تھا۔ اس کے پیروں میں اعلیٰ درجے کا پمپ شوز اور جرابیں تھیں۔ وہ کھڑکی والی نشست پر تھا۔ بیٹھنے کے کچھ دیر بعد اس نے بے چینی سے پہلو بدلا اور جھک کر پائنچے تلے اپنا موزہ ٹھیک کیا۔ میں نے غیر محسوس انداز میں ذرا آگے جھک کر دیکھا مگر مجھے کوئی خاص بات محسوس نہیں ہوئی۔
بس کے دھاتی فرش پر گھسا ہوا فٹ میٹ بچھا ہوا تھا جو کئی جگہ سے پھٹ بھی گیا تھا۔ ابھی بس روانہ نہیں ہوئی تھی اور کچھ دیر بعد اس نے پھر یہی حرکت دہرائی۔ بس روانہ ہوئی تو کچھ دیر بعد اس نے پھر اسی حرکت کا اعادہ کیا تو میں نے ایسے ہی پوچھ لیا۔ ''سیٹھ کوئی مسئلہ ہے؟''
اس نے خشمگیں نظروں سے مجھے دیکھا اور پھنکار کر بولا۔ ''تجھے کیا اپنا کام کر۔''
میں کھٹکا کہ کوئی ایسی بات تھی جو وہ مجھے بتانا نہیں چاہ رہا تھا اور اسے مسئلہ ہو رہا تھا اس لیے وہ بار بار موزہ ٹھیک کر رہا تھا۔ اس کے بعد میں سیدھا بیٹھ گیا اور بہ ظاہر میں اس کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا مگر میری ساری حسیات اسی کی طرف متوجہ تھیں۔ معاً مجھے لگا کہ کوئی دھاتی چیز کھنک کر بس کے فرش پر گری ہو۔ سردی کی وجہ سے کھڑکیاں اور شیشے بند تھے۔ بس کا انجن خاموش تھا اس لیے اندر سناٹا تھا اور میں نے آواز سن لی۔ دھات کھنکنے کی آواز پر آگے کی طرف جھکے سیٹھ احسان نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا مگر میں انجان بنا رہا بلکہ یوں سر پشت سے ٹکا دیا جیسے مجھے نیند آرہی ہو۔ مگر میں بند آنکھ میں ذرا سی جھری سے دیکھ رہا تھا اور سیٹھ احسان کی حرکات بتا رہی تھیں کہ وہ صرف موزہ درست نہیں کر رہا ہے بلکہ وہ اور بھی کچھ کر رہا تھا۔ تقریباً دو منٹ بعد وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔
میں متجسس تھا مگر یہ تجسس کسی سازش یا اور چکر میں نہیں تھا میں بس یہ جاننا چاہتا تھا کہ سیٹھ احسان موزے کے ساتھ کر کیا رہا تھا؟ سیٹھ احسان سیدھا ہوا تو میں ساکت بن گیا۔ کچھ دیر بعد روہڑی آیا اور بس ایک جھٹکے سے رکی، میں بہ ظاہر چونکا۔ کچھ مسافر یہاں سے بھی سوار ہوئے۔ مسافروں کے چڑھنے اور اترنے کے لیے بس میں دو دروازے تھے مگر ڈرائیور ایک ہی کھولتا تھا جو اس کے نزدیک تھا۔ دروازہ کھلا اور پہلے ایک دبلا اور کسی قدر طویل قامت کا ادھیڑ عمر مرد اندر آیا۔ لباس اور چہرے سے ہی وہ غریب اور مشکل زدہ لگ رہا تھا۔ اس کی مشکل کا اندازہ بھی فوراً ہوگیا جب ایک تقریباً نوجوان لڑکی اندر آئی۔ اس کی عمر سولہ کے آس پاس تھی۔ صاف رنگت کے ساتھ اس کے نقوش بھی خوب صورت تھے۔ سر کی چادر سے ہلکے بھورے ریشمی بال چمک رہے تھے۔
مسئلہ اس کی آنکھوں میں تھا اس کے دونوں ڈیلے

بالکل سفید تھے۔اس کے ہاتھ میں نابیناؤں والی چھڑی تھی۔آدمی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے راستہ سمجھاتے ہوئے ہماری نشستوں کے پاس آیا اور ہمارے برابر والی قطار کی خالی دونشستوں میں سے ایک پر خود بیٹھ گیا اور دوسری پر لڑکی کو بٹھایا تھا۔عجیب بات تھی کہ اس نے لڑکی کو کنارے والی نشست پر بٹھایا تھا اور خود کھڑکی کے پاس والی نشست پر بیٹھا تھا۔ورنہ عام طور سے حضرات اپنی عورتوں کو کھڑکی کی طرف بٹھاتے ہیں کیونکہ سیٹوں کے درمیان جگہ اتنی تنگ ہے کہ آتے جاتے آدمی بیٹھنے والوں سے ٹکرا جاتا ہے۔لڑکی کم عمر تھی اور اس کی آنکھوں میں بھی نقص تھا مگر اس میں شبہ نہیں کہ وہ حسن کے باقی پیمانوں پر پورا اترتی تھی۔ چادر میں ہونے کے باوجود پتا چل رہا تھا کہ اس کا جسم متناسب ہے۔اس نے معمولی سا موٹے کپڑے کا مگر کسی قدر فٹنگ والا سوٹ پہن رکھا تھا۔چادر بھی کم قیمت اور خاصی گھسی ہوئی تھی۔ پیروں میں اس سرد موسم میں بھی صرف چپل تھی اور فیتوں میں اس کے گلابی پاؤں نمایاں تھے۔اس نے مقامی زبان میں آدمی سے کہا۔

”بابا کتنی دیر لگے گی؟“

”ابھی تو حیدر آباد بہت دور ہے۔“ آدمی نے جواب دیا۔وہ لڑکی کا باپ تھا۔لڑکی اور میرے درمیان مشکل سے دوفٹ کا فاصلہ تھا اور مجھے اس کی یہ قربت اچھی لگ رہی تھی۔ روہڑی سے اچھے خاصے لوگ بس میں سوار ہوئے تھے اور اب بس تین چوتھائی بھر گئی تھی۔کچھ دیر بعد بس میں چڑھنے والا ایک جوان آدمی پچھلی سیٹوں کی طرف آیا اور لڑکی کے پاس سے گزرنے لگا تو جان بوجھ کر اس سے رگڑ کھا کر گیا تھا۔اس کی حرکت کا اندازہ مجھے یوں ہوا کہ وہ مجھے چھوئے بغیر گزر گیا تھا۔ مجھے غصہ آیا مگر میں کیا کہہ سکتا تھا۔اس کے ساتھ ہی اس کا باپ بھی بیٹھا ہوا تھا اس نے کوئی پروا نہیں کی تھی۔عجیب بات یہ تھی کہ لڑکی نے بھی کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا کہ کوئی اجنبی یوں اس کے بدن سے رگڑ کھاتا ہوا گیا ہے۔حد یہ کہ اس نے اندر ہونے کی کوشش بھی نہیں کی۔وہ پہلے کی طرح سیدھی بیٹھی تھی۔میں بار بار کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا مگر جب ایک بار سیٹھ احسان نے کھنکھار کر مجھے اشارہ کیا تو میں جلدی سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

شاید اس نے تاڑ لیا تھا کہ میں لڑکی میں دل چسپی لے رہا ہوں۔اگرچہ میرا اندازہ وہ نہیں تھا جو شاید سیٹھ احسان سمجھ رہا تھا۔ٹھیک ہے وہ خوب صورت تھی مگر شاید مجھے اس کی طرف اس کی آنکھوں کی محرومی نے متوجہ کیا تھا۔ورنہ دکان پر بھی بہت سی خوب صورت لڑکیاں اور عورتیں آتی تھیں جو بہت بے تکلف ہو کر بات کرتی تھیں مگر میں کبھی ان کی طرف یوں متوجہ نہیں ہوا تھا۔خیر پور سے آگے بس نے ہائی وے کا رسول پور جانے والا حصہ پکڑا۔یہ نیشنل ہائی وے کا ایک حصہ ہے مگر اس سے ذرا ہٹ کر ہے۔اس پر ٹریفک اتنا نہیں ہوتا ہے اور سردیوں کے موسم میں ویسے ہی لوگ کم سفر کرتے ہیں۔اب ہمارے چاروں طرف کھجور کے باغات تھے۔سورج ابھی بھی نہیں نکلا تھا اور دھند تھی مگر کسی قدر روشنی ہوگئی تھی۔ دھند کی وجہ سے بس کی رفتار کم تھی اور ہم بہ مشکل ایک گھنٹے میں خیر پور پہنچے تھے۔موسم دھند والا نہیں تھا یہ بس رات کی دھند تھی جو سورج نکلنے کے کچھ دیر بعد غائب ہو جاتی تھی۔

درمیان میں بس دس منٹ کے لیے روہڑی رکی تھی۔جہاں سے لڑکی اور دوسرے مسافر سوار ہوئے تھے۔کچھ دیر بعد وہی آدمی جو پیچھے جاتے ہوئے جان بوجھ کر لڑکی سے رگڑ کھاتا ہوا گیا تھا پھر اٹھا اور بس کے اگلے حصے میں جاتے ہوئے اس بار بھی جان بوجھ کر لڑکی سے ٹکرایا۔میرا خیال تھا کہ لڑکی اور اس کا باپ پھر کوئی ردعمل نہیں دیں گے۔مگر اس بار لڑکی نے ایسی چیخ ماری کہ پوری بس چونک گئی۔اس نے چلا کر کہا۔”بابا یہ کون ہے جو بار بار مجھ سے ٹکرا رہا ہے۔“

”تم جان بوجھ کر لڑکی سے ٹکرا رہے ہو۔“ میں نے بھی دخل دیا۔اس پر سیٹھ احسان نے مجھے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا۔شاید اسے میری مداخلت پسند نہیں آئی تھی مگر میں نے اس کی پروا نہیں کی۔لڑکی کا باپ بھی کھڑا ہو گیا تھا۔چند ایک مسافر اور کھڑے ہوئے۔ممکن تھا کہ جھگڑا ہو جاتا کیونکہ وہ آدمی بھی ذرا بدمعاشی کے موڈ میں آگیا تھا۔مگر اس موقع پر عقب میں بیٹھے چادر پوش بزرگ صورت آدمی نے بیچ بچاؤ کرایا۔اس نے سب کو ٹھنڈا کیا۔

”بابا لڑتے کیوں ہو۔ہم انسان ہیں کتے تھوڑی ہیں جو ذرا سی بات پر لڑنا اور غرانا شروع کر دیں۔“

”بابا یہ میری لڑکی کو تنگ کر رہا ہے۔“ لڑکی کے باپ نے کہا۔

”وہ غلطی تیری بھی ہے لڑکی کو کھڑکی کی طرف بٹھاتا۔“ بزرگ نے اسے کہا۔”ادھر راستہ ہے آتا جاتا آدمی ٹکرا جاتا

ہے۔‘‘
بزرگ کا لہجہ ایسا شیریں اور متاثر کرنے والا تھا کہ ذرا سی دیر میں سب موم ہو گئے۔ وہ آدمی بھی معافی مانگ کر واپس اپنی سیٹ پر چلا گیا۔ جھگڑا ہونے پر ذرا دیر کے لیے ڈرائیور نے بس روکی تھی مگر جب جھگڑا رفع ہوا تو اس نے دوبارہ چلا دی۔ لڑکی اب کھڑکی والی سیٹ پر تھی۔ بزرگ ابھی کھڑا تھا۔ اس نے لڑکی کے باپ سے پوچھا۔ ’’تیری بیٹی کو کیا ہوا ہے؟‘‘
’’بابا بھلی چنگی تھی ادھر دو سال پہلے اس کی آنکھیں سفید ہونا شروع ہوئیں اور آہستہ آہستہ بالکل سفید ہو گئیں۔ اسے ڈاکٹروں کو دکھایا۔ موتیا کا ٹیسٹ ہوا بابا پر یہ موتیا بھی نہیں ہے۔ ڈاکٹر بیماری سمجھ نہیں سکے۔ اب میری بیٹی کو بالکل نظر نہیں آتا ہے۔ پھر کسی نے بتایا کہ ادھر حیدر آباد میں ایک ڈاکٹر ہے وہ آنکھوں کا علاج کرتا ہے اب اس کے پاس لے جا رہا ہوں۔ غریب آدمی ہوں پر کیا کروں بیٹی کو ایسے ہی تو نہیں چھوڑ سکتا۔‘‘
’’اللہ خیر کرے گا۔‘‘ بزرگ نے کہا اور پھر بولا۔ ’’اگر تو اجازت دے تو میں تیری بیٹی کی آنکھیں دیکھ لوں، ہو سکتا ہے اللہ کے حکم سے اسے یہیں شفا مل جائے۔‘‘
بزرگ کی بات پر صرف وہ آدمی ہی نہیں آس پاس بیٹھے سب لوگ چونک گئے تھے۔ اس جھگڑے کے دوران میں لڑکی کھڑی ہوئی تو اس کی آنکھوں کا نقص ان لوگوں نے بھی دیکھ لیا جنہوں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ آدمی نے بے یقینی سے کہا۔ ’’وہ کیسے سائیں؟‘‘
’’اللہ کے حکم سے سب ہو جاتا ہے۔‘‘ بزرگ نے مخصوص لہجے میں کہا۔ ’’مجھے اُمید ہے یہ ٹھیک ہو جائے گی۔‘‘
آدمی مضطرب ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ ’’سائیں دیکھو ضرور دیکھو سائیں...... اگر میری بیٹی ٹھیک ہو گئی تو میں ساری عمر تمہیں دعائیں دوں گا۔‘‘
’’مجھ گناہ گار کو دعاؤں کی ہی ضرورت ہے۔‘‘ بزرگ نے کہا اور آدمی کی نشست پر بیٹھ گیا۔ مگر اس نے لڑکی سے فاصلہ رکھا تھا۔ ’’بیٹی میری طرف دیکھ۔‘‘
’’بابا مجھے نظر نہیں آتا۔‘‘ لڑکی نے کہا اور رخ بزرگ کی طرف کر لیا۔ میں اور کئی دوسرے لوگ کھڑے ہو کر یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ بزرگ ذرا آگے جھکا اور غور سے لڑکی کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ چند منٹ بعد وہ کھڑا ہو گیا اور اس نے لڑکی کے باپ سے کہا۔
’’یہ ٹھیک ہو جائے گی، مجھے اوپر والے سے پوری اُمید ہے وہ اس معصوم بچی کو یوں اندھیروں میں نہیں چھوڑے گا۔ مگر اس کے لیے مجھے عمل کرنا ہوگا۔ اگر تم اس کے لیے تیار ہو تو میں ابھی عمل کرتا ہوں۔‘‘
آدمی سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے پوچھا۔ ’’بابا کیسا عمل کرو گے؟‘‘
’’اس چادر کا ایک سرا تمہاری بچی کے سر پر ہوگا اور دوسرا سرا میرے سر پر ہوگا۔ ہم دونوں کے چہرے کوئی تیسرا نہ دیکھ پائے تب ہی یہ عمل مکمل ہوگا اور نہ ہی کوئی اس میں مداخلت کرے۔‘‘
’’عمل کتنی دیر کا ہوگا بابا؟‘‘
’’جب تک تیری بچی کی آنکھیں ٹھیک نہیں ہو جاتیں۔‘‘
مجھے یہ بات عجیب سی لگ رہی تھی کہ یہ بزرگ اور لڑکی ایک ہی چادر تلے ہوں گے۔ شاید لڑکی کے باپ اور دوسروں کو بھی عجیب لگ رہی تھی۔ مگر بزرگ نے دعویٰ اتنا بڑا کیا تھا کہ آدمی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ’’ٹھیک ہے سائیں، میں راضی ہوں۔‘‘
’’بچی کو یہاں لے آؤ۔‘‘ بزرگ نے پچھلی نشستوں کی طرف اشارہ کیا اور آدمی اپنی لڑکی کو بازو سے پکڑ کے پیچھے لے گیا۔ بزرگ نے کھڑے لوگوں سے کہا۔ ’’بھائیوں یہ تماشا نہیں ہے، میں اللہ کے نام پر عمل کرنے جا رہا ہوں، آپ سب اپنی جگہوں پر بیٹھیں اور دعا کریں کہ اللہ اس بچی کی آنکھیں ٹھیک کر دے۔‘‘
کچھ لوگ مجھ سمیت بیٹھ گئے اور کچھ کھڑے رہے۔ سیٹھ احسان نے آہستہ سے کہا۔ ’’جلیل تو اس چکر میں زیادہ دل چسپی لے رہا ہے؟‘‘
’’سیٹھ سوچنے کی بات ہے یہ آدمی کیسے اس لڑکی کی آنکھیں ٹھیک کرے گا۔‘‘
’’جب کرے گا تو دیکھ لینا۔‘‘ اس نے بے نیازی سے کہا۔ میں نے سیٹ سے جھانک کر دیکھا تو بزرگ نے لڑکی کو سب سے پیچھے والی نشست پر بٹھا لیا تھا اس کا رخ ترچھا تھا۔ پھر بزرگ ایک سیٹ چھوڑ کر لڑکی کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا اور اس نے لڑکی کے باپ سے کہا۔
’’بابا یہ چادر اپنی لڑکی اور میرے سر پر اس طرح سے ڈال کہ کوئی ہمارا منہ نہ دیکھے۔‘‘
آدمی نے چادر کا ایک سرا لڑکی کے سر پر اس طرح

ڈالا کہ اس نے اسے پشت اور نظر آنے والی سائیڈ سے پوری طرح ڈھک لیا۔ پھر اس نے دوسرا سرا اسی طرح بزرگ کے سر پر ڈالا۔ چادر ان دونوں پر کسی خیمے کی طرح تنی ہوئی تھی اور اس کا درمیانی حصہ خالی تھا۔ بزرگ نے نشست کا فاصلہ رکھ کر لوگوں کی وہ بے چینی دور کردی جو یہ طریقہ سن کر مجھ سمیت سب ہی افراد میں پیدا ہوئی تھی۔ ہمارے معاشرے میں عورت اور مرد کا چاہے وہ کسی بھی عمر کے ہوں اتنے نزدیک آنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ چاہے مقصد کسی کا علاج کیوں نہ ہو۔ ہمارے ہاں تو اس معاملے میں اتنی زیادہ سختی اور جہالت ہے کہ ہونے والے دس میں سے نو قتل اسی وجہ سے ہوتے ہیں اور اکثر ناحق ہوتے ہیں۔

لوگ اپنی دشمنی نکالنے کے لیے غیرت کا نام لیتے ہیں۔ ایک ایسا واقعہ بھی میری نظر میں آیا جب میرے گاؤں کے ایک آدمی نے اپنی چودہ سالہ لڑکی کو گلی میں گرا کر اور اینٹیں مار مار کر قتل کردیا۔ اس لڑکی کا صرف اتنا قصور تھا کہ وہ صبح گھر کا چولہا جلانے کے لیے لکڑی لینے نزدیکی درختوں تک گئی تھی اور واپس آتے ہوئے گاؤں کے ایک لڑکے کے پاس سے گزری تھی۔ اس کی بدقسمتی کہ اس کے باپ نے یہ منظر دیکھا اور اسی بنیاد پر اس نے اپنی لڑکی پر کاری ہونے کا الزام لگا کر اسے بہیمانہ انداز میں قتل کردیا اور ستم ظریفی یہ ہے کہ گاؤں کے جرگے نے اسے رہا کردیا بلکہ اس کے اقدام کو سراہا۔ وہ آج بھی سینہ تان کر آزاد گھوم رہا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قبائلی اس معاملے میں کتنے حساس ہوتے ہیں۔

میری طرح سب ہی جھانک رہے تھے۔ سب سے پیچھے والے کا سر اس سے پیچھے والے کے لیے رکاوٹ بن رہا تھا اور وہ آگے ہو کر دیکھ رہا تھا تو اپنے سے پیچھے والے کے لیے مزید رکاوٹ بن رہا تھا۔ یوں ایک چین چل رہی تھی میری سیٹ چوتھے نمبر پر تھی اور میں اب اتنا آگے نہیں ہوسکتا تھا اس لیے مجبوراً سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ آگے والے جو متجسس تھے وہ بزرگ کی ہدایت نظر انداز کر کے کھڑے ہو کر عمل دیکھنے میں مصروف تھے۔ حد یہ کہ بس کا ڈرائیور بھی اس کی رفتار بہت ہلکی کر کے عقبی آئینے کی مدد سے دیکھ رہا تھا۔ بس رسول پور سے کچھ دور تھی۔ رسول پور ہائی وے پر نہیں آتا تھا بلکہ اس سے کچھ دور تھا مگر شہر کے نزدیک ہائی وے پر دکانیں اور ہوٹل وغیرہ تھے۔ جو آنے جانے والے مسافروں کے لیے تھے۔

سیٹھ احسان نے کہا تھا کہ بس وہاں رکے گی تو ہم ناشتا وہیں کریں گے۔ مگر میں نے سیٹھ پر بھروسا نہیں کیا تھا وہ ناشتے میں چائے پاپے کھلا دیتا تو میں کیا کرتا۔ وہ بلا کا کنجوس بھی تھا اگر دکان پر اسے دو روپے بھی خرچ کرنا پڑتے تھے تو اس کی جان پر بن جاتی تھی۔ کئی مواقع ایسے آئے جب ہم نے اس سے مرغ کی توقع کی تو دال بھی مشکل سے ملی۔ دکان پر اس کے لیے گھر سے کھانا آتا اور وہ بچ جانے والا کھانا کسی کو دینے کی بجائے واپس ٹفن میں پیک کر کے ملازم کے ہاتھ گھر بھجوا دیتا تھا۔ اس سے احسان سیٹھ کی کنجوسی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے گھر سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے بوائل انڈوں اور چائے سے ڈٹ کر ناشتا کرلیا تھا اب اگر دوپہر تک نہ بھی ملتا تو میرا گزارا تھا۔ اگر ناشتا ٹھیک ہوتا تو میں ڈٹ کر کھالیتا ورنہ حیدرآباد پہنچ کر دیکھتا۔

وقت گزر رہا تھا میں نے گھڑی میں وقت نوٹ کیا جب بزرگ نے چادر تلے اپنا عمل شروع کیا تھا۔ دس منٹ گزرے اور پھر بیس منٹ گزر گئے۔ میں نے جتنی بار دیکھا دونوں ساکت ہی نظر آئے تھے۔ لوگ رفتہ رفتہ بور ہونے لگے اور تھک کر واپس اپنی نشستوں پر بیٹھنے لگے۔ آدھے گھنٹے بعد سوائے لڑکی کے باپ کے سب ہی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تھے۔ صرف وہی پیچھے ان کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہ بزرگ سچ ایسا عمل جانتا ہے جس سے بالکل سفید ہونے والی آنکھیں بھی ٹھیک ہو جائیں تو اسے چاہیے کہ کوئی علاج گاہ کھول لے۔ یہ بیماری تو ہمارے ہاں بہت عام ہے۔ وہ خلق خدا کو فائدہ ہی دے گا۔ مگر شاید اس طرح کے کام کرنے والوں کا اپنا کوئی حساب کتاب ہوتا ہے۔ وہ عام ڈاکٹروں اور حکیموں کی طرح اپنا کلینک کھول کر نہیں بیٹھ سکتے۔ میں سوچوں میں گم تھا کہ عقب سے لڑکی کی خوشی سے بھرپور چیخ سنائی دی۔

"بابا...... مجھے نظر آرہا ہے۔"

میں بے ساختہ کھڑا ہوا۔ میں کیا پوری بس کے مسافر کھڑے ہوگئے تھے۔ لڑکی اب چادر سے باہر تھی اور بزرگ اپنی چادر لپیٹ رہا تھا۔ میں حیران رہ گیا۔ لڑکی کی آنکھیں جو ڈراؤنی فلموں کی چڑیل کی طرح بالکل سفید تھیں اب صاف اور شفاف تھیں۔ ان میں ہلکے بھورے رنگ کا دائرہ اور پتلی نظر آرہی تھی اور اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ میں دم بہ خود سا اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ ٹھیک ہو گئی تھی بلکہ مجھے اس کے بے پناہ بڑھ جانے والے حسن نے

مسحور کر دیا تھا۔ آنکھیں کیا ٹھیک ہوئیں اس کا چہرہ ہی بدل گیا تھا۔ اس کا باپ اپنی لڑکی کا چہرہ ٹٹول رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ''اڑے یہ تو معجزہ ہو گیا...... سائیں تم نے کمال کر دیا۔''

''معجزہ نبیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔'' بزرگ نے کہا۔ ''میں اللہ کا ایک عام سا گناہ گار بندہ ہوں یہ اسی کا کرم ہے۔''

لڑکی جواب تک چپ اور بے حرکت تھی آنکھیں آنے پر اس کی بے چینی اور اضطراب دیکھنے والا تھا جیسے وہ ایک ہی بار میں زیادہ سے زیادہ دنیا دیکھ لینا چاہتی ہو۔ پھر اس کی نظر مجھ پر آئی اور میں اسے ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شرم وحیا نمودار ہوئی۔ اس نے جلدی سے چادر اپنے سر اور چہرے پر درست کی تو مجھے ہوش آیا اور میں واپس اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ بس میں سوار عورتیں اس کے پاس جا کر اسے مبارک باد دے رہی تھیں اور مرد بزرگ کے پاس جا رہے تھے اور اب سب اس سے دعا اور اپنی بیماریوں کے لیے عمل کرانے کے چکر میں تھے۔ مگر وہ چادر اوڑھ کر بیٹھ گیا اور دوبارہ سے تسبیح سنبھال لی تھی۔ وہ لوگوں کے سوالوں کا جواب ٹالنے والے انداز میں دے رہا تھا اور لڑکی کے ٹھیک ہونے کو اللہ کی مہربانی قرار دے رہا تھا۔ لڑکی واپس اپنی نشست پر آ گئی تھی اور کھڑکی سے باہر کی دنیا دیکھ رہی تھی۔ اس کے باپ نے بتایا کہ وہ دو سال سے نابینا تھی تو اتنے عرصے بعد بینائی پانے والے کا یہی حال ہو سکتا تھا جو اس لڑکی کا ہو رہا تھا۔ بزرگ کے پاس رش کم ہوا تو لڑکی کے باپ نے اس کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''سائیں میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں...... غریب آدمی ہوں کہو تو جان بھی حاضر ہے۔''

''تمہاری جان، مال اور وقت میں سے کچھ نہیں چاہیے۔'' بزرگ نے نرمی سے کہا۔ ''شکریہ اوپر والے کا ادا کرو۔''

''اس کا شکریہ کیسے ادا کروں؟''

''اس کے بندوں کو خوش کر کے۔'' بزرگ نے کہا۔ ''اس بس میں موجود لوگوں کا منہ میٹھا کرو۔''

''ابھی تو کچھ نہیں ہے سائیں پر ادھر رسول پور میں مٹھائی کی دکانیں ہیں وہاں سے مٹھائی لے لوں گا۔'' آدمی نے عاجزی سے کہا۔ وہ اٹھ کر اپنی نشست پر آنے لگا تو لوگوں نے آوازیں لگائیں کہ ہاں مٹھائی تو ہونی چاہیے کہ اس کی اتنی بڑی مشکل راستے میں آسان ہو گئی اور اس کی بچی کی آنکھیں ٹھیک ہو گئیں۔ اس نے عاجزی سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''کیوں نہیں کھلاؤں گا ضرور کھلاؤں گا سب کو۔''

کچھ دیر میں بس رسول پور کے نزدیک مارکیٹ میں رکی۔ مارکیٹ زیادہ بڑی نہیں تھی اور یہاں ساری رونق آنے جانے والوں کی وجہ سے تھی۔ ہوٹل کھلے ہوئے تھے اور ناشتا ہو رہا تھا۔ سیٹھ احسان کے بارے میں میرا اندازہ درست نکلا جب اس نے سرے سے ناشتا ہی گول کر دیا اور مجھ سے بولا۔ ''اڑے جلیل چھوڑ یہاں کے بیکار ناشتے کو تجھے حیدر آباد کی نہاری اور بریانی کھلاؤں گا۔''

میں نے خدا کا شکر ادا کیا جو ناشتا کر کے آیا تھا ورنہ اس نے حیدر آباد تک بھوکے پیٹ سفر کرانا تھا۔ میں اس کی چالاکی سمجھ رہا تھا۔ وہ مٹھائی کے چکر میں بھی تھا کہ اس سے بھی کچھ آسرا ہو جائے گا اور ناشتے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ مجھے مٹھائی سے خاص رغبت نہیں تھی بس کھا لیتا ہوں۔ اس لیے مجھے انتظار بھی نہیں تھا۔ لڑکی کا باپ بس رکتے ہی اتر گیا تھا اس کے ساتھ کچھ مسافر اور بھی اترے تھے جنھوں نے ناشتا کرنا تھا یا پھر دیگر ضروریات سے فارغ ہونا تھا۔ ڈرائیور نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ صرف پندرہ منٹ رکے گا اس کے بعد بس چلا دے گا۔ اس لیے سب خود سے خیال کر کے واپس آئیں۔ اس لحاظ سے سیٹھ احسان کا فیصلہ درست ثابت ہوا۔ پندرہ منٹ میں ہم کیا ناشتا کرتے زیادہ سے زیادہ چائے کا کپ پی سکتے تھے۔

جانے والے دوسرے مسافر آتے رہے تھے مگر لڑکی کا باپ نہیں آیا۔ شاید مٹھائی کی دکان دور تھی۔ پندرہ منٹ پورے ہوئے تو ڈرائیور نے ہارن دیا۔ اس نے انجن بھی اسٹارٹ کر لیا تھا۔ دوسری بار ہارن دینے پر لڑکی کا باپ دور سے دوڑتا ہوا بس کی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ ہانپتے ہوئے بس میں سوار ہوا اور ڈرائیور نے دروازہ بند کر کے بس آگے بڑھا دی تھی۔ کلینر نے غصے سے کہا۔ ''اتنی دیر لگا دی کہاں رہ گیا تھا۔''

''اس کے پاس باسی مٹھائی تھی تازہ نکلوا رہا تھا اس لیے دیر ہو گئی۔'' آدمی نے عاجزی سے کہا۔ وہ خاصا بڑا والا ڈبا لایا تھا جس میں کم سے کم دو کلو مٹھائی آ سکتی تھی۔ وہ بھاگتا ہوا آیا تھا اس لیے آگے ایک خالی نشست پر بیٹھا ہوا سانس درست کر رہا تھا۔ بہت سے بے تابی سے منتظر تھے کہ وہ کب لوگوں کا منہ میٹھا کرانا شروع کرتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ آگے سے شروع کرے گا مگر اس کے برعکس وہ اٹھ کر سب

سے پہلے بزرگ کے پاس گیا اور مٹھائی کا ڈبا کھولتے ہوئے عاجزی سے بولا۔ ''سائیں پہلے تم اپنے مبارک ہاتھوں سے شروع کرو۔''

بزرگ نے ایک چھوٹا گلاب جامن لیا اور منہ میں رکھ لیا۔ سب کو پورا کرنے کے لیے وہ چھوٹے گلاب جامن لایا تھا۔ پھر اس نے سب کو دینا شروع کر دیا۔ وہ سب کے سامنے ڈبا کر رہا تھا اور لوگ خود سے نکال رہے تھے۔ میری باری آئی تو میں نے ایک لیا مگر سیٹھ احسان نے دو نکال لیے۔ وہ مٹھائی کا شوقین تھا اور مفتا ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ آدمی کے آنے تک میں لڑکی کی طرف متوجہ تھا۔ سچی بات ہے جب سے وہ آکر نشست پر بیٹھی تھی میں اسی کی طرف متوجہ تھا اور اس سے پہلے کہ اس کا باپ آکر ہم دونوں کے درمیان بیٹھ جاتا میں جی بھر کر اسے دیکھ لینا چاہتا تھا۔ میں نے مٹھائی بھی بے دلی سے لی تھی اور گلاب جامن مجھے پسند نہیں تھا۔ آدمی آگے گیا تو سیٹھ احسان نے للچائی نظروں سے میرے ہاتھ میں موجود گلاب جامن کو دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ ''اڑے جلیل تو کہاں کھاتا ہے لا مجھے دے۔''

میں نے اس کی طرف بڑھا دیا اور اس نے وہ بھی کھا لیا۔ میں سیٹ سے ٹیک لگا کر آدمی کی طرف متوجہ ہوا جو اب کلینر کو دے رہا تھا اور سب سے آخر میں وہ ڈرائیور کی طرف بڑھا تھا۔ ادھر اس نے ڈرائیور کو گلاب جامن دیا اور ادھر سیٹھ احسان بوری کی طرح کھڑکی کی طرف لڑھک گیا۔ میں چونکا اور تب میں نے دیکھا کہ آگے والے بھی اپنی نشستوں پر گر رہے تھے اور ان میں سے کچھ تو نیچے ہی گر گئے تھے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو عقب والوں کا بھی یہی حال تھا۔ یقیناً گلاب جامنوں میں کچھ ملا ہوا تھا۔ جسے کھاتے ہی سب بے ہوش ہو رہے تھے۔ مگر بزرگ بے ہوش ہونے کی بجائے کھڑا ہو گیا تھا اور اب اس طرف آ رہا تھا۔ پتا نہیں میرے دل میں کیا آیا یا میری چھٹی حس نے مجھے اکسایا کہ اس سے پہلے وہ میرے نزدیک آتا میں بھی آنکھیں بند کر کے سیٹ پر ڈھیلا پڑ گیا۔ مجھے سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی کہ چکر کیا ہے۔

یہ ڈاکو تھے مگر دوسری طرح سے لوٹ مار کرنے والے تھے۔ اس کے باوجود ان کے مسلح ہونے کا امکان تھا اور اگر کوئی بے ہوش نہ ہوتا تو وہ اس سے دوسری طرح سے نمٹتے۔ اسی خطرے کے پیش نظر میں نے بے ہوش ہونا ہی مناسب سمجھا۔ بزرگ کے ساتھ لڑکی اور وہ آدمی بھی اٹھ گیا تھا جو لڑکی سے دو بار ٹکرایا تھا۔ چوتھا لڑکی کا نام نہاد باپ تھا۔ اسی اثنا میں بس کی رفتار سست ہونے لگی تھی۔ ڈرائیور کے بے ہوش ہونے کے بعد یہ تو ہونا ہی تھا۔ ان میں سے کسی نے ڈرائیونگ سنبھال لی تھی اور پھر بس کو جھٹکے لگنے لگے۔ میں نے خفیف سی آنکھیں کھول کر دیکھا بس ہائی وے سے اتر کر کچے میں جا رہی تھی۔ کسی کی مداخلت سے بچنے کے لیے وہ بس کو سڑک سے دور لے جا رہے تھے تاکہ مسافروں کو تسلی سے لوٹ سکیں۔ جھٹکے اتنے زیادہ تھے کہ کوئی بھی مسافر اپنی نشست پر ٹک نہیں سکتا تھا ان میں سے بیشتر نیچے گر گئے اور باقی بھی آدھے نشست پر تھے تو آدھے نیچے گرے ہوئے تھے۔

میں گرنے سے بچنے کے لیے سیٹھ احسان پر لڑھک گیا۔ کوئی دس منٹ بعد بس رکی تو جھٹکے بھی رک گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ لوگ حرکت میں آگئے۔ میں نے عقل مندی کی جو بروقت بے ہوش بن گیا تھا کیونکہ اب مجھے بزرگ، لڑکی کے باپ اور تیسرے آدمی کے ہاتھ میں پستول دکھائی دے رہے تھے۔ بزرگ ان کا سرغنہ تھا کیونکہ وہ انہیں ہدایت دے رہا تھا۔ اس نے لڑکی کو بھی کام پر لگا دیا تھا کہ وہ مسافر عورتوں کی تلاشی لے اور ان کے پاس موجود ہر چیز نکال لی جائے۔ اس نے پاٹ دار آواز میں کہا۔ ''جو کھاتے پیتے لگ رہے ہوں ان کی ہر جگہ کی تلاشی لینا۔ یہ پیسا اور قیمتی چیزیں چھپا کر لے جاتے ہیں۔''

اس کی بات سنتے ہی میرا دھیان سیٹھ احسان کے موزوں کی طرف گیا تھا۔ وہ سامنے سے تلاشی لیتے ہوئے پیچھے کی طرف آ رہے تھے۔ میرے پرس میں سوائے دو سو روپے کے اور کچھ نہیں تھا۔ میں دعا کر رہا تھا کہ وہ میرا پرس لے کر نہ جائیں کیونکہ اس میں میرا شناختی کارڈ بھی تھا اور یہ چلا جاتا تو اسے دوبارہ سے بنوانے کے لیے مجھے نہ جانے کتنے دھکے کھانے پڑتے۔ اتفاق سے میری طرف لڑکی آئی۔ اس نے عورتوں کی تلاشی مکمل کر لی تھی۔ بس میں مشکل سے چار پانچ عورتیں تھیں۔ لڑکی نے پہلے مجھے کھینچ کر سیدھا کیا۔ میرا وزن زیادہ نہیں تھا اور میں نے تعاون بھی کیا تھا۔ آسانی سے سیدھا ہو گیا۔ شکر ہے کہ لڑکی تھی ورنہ کوئی مرد ہوتا تو بھانپ جاتا کہ میں ہوش میں ہوں ورنہ اتنی آسانی سے سیدھا نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ اپنے نازک ہاتھوں سے مجھے ٹٹولنے لگی اور میرے دل کی دھڑکن اس کا لمس اور اس کا قرب محسوس کر کے تیز ہو



گئی تھی۔اس نے کوئی خوشبو نہیں لگائی تھی مگر اس کے کورے بدن کی اپنی خوشبو تھی جو میں بہت واضح محسوس کررہا تھا۔نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ وہ کنواری ہے اسے ابھی تک کسی مرد نے نہیں چھوا ہے۔سچی بات ہے جب تک وہ میری تلاشی لیتی رہی میں بہت مشکل میں رہا۔میرے لیے بے ہوشی کی اداکاری جاری رکھنا مشکل ہوتا جارہا تھا۔میرا دل تو پوری رفتار سے دھڑک رہا تھا میرا سانس بھی تیز ہوگیا تھا۔پھر اس کا ساتھی آگیا اس نے لڑکی سے کہا۔"ماری ہٹ یہاں سے اس گینڈے کو میں دیکھتا ہوں۔"

اس نے جس طرح ماری کا نام لیا تھا اس سے ظاہر تھا کہ ان میں بہت بے تکلفی تھی۔وہ پیچھے ہٹی اور بولی۔"اس کی تلاشی لے لی اس کے پاس پرس اور دوسو روپے ہیں۔"

"اسے چھوڑ۔" آدمی نے پرس لے کر میری گود میں پھینک دیا۔"اصل مال اس کے پاس ہوگا۔"

اس کا اشارہ سیٹھ احسان کی طرف تھا۔مسئلہ یہ تھا کہ اتنی سی جگہ میں اس کی تلاشی لینا آسان نہیں تھا اس لیے آدمی نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ مجھے کھینچ کر برابر والی نشست پر ڈال دیا۔اس بار میں مکمل بے ہوش بنا رہا اور اپنا جسم ڈھیلا رکھا تھا۔اس وجہ سے اسے میرا بوجھ اٹھانے میں دشواری پیش آئی تھی اور اس نے مجھے اٹھا کر تقریباً پٹخ دیا تھا۔اٹھانے کے دوران میں میرا پرس نیچے گر گیا تھا مگر کسی نے اس پر توجہ نہیں دی۔آدمی سیٹھ احسان کی تلاشی لینے لگا۔اس کا پرس نکلا اور اس میں معمولی سی رقم تھی۔وہ اس کی مزید تلاشی لینے لگا۔مگر اس کے پاس سے کوئی رقم اور قیمتی چیز نہیں نکلی تھی۔آدمی نے مایوسی سے کہا۔"یہ تو کنگلا نکلا ہے۔پرس میں ڈھائی ہزار ہیں اور کچھ بھی نہیں ہے۔"

"ادا اس کی انگوٹھی اور گھڑی لے لو۔" لڑکی نے مشورہ دیا تو مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ وہ اسے ادا کہہ رہی تھی۔اس کا مطلب ہے کہ وہ بہن بھائی تھے یا ان میں بہن بھائی والا رشتہ تھا۔آدمی نے لڑکی کے مشورے پر عمل کیا۔اس دوران میں بزرگ اور لڑکی کا باپ دوسرے مسافروں کی تلاشی لے رہے تھے۔عورتوں کی تلاشی لڑکی لے چکی تھی اور مجھے تعجب ہوا کہ ڈاکو ہونے کے باوجود ان لوگوں نے اتنا خیال رکھا تھا کہ کوئی مرد کسی عورت کو نہیں چھو رہا تھا۔مسافروں کے پاس سے جو نکل رہا تھا وہ جمع کرتے جارہے تھے۔جب سب کی تلاشی کا عمل مکمل ہوگیا تو تینوں مرد لڑکی کو اندر چھوڑ کر باہر نکل گئے۔اب وہ مسافروں کے

سامان کی تلاشی لیتے کہ اس میں تو کوئی قیمتی چیز یا رقم موجود نہیں ہے؟ لڑکی کم سن ہونے کے باوجود بھی تجربہ کار لگ رہی تھی۔ اس نے بہت ماہرانہ انداز میں میری تلاشی لی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ اس کے لیے یہ کام نیا نہیں ہے۔ وہ میرے پاس آئی اور آہستہ سے جھک کر بولی۔

''مجھے معلوم ہے تم ہوش میں ہو۔''

میں اچھل پڑا تھا اور یوں میں نے ثبوت بھی دے دیا کہ میں ہوش میں ہوں۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور سہمے انداز میں کہا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''میں نے دیکھ لیا تھا کہ تم نے اپنا گلاب جامن اس موٹے کو دے دیا تھا۔'' اس نے سیٹھ احسان کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ ''تم نے اپنے ساتھیوں کو کیوں نہیں بتایا؟''

''کیونکہ تم مجھے اچھے لگے اور دوسرے میں ان کے چنگل سے نکلنا چاہتی ہوں۔''

ہم دونوں ہی دھیمی آواز میں بات کر رہے تھے کیونکہ بس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اگر زور سے بولتے تو آواز باہر جا سکتی تھی۔ وہ میرے قریب تھی مگر اس کا سادہ سا اظہار پسندیدگی سن کر مجھے اس موسم میں بھی پسینا آ گیا تھا۔ ''یہ لوگ کون ہیں اور تم ان کے ساتھ کیوں ہو؟''

''بڈھے کو چھوڑ کر باقی دو میرے بھائی ہیں۔ بڈھا ہمارا سردار ہے۔ پہلے ڈاکو تھا پھر یہ کام کرنے لگا۔''

''یہ بھی تو ڈکیتی ہے۔''

''اسی لیے میں ان کے چنگل سے نکلنا چاہتی ہوں۔'' اس نے کہا اور میری طرف دیکھا۔ ''کیا تم میری مدد کرو گے؟''

میں بھلا اس کی مدد کیسے کر سکتا تھا مگر میرا دل انکار کو تیار نہیں تھا۔ ''جو میرے بس میں ہوا کروں گا مگر میں تمہاری کیا مدد کروں؟''

اس نے ایک پرچی مجھے دی۔ ''یہ میرا پتا ہے، ہم حیدر آباد میں رہتے ہیں۔''

میں نے پرچی رکھ لی۔ ''ٹھیک ہے اب میں کیا کروں۔''

''تم حیدر آباد آ کر مجھے یہاں سے لے جانا؟''

''کہاں؟''

''مجھے کیا پتا؟'' وہ کسی قدر تنگ کر بولی۔ ''میں عورت ہو کر ہمت کر رہی ہوں اور تم مرد ہو کر ایسی باتیں کر رہے ہو۔''

اس کی بات سن کر مجھے سچ مچ شرم آئی۔ میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے لیکن میں بتا دوں میں غریب آدمی ہوں اور تمہیں میرے ساتھ مشکل میں رہنا پڑے گا۔''

''تم فکر مت کرو میرے پاس کچھ رقم ہے اس سے گزارا ہو جائے گا۔'' وہ اعتماد سے بولی۔ ''میں تم سے کوئی شکایت نہیں کروں گی۔ ایک بات اور ہے تم مجھے لے کر جاؤ گے تو سب سے پہلے مجھ سے نکاح کرو گے میں ایسے ہی تمہارے ساتھ نہیں رہوں گی۔'' کہتے ہوئے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''ماروی۔'' وہ بولی۔ ''پر سب ماری کہتے ہیں۔''

''میرا نام جلیل ہے۔''

''میں نے شناختی کارڈ میں دیکھ لیا ہے۔''

''تم پڑھی لکھی ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''میٹرک کیا ہے۔''

مجھے لگا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ اس لڑکی کو دیکھا تو میں نے اس کے لیے خاص جذبہ محسوس کیا اور اس وقت میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اسے حاصل بھی کر سکوں گا۔ یہ ساری گفتگو مشکل سے پانچ منٹ میں ہو گئی۔ آدمی اندر آنے لگے تو اس نے آہستہ سے کہا۔ ''میں تمہارا انتظار کروں گی۔''

''میں آؤں گا اگر زندہ رہا تو......'' میں نے وعدہ کر لیا۔ آدمی اندر آ رہے تھے اور میں ساکت بن گیا۔ ان کی آوازیں اور خوشی بتا رہی تھی کہ ان کے ہاتھ اس ڈکیتی میں خاصا مال لگا ہے۔ ماری واپس چلی گئی اور کچھ دیر بعد وہ بس سے اتر گئے تھے۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ چلے گئے ہیں تو میں اٹھ کر باہر آیا اور ہائی وے کے ساتھ درختوں تک گیا تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ آس پاس کا جائزہ لوں اور سڑک تک جا کر مدد طلب کروں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ کہیں مجھے ہوش میں پا کر دوسروں کو شک نہ ہو جائے۔ اس لیے میں سب کے ساتھ ہی ''ہوش'' میں آتا تو مناسب تھا۔ صرف سیٹھ احسان جانتا تھا کہ میں نے گلاب جامن نہیں کھایا تھا مگر میں اسے کہہ سکتا تھا کہ جب میں بے ہوش نہیں ہوا تو ان لوگوں نے مجھے پستول کی نوک پر زبردستی گلاب جامن کھلایا اور میں بے ہوش ہو

گیا۔ میں بھی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گلاب جامن میں شامل دوا بہت زوداثر بھی کیونکہ جس نے کھایا وہ منٹ سے بھی پہلے بے ہوش ہوگیا۔

نہ جانے اس کا اثر کتنی دیر رہتا۔ تین گھنٹے بعد لوگوں کو رفتہ رفتہ ہوش آنا شروع ہوا۔ جوان لوگ جلدی ہوش میں آگئے تھے اور میں جوان تھا اس لیے میں بھی جلدی اٹھ بیٹھا۔ ہوش میں آنے کے بعد بھی لوگوں کے سر چکرا رہے تھے اور ان میں سے کچھ نے الٹی کر دی جس سے ان کی حالت بہتر ہوئی تھی۔ سب بدحواس اور رو دھو رہے تھے۔ جن کا زیادہ گیا تھا وہ زیادہ رو دھو رہے تھے۔ سب سے زیادہ واویلا سیٹھ احسان نے کیا وہ شور کرتا رہا کہ وہ لٹ گیا اور برباد ہو گیا مگر اس نے کسی کو بتایا نہیں کہ اس کا کیا گیا تھا؟ کچھ دیر بعد سارے مسافر قافلے کی صورت میں ہائی وے کی طرف روانہ ہوئے جہاں سے ہمیں مدد ملی اور اگلی پولیس چوکی تک پہنچے۔ وہاں ڈکیتی کا پرچا کٹوایا اور پولیس نے سب کا بیان لیا۔ شام انہی کاموں میں ہوگئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ہم واپس سکھر روانہ ہوں گے۔

مگر رات اسی پولیس چوکی میں گزار کر سیٹھ احسان نے صبح نہ جانے کہاں سے رقم کا بندوبست کیا اور ہم حیدر آباد گئے اور وہاں سے اس نے مال لیا اور واپس روانہ ہو گیا۔ اس سارے عرصے میں وہ اپنے نقصان کو روتا رہا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس بار اس کا سچ مچ کا نقصان ہوا ہے ورنہ پہلے وہ چالاکی سے بچ جاتا تھا۔ اس کی چالاکی اس بار کام نہیں آئی تھی۔ جب واپس دکان پہنچا تو اس نے مال اترواتے ہی تمام ملازموں کو جمع کر کے کہا۔ ''بابا میرے ساتھ برا ہوا ہے پورے دو لاکھ کا نقصان ہوا ہے اب تم لوگ اس نقصان کو پورا کرنے میں میرا ساتھ دو۔''

''ہم کیسے ساتھ دیں؟''

''میں اس وقت تک تم لوگوں کو پانچ سو روپے کم دوں گا جب تک میرا دو لاکھ کا نقصان پورا نہیں جاتا۔''

ہم بھڑک اٹھے تھے۔ میں نے کہا۔ ''سیٹھ کیسی بات کرتے ہو۔ اگر ہمارا نقصان ہوا تو تم نے کبھی بھرا ہے۔''

''یہ دکان کا نقصان ہے۔''

''ہم ملازم ہیں مالک نہیں ہیں تم نے کبھی نفع میں ایک روپیا بھی ہم کو دیا ہے جو نقصان میں ہمیں شامل کر رہے ہو۔''

میں بول رہا تھا اور باقی لڑکے میرا ساتھ دے رہے تھے۔ کوئی بھی اس بات کو ماننے کو تیار نہیں تھا۔ مگر سیٹھ احسان فیصلہ کر چکا تھا اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے بابا تو تم لوگ چھٹی کرو میں دوسرے لڑکے رکھتا ہوں۔ ان کو کم تنخواہ دوں گا تو میرا نقصان جلدی پورا ہو جائے گا۔''

اس پر مجھ سمیت چار لڑکوں نے کام کرنے سے انکار کر دیا اور دو مان گئے۔ سچی بات ہے کہ میں اس سارے عرصے میں سوچتا رہا تھا کہ کس طرح ملازمت چھوڑوں کہ سیٹھ احسان کو مجھ پر کسی قسم کا شک نہ ہو۔ اس نے پوچھا نہیں تھا کہ جب اس نے میرا گلاب جامن کھایا تھا تو میں کیسے بے ہوش ہوا۔ اگرچہ میں نے پولیس چوکی پر اپنے بیان میں کہہ دیا تھا کہ ڈاکوؤں نے زبردستی مجھے گلاب جامن کھلایا تھا۔ سیٹھ احسان نے شاید اس پر یقین کر لیا۔ اب اس نے خود موقع دے دیا تھا۔ میں نے ملازمت چھوڑی اور بہنوں سے کہا کہ نوکری کے لیے کراچی جا رہا ہوں۔ کچھ رقم ان سے ادھار لی اور کچھ میرے پاس موجود تھی۔ میں اسی راستے سے حیدرآباد کی طرف گیا اور پیشاب کرنے کے بہانے اس جگہ بس رکوائی جہاں ڈکیتی ہوئی تھی۔ بس سے اتر کر میں درختوں تک آیا اور ایک درخت کی جڑ کے پاس زمین میں چھپائے سونے کے بسکٹ نکالے۔

دس دس گرام کے پانچ بسکٹ سیٹھ احسان اپنی جرابوں میں چھپا کر لے جا رہا تھا اور بس میں وہ انہیں ہی ٹھیک کرتا رہا تھا۔ جب سردار نے مکمل تلاشی کی بات کی تو میں نے اسی طرح جھکے جھکے سیٹھ احسان کے موزوں سے بسکٹ نکال کر بس کی فرش کے فٹ میٹ تلے چھپا دیئے۔ ڈاکوؤں نے صرف انسانوں کی تلاشی لی تھی اس طرف کسی کا دھیان ہی نہیں گیا۔ ماری کا بھی نہیں جو جانتی تھی کہ میں ہوش میں ہوں۔ اب مجھے پتا چلا کہ سیٹھ احسان کس طرح کپڑے کی ادائیگی کے لیے مال لے جاتا تھا۔ وہ خاندان کے سناروں سے یہ بسکٹ لیتا ہوگا اور حیدرآباد جا کر فروخت کر دیتا ہوگا۔ بسکٹ ہاتھ کے ہاتھ بک جاتے ہیں۔ بسکٹ لے کر میں بس میں سوار ہوا اور حیدرآباد پہنچا۔ ماری کا پتا تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ یہ ایک اچھے علاقے میں دو منزلہ مکان تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ ماری سے کیسے رابطہ کروں۔ میں گلی سے دو تین بار گزرا اور دروازے پر دستک دینے کی ہمت نہ کر سکا۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں ماری کے بھائیوں یا اس بڈھے سردار میں سے کوئی نہ نکل آئے اور مجھے پہچان بھی

لے۔ مگر جب دوسری بار گزر کر جا رہا تھا تو ایک سبزی والا گلی میں آیا۔ وہ ماری کے مکان کی طرف جا رہا تھا کہ میں رک گیا۔ مجھے خیال آیا کہ شاید ماری سبزی لینے باہر آئے۔ خوش قسمتی سے ایسا ہی ہوا۔ سبزی والا آواز لگاتا ماری کے دروازے پر پہنچا تو دروازہ کھلا اور وہ باہر آئی۔ میری جان جیسی آنکھوں میں کھنچ آئی تھی اور میں تیزی سے واپس آیا۔ سبزی والے کے پاس رکا اور ٹماٹر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ کیا حساب ہیں؟''

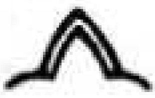
''اسی روپے کلو۔'' سبزی والے نے کہا۔ مگر مجھے کون سے لینے تھے۔ ماری نے چونک کر مجھے دیکھا اور میرا مقصد پورا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر دبی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ سبزی لیتے ہوئے اس نے اشارے سے مجھ سے کہا کہ میں چار بجے آؤں اس وقت گھر میں کوئی ہے۔ میں نے سر ہلایا اور اس کی گلی سے نکل کر ایک نزدیکی ہوٹل میں جا بیٹھا۔ ٹھیک چار بجے میں اس کی گلی میں واپس آیا تو ماری دروازے پر موجود تھی۔ اس نے عبایا اور نقاب لے لیا تھا اور ایک بیگ اٹھائے کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے اشارہ کیا اور خود گلی کے سرے کی طرف چل پڑی۔ میں ذرا فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ میں اس کی مستعدی اور اس سے بھی زیادہ یقین پر حیران تھا۔ اسے یقین تھا کہ میں آؤں گا اور اس نے ساری تیاری کی ہوئی تھی۔ اس کا بیگ زیادہ بڑا نہیں تھا اس میں مشکل سے چند جوڑے اور کچھ سامان آ سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد ہم ایک رکشے میں حیدرآباد بس اسٹاپ تک جا رہے تھے۔ راستے میں ہم نے زیادہ بات نہیں کی کیونکہ رکشے والا سن سکتا تھا جب سے سی این جی رکشے آئے ہیں ان کی آواز نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ بس اسٹاپ پر اترتے ہی اس نے مجھ سے کہا۔ ''ہمیں کراچی جانا ہے۔''

کراچی جانے کے لیے بے شمار بسیں اور وین تیار تھیں۔ ہم نے ایک وین کا ٹکٹ لیا کیونکہ یہ تیزی سے سفر کرتی ہیں اور راستے میں رکتی نہیں ہیں۔ دو گھنٹے بعد ہم کراچی میں تھے۔ حسب وعدہ میں نے سب سے پہلے ماری سے نکاح کیا۔ ایک کچی بستی کی مسجد کے مولوی صاحب نے نہ صرف ہمارا نکاح پڑھایا بلکہ ہمیں اسی آبادی میں ایک چھوٹا سا ایک کمرے کا لیکن پکا مکان کرائے پر دلوایا۔ اس تعاون کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں جھوٹ بولنا پڑا تھا کہ ماری ہندو ہے اور میرے ساتھ فرار ہو کر آئی۔ وہ اسلام قبول کرنا چاہتی ہے اور اسے اپنے قبیلے والوں سے خطرہ ہے۔ ''اسلام قبول کر کے اس کا نام ماروی رکھا گیا۔ ماری کو خطرہ تھا کہ اس کے بھائی اور خاص طور سے سردار ہمارے پیچھے آ سکتے تھے کیونکہ سردار کی ماری پر نیت تھی اور اسی وجہ سے اس نے اتنا بڑا قدم اٹھایا اور میرے ساتھ گھر سے فرار ہو گئی۔ وہ دیکھنے میں کمسن لگتی تھی مگر اس کا شناختی کارڈ تھا۔ شادی کے بعد میں نے اس کا نیا شناختی کارڈ اپنے نام پر بنوایا۔ اب وہ ماروی جلیل تھی۔

ماری نے بتایا کہ سردار اس کی آنکھوں پر کوئی سفیدی سی جھلی چڑھا دیتا تھا۔ اس سے اس کی آنکھیں بالکل سفید ہو جاتی تھیں اور یہ جھلی بہت آسانی سے اتر جاتی تھی۔ انہوں نے اس طریقے سے کوئی چار بار واردات کی اور ہر بار انہیں لاکھوں کا مال ملا۔ اس کے علاوہ بھی وہ ڈکیتی کرتے رہتے تھے۔ وہ اپنے ساتھ خاصی رقم لائی تھی، یہ تقریباً تین لاکھ روپے تھے۔ یہ رقم اس کے بھائیوں کے حصے کی تھی۔ اسے کچھ نہیں ملتا تھا کیونکہ وہ ان کی ذمے داری تھی۔ اس رقم سے ہم نے یہی مکان خرید لیا جس میں ہم رہ رہے تھے۔ میں نے کام کا سوچا تو پہلے کپڑے کی دکان کھولنے کا خیال آیا مگر اس کے لیے سرمایہ بہت چاہیے تھا۔ میرے پاس بسکٹ تھے جو میں نے دو لاکھ ساٹھ ہزار کے فروخت کیے۔ اس وقت سونے کا دام چڑھا ہوا تھا۔

مگر کپڑے کے کام کے لیے یہ بھی ناکافی تھے۔ میں اپنے باپ کی خواہش پوری کرنا چاہتا تھا۔ کراچی آنے کے بعد میں نے بی کام کے لیے کالج میں داخلہ لیا۔ کالج برائے نام ہی جاتا تھا۔ البتہ ایک کوچنگ سینٹر سے میں نے تیاری کر لی۔ اس دوران میں دیکھتا رہا کہ کون سا کام آسان، کم پیسوں اور فوری نفع دینے والا ہو سکتا ہے۔ مجھے سبزی فروش کا کام سمجھ میں آیا۔ میں نے بی کام فائنل کا امتحان دیا اور سبزی کی دکان کھول لی۔ کچھ عرصے بعد اسی آبادی کے قریب ایک پکی سوسائٹی میں جگہ ملی تو دکان وہاں منتقل کر لی۔ یہاں میں نے مال اچھا رکھا اور ساتھ میں ایک ملازم بھی رکھ لیا۔ یہاں دکان ایسی چلی کہ اسی سوسائٹی میں، میں نے اپنا گھر لے لیا۔ آج میں ماری کے ساتھ خوش ہوں۔ ہمارے تین بچے ہیں۔ مالی لحاظ سے خوشحالی ہے مگر اب بھی کبھی کبھی ہم خوف زدہ ہو جاتے ہیں کہ کہیں ماضی ہمارا پیچھا کرتا یہاں تک نہ آ جائے۔



رائگاں

محترم معراج رسول
السلام علیکم
پاکستان سے اتنے فاصلے پر دیارِ غیر میں پہنچ کر بھی میں ضمیر کے کچوکے سے نجات حاصل نہیں کرسکا ہوں۔ جسے میں نے وقت گزاری سمجھا تھا وہ ایسا گہرا زخم دے جائے گا،میں بے وفا اور وہ باوفا سمجھ لی جائے گی، اس کا مطلق احساس نہ تھا۔ اس نے برسوں پہلے کہا تھا کہ جس ٹرین سے تم کسی اور کے ساتھ اترے، میں اسی ٹرین کے نیچے سر رکھ کر جان دے دوں گی اور اس نے ایسا کر کے دکھایا۔ اس میں غلطی کس کی ہے میری یا اس کی؟
شاہ میر
(روم، اٹلی)

سب کچھ میرا دیکھا بھالا تھا لہٰذا گاڑی نے جیسے ہی کالا پل کراس کیا میں اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تا کہ بھیڑ سے بچ کر پہلے ہی پلیٹ فارم پر پاؤں رکھ دوں۔ میرے پاس سامان تو زیادہ تھا نہیں۔ ہلکا سا ایک سوٹ کیس تھا اور بس۔ قلی کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ سوٹ کیس میں خود ہی اٹھا سکتا تھا۔ مجھے دیکھ کر افشاں نے بھی اپنا ہینڈ بیگ اٹھا لیا۔ ہم دونوں دروازے کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ عقلمند ایک ہم ہی نہیں تھے اور بھی لوگ تھے جو ہم سے پہلے

دروازے پر پہنچ گئے تھے۔ گاڑی رکتے ہی پہلے میں نیچے اترا پھر افشاں نے پاؤں نیچے رکھا۔ ابھی ہم نیچے اتر کر اپنی سانس درست کر ہی رہے تھے کہ ایک عورت بھیڑ کو چیرتی ہوئی میری طرف بڑھی اور میرا گریبان پکڑ لیا۔ میں نے اسے پہچان لیا لیکن یہ کوئی موقع نہیں تھا کہ میں اس کا نام لے کر اسے پکارتا۔ اس نے ایک نظر افشاں پر ڈالی اور زور سے چیخی۔

"یہ کون ہے تیری۔"

"میری بیوی ہے۔"

یہ سنتے ہی اس نے میرا گریبان چھوڑ دیا اور پیچھے ہٹتے ہٹتے بھیڑ میں گم ہوگئی۔ اتنی دیر میں لوگ جمع ہوگئے۔ ایک قلی بھی ہمارے قریب آکر کھڑا ہوگیا تھا اور میرے کہے بغیر میرا سوٹ کیس اٹھا کر سر پر رکھ لیا تھا۔

"آج اس پگلی پر کوئی دوسرا ہی دورہ پڑا ہوا تھا۔ ورنہ یہ حرکت وہ کبھی کرتی تو نہیں تھی۔ اب اس کی شکایت کرنی پڑے گی۔ کیا خبر کسی وقت کسی کو نقصان پہنچا دے۔" قلی نے میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"اس کی شکایت مت کرنا۔"

"کیوں بابو جی۔"

"ریلوے افسر اسے پولیس کے حوالے کردیں گے۔ وہ نہ جانے اس کا کیا حشر کریں۔"

"اس کا پاگل پن خطرناک بھی تو ہوتا جارہا ہے۔ کسی وقت کسی پر حملہ کر بیٹھی تو کیا ہوگا۔"

"ہوسکتا ہے اس کو میری شکل پر کسی اور کا دھوکا ہوا ہو۔ ایسی خطرناک ہوتی تو کسی اور پر بھی حملہ کرسکتی تھی۔"

"ہاں بابو جی کہہ تو آپ بھی ٹھیک رہے ہو۔ نہیں کروں گا شکایت، ویسے بھی یہ کسی کو نقصان پہنچاتی نہیں ہے پیچھے جو بستی ہے اسی میں رہتی ہے جب کوئی گاڑی آتی ہے تو اس کے پیچھے بھاگتی ہے۔ ایک ایک ڈبے میں جھانکتی ہے۔ آج تک کسی کو کچھ نہیں کہا۔ آپ کا گریبان نہ جانے کیسے پکڑ لیا اور پھر خود ہی چھوڑ دیا۔"

"یہ لڑکی کب سے یہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے کوئی خاص غور تو نہیں کیا لیکن پچھلے دو سال سے تو دیکھ رہا ہوں۔"

"اسے کوئی ڈھونڈنے بھی نہیں آیا؟"

"بابو جی، مجھے کچھ معلوم نہیں۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے یہ لڑکی کسی اور شہر کی ہو۔ ریل میں بیٹھ کر یہاں آگئی ہو یا کسی پاگل خانے سے بھاگ آئی ہو۔ کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

باتیں کرتے ہوئے ہم باہر آگئے۔ ہمیں دیکھ کر ایک ٹیکسی ہمارے پاس آکر رک گئی۔ قلی نے سامان رکھ دیا اور ہم ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔

"ڈیفنس چلو۔" میں نے ٹیکسی والے سے کہا۔

"میں بہت چھوٹی تھی جب کراچی آئی تھی۔ اب تو کراچی بہت بدل گیا ہے۔" افشاں نے کہا۔

"سب کچھ ہی بدل گیا۔" میں نے شکستہ آواز میں کہا لیکن ظاہر ہے افشاں بات کی تہہ کو نہیں پہنچ سکتی تھی۔

"میں تو اس پاگل لڑکی کو دیکھ کر ڈر ہی گئی تھی۔"

"وہ کوئی خطرناک پاگل نہیں تھی جسے دیکھ کر ڈرا جائے۔"

"آپ کا گریبان پکڑ لیا تھا۔ اس کے بعد کچھ بھی کر سکتی تھی۔"

"مجھے تو یہ لگتا ہے اس کی کوئی عزیز ہستی اسے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ وہ اس کا محبوب بھی ہوسکتا ہے۔ وہ اس کے انتظار میں پاگل ہوگئی ہو۔ ہر مسافر کے چہرے میں اس کا چہرہ ڈھونڈتی رہتی ہے۔ میرے چہرے میں اسے اپنے محبوب کی شباہت نظر آئی۔ اس نے میرا گریبان پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔ پھر فوراً ہی اسے خیال آیا ہوگا کہ میں وہ نہیں ہوں اور اس نے مجھے چھوڑ دیا۔"

"واہ، کیا تجزیہ کیا ہے۔ افسانہ نگار میں ہوں کہانی آپ نے تحریر کردی۔ میں آپ سے سو فیصد متفق ہوں۔ بالکل یہی ہوا ہوگا۔ بے چاری۔"

باتوں باتوں میں وقت کٹ گیا اور ہماری منزل آگئی۔ میرا ذہن اب تک اس لڑکی میں الجھا ہوا تھا۔ جسے میں الماس کے نام سے پہچان چکا تھا۔ اس لڑکی سے میری بہت سی یادیں جڑی ہوئی تھیں مگر ٹیکسی رک چکی تھی اس لیے اترنا پڑا۔

یہ گھر جہاں ہم آئے تھے افشاں کے خالو خالہ کا تھا۔ اس کے خالو ریٹائرڈ فوجی تھے اور اب پراپرٹی کا کام کررہے تھے۔ ان کی دو بیٹیاں شادی شدہ تھیں اور بیٹا اپنی بیوی کے ساتھ امریکا میں مقیم تھا۔ یہ سب باتیں افشاں مجھے راستے میں بتا چکی تھی۔ شادی کے بعد ہی سے وہ خالہ سے ملنے اور کراچی دیکھنے کی ضد کرنے لگی تھی۔ اس کے بعد بھی آتے آتے ایک سال لگ گیا تھا۔ ایک ضد اس کی یہ بھی تھی کہ وہ ٹرین سے کراچی جائے گی اور بغیر اطلاع دیے پہنچے گی۔ وہ

ٹرین میں کبھی نہیں بیٹھی تھی ورنہ میں یہ تھکا دینے والا سفر جہاز سے کرتا اور اب سوچ رہا تھا کہ اگر ٹرین سے نہ آیا ہوتا تو الماس کو اس حالت میں دیکھنے سے بچ جاتا۔ خدا کو یہ تکلیف دہ منظر بھی دکھانا تھا ورنہ میں تو الماس کو تقریباً بھول ہی چکا تھا۔

ہم افشاں کی خالہ کے پاس بیٹھے تھے لیکن میرا ذہن الجھا ہوا تھا۔ میں ابھی تک افشاں کی خالہ کے شاندار بنگلے میں نہیں ریلوے پلیٹ فارم پر تھا۔ اگر وہ مجھے میرے نام سے پکار لیتی تو کیا ہوتا۔

''شاہ میر بیٹا! تم بولتے کم ہو یا سسرال سمجھ کر شرما رہے ہو۔''

''جی نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میں نے سوچا آپ دونوں جی بھر کے باتیں کرلیں اس کے بعد میں بولنا شروع کروں گا۔''

''افشاں ہمیشہ کی باتونی ہے۔ اس کے سامنے بڑے بڑے خاموش ہو جاتے ہیں، تم عقل مند ہو جو چپ ہو گئے ہو۔''

''یہ ایسے چپ ہونے والے نہیں ہیں۔ اسٹیشن پر ان کے ساتھ ایک دلچسپ واقعہ ہو گیا۔ شاید اس کے بارے میں اب تک سوچ رہے ہیں ورنہ یہ چپ رہنے والے نہیں۔''

اس کے بعد افشاں مزے لے لے کر پورا واقعہ سنانے لگی۔ اپنی طرف سے کچھ اضافے بھی کرتی جا رہی تھی۔

''ان کی کوئی پرانی جاننے والی ہوگی مگر یہ بتا ہی نہیں رہے ہیں۔ بے چاری کا دل توڑ دیا اور وہ اس حال کو پہنچ گئی۔''

افشاں کی خالہ نے شاید اپنے شوہر کو فون کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ بھی آ گئے اور گفتگو کا رخ کسی اور طرف مڑ گیا۔ وہ سابق فوجی تھے لیکن نہایت شوخ اور دلچسپ ثابت ہوئے۔ تھوڑی ہی دیر میں ایسے گھل مل گئے جیسے برسوں کے دوست ہوں۔ میں اس وقت تنہائی چاہتا تھا لیکن انہوں نے اپنی لچھے دار باتوں میں گرفتار کرلیا۔

کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ ملازم نے کھانا چن دیا۔

''بھئی اب تم لوگ تھوڑی دیر آرام کرلو۔ پھر سی ویو چلیں گے۔ کوئی کراچی آئے اور سمندر نہ دیکھے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔''

''خالو جان یہ کراچی ہی کے ہیں۔ خوب سمندر دیکھا ہوگا۔ لاہور تو اب گئے ہیں۔ ہاں آپ میرے لیے کہہ سکتے ہیں۔ بچپن میں کراچی آئی تھی۔ اسی وقت کا سمندر دیکھا ہوا ہے۔''

خالو جان کو یہ نیا موضوع مل گیا کہ میں کراچی کا ہوں۔ اب وہ یہ جاننے کی فکر میں کوشاں ہو گئے کہ میں کراچی میں کہاں رہتا تھا۔ تعلیم کہاں حاصل کی، ملازمت کہاں کی، لاہور کیوں گئے، افشاں سے شادی کیسے ہو گئی وغیرہ وغیرہ۔

افشاں اور خالہ جان تو آرام کرنے چلی گئیں اور میں پھنس گیا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ افشاں کو بھی باتوں کے نام پر خالہ جان کو اپنا دماغ کھلانا پڑا تھا۔ بات یہ تھی کہ دونوں میاں بیوی اتنے اکیلے تھے کہ باتوں کو ترس گئے تھے۔ کسی شکار کی طرح ہم دونوں ہاتھ آ گئے تھے۔

باتوں میں اتنا وقت گزر گیا کہ سی ویو جانے کا وقت ہو گیا۔ ڈرائیور نے آکر اطلاع دی کہ گاڑی لگا دی ہے۔ لمحے بھر کے آرام کے بغیر ہمیں جانا پڑا۔

رات کا کھانا بھی باہر کھانا پڑا۔ گھر آکر پھر باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بہرحال آدھی رات کے بعد ہماری جان چھوٹی اور اس نوید کے ساتھ کہ صبح جلدی اٹھ جانا افشین کے گھر چلنا ہے۔ افشین ان کی بیٹی کا نام تھا۔

''یہ تمہارے خالو کچھ کھسکے ہوئے نہیں ہیں؟'' میں نے کمرے میں آتے ہی افشاں سے کہا۔

''ارے نہیں، بے چارے باتیں کرنے کو ترس گئے ہیں اور پھر خوش بھی بہت ہو رہے ہیں۔''

''اس طرح ہم اکیلے تو گھوم ہی نہیں سکیں گے۔''

''ان کا شوق پورا ہو جائے پھر ہم اکیلے بھی گھوم لیں گے۔''

''سال دو سال سے پہلے ان کا شوق پورا ہونے والا نہیں۔''

''اب ایسا بھی نہیں ہے۔''

افشاں اتنی تھک گئی تھی کہ بستر پر لیٹتے ہی سو گئی۔ تھکا ہوا تو میں بھی تھا لیکن لیٹتے ہی مجھے الماس کا خیال آ گیا اور پھر نیند اچٹ گئی۔ وہ تمام باتیں یاد آنے لگیں جو اب ماضی بن چکی تھیں۔ ایک ایک منظر میرے سامنے آ گیا۔

الماس اور میں ایک ہی آفس میں تھے۔ میں آفیسر گریڈ میں اور وہ کلرک تھی۔ میرا اور اس کا سیکشن بھی الگ تھا۔ میں ایڈمنسٹریشن میں تھا اور وہ اکاؤنٹس میں۔ اسی لیے

میں اسے شکل سے نہیں پہچانتا تھا۔
اس روز میں آفس سے نکل کر پارکنگ میں آیا۔ گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی والا تھا کہ ایک لڑکی نے شیشہ کھٹ کھٹایا۔ میں نے لڑکی سمجھ کر شیشہ اتار دیا کہ نہ جانے کیا کہنا چاہتی ہے۔ اس نے ہاتھ ڈال کر لاک کھولا اور جھپاک سے میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھ کر دروازہ بند کرلیا۔
''میرا نام الماس ہے۔ میں آپ ہی کے آفس میں کام کرتی ہوں۔ مجھے ذرا جلدی جانا تھا اس لیے میں نے یہ گستاخی کرلی۔''
''وہ تو سب ٹھیک ہے۔ آپ میرے ہی دفتر میں ہوں گی لیکن آپ سے میری شناسائی نہیں ہے اس لیے آپ کو اجازت لے کر بیٹھنا چاہیے تھا۔''
''میں اجازت لینے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ آپ گاڑی آگے بڑھائیں میں راستے میں آپ کو سب کچھ بتادوں گی۔''
آفس کی چھٹی ہوگئی تھی۔ لوگ پارکنگ کی طرف آرہے تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کوئی اسے میرے ساتھ دیکھے۔ کیا خبر دفتر میں اس کی کیا شہرت ہے۔ میں نے اس میں عافیت سمجھی کہ گاڑی کو پارکنگ سے نکال کر لے جاؤں۔
''جہاں اترنا ہوگا بتادوں گی۔''
''وہ تو آپ بتادیں گی لیکن یہ تو بتائیے آپ میری اجازت کے بغیر میری گاڑی میں بیٹھیں کیسے۔''
''سر، میرے بھائی کا ایکسی ڈنٹ ہوگیا ہے۔ ابھی ابھی فون آیا تھا۔ میں جلد از جلد پہنچنا چاہتی تھی۔ اگر ٹیکسی کے لیے سڑک تک جاتی تو بہت دیر ہوجاتی۔ میں نے دیکھا کہ آپ گاڑی میں بیٹھ رہے ہیں تو......''
''بس مس الماس میں سمجھ گیا۔ آپ کی گھبراہٹ آپ کے چہرے سے ظاہر ہے۔ اب میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں کہ میں نے آپ سے اتنے سوال جواب کر ڈالے۔ یہ بتائیے آپ کا بھائی کس اسپتال میں ہے۔''
''آپ مجھے کسی ایسی جگہ اتار دیجیے جہاں ٹیکسی مل جائے۔ میں ٹیکسی پکڑ کر چلی جاؤں گی۔''
''میں نے پوچھا ہے آپ کا بھائی کس اسپتال میں ہے۔''
اس نے مجھے اسپتال کا نام بتایا اور میں نے گاڑی اس طرف موڑ دی۔ میں یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ اس لڑکی نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے یا اس کا بھائی واقعی اسپتال میں داخل ہے۔
''تمہارا کوئی اور بھائی بھی ہے؟''
''نہیں سر، یہی ایک بھائی ہے جس کا ایکسی ڈنٹ ہوا ہے۔ بوڑھے والدین ہیں نہ جانے وہ کس طرح اسپتال والوں سے نمٹ رہے ہوں گے۔ کس طرح بھائی کو اسپتال لائے ہوں گے۔''
''اگر آپ کہیں تو میں بھی ایک نظر آپ کے بھائی کو دیکھ لوں۔''
''نہیں سر، آپ کو زحمت ہوگی۔ آپ نے مجھے یہاں تک چھوڑ دیا آپ کی یہی مہربانی بہت ہے۔''
''نہیں، میں چلتا ہوں۔ شاید وہاں میری ضرورت پڑ جائے۔''
میں نے گاڑی پارک کی اور اس کے ساتھ اسپتال کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ اس کے والد سیڑھیوں پر ہی مل گئے۔
''بیٹی الماس، اچھا ہوا تو آگئی۔ بہت برا ایکسی ڈنٹ ہوا ہے۔ ٹانگ کئی جگہ سے ٹوٹ گئی ہے۔ سر پر بھی چوٹیں ہیں۔ ڈاکٹر کہہ رہے ہیں پہلے پیسے جمع کراؤ اس کے بعد آپریشن کریں گے۔ تیری ماں نے یہ چوڑیاں دی ہیں انہیں بیچ کر میں ابھی آتا ہوں۔ تو جب تک ماں کو دلاسہ دے۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' انہوں نے میری طرف دیکھا۔ ''الماس یہ کون ہے تیرے ساتھ؟''
''ابا یہ میرے باس ہیں انہوں نے خالد کا سنا تو اسے دیکھنے آگئے۔''
''بیٹا، تم ایسے وقت آئے ہو کہ میں تم سے ہنس کر بات بھی نہیں کرسکتا۔''
''بڑے صاحب، آپ کو چوڑیاں بیچنے کی ضرورت نہیں۔ بس مجھے ڈاکٹر سے ملوادیں۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔''
''میں نے بات کرکے دیکھ لی ہے۔ وہ نہیں مانتا۔ وہ اس وقت مان بھی گیا تو پیسوں کا انتظام تو پھر بھی کرنا ہوگا۔''
''کچھ نہ کچھ ہوجائے گا۔ آپ آئیں تو میرے ساتھ۔''
میں انہیں لے کر ڈاکٹر کے پاس چلا گیا۔ اس وقت جتنے پیسے میرے پاس تھے ڈاکٹر کے پاس جمع کرادیے۔ باقی کا چیک کاٹ کردے دیا۔ اپنے ایک ڈاکٹر دوست سے فون

بھی کرادیا جس کی وجہ سے کافی رعایت بھی مل گئی۔ میں نے الماس کو اعتماد میں لیا۔
''میں نے پے منٹ کردی ہے۔ تم اپنی والدہ کی چوڑیاں نہ بکنے دو۔''
''سر، ابا کبھی نہیں مانیں گے۔ وہ دکان بیچ دیں گے لیکن کسی کا احسان نہیں اٹھائیں گے۔''
''تم ان سے کہنا، ڈاکٹر صاحب سر کے دوست نکلے۔ وہ آپریشن فری کررہے ہیں۔''
''سر، یہ تو مجھے بھی اچھا نہیں لگے گا کہ آپ پے منٹ کریں۔''
''مجھے یہ ثواب کمانے دو۔ تمہارے بھائی کا تمام علاج میں کراؤں گا۔ تم بس اپنے گھر والوں کو یہ بتاتی رہو کہ علاج فری ہورہا ہے۔''
اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ میرا یہ احسان کبھی نہ بھولنے کا عہد کررہی تھی۔
اس کے بھائی کا آپریشن دو گھنٹے تک چلتا رہا۔ اس وقت تک میں وہیں رکا رہا کہ نامعلوم کس وقت کس چیز کی ضرورت پڑ جائے۔
جب وہ آپریشن تھیٹر سے باہر آیا تو میں نے الماس کے ہاتھ میں دس ہزار روپے دیے اور اپنا پرسنل فون نمبر دے دیا کہ جس وقت میری ضرورت پڑ جائے وہ مجھے فون کر دے۔
میں اسپتال سے باہر آیا تو خود کو ایسا مطمئن محسوس کررہا تھا کہ ایسا اطمینان کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ سچ ہے کسی کے کام آنا ہی سب سے بڑی نیکی ہے۔
میں بہت تھک گیا تھا۔ گھر پہنچ کر الٹا سیدھا کھانا کھایا۔ کچھ دیر بستر پر لیٹ کر ٹی وی دیکھا اور پھر سوگیا۔
صبح اٹھا۔ حسب معمول شیو کیا اور دفتر کی طرف روانہ ہوگیا۔ راستے میں اچانک الماس کا خیال آیا اور میں نے گاڑی نہ چاہتے ہوئے بھی اسپتال کی جانب موڑلی حالانکہ مجھے آفس جانے میں دیر ہوگئی تھی۔ میں اسپتال پہنچا تو الماس کے والد سے ملاقات ہوئی۔ میں نے الماس کا پوچھا تو انہوں نے یہ کہہ کر مجھے حیران کردیا کہ وہ آفس گئی ہے۔
''اسے نوکری کی فکر لگی رہتی ہے۔ کہہ رہی تھی چھٹی کرلی تو پیسے نہ کٹ جائیں۔''
مجھے لگا کہ میں خالد کو نہیں الماس کو دیکھنے آیا تھا۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد میں نے اجازت مانگی۔

منجنیق

عربی لفظ گوپھن۔ انگریزی Catapult جو لاطینی Catapalta سے ماخوذ ہے۔ ایک قدیم جنگی مشین جس کی دو قسمیں مروج تھیں۔ چھوٹی منجنیق سے تیر و آتش اور بڑی سے بھاری پتھر اور کھولتے ہوئے تیل کے پیپے پھینکے جاتے تھے۔ برصغیر پاک و ہند میں غالباً سب سے پہلے محمد بن قاسم نے یہ مشین استعمال کی۔ اس کا نام عروسک تھا اور اس سے عربوں نے دیبل کا قلعہ ڈھایا تھا۔ چودھویں صدی عیسوی میں توپ کی ایجاد سے منجنیقوں کا استعمال متروک ہوگیا۔

منجھ روپ

انڈے سے باہر آنے کے بعد ہر کیڑا مختلف حالتوں سے گزرتا ہے۔ پہلی حالت کو پہلی روپ اور دوسری حالت کو پوپا یا منجھ روپ کہتے ہیں۔ پہلا روپ ختم ہونے پر کیڑا کسی چیز سے چمٹ جاتا ہے یا اپنے اوپر ایک خول چڑھا لیتا ہے اور کچھ مدت کے لیے سو جاتا ہے۔ اس نیند کے دوران اس کے جسم میں نمایاں تبدیلی ہوتی ہے۔ جب وہ جاگتا ہے تو پورا پردار کیڑا بن چکا ہوتا ہے اور یہ اس کی آخری حالت ہوتی ہے۔

مرسلہ: زہرہ جبیں۔ سکھر

''میں اور بیٹھتا لیکن آفس کو دیر ہورہی ہے۔''
''ہاں بیٹا جاؤ۔ پہلے نوکری اور بعد میں کچھ اور۔ میں یہاں ہوں۔ اب خالد کی طبیعت بھی بہتر ہے۔''
میں آفس پہنچنے کے بعد سیدھا اکاؤنٹس سیکشن میں گیا۔ اس نے کام کرتے ہوئے گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ابھری لیکن وہ اتنی محتاط تھی کہ کوئی بات کیے بغیر پھر اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ میں اس کی میز سے گزرتا ہوا اکاؤنٹس آفیسر کے کمرے میں چلا گیا۔
''قدوائی صاحب، آپ کے سیکشن میں الماس نام کی ایک لڑکی ہے۔''
''ہاں ہے تو۔ کیا کوئی کمپلین ہے اس کی؟''
''اس کا بھائی اسپتال میں ہے۔ شدید ایکسی ڈنٹ ہوا ہے اور اس کے گھر میں کوئی مریض کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے۔ اس کی دس روز کی چھٹی منظور کرلیں۔''
''کیا سادہ کاغذ پر منظوری دے دوں۔ آپ سے

کہنے کی بجائے وہ مجھ سے کہتی۔ بہر حال اس سے کہیں درخواست لکھ کرلے آئے میں منظور کرلوں گا۔''

''اسے کسی کام سے میرے پاس بھیجئے۔ میں اسے سمجھاتا ہوں۔''

''شاہ میر صاحب، آپ الماس کو کیسے جانتے ہیں۔''

میں نے اس سے تعارف کی پوری کہانی سنا کر انہیں مطمئن کر دیا۔

کچھ دیر بعد وہ ایک فائل ہاتھ میں پکڑے ہوئے میرے پاس آئی اور ایک کیس مجھے سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔

''یہ تو میں بعد میں سمجھ لوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ تم آج آفس کیوں آگئیں۔''

''اگر تنخواہ میں سے پیسے کٹ گئے تو گھر کا چولہا بھی نہیں جلے گا۔ اسپتال کا خرچ تو آپ نے اٹھا لیا گھر کا خرچ تو مجھے ہی اٹھانا ہے۔ بھائی کی دیکھ بھال کرنے کے لیے ابا موجود ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔''

''آپ قدوائی صاحب کو چھٹی کی درخواست دے دیں۔ میں نے ان سے بات کر لی ہے۔''

''وہ نہ جانے کیا سمجھے ہوں گے۔''

''کچھ نہیں سمجھے ہوں گے آپ جائیں اور درخواست دیں۔''

''یس سر۔''

قدوائی صاحب نے نہ صرف اس کی چھٹی منظور کر لی تھی بلکہ آدھے دن کی چھٹی اپنی طرف سے دے دی تھی۔ میں آفس سے اٹھ کر اسپتال گیا تو وہ وہاں پہلے سے موجود تھی۔

میں گھر سے آفس آتے وقت اور گھر جاتے ہوئے اسپتال کا چکر لگا رہا تھا۔ خالد کی حالت روز بروز بہتر ہوتی جا رہی تھی۔

اس دن میں اتفاق سے اسپتال ہی میں موجود تھا جب خالد کو ڈسچارج کیا جا رہا تھا۔ میری گاڑی موجود تھی لہٰذا میں نے اپنی گاڑی کی پیش کش کی لیکن معلوم ہوا اسے لٹا کر لے جانا ہے اس لیے ایمبولینس ضروری ہے۔ پھر بھی میں ایمبولینس کے ساتھ ساتھ گیا اور اس کے گھر پہنچ گیا۔

گھر دیکھ کر غربت کا اندازہ ہو رہا تھا لیکن گھر جس طرح صاف پڑا تھا اس سے ان لوگوں کے مہذب ہونے کا بھی علم ہو رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر یہ بھی معلوم ہوا کہ خالد نے انٹر کا امتحان دیا ہے۔ پاس ہو گیا تو ملازمت تلاش کرے گا۔ میں نے ان لوگوں سے وعدہ کیا کہ اس کے پاس ہوتے ہی میں اسے کہیں نہ کہیں ملازمت دلوا دوں گا۔

میں نے دفتر آتے ہی اس کا ٹرانسفر اپنی برانچ میں کرا لیا تھا تاکہ اس کے مسائل سے واقف ہو سکوں اور اس کا کوئی نہ کوئی حل تلاش کر سکوں۔ کچھ دن بعد اس کا بھائی بالکل ٹھیک ہو گیا تو اس کی شوخی لوٹ آئی۔ مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ اس سے ایک غلط موقع پر ملا تھا ورنہ وہ تو نہایت حاضر جواب اور شوخ وشنگ لڑکی ہے۔ میری ہی برانچ میں تھی اس لیے اکثر میرے پاس آکر بیٹھ جاتی تھی اور نہایت شاندار فقروں سے اپنے ہونے کا احساس دلاتی رہتی تھی۔ اس کی ذہانت سے میں اتنا متاثر ہوا کہ اپنے مسائل بھی اس سے ڈسکس کرنے لگا۔ میں نے اس کے بھائی کی نوکری کا بندوبست بھی کر دیا تھا اور اسے یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ پرائیویٹ طور پر اپنی تعلیم جاری رکھے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس نے میرے مشورے پر عمل کیا۔

کبھی کبھی میں الماس کے ساتھ اس کے گھر بھی چلا جاتا تھا۔ ان لوگوں پر میرے اتنے احسانات تھے کہ وہ مجھے خوش آمدید کہنے میں بجا تھے۔ ان کے رویے سے میری حوصلہ افزائی ہو رہی تھی۔

الماس سے اب میری اتنی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی کہ وہ لنچ میرے ساتھ کرنے لگی تھی۔ کبھی میں دفتر میں لنچ منگوا لیتا تھا کبھی ہم دونوں باہر چلے جاتے تھے۔ چھٹی کے بعد میں ہی اسے گھر ڈراپ کرتا تھا۔ کبھی گھر کے باہر ہی سے چلا جاتا تھا کبھی اس کے ساتھ گھر کے اندر بھی چلا جاتا تھا۔

ایک دن میں سنجیدگی سے سوچنے لگا کہ ان لوگوں کو یہ تو معلوم ہے کہ میں غیر شادی شدہ ہوں لہٰذا یقیناً ان کے دل میں آتا ہوگا کہ میں الماس میں دلچسپی لیتا ہوں۔ اس سے شادی کر لوں گا۔ ان کا یہ خیال کچھ ایسا ناجائز بھی نہیں۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کی بیٹی کی شادی کسی اچھی جگہ ہو جائے۔ میں نے اپنے دل کو ٹٹولا کہ الماس کے لیے میرے دل میں کیا جذبات ہیں۔ دل سے آواز آئی کہ میں الماس سے محبت کرنے لگا ہوں۔ کیا یہی جذبات اس کے بھی ہیں؟ اس کا جواب میں نہیں دے سکتا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہو جائے گی؟ تب میں نے سوچا میں اس سے پوچھ کر تو دیکھوں۔

میں نے یہ فیصلہ کر تو لیا تھا کہ اس سے بات کروں گا

لیکن ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ یہ احساس بھی تھا کہ میں آفیسر ہوں اور وہ کلرک۔

شاید اس فیصلے پر عمل کرنے میں مزید وقت لگ جاتا لیکن ایک واقعے نے مجھے جلد باز بنادیا۔ میری والدہ شادی کے لیے اصرار کرتی ہی رہتی تھیں۔ مجھے شادی کر بھی لینی چاہیے تھی۔ گھر میں ان کے سوا کوئی عورت نہیں تھی۔ ایک بہن تھی جو شادی کر کے لندن چلی گئی تھی۔ بھائی ابھی پڑھ رہا تھا۔ ایک میں ہی تھا جو برسرِ روزگار تھا اور میری عمر بھی ہو گئی تھی۔ شادی کر لیتا تو والدہ کا ہاتھ بٹانے کے لیے ایک عورت گھر میں آجاتی۔ میرا حال یہ تھا کہ شادی کرنے کے قطعی موڈ میں نہیں تھا اور ٹالتا چلا آیا تھا لیکن اس دن وہ بہت سنجیدہ تھیں اور ہمارے رشتے کے ایک چچا تھے ان کی بیٹی کے لیے بات بھی کر آئی تھیں۔ میں نے اس لڑکی کو دیکھا ہوا تھا۔ مجھے وہ قطعی پسند نہیں تھی۔ میں نے اس مرتبہ امی سے صاف انکار نہیں کیا صرف اتنا کہہ دیا کہ سوچ کر بتاؤں گا۔ امی خوش ہو گئیں کہ پتھر پگھل گیا۔

اب ضروری ہو گیا تھا کہ میں الماس سے بات کرتا۔

”الماس، میں تمہیں کیسا لگتا ہوں۔“

”سر آپ بہت اچھے ہیں۔“

”کیا تم نے کبھی اپنے دل میں میری محبت محسوس کی ہے؟“

”کسی اجنبی کے پاس تو کوئی اتنی دیر نہیں بیٹھتا۔“

”مجھ سے شادی کرو گی؟“

”سر، آپ کو بہت اچھی اچھی لڑکیاں مل جائیں گی۔“

”جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔ مجھ سے شادی کرو گی؟“

”ایسی باتیں لڑکیوں سے نہیں ان کے والدین سے کی جاتی ہیں۔“ اس نے کہا اور میرے پاس سے اٹھ کر چلی گئی۔ اس کے اس طرح جانے ہی میں اس کا جواب پوشیدہ تھا جو انکار میں نہیں اقرار میں تھا۔

میں وقت کا انتظار کر رہا تھا کہ کب اس کے والدین سے بات کروں لیکن وقت نے میرا انتظار نہیں کیا۔ وہ اٹھ کر گئی اور میرے ٹرانسفر آرڈر آگئے۔ کمپنی کی ایک برانچ لاہور میں قائم ہوئی تھی۔ وہاں کے ایڈمنسٹریشن کے لیے ایک لائق آدمی کی ضرورت تھی قسمت کی خوبی دیکھیے کہ وہ لائق آدمی میں تھا۔ مجھے دوگنی تنخواہ پر وہاں بھیجا جا رہا تھا۔ انکار کی صورت میں میری نوکری بھی جا سکتی تھی۔

جائفل Nutmeg

ایک سدا بہار درخت جس کی اونچائی پچاس سے ساٹھ فٹ ہوتی ہے۔ نر اور مادہ درخت علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ خود رو درخت جزائر مولکاس اور جزائر نیوگنی (انڈونیشیا) میں پایا جاتا ہے۔ جائفل عموماً مولکاس سے برآمد ہوتا ہے۔ پنانگ، ملائیشیا، بنگال، جزائری یونین (بحرہند) برازیل، فرانسیسی گی آنا اور جزائر غرب الہند میں بھی تجربتاً اگائی گئی ہے۔ درخت کاشت کے آٹھ سال بعد پھل لاتا ہے اور پچیس برس میں جوان ہوتا ہے۔ ساٹھ سال کی عمر تک پھل دیتا ہے۔ جائفل کی تاثیر گرم ہے اور عام طور پر نمونیے کے مریض کو دیا جاتا ہے۔

مرسلہ: حیات خان آفریدی۔ بٹ گرام

ایک ہفتے کے اندر اندر مجھے جانا تھا۔ اتنی جلدی شادی ہو نہیں سکتی تھی اور میں یہ چانس بھی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر میں نے یہ بھی سوچا کہ اس وقت اگر میں نے الماس کی بات امی کے سامنے چھیڑی تو وہ قطعی نہیں مانیں گی کیوں کہ وہ کسی اور لڑکی کو پسند کر چکی ہیں بلکہ بات بھی کر لی ہے۔ اگر میں کچھ دن کے لیے لاہور چلا جاؤں تو معاملہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ واپس آکر میں الماس کو اس کے سامنے پیش کر دوں گا بلکہ امی بھی تو میرے ساتھ ہی جائیں گی۔ کچھ نہ کچھ کر لوں گا۔ رہا الماس کا سوال تو یہ بات ابھی اسی تک ہے۔ میں اس سے یہ عہد کر کے جاؤں گا کہ واپس آکر اس سے شادی کر لوں گا۔ لاہور دور ہی کتنا ہے ایک فلائٹ سے آؤں گا اور دوسری فلائٹ سے بیاہ کر لے جاؤں گا۔ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے، میرا انتظار کرلے گی۔

میں نے اس سے بات کی۔ اب وہ اس مرحلے میں تھی کہ جو کچھ دل میں تھا بے تکلفی سے کہہ سکتی تھی۔

”آپ کے تو بڑے تعلقات ہیں۔ میرا ٹرانسفر بھی اپنے ساتھ کرا لیجیے۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔“

”ابھی مجھے وہاں کا کچھ علم نہیں۔ جا کر جائزہ تو لوں۔“

”سر، میں آپ کو کھونا نہیں چاہتی۔ آپ مجھ سے شادی کر لیں اور اپنی فیملی کے طور پر مجھے اپنے ساتھ لے چلیں۔ میں نوکری چھوڑ دوں گی صرف آپ کی خدمت

کروں گی۔"

"میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ ایک سال میں تمہیں اپنے پاس بلالوں گا۔"

"یہ ایک سال میں کیسے گزاروں گی۔ آپ نے ایک ساتھ اتنی شمعیں جلادی ہیں کہ میں کس کس کو بجھاؤں گی۔"

"میں تمہیں فون کرتا رہوں گا۔ خط لکھتا رہوں گا۔"

یہ باتیں کئی دن تک چلتی رہیں اور بالآخر اس نے ہار مان لی۔

"آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ وہاں جاکر مجھے بھول نہیں جائیں گے۔ اگر آپ کو وہاں کوئی اور لڑکی پسند آگئی تو میں اپنی جان دے دوں گی۔"

یہ باتیں ہر محبت کرنے والی لڑکی کرتی ہے۔ وہ بھی کررہی تھی اور میری روانگی کا دن آگیا۔

وہ مجھے اسٹیشن چھوڑنے آئی۔

"سر میں جس طرح آج آپ کو رخصت کرنے آئی ہوں اسی طرح جب آپ کی واپسی ہوگی تو لینے آؤں گی۔ اگر آپ کے ساتھ کوئی اور لڑکی ہوئی تو میں اسی ٹرین کے آگے لیٹ کر اپنی جان دے دوں گی۔"

خدا جانے یہ باتیں اس سے کون کہلوارہا تھا۔

"تم کیا سمجھتی ہو میں تمہیں بھول جاؤں گا۔ میرا انتظار کرنا۔" میں نے کہا اور گاڑی میں سوار ہوگیا۔

لاہور آکر میں اسے واقعی نہیں بھولا تھا۔ بھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دن میں کم از کم دوبارہ اسے فون کرلیا کرتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ خوش ہوگی بلکہ یہ میری بھی مجبوری تھی۔ میں اس کا عادی ہوگیا تھا۔

دو تین ماہ بعد میں نے والدہ اور بھائی کو بھی بلالیا۔ خیال میں تھا کہ امی سے بات کرکے الماس کو بھی بلوالوں گا یا کراچی جاکر اس سے شادی کرلوں گا۔

ابھی مجھے اس کمپنی میں کام کرتے ہوئے چھ مہینے ہوئے تھے کہ میں نے نوکری چھوڑ دی۔ اس کا سبب اس کمپنی کے ایک ڈائریکٹر مسٹر ربانی ہیں۔ ان کا کمپنی کے دیگر مالکان سے جھگڑا ہوا اور انہوں نے اپنا حصہ الگ کرلیا۔ وہ ایک بہت بڑے بزنس مین تھے۔ ان کا کاروبار کئی ممالک میں پھیلا ہوا تھا۔ وہ کمپنی میں رہ کر میرا کام دیکھ چکے تھے اور مجھ سے بہت خوش بلکہ متاثر تھے لہٰذا جب وہ کمپنی سے الگ ہونے لگے تو انہوں نے مجھے بھی اکسایا کہ میں استعفیٰ دے دوں۔ وہ مجھے اپنے کاروبار میں شامل کرلیں گے۔

"اٹلی میں میرا کاروبار بہت متاثر ہورہا ہے۔ میں چاہتا ہوں تمہیں وہاں بھیج دوں۔"

یہ ایسی آفر تھی کہ مجھے تیار ہونا پڑا۔ میں نے کمپنی سے استعفیٰ دے دیا۔ میں نے جان بوجھ کر الماس کو نہیں بتایا۔ وہ لاہور آنے پر ہی اتنی خفا ہوئی تھی اٹلی جانے پر نہ جانے اس کا ردِعمل کیا ہوتا۔ کہیں وہ لاہور نہ آجائے۔ اسے میں نے یہ بھی نہیں بتایا۔

میں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ جب میں اٹلی پہنچ جاؤں گا تو اٹلی سے اسے فون کروں گا۔ وہ میرا پیچھا کرتی ہوئی اٹلی نہیں آسکتی۔ جب میں اپنا مستقبل بنالوں گا تو پاکستان آکر اس سے شادی کرلوں گا۔

ملازمت سے استعفیٰ دینے کے بعد مسٹر ربانی سے میرے تعلقات بہت گہرے ہوگئے۔ وہ اپنے کاروبار سے متعلق بریفنگ دینے کے لیے اکثر مجھے اپنے گھر بلاتے تھے اور گھنٹوں مجھے وہاں بیٹھنا پڑتا تھا۔

ایسی ہی ایک ملاقات میں میرا آمنا سامنا ان کی بیٹی افشاں سے ہوا۔ دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اس کا موازنہ الماس سے کیا۔ دونوں کا کوئی جوڑ ہی نہیں تھا۔ نہایت حسین، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بہت بڑے باپ کی بیٹی جن سے اب میرا مستقبل وابستہ تھا۔

اس گھر کا آزاد ماحول تھا۔ وہ ایک دفعہ ملی تو گھنٹوں ہمارے پاس بیٹھتی۔ مسٹر ربانی گھر پر نہ بھی ہوتے تو بھی ہم دونوں دنیا کے ہر موضوع پر گھنٹوں بے تکان بولتے رہتے۔ کبھی کبھی ایک ساتھ باہر گھومنے بھی چلے جاتے۔

آہستہ آہستہ میں اس کے قریب ہوتا چلا گیا۔ الماس کہیں پیچھے رہ گئی۔ اس کے باوجود مصلحت اسی میں تھی کہ میں الماس سے فون پر بات کرتا رہوں۔ لیکن یہ سلسلہ کچھ ہی دن چلا۔ اسے کہیں سے معلوم ہوگیا کہ میں نے نوکری چھوڑ دی ہے۔ میں اسے سمجھانے کے لیے کراچی چلا گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے کسی کے ساتھ مل کر بزنس شروع کیا ہے۔ اس لیے ملازمت چھوڑ دی۔ جیسے ہی بزنس کچھ چلے گا میں اس سے شادی کرلوں گا۔

اسے سمجھانا آسان نہیں تھا۔ وہ یہی کہہ رہی تھی کہ بزنس سے شادی کا کیا تعلق۔ آپ شادی کرلیں میں آپ کو بزنس کرنے سے منع تھوڑی کررہی ہوں۔"

میں اس وعدے کے ساتھ اس کے پاس سے چلا آیا

کہ چھ ماہ بعد وہ میرے پاس لاہور میں ہوگی۔
کراچی سے آنے کے بعد ضروری ہو گیا تھا کہ میں جلد سے جلد اگلی چلا جاؤں۔
ایک دن میں نے افشاں سے وہی سوال کر لیا جو کبھی الماس سے کیا تھا۔
''افشاں میں تمہیں کیسا لگتا ہوں۔''
''ڈیڈی کا خیال تو یہ ہے کہ آپ بہت اچھے آدمی ہیں۔''
''میں ڈیڈی کا نہیں تمہارا خیال پوچھ رہا ہوں۔''
''میرا بھی یہی خیال ہے۔''
''افشاں ہم دونوں پڑھے لکھے اور باشعور ہیں۔ اگر ہم دونوں ایک ہو جائیں۔''
''یہ بات آپ کو ڈیڈی سے کرنی چاہیے۔''
''ان سے بات کرنے سے پہلے میں تمہاری رائے جاننا چاہتا تھا۔''
''ڈیڈی جو کہیں گے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''
''اگر ڈیڈی نے انکار کیا؟''
''میں انہیں منالوں گی۔''
اتنے واضح جواب کے بعد کچھ اور پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں نے ہمت جمع کی اور اپنا سوال افشاں کے ڈیڈی کے سامنے رکھ دیا۔ ان کا جواب سن کر تو مجھے یوں لگا جیسے وہ یہ بات کب سے اپنے دل میں لیے بیٹھے تھے۔ بیٹی کا باپ ہونے کی حیثیت سے خود کہنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اسی لیے انہوں نے ہم دونوں کو اتنی ڈھیل دے رکھی تھی۔
''میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا لیکن افشاں سے پوچھے بغیر میں تمہیں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔''
''میں آپ کے مثبت جواب کا انتظار کروں گا۔''
مجھے اب کوئی فکر نہیں تھی۔ افشاں کی رائے میں پہلے ہی معلوم کر چکا تھا۔ انہوں نے افشاں سے معلوم کیا ہوگا پھر مجھ سے بات کی۔
''بیٹا، جو بات تم کہہ رہے ہو تمہاری والدہ کے منہ سے ادا ہوتی تو اچھا تھا۔ ان کی رضا مندی بھی ضروری ہے۔''
''میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ آپ کی طرف سے انکار ہو اور انہیں تکلیف پہنچے۔ آپ تیار ہیں تو میں انہیں لے آؤں گا۔ میں ان پر یہ ظاہر نہیں ہونے دوں گا کہ آپ سے پہلے ہی بات ہو چکی ہے۔''
میں نے والدہ سے بات کی تو انہیں میرے چچا کی وہی لڑکی یاد آ گئی جس سے وہ میری شادی کرنا چاہتی تھیں۔
''بیٹا! میں نے انعم کو تمہاری دلہن بنانا چاہا تھا۔ وہ اب تک تمہارے خواب دیکھ رہی ہے۔''
''امی آپ کیا پرانی باتیں لے کر بیٹھ گئیں۔''
''میں اس کے باپ کو زبان دے چکی ہوں۔ تم نے سوچنے کے لیے وقت مانگا تھا۔ اب بہت وقت گزر چکا ہے۔''
''امی، وقت ہی نے مجھے سکھایا ہے کہ میں افشاں سے شادی کرلوں۔ اسی میں میرا فائدہ ہے۔''
''تم شادی کر رہے ہو یا تجارت۔''
''ہر آدمی کو اپنے مستقبل کی فکر ہوتی ہے۔ مجھے بھی ہے۔ افشاں کے ڈیڈی بہت بڑے بزنس مین ہیں۔ ان کی بیٹی سے شادی کرلوں گا تو میرا مستقبل روشن ہو جائے گا۔ ملکوں ملکوں کی سیر کروں گا اور آپ میرے ساتھ ہوں گی۔''
''بڑے آدمی کی بیٹی سے شادی کر کے ان کی غلامی کرے گا۔''
''غلامی کیوں کروں گا۔ ان کی بیٹی نے مجھ میں کچھ دیکھا ہی ہوگا جو کہہ رہی ہے کہ ڈیڈی کے پاس اپنی امی کو بھیجو۔''
''جو لڑکی اپنے منہ سے یہ کہہ رہی ہے وہ کیسی لڑکی ہو گی۔''
''آپ یہ باتیں نہیں سمجھیں گی۔ وہ بڑے لوگ ہیں وہ ایسی باتوں کی پروا نہیں کرتے۔''
میرے چھوٹے بھائی عدنان نے بھی میری حمایت کرتے ہوئے امی کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ برابر اپنی ضد پر اڑی ہوئی تھیں۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ جب تم

میری پسند کی شادی نہیں کر سکتے اور اپنی پسند کی کرنا چاہتے ہو تو خود جا کر بات کرو۔

اب میرے پاس ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ لندن فون کر کے بہن سے بات کروں۔ بہن نے بھی فون کر کے امی کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

جب امی نے دیکھا کہ سب کی ایک زبان ہوگئی ہے تو وہ بادل نخواستہ چلنے کے لیے تیار ہوگئیں لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ خوش دلی سے تیار نہیں ہوئی ہیں۔ یہ بددلی بھی بہت جلد خوش دلی میں بدلے گی۔ اسی دن انعم کے والد کا فون آیا کہ انعم کی بات پکی ہوگئی ہے اگلے ہفتے شادی ہے۔

امی نے اسے اپنی توہین سمجھا کہ ان سے پوچھے بغیر انعم کی شادی کردی گئی۔

''میں نے اپنے بچے کی ابھی تک کہیں بات نہیں لگائی اور تم نے انعم کی شادی بھی طے کردی۔ میں نے اسے اپنے بیٹے کے لیے مانگا تھا۔ تمہیں مجھ سے پوچھنا چاہیے تھا۔''

ٹیلی فون پر خوب جھڑپ ہوئی اور امی نے یہ کہتے ہوئے فون پٹخ دیا۔''اب تم دیکھنا شاہ میر کی شادی کہاں کرتی ہوں۔ ایسے باپ کی بیٹی سے کروں گی جو تم سب کو خرید کر چھوڑ دے گا۔ یہ طے ہوگیا کہ کل افشاں کے گھر چلیں گے۔''

اس رات میں سونے کے لیے لیٹا تو الماس میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ ''شادی مبارک'' اس کے لہجے میں بلا کا طنز تھا۔

''بس اتنی جلدی میں شادی ہوئی کہ میں تمہیں بتا ہی نہ سکا۔''

''یاد ہے نا میں نے کیا کہا تھا۔''

''تم نے تو بہت باتیں کی تھیں۔''

''میں نے کہا تھا اگر میں نے آپ کے ساتھ کسی دوسری لڑکی کو دیکھا تو میں اسی ٹرین کے آگے لیٹ جاؤں گی۔''

''کیوں پاگل پن کی باتیں کرتی ہو۔''

''نہیں سر، آج سے میں روز پلیٹ فارم پر جایا کروں گی کبھی تو آپ کراچی آئیں گے دیکھوں گی آپ مجھ سے ملنے آرہے ہیں یا کسی اور کے ساتھ ہیں۔''

''فضول باتیں مت کرو۔''

''آپ اپنا وعدہ بھول گئے لیکن میں اپنے عہد پر قائم رہوں گی۔ آخر آپ کو ایک مرتبہ دیکھنا بھی تو ہے۔ آپ کو دیکھے بغیر میں مر بھی تو نہیں سکتی۔''

''میں تم سے اب بھی محبت کرتا ہوں۔ اس لڑکی سے تو میں نے مالی فائدے کے لیے شادی کی ہے۔ محبت تو میری تم ہی ہو۔''

''بس مجھے آپ کا یہی جھوٹ سننا تھا۔ اب میں آسانی سے مر سکتی ہوں۔''

میری آنکھ کھلی تو سرہانے کوئی بھی نہیں تھا۔ اف میرے خدا! یہ خواب تھا اور کتنا بھیانک۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے خواب اور حقیقت کا موازنہ کیا تو میرے اندر ایک جنگ چھڑ گئی۔ نادانستگی میں مجھ سے کتنا بڑا گناہ سرزد ہوگیا۔ میں ایک معصوم لڑکی کو دھوکا دے رہا ہوں۔ وہ اب بھی یہی سمجھ رہی ہوگی کہ میں اس کے لیے بزنس جما رہا ہوں۔ میں اس سے چھ مہینے کا وعدہ کر کے آیا تھا۔ وہ ایک ایک دن گن گن کر گزار رہی ہوگی۔ میں امی کو افشاں کے گھر نہ بھیجوں۔ انہیں لے کر کراچی چلا جاؤں اور الماس سے شادی کرلوں مگر پھر میرے مستقبل کا کیا ہوگا۔ میں تو اب نوکری بھی چھوڑ چکا۔ اب تو میں پوری طرح افشاں کے ڈیڈی کے رحم و کرم پر ہوں۔ اگر میں ان کی بیٹی سے شادی کی بات نہ چھیڑتا تو بھی وہ مجھے اٹلی بھیج رہے تھے لیکن اگر اب انکار کردوں تو ہرگز مہربانی نہیں کریں گے بلکہ اسے وہ اپنی توہین سمجھ کر مجھے دھکے دے کر گھر سے نکلوا دیں گے۔ وہ اگر معاف بھی کردیں تو افشاں اپنی اس ذلت کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ وہ کوئی بھی انتقام لے سکتی ہے۔ تو کیا میرا فیصلہ ٹھیک ہے؟ ٹھیک ہی تو ہے افشاں سے شادی کے بعد مجھے دنیا کی ہر نعمت میسر آجائے گی۔ ربانی صاحب کے انتقال کے بعد ان کی تمام دولت افشاں کو ملے گی جو میری ہوگی۔ اگر میں الماس سے شادی کرلیتا ہوں تو مجھے کیا ملے گا۔ الٹا اس کے گھر والوں کو سپورٹ کرنا پڑے گا۔ کہیں نوکری ڈھونڈ کر اسے پالتا رہوں گا اور بس۔ ایک اوسط درجے کی زندگی ہوگی اور چند بچے۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں وہی میرے حق میں بہتر ہے۔ شکل و صورت کے اعتبار سے بھی افشاں، الماس سے کہیں بہتر ہے۔ الماس کا ردعمل کیا ہوگا؟ کچھ بھی ہو مجھے کیا۔ وہ کہہ رہی تھی اپنی جان دے دے گی۔ یہ خواب تھا اور کچھ نہیں۔ دنیا میں سینکڑوں لڑکیاں ایسی ہیں جو محبت کسی سے کرتی ہیں شادی کہیں اور ہو جاتی ہے۔ سب مر تو نہیں جاتیں۔ الماس بھی کچھ دنوں میرا انتظار کرے گی اور پھر کہیں شادی کرلے گی۔

میں نے خواب دیکھنے کے بعد باقی رات اپنے آپ سے جنگ کرتے ہوئے گزاری اور صبح تک اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ مجھے افشاں سے شادی کر لینی چاہیے۔ میری محبت پر میری خودغرضی غالب آگئی۔

دوسرے دن شام کو میں امی اور بھائی کو لے کر افشاں کے گھر چلا گیا۔ امی کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ افشاں کا گھر اتنا شاندار ہوگا۔ وہ اندر داخل ہوتے ہی نہال ہو گئیں کہ میں ایسی اچھی جگہ شادی کر رہا ہوں۔ افشاں کو دیکھ کر تو جیسے ان کے ہوش ہی اڑ گئے۔ اسی وقت میرے کان میں کہہ دیا۔ ''بالکل پری ہے پری۔ تو نے بات تو کر لی ہے یہ لوگ انکار تو نہیں کر دیں گے۔''

انکار کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ امی کو لانا تو بس رسمی کارروائی تھی۔ ربانی صاحب نے امی کے سامنے میری اتنی تعریفیں کیں کہ امی کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔

''ہمیں تو خوشی ہوگی اگر افشاں کی شادی آپ کے بیٹے سے ہو جائے۔''

اسی وقت رشتہ منظور ہو گیا۔ شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی۔ وہاں کیا دیر تھی۔ ایک ہفتے بعد ہی میں اور افشاں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔

میرا مکان افشاں کے شایانِ شان نہیں تھا لہٰذا ربانی صاحب نے اپنی کوٹھی کا ایک حصہ ہمیں دے دیا۔ امی اور بھائی بھی وہیں آ گئے۔ افشاں رخصت ہو کر اسی حصے میں آئی۔

شادی سے پہلے ہی ربانی صاحب مجھے اٹلی بھیجنا چاہتے تھے۔ اب تو شادی بھی ہو گئی تھی لہٰذا پندرہ دن بعد میں افشاں کو لے کر اٹلی چلا گیا۔

ایک مہینا سیر سپاٹے میں گزرا اور پھر ربانی صاحب کا آفس سنبھال لیا۔ دفتر کا برا حال تھا۔ اسے سنبھالنے میں کئی مہینے لگ گئے۔ پھر میں نے امی اور چھوٹے بھائی کو بھی بلا لیا۔

اٹلی پہنچ کر بھی مجھے الماس کا خیال آیا تھا لیکن اب میں نے اسے ٹیلی فون کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اب اسے کچھ بتانے یا نہ بتانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اب میں محفوظ تھا وہ میرا پیچھا کرتی ہوئی اٹلی نہیں آ سکتی تھی۔

پانچ سال گزر گئے۔ ہم لاہور آئے ہوئے تھے کہ افشاں نے کراچی چلنے کی فرمائش کی۔ میں الماس کی طرف سے خوف زدہ تھا اس لیے ٹالتا رہا۔ پھر سوچا پانچ سال گزر گئے ہیں وہ مجھے بھول گئی ہوگی۔ کراچی اتنا بڑا شہر ہے ضروری تو نہیں کہ وہ مجھے ڈھونڈ ہی لے۔ میں افشاں کو لے کر کراچی آ گیا۔

یہ تھی وہ کہانی جو میں افشاں کے خالو کے ایک کمرے میں سوتے جاگتے خود کو سناتا رہا۔

صبح کسی وقت آنکھ لگی تھی کہ افشاں نے مجھے اٹھا دیا۔ وہ سب لوگ افشین (افشاں کی کزن) کے گھر جانے کی تیاری کر رہے تھے لیکن مجھے تو کہیں اور جانا تھا۔

''میں اپنے ایک دوست سے ملنے جا رہا ہوں۔ بس ایک گھنٹے میں آتا ہوں پھر چلیں گے۔''

گھر میں کئی گاڑیاں تھیں۔ ڈرائیور بھی تھا لیکن میں ڈرائیور کو نہیں لے جا سکتا تھا۔ گاڑی میں بیٹھا اور کینٹ اسٹیشن پہنچ گیا۔ میں اگر الماس کو سمجھا نہیں سکا تو اسے پاگل خانے میں تو داخل کرا دوں گا۔ اس کا علاج تو ہو جائے گا۔ میں بھاگتا ہوا پلیٹ فارم پر گیا اور اسے ڈھونڈنے لگا۔ وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ پھر مجھے خیال آیا جب کوئی ٹرین آتی ہے تو وہ ٹرین کی طرف بھاگتی ہے۔ اتفاق سے ایک ٹرین بھی جلد ہی آ گئی۔ میں ٹرین کی طرف دوڑا۔ ایک ایک ڈبے میں جھانکتا پھر رہا تھا۔ وہ کہیں نظر نہ آئی۔ مسافر ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ پلیٹ فارم لوگوں سے خالی ہو گیا۔ میں تھک ہار کر ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ مجھے وہی قلی نظر آ گیا جس نے ایک دن پہلے میرا سامان اٹھایا تھا۔ میں اس کی طرف لپکا۔

''تم نے اس لڑکی کو کہیں دیکھا ہے جس نے کل میرا گریبان پکڑا تھا۔''

''اب وہ کہاں۔''

''کیا مطلب؟''

''پاگل تو تھی ہی۔ کل ہی ایک ٹرین کے آگے لیٹ گئی۔ پرخچے اڑ گئے بے چاری کے۔''

میں وعدہ فراموش تھا۔ وہ اپنے عہد کی پکی نکلی۔ اس نے کہا تھا اگر اس نے مجھے کسی لڑکی کے ساتھ دیکھا تو ٹرین کے آگے لیٹ جائے گی۔ اس نے وہی کیا۔

میں نے سوچا اس کی تعزیت کے لیے اس کے گھر جاؤں لیکن ایک قاتل، مقتول کے وارثوں کے سامنے کیسے جا سکتا تھا۔

میں گھر لوٹ آیا۔ کچھ دنوں بعد میں اور افشاں لاہور آئے اور پھر اٹلی چلے گئے۔





محافظ

محترم مدیر سرگزشت

سلامِ مسنون

کہتے ہیں کہ شوہر بیوی کا محافظ ہوتا ہے لیکن میرے شوہر میں ایسی کوئی بات نہیں تھی اسی لیے میں نے اتنا بڑا قدم اٹھایا۔ میرا یہ فیصلہ غلط تھا یا صحیح اس کا جواب میری آپ بیتی ہے۔

بانو

(لاہور)

مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ میں جس شخص کی بیوی بن کر جارہی ہوں وہ کیسا ہوگا۔

یہ رشتہ ہماری دور کی ایک رشتے دار نے لگایا تھا۔ مجھے کمال کی تصویر بھی دکھائی گئی تھی۔ ایک مہذب سا نوجوان جس کے ہونٹوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ تھی۔

''بہت ہی سیدھا بچہ ہے۔'' رشتے دار خاتون نے بتایا۔ ''اللہ میاں کی گائے سمجھ لو۔ حالانکہ اس کے دو بھائی اور بھی ہیں۔ جمال اور جلال۔ لیکن جو فرمانبرداری اور

سعادت مندی اس میں ہے وہ کسی میں نہیں ہے۔''

''اور پڑھا لکھا کتنا ہے؟'' اماں نے پوچھا۔

''بی اے کر چکا ہے۔ ایک جگہ ملازمت بھی کر رہا ہے۔'' انہوں نے بتایا۔

''کیا اس کے بھائیوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔''

''شادی تو نہیں ہوئی لیکن منگنی ہو چکی ہے۔ ایک بھائی کی، دوسرے کے ذہن پر یورپ جانے کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔ وہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔''

اماں نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے دھیرے سے کہا۔ ''اماں بہتر تو یہی ہے کہ آپ خود جا کر دیکھ آئیں۔''

''میں تو کہتی ہوں کہ خود لڑکی بھی ایک بار اس سے مل لے۔'' اس خاتون نے کہا۔ ''آج کل کا زمانہ کچھ اور ہے۔ اب پرانی رسمیں نہیں چلتیں۔ ایک دوسرے سے ایک بار اگر مل لیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

اماں کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا اور خود میں بھی اسی خیال کی تھی کہ جن کو ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارنا ہے۔ انہیں ایک دوسرے سے ضرور واقف ہونا چاہیے۔

میری ایسی کئی سہیلیاں تھیں جنہوں نے اپنی پسند کی شادیاں کی تھیں لیکن میں یہ تو نہیں کر رہی تھی کیونکہ میں تو اس کو جانتی ہی نہیں تھی۔ صرف اتنا تھا کہ ایک بار اسے دیکھ تو لوں۔

ملاقات کا انتظام بھی کروا دیا گیا۔ کمال ایک شام ہمارے بلانے پر ہمارے گھر آ گیا اور پہلی نظر میں وہ مجھے اچھا لگا تھا۔

اس کی نگاہوں میں وہ بے باکی نہیں تھی۔ جو آج کل کے نوجوانوں کی نگاہوں میں ہوتی ہے۔ تصویر میں جس طرح کی شرمیلی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر تھی۔ سامنے بھی ویسی ہی تھی۔

اماں اس کے لیے ناشتا سجا کر کمرے سے باہر چلی گئی تھیں۔ تاکہ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے باتیں کرنے کا موقع مل سکے۔

اگر میں خود ہی باتوں کا سلسلہ شروع نہیں کرتی تو پھر وہ تو خاموش ہی بیٹھا رہتا۔

''جی جناب! یہ فرمائیں آپ کی ایکٹی وٹیز کیا کیا ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کوئی خاص نہیں۔'' وہ دھیرے سے بولا۔ ''دفتر سے گھر واپس آ کر گھر کے کاموں میں لگ جاتا ہوں۔''

''واہ۔'' میں ہنس پڑی۔ ''یعنی گھر کے برتن وغیرہ دھونے کے کام۔''

''ارے نہیں۔'' وہ شرمندہ سا ہو گیا۔ ''میرا مطلب ہے پچاس کام ہوتے ہیں۔ باہر سے سامان لانا، پھر دونوں بھائی بڑے ہیں۔ ان کے بہت سے کام ہوتے ہیں۔''

''آپ کے دوست وغیرہ تو ہوں گے۔''

''بہت کم۔'' اس نے جواب دیا۔ ''بس وہی محلے کے دو چار دوست ہیں اور وہ بھی بچپن کے۔ بس ان ہی سے دوستی ہے۔ آپ تو جانتی ہیں نا کہ آج کل کے حالات کیسے ہیں۔ اس لیے کوئی نیا دوست نہیں بناتا ہوں۔''

''خیر، یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' میں نے گردن ہلائی۔ ''اب ایک بات پوچھوں۔ برا تو نہیں مانیں گے۔''

''ضرور پوچھیں۔''

''کسی لڑکی سے تو دوستی رہی ہو گی؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے نہیں۔'' وہ گھبرا سا گیا تھا۔ ''یہ کس نے کہہ دیا آپ کو۔ آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا۔''

''اوہو، اتنے پریشان کیوں ہو گئے، میں نے تو یوں ہی ایک بات پوچھ لی تھی۔''

''نہیں......نہیں......ایسا کبھی موقع ہی نہیں ملا۔ بھیا کہتے ہیں کہ شریف لڑکوں کو ان چکروں میں نہیں پڑنا چاہیے۔''

''کون بھیا۔''

''جلال بھائی! وہ واقعی بہت جلال والے ہیں۔ میں ان سے بہت ڈرتا ہوں۔''

''اچھا چھوڑیں۔ اب آپ کچھ میرے بارے میں تو پوچھیں۔''

''آپ سے کیا پوچھوں؟ آپ مجھے اچھی لگی ہیں۔ بس اور کیا کہوں۔'' اس نے شرما کر گردن جھکا لی تھی۔

اس کی باتیں بہت اچھی لگی تھیں۔ اس میں ایک خاص قسم کی تہذیب تھی۔ جو آج کے نوجوانوں میں دیکھنے میں ہی نہیں آتی۔

جب اماں کمرے میں آئی اور انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا تو میں نے اقرار میں اپنی گردن ہلا دی۔

بہرحال چھ مہینوں کے اندر ہی ہماری شادی ہوگئی۔
شادی کے ہنگامے میں پتا ہی نہیں چلا کہ کمال کے کتنے رشتے دار تھے۔ بہرحال ہر ایک سے تعارف کروایا گیا۔ یہ جلال ہیں۔ یہ جمال ہیں، یہ بڑی خالہ ہیں۔ یہ ماموں ہیں وغیرہ۔ میں سعادت مندی سے گردن جھکا کر سب کو سلام کرتی رہی۔
پھر رخصتی ہوگئی۔ وہی منظر، جو میں اپنی دوستوں اور رشتے داروں کے دیکھ چکی تھی۔ وہی آنسو، وہی رونا وہی قرآن کے سائے میں رخصتی۔
چاروں طرف لڑکیاں، عورتیں اور مرد نہ جانے کون کون تھا۔ اس وقت پتا چلا کہ رخصتی کے وقت کسی لڑکی کے کیسے احساسات ہوتے ہیں۔ کیسے اندیشے ہوتے ہیں۔ کیسی اُمیدیں ہوتی ہیں۔ کتنی خوشیاں ہوتی ہیں۔ کتنے ارمان ہوتے ہیں جن کو لےکر وہ اپنی سسرال میں اپنے پیا کے گھر جاتی ہے۔
کمال کا مکان زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن پھر بھی غنیمت تھا کہ ان کا اپنا مکان تھا۔ پُرسکون سا۔ مجھے حجرۂ عروسی میں لاکر بٹھا دیا گیا۔ وہی رسومات ادا ہوتی رہیں جو ایسے موقع پر ہوتی ہیں۔ رشتے دار خواتین کی آمد مبارک بادیں اور نہ جانے کیا کیا۔
خدا خدا کر کے رات دو بجے کے قریب یہ ہنگامہ ختم ہوا۔ اب کمال کو میرے پاس آنا تھا۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس کے استقبال کے لیے تیار تھی۔
کمال دولہا بنا ہوا داخل ہوا۔ میں تو پہلی دفعہ ہی اسے پسند کر چکی تھی۔ وہ ایک اسمارٹ اور خوش شکل نوجوان تھا۔
وہ میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا سہرا اتار کر ایک طرف رکھ دیا تھا۔
''بانو۔'' اس نے کچھ دیر تک مجھے دیکھنے کے بعد دھیرے سے کہا۔ اس کی آواز میں لرزش صاف محسوس ہو رہی تھی۔ ''میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ مجھے تم جیسی شریکِ زندگی مل گئی۔''
اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی۔ اچانک زور زور سے دروازے پر دستک ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی کسی کی آواز آئی۔ ''کمال باہر آؤ جلدی۔''
میں نے دیکھا کہ کمال کا رنگ فق ہوگیا تھا۔
''کیا بات ہے کمال؟ کون بلا رہا ہے؟'' میں نے حیران اور پریشان ہوکر پوچھا۔

''یہ جلال بھائی ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''پتا نہیں کیا بات ہے۔ میں سن کر آتا ہوں۔''
اس کے کمرے سے جانے کے بعد میں یہ سوچتی رہ گئی کہ خدا جانے کیا معاملہ تھا۔ انتظار کرتی رہی۔ اس کی واپسی بیس پچیس منٹ کے بعد ہوئی تھی۔
میں نے دیکھا کہ وہ کچھ بجھا ہوا اور خاموش سا تھا۔
وہ خاموشی سے آکر بیٹھ گیا۔
''کیا بات ہے کمال؟'' میں نے پوچھا۔ ''سب خیریت تو ہے ناں؟''
''ہاں سب خیریت ہے۔ وہ جلال بھائی کے سگریٹ کا پیکٹ نہیں مل رہا تھا۔'' اس نے دھیرے سے بتایا۔
''تو پھر۔'' مجھے یہ سن کر کچھ عجیب سا لگا تھا۔
''پھر کیا، میں ان کے لیے سگریٹ لانے چلا گیا تھا۔'' اس نے بتایا۔
مجھے اور بھی حیرت ہوئی تھی۔ ''یہ کیسی بات ہوئی کیا گھر میں کوئی اور نہیں ہے یا وہ خود نہیں جا سکتے تھے۔''
''بات یہ ہے کہ ان کے لیے سگریٹ میں ہی لایا کرتا ہوں۔'' وہ شرمندہ سے انداز میں بولا۔
''کمال میری سمجھ میں یہ رویہ نہیں آرہا ہے۔ انہیں خیال کرنا چاہیے کہ تمہاری آج ہی شادی ہوئی ہے تم اپنی دلہن کے کمرے میں گئے ہو اور تمہیں سگریٹ لانے بھیج دیا۔ تمہارے دوسرے بھائی کہاں ہیں؟''
''جمال بھائی تو کب کے سو گئے۔'' اس نے بتایا۔
''خیر چھوڑو یہ سب، ہم کہاں کی باتیں کرنے لگے۔''
یہ تھا اس گھر میں میری پہلی رات کا تجربہ۔
اور جیسے جیسے دن گزرتے گئے ویسے ویسے مجھ پر بہت سی باتیں کھلتی چلی گئیں۔ اس گھر میں کمال کی حیثیت غلاموں والی تھی۔ وہ اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لے سکتے تھے۔
دونوں بھائیوں کے سامنے سہمے سہمے رہتے۔ خاص طور پر جلال کے سامنے۔ جلال مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا۔
سخت گیر ہونا اور بات ہے اور ہوس زدہ ہونا اور بات ہے۔ میں اس کی آنکھوں میں اپنے لیے ہوس دیکھا کرتی۔ عورت کو ایسے معاملات کا اندازہ ہوتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔ میں نے تیسرے یا چوتھے دن ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ شخص ٹھیک نہیں ہے۔
ایک بار ایسا ہوا کہ میں اپنے کمرے سے نکل رہی تھی

کہ جمال دستک دیئے بغیر کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے صرف پتلون پہن رکھی تھی۔ جب کہ اوپر بنیان بھی نہیں تھا۔ قمیص اس کے ہاتھ میں تھی۔

میں اسے اس طرح دیکھ کر بوکھلا سی گئی تھی۔

''یہ لو۔'' اس نے قمیص میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس پر استری کردو۔''

میں نے دھیرے سے کہا۔ ''جمال بھائی آپ اس طرح تو کمرے میں نہیں آتے ناں۔''

''تو کیا ہو گیا۔'' اس نے اپنے تیور چڑھائے۔ ''میں کوئی بری نیت سے تو تیرے پاس نہیں آیا۔''

''یہ آپ نے کیسے سوچ لیا کہ آپ کی نیت بری بھی ہو سکتی ہے۔''

''اچھا اچھا فلسفہ مت جھاڑ، میں جانتا ہوں کہ تو پڑھی لکھی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اپنی بقراطی دکھا۔''

میں سکتے میں رہ گئی۔ یہ آدمی کس قسم کی گھٹیا باتیں کر رہا تھا۔ اس نے مجھے کیا سمجھ رکھا تھا۔ میں اس گھر میں کمال کی بیوی بن کر آئی تھی۔ کسی اور سے میرا کیا تعلق ہو سکتا تھا۔

''جلال بھائی! آپ مجھ سے کیسی باتیں کر رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں تو آپ کا بہت احترام کرتی ہوں۔''

''اچھا اچھا کرتی رہنا احترام لیکن کام بھی کر۔''

اسی دوران میں کمال بھی کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے میرے اور جلال کے درمیان ہونے والی ساری باتیں سن لی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ تو ضرور کہے گا لیکن اس کے برعکس وہ مجھ پر برس پڑا۔ ''جب جلال بھائی ایک بات کہہ رہے ہیں تو بحث کیوں کر رہی ہو۔ قمیص لو ان سے اور استری کردو۔''

اس وقت جلال کی بکواس نے اتنا دکھ نہیں دیا تھا جتنا دکھ مجھے کمال کی باتیں سن کر ہوا تھا۔

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ میں نے جلال کے ہاتھ سے قمیص جھپٹ لی اور ایک طرف چلی گئی۔ کمال اس وقت جلال سے کہہ رہا تھا۔ ''ابھی استری ہو جائے گی جلال بھائی۔ آپ ناراض مت ہوا کریں۔''

''سمجھا دینا اس کو کہ اس گھر میں نخرے نہیں چلیں گے۔ کم سے کم میرے ساتھ تو بالکل بھی نہیں چلیں گے۔''

وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا تھا۔ کمال نے میرے پاس آ کر میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''بانو، جلال بھائی دل کے اچھے ہیں۔ تم ان کی باتوں کا برا مت مانا کرو۔''

''کمال!'' میں غصے سے بولی۔ ''اگر یہ فیصلہ ہو جائے ناکہ میں اس گھر میں کس کی بیوی ہوں تو میں اسی طرح ایڈجسٹ کرلوں گی۔''

''بانو۔'' وہ تڑپ اٹھا۔ ''ایسا تو نہ کہو۔''

''تو اور کیا کہوں۔ کیا تم کو معلوم ہے کہ تمہارے بھائی بغیر دستک دیئے میرے کمرے میں آ گئے تھے اور وہ بھی اس حالت میں کہ صرف پتلون پہن رکھی تھی۔ یہ کیسا رویہ ہے۔ کیسا انداز ہے، کیا اپنے چھوٹے بھائی کی بیوی کے ساتھ ایسا ہی کرتے ہیں۔''

''بانو! میں ان کو سمجھا دوں گا۔'' وہ دھیرے سے بولا۔ ''ان سے کہہ دوں گا کہ وہ آئندہ ایسا نہ کریں۔''

''کمال! برا نہ مانو تو میں یہ بتاؤں کہ تم زندگی بھر ایسا نہیں کر سکو گے۔'' میں نے کہا۔ ''کیوں کہ وہ تمہارے حاکم ہیں اور تم اس گھر کے غلام۔ تمہاری حیثیت اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔''

کمال کا جھکا ہوا سر اس بات کا اعتراف کر رہا تھا کہ میں جو کچھ بھی کہہ رہی ہوں وہ درست ہے۔ اسے بھی اس بات کا احساس ہے لیکن نہ جانے کیوں وہ زبان نہیں کھولتا۔ خاموش رہتا ہے۔

بہرحال میں نے اس کمینے کی قمیص استری کر کے کمال کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''جاؤ اس کو دے آؤ اور اس کو سمجھا دینا کہ اس طرح کمرے میں نہ آیا کرے اور میں اس کی کنیز نہیں ہوں۔''

کمال خاموشی سے قمیص لے کر باہر چلا گیا تھا۔

اب مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اس گھر میں زندگی کس طرح گزرنے والی ہے۔ کمال میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنے بھائیوں کا سامنا کر سکے۔

دوسرا بھائی جمال اگرچہ بہت کم میرے سامنے آیا کرتا، عام طور پر وہ گھر سے باہر ہی رہا کرتا تھا لیکن جب بھی آتا اس کے بھی یہی تیور ہوتے۔

فلاں کام کردو، میرے کپڑے دھو کر ڈال دو۔ میں دھوبی کے یہاں نہیں دے سکتا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اور ستم یہ تھا کہ کمال یہ سب دیکھنے اور سننے کے باوجود

خاموش رہتا تھا۔
اور جہاں تک ماں کا سوال تھا تو اس کا۔۔۔ رویہ تو اور بھی عجیب تھا۔ وہ کمال کے مقابلے میں ان دونوں کو زیادہ اہمیت دیا کرتی۔

اور کمال کا حال تو میں بتا چکی ہوں۔ ایک خوفزدہ سہما سہما سا انسان۔ جو اپنے حق کے لیے آواز بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ گھر والوں کے رویے کو دیکھ کر بھی خاموش رہتا۔

ایک رات جب میں نے اسے اس بات کا عندیہ دیا تو وہ شرمندہ ہو کر بولا۔ ''میں کیا کروں بانو؟ ان دونوں کے سامنے اپنی آواز میں نہیں اٹھا سکتا ہوں۔''

''لیکن کیوں؟''

''میں نے بتایا نا کہ مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میرے دل میں ان کا خوف بیٹھا ہوا ہے۔ بچپن ہی سے دونوں مجھ پر سختی کرتے چلے آئے ہیں اور اماں بھی ان ہی کا ساتھ دیتی ہیں۔''

''تو یہ کہو کہ ان سبھوں نے مل کر تمہاری زندگی تباہ کردی ہے۔ تم کو نفسیاتی مریض بنا دیا ہے۔''

''ایسا ہی سمجھ لو۔'' اس نے اعتراف کیا۔ ''ان کے سامنے میری کوئی حیثیت نہیں ہے۔''

مجھے اس پر افسوس ہی ہو رہا تھا اور غصہ بھی آ رہا تھا کہ میری شادی کیسے شخص سے کر دی گئی تھی۔ جو شخص اپنی بیوی کے لیے اس کا محافظ نہ بن سکے اس کو تو شادی کرنے کا کوئی حق ہی نہیں ہوتا۔ سعادت مندی اور فرمانبرداری کی بھی ایک حد ہوا کرتی ہے۔

ایک بار جلال نے اپنی کمینگی کی انتہا کر دی۔ ماں اپنی بہن کے یہاں رہنے کے لیے گئی ہوئی تھیں۔ جمال صبح سویرے گھر سے نکل گیا۔

گھر میں صرف میں، جلال اور کمال تھے۔ ناشتے کا وقت تھا۔ دونوں بھائی آنگن میں تخت پر بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔

میں ان کے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔ میں نے چائے کی ٹرے ان کے سامنے لا کر رکھ دی اور جب واپس جانے لگی تو جلال نے اچانک میرا ہاتھ تھام کر مجھے اپنے پاس بٹھایا۔ ''ارے اب ایسی بھی کیا ناراضگی۔ کبھی میرے پاس بھی تو بیٹھ جایا کرو۔''

اس نے اس طرح جھٹکا دے کر بٹھانے کی کوشش کی تھی کہ میں اس کی گود میں گرتے گرتے بچی تھی۔ میں نے

دیکھا کہ ایک لمحے کے لیے کمال کا رنگ بدل گیا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا پھر خاموش رہا اور میرا یہ حال تھا کہ بے بسی اور شرمندگی سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

اور جلال ہنس رہا تھا۔ ''یار تیری بیوی کے تو نخرے ہی کم نہیں ہوتے۔''

کمال جزبز ہو کر رہ گیا۔ ہو سکتا ہے اس کے دل میں کوئی آتش فشاں ابل پڑا ہو لیکن وہ خاموش رہا تھا۔ میں نے ایک نظر کمال کی طرف دیکھا اور اٹھ کر جانے لگی تو جلال نے پھر میرا ہاتھ کھینچ کر مجھے اپنے پاس بٹھانے کی کوشش کی۔

''او ہو اب ایسا بھی کیا۔ تم تو ذرا ذرا سی بات پر اکھڑ جاتی ہو۔''

اور اس وقت پہلی بار بالکل پہلی بار کمال نے اپنی زبان کھولی۔ ''چھوڑ دیں بھائی صاحب۔ یہ سب نہ کیا کریں۔ یہ بیوی ہے میری۔''

''کیا!'' جلال بپھر گیا تھا۔ ''تو نے کیا سمجھا ہے مجھے۔ تیرا کیا خیال ہے کہ میں تیری بیوی پر نظر رکھتا ہوں۔ تجھ میں اتنی ہمت کیسے ہوئی۔''

میری توقع کے بالکل برعکس، کمال نے خوفزدہ ہو کر اپنی گردن جھکا لی۔ میرا خیال تھا کہ وہ کسی قسم کا ری ایکٹ کرے گا لیکن کچھ بھی نہیں۔ اس کی طرف سے تو ایک بے غیرت سی اور بے حس سی خاموشی کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔

وہ گردن جھکائے جلال کی بکواس سن رہا تھا۔ میں روتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔ بہت دیر تک روتی رہی۔ روتی رہی۔ پھر میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔

میں دن بھر اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی۔

مغرب کے بعد میں نے خود کو بنانا سنوارنا شروع کر دیا تھا۔ اپنا سب سے اچھا جوڑا پہنا۔ خوب صورت سا میک اپ کیا اور ایک طرف بیٹھ کر کمال کا انتظار کرنے لگی۔

کمال معمول کے مطابق گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر دس ساڑھے بجے کے قریب کمرے میں آیا تھا۔ مجھے اس طرح بنا سنورا دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''واہ آج تو تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔''

''کمال میں ذرا ایک دو گھنٹوں کے لیے جا رہی ہوں۔'' میں نے بہت سنجیدگی سے کہا۔

''جا رہی ہو، کہاں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''تمہارے بھائی جلال کے کمرے میں۔'' میں نے کہا۔ ''کیوں کہ مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ میرا شوہر کون ہے تو میں کیوں نہ اس کے پاس جاؤں۔ اس نے کہا ہے کہ ہو سکے تو رات کو آجانا۔''

کمال ہونٹ بھینچے میری طرف دیکھتا رہا۔ میں نے اس وقت محسوس کیا کہ آنکھوں میں خون اتر آنا کس کو کہتے ہیں۔ وہ تیزی سے مڑا اور دروازے سے باہر چلا گیا۔

میں بھی اس کے پیچھے لپکی لیکن اس نے باہر سے دروازے کی کنڈی لگا دی تھی۔ میں دروازے پر زور زور سے دستک دینے لگی۔ ''کھولو کمال دروازہ کھولو۔''

اس کے بعد زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر ایک بھیانک سی چیخ، پھر کچھ اور آوازیں کچھ دیر بعد دروازہ کھول دیا گیا۔

دروازہ کھولنے والا جمال تھا۔ دوسرا بھائی اور اس کے ساتھ کچھ پڑوسی بھی تھے۔ میں نے ایک نظر میں بہت کچھ دیکھ لیا تھا۔

جلال کی لاش آنگن میں پڑی تھی۔ خون میں سرخ اور کمال ایک طرف سر جھکائے کھڑا تھا۔

پولیس نے آکر کمال کو گرفتار کر لیا تھا۔ جلال کا خون کر دینے کے بعد اس نے فرار ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ خاموشی سے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔

کسی کو پتا نہیں چل سکا تھا کہ آخر ایسا کیا ہوا تھا ایک بھائی نے دوسرے بھائی کا خون کیا لیکن یہ بات صرف میں جانتی تھی۔ کمال جانتا تھا۔ یا شاید گھر والوں کو بھی اندازہ ہو۔

میں نے یہ سب کمال کی غیرت کو جگانے کے لیے کیا تھا لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ طیش میں آکر اتنا بڑا قدم اٹھا لے گا۔ اس نے جو کچھ کیا شاید اسے یہ سب نہیں کرنا چاہیے تھا یا شاید یہی کرنا تھا اس کو۔

کمال عمر قید کی سزا کاٹ رہا ہے۔ میں نے دوسری شادی نہیں کی اور نہ ہی اس سے الگ ہونے کا سوچا ہے۔ کیوں کہ اس حرکت کے بعد تو وہ صحیح معنوں میں شوہر ہو گیا ہے۔ اپنی بیوی کا سچا محافظ۔ اس کی غیرت پر آنچ نہ آنے دینے والا۔

مجھے فخر ہے اپنے اس شوہر پر جو اپنے بھائی کا قاتل ہے اور میں مرتے دم تک اس کا انتظار کرتی رہوں گی۔



لمحۂ محبت

محترمہ معراج رسول
السلام علیکم
یہ سرگزشت میری واقف کار رافیعہ کی ہے جو اب پاکستان سے ہزاروں میل دور جا بسی ہے لیکن اس کی ایک غلطی نے اس کی زندگی کو کس طرح تباہ و برباد کیا یہ دوسری لڑکیوں کے لیے سبق ہے۔ اسی وجہ سے میں... اس کی زندگی کو احاطہ تحریر میں لائی ہوں۔ امید ہے یہ سرگزشت تمام قارئین کو پسند آئے گی۔

صدف آصف
(کراچی)

اس نے جہاز کی کھڑکی سے باہر جھانکا، تو یوں لگا جیسے وہ تتلی بن کر فضاؤں میں اڑ رہی ہو۔ برف جیسے بادلوں کو چھونے کے لیے دل للچایا، اچانک سپید روئی کے گالوں سے آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی سنہری شعاع ناک کی لونگ سے ٹکرائی، اور اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔

یہ رافعہ کا پہلا طویل فضائی سفر تھا۔ وہ شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ یوکے جا رہی تھی، اسی لیے شاید اتنی ایکسائٹمنٹ ہو رہی تھی۔ انگلیوں سے گردن پر دباؤ ڈالنے کے

بعدوہ آرام دہ سیٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی، وہ دلچسپی سے مسافروں کی حرکات وسکنات کا جائزہ لینے لگی۔کوئی سو رہا تھا، کوئی کانوں پر ہیڈفون چڑھائے بیٹھا تھا، کسی کے ہاتھ میں انگلش میگزین تھا اور کوئی آدم بیزار سا آنکھیں موندے پڑا تھا، رافعہ کو طیارے کے اندر کا خنک ماحول کافی پرسکون لگا۔سب اپنے آپ میں مگن تھے۔کسی کو کسی کی کوئی فکر نہیں تھی۔

رافعہ شوہر سے ضد کر کے کھڑکی کی سائیڈ والی نشست پر بیٹھی تھی۔فریڈ اس کی بچکانہ سی خوشی پر مسکرا دیا اور بغیر کسی وقت کے خواہش پوری کر دی۔

''آہم۔آہم۔'' وہ سوتے میں کنکھارا تو رافعہ نے مڑ کر محبت سے شوہر کو تکتے ہوئے ہاتھ سے اخبار لے لیا جو نیچے گر رہا تھا۔

رافعہ کی نگاہوں نے مزے سے اس کا جائزہ لیا۔گورا رنگ، متناسب قدوقامت، گھنگریالے بال جن میں کہیں کہیں سفید چاندی چھلک رہی تھی۔نیلی آنکھیں جن پر اس وقت نیند کا خمار طاری تھا۔

''بس۔آنکھوں کے نیچے پڑنے والی لکیریں اور بالوں میں اترتی چاندنی بڑھتی عمر کی چغلی کھاتی ہے۔ورنہ صاحب نے خود کو بہت فٹ رکھا ہوا ہے۔'' ایک پیاری سی مسکراہٹ رافعہ کے ہونٹوں کو چھوگئی۔

وہ جو شادی کے نام سے بھی خوف کھاتی تھی، فریڈ کی رفاقت میں مطمئن ہوگئی، وہ خاصے سلجھے ہوئے انسان تھے، رافعہ خود بھی شادی کے بعد سے بہت محتاط رہی۔تلخ زندگی نے اسے سمجھوتوں کے بہت سارے نئے سبق پڑھا دیے۔

فریڈ شادی کے بعد اسے پاکستان چھوڑ کر اپنی جاب پر واپس لندن چلا گیا تو خاندان والوں نے خوب باتیں بنائیں، کچھ نے تو برملا کہہ دیا کہ لڑکا اب وہاں سے پروانۂ آزادی ہی بھیجے گا، مگر سب کی امیدوں کے برعکس۔اس نے وہاں جاتے ہی رافعہ کے کاغذات جمع کرائے اور ایک سال بعد جب اسے اپنے ساتھ لے جانے آیا تو اس کی آنکھیں خوشی سے بھیگ گئیں۔

رافعہ کے چھوٹے بھائی اور بھاوج نے ان کٹھن دنوں میں اس کا بہت ساتھ دیا۔

''فریڈ۔آپ میری زندگی کے وہ لمحۂ محبت ہیں، جس نے خزاں کو بہار کا روپ دیا۔'' رافعہ نے پیار لٹاتی نگاہیں فریڈ پر ڈالیں۔

خیالات کی رو بھٹکنے لگی، ماضی حال پر حاوی ہوا تو اس کا روشن چہرہ بجھنے لگا۔اچھی اور بری یادوں کا ایک ریلا سا آیا اور وہ اس میں بہتی دور نکل گئی۔

☆☆☆

''میں نے ایک بار کہہ دیا، مجھے کھانا نہیں کھانا پھر۔آپ کیوں پیچھے پڑی ہوئی ہیں؟'' رافعہ نے غصے میں کرسی سرکائی تو ٹیبل کے کونے پر رکھے شیشے کے پیالے سے ہاتھ ٹکرایا۔چھنا کا ہوا۔کانچ کرچی کرچی ہو کر ڈائننگ ہال کے کارپٹ پر بکھر گیا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے۔تم گھر کی کماؤ پوت نہیں ہو، جو ذرا ذرا سی بات پر آسمان سر پر اٹھا لیتی ہو؟'' ثمینہ کا بی پی ہائی ہونے لگا۔

''میں نے چائنیز کی فرمائش کی تھی پھر کیوں نہیں بنوایا؟'' اس نے ماں کی نہیں سنی، اپنی سنائی اور وہاں موجود کسی کی جانب دیکھے بغیر پیر پٹختی باہر نکل گئی۔

''یا اللہ۔اس لڑکی کے حال پر رحم فرما دے'' ثمینہ نے منہ اوپر اٹھا کر دونوں ہاتھ پھیلائے۔

''آپ لوگوں نے شروع سے بجو کی ہر بات مان کر انہیں سر پر بٹھا لیا ہے۔اب وہ کسی کی سننے والی نہیں۔'' حسان علی نے ہمدردی کی جگہ طعنہ دیا جو ٹھک سے جا کر ماں کے کلیجے پر لگا۔

''واہ بیٹا واہ، شاباش ہے تم پر۔ماں سے ہمدردی کرنے کی جگہ الٹا۔باتیں سنا رہے ہو۔'' ثمینہ نے بیٹے کو دکھ سے دیکھا اور دوپٹے کے پلو میں آنسو جذب کرنے کے بعد ٹوٹے کانچ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''امی پلیز، چھوڑ دیں۔ہاتھ نہ کٹ جائے اور میں طعنے نہیں دے رہا حقیقت بتا رہا ہوں۔'' حسان نے ماں کو کاندھے سے تھام کر اٹھایا اور کرسی پر بٹھاتے ہوئے رسانیت سے سمجھایا۔ثمینہ منہ سجائے بیٹھ گئیں۔سامیہ کو بڑی بہن کی حرکت پر شدید غصہ آیا مگر وہ ہمیشہ کی طرح پی گئی۔

''سامیہ۔مائی کو بلواؤ۔وہ کمرا صاف کر دے گی۔'' حسان نے چھوٹی بہن کو اشارہ کیا تو وہ فوراً اٹھ کر باہر نکل گئی۔ایک فرد کی وجہ سے اچھا خاصہ ماحول کشیدہ ہوگیا۔

''کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا کیا کروں؟ مزاج دن بہ دن سوا نیزے پر پہنچ رہا ہے۔سمجھاؤ تو ہر بات کا الٹ مطلب نکالتی ہے۔'' ثمینہ نے بیٹے کے سامنے دل کا بوجھ ہلکا کیا۔

"ویسے۔آج کون سی بات شاہانہ مزاج کو ناگوار خاطر گزری؟" حسان نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔کل چائنیز کی فرمائش کی تو میں نے کہا بنوا دوں گی۔اتفاق سے آج سامیہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔کھانا پکانے والی بوا بھی دو دنوں سے چھٹی پر ہے۔اب مجھ اکیلی جان میں اتنی ہمت نہیں رہی کہ ڈھیر ساری سبزیاں کاٹوں اور چائنیز رائس بناؤں، اسی لیے سادے دال چاول بنا لیے، فریج میں کباب رکھے تھے، وہ فرائی کر دیے پر مہارانی کو کچھ پسند ہی نہیں آتا۔ناراض ہو کر کھانا چھوڑ دیا۔" ثمینہ نے تفصیل بتائی۔اسی دوران مائی نے گلاس کے ٹکڑے اٹھا کر کارپٹ صاف کر دیا۔

"آپ کی غلطی یہ ہے کہ آپ نے کھانا پکایا۔بجو سے کچن سنبھالنے کا کہتیں یا پھر بازار سے منگوا کر کچھ رکھ دیتیں، تب ہی ان کے دماغ ٹھکانے آتے۔" وہ بلبلا کر بولا۔سامیہ جو ٹیبل صاف کر رہی تھی بھائی کی صاف گوئی پر مسکرا دی۔

"اچھا چھوڑ، تمہاری بڑی بہن ہے۔ایسی باتیں نہیں کرتے۔" انہوں نے بیٹے کو تنبیہ کی۔ثمینہ رافعہ کو خود کچھ بھی کہہ سن لیں مگر کسی اور کو کہنے نہیں دیتیں۔

وہ ہمیشہ ایسے ہی بڑی بیٹی کی سائیڈ لیتیں۔رافعہ کو والدین کی بے جا حمایت حاصل تھی، اسی وجہ سے وہ خود کو بہت اہم سمجھنے لگی تھی۔اب تو یہ حال ہو چکا تھا کہ اگر منہ نکلی بات پوری نہ کی جائے تو وہ بپھر جاتی۔

"جی وہ بڑی ہیں تو سامیہ چھوٹی۔اس گھر میں سب کے ساتھ جو زیادتی ہوتی ہے، اس پر میرا دل دکھتا ہے۔" حسان نے سامیہ کو اپنے ساتھ لگایا، جو اس بحث مباحثہ پر اداس چہرہ بنائے بیٹھی تھی۔

"لڑکے، تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے سامیہ میری بیٹی نہیں اور میں اس کی ماں نہیں دشمن ہوں۔اور یہ بتاؤ کیا رافعہ تمہاری کچھ نہیں لگتی ہے؟" ثمینہ کا غصہ کم ہو چکا تھا، بڑی کے خلاف بیٹے کا بولنا اب ان کی برداشت سے باہر ہو گیا۔

"یہی تو سمجھا رہا ہوں۔بجو بھی میری بہن ہیں مگر وہ جتنی ضدی ہوتی جا رہی ہیں۔کل کو ان کے ساتھ کچھ برا ہوا تو۔یہ بات میرے لیے ناقابل برداشت ہو گی۔" حسان کی پُر سوچ نگاہیں ماں پر ٹک گئیں۔ثمینہ کا دل ہولا۔

"اللہ۔نہ کرے کہ میری اولادوں کے ساتھ کچھ برا ہو۔میرے مالک۔اس گھر پر اپنی رحمتوں کا سایہ برقرار رکھنا۔" وہ بے چین ہو اٹھیں۔

"آمین" حسان اور سامیہ نے بیک وقت کہا۔اور دونوں ہنس دیے۔رافعہ کے مقابلے میں حسان کی سامیہ سے بہت بنتی تھی۔

ثمینہ اس ہنسی مذاق میں بچوں کے ساتھ شامل نہیں ہو سکیں۔سامیہ کی خودسری کی وجہ سے ان کے دل میں ہول اٹھنے لگے تھے۔وہ ایک ہی انداز میں بیٹھی، خلاؤں میں گھورتی رہیں۔

☆☆☆

علی اصغر اور ثمینہ کی زندگی میں رافعہ اس وقت آئی جب مایوسیوں کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔شادی کے پانچ سال بعد ثمینہ ماں بنی تو علی اصغر دیوانے ہو اٹھے۔اولاد کے لیے دونوں میاں بیوی نے خوب منتیں مرادیں مانیں۔قدرت کو جوش آ ہی گیا اور اتنی پیاری بچی پا کر ان کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔پریوں جیسی بیٹی کا نام رافعہ علی رکھا گیا، وہ ان کے آنگن میں کیا آئی جیسے قسمت کی دیوی علی اصغر پر یک بیک مہربان ہوتی چلی گئی۔ان کی ٹائلز اور سینیٹری کی چھوٹی سی دکان تھی، تاہم اس فیلڈ میں ان کے پاس کئی سالوں کا تجربہ تھا۔ایک دوست کے سمجھانے پر انہوں نے کچھ سرمائے اور بینک سے لون لے کر ٹائلز کٹنگ کا اپنا کارخانہ کھول لیا، جس میں انہیں کافی نفع ہوا۔اس طرح کاروبار بہت تیزی سے پھلنے پھولنے لگا۔

رافعہ کے بعد حسان آیا اور پھر دوسری بیٹی سامیہ پیدا ہوئی، مگر دونوں میاں بیوی کے دل میں جو محبت پہلوٹھی کی لڑکی کے لیے تھی۔اس کی جگہ باقی دونوں اولادیں نہ لے سکیں۔رافعہ نے ان کی پانچ سالوں کی پیاسی روح کو سیراب کر دیا اور اپنی مسلم جگہ بنا بیٹھی۔

علی اصغر نے بیٹی کو اتنے ناز نخروں سے پالا کہ فرمائش منہ سے نکلنے سے قبل پوری کر دی جاتی، پھر اس کا دماغ کیوں خراب نہ ہوتا۔

رافعہ کو ہوش سنبھالتے ہی گھر میں اپنی حیثیت کا احساس ہو گیا۔وہ بادلوں میں تیرنے لگی۔پھر جوان ہونے کے بعد بھی زمین پر پاؤں نہیں دھرے۔

لاڈ و پیار کی بہتات نے اس میں برداشت کی کمی کر دی وہ بڑی اولاد ہونے کے باوجود چھوٹی بنی رہتی۔آئے دن کچھ نہ کچھ ایسا کرتی جس کی وجہ سے گھر والے ذہنی کوفت کا شکار ہو جاتے۔بڑے ہونے پر اس نے گھریلو کاموں سے کوئی دلچسپی

نہیں لی۔ وہ کافی حد تک خود غرض ہوگئی، بعض اوقات وہ اپنی چھوٹی بہن بھائی کی حق تلفی کرنے سے بھی نہ چوکتی۔ سامیہ تو چپ ہو جاتی مگر حسان خوب سناتا، اسی لیے ان دونوں کی بالکل نہیں بنتی۔

رافعہ میں ایک اچھی بات تعلیم سے اس کا جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ وہ شروع سے پوزیشن ہولڈر رہی، اس کی دلکش آنکھوں میں ڈاکٹر بننے کا سپنا سجا ہوا تھا۔ وہ نہ صرف خوب دل لگا کر پڑھتی، بلکہ گھر والوں پر اپنی مف تعلیم کا رعب جماتی، یوں اسے کام میں سہولت مل جاتی۔ علی اصغر کو بیٹی کا منہ بسورنا برداشت نہیں ہوتا۔ وہ ہر معاملے میں رافعہ کی بے جا حمایت کرتے۔

اس کے مقابلے میں چھوٹی سامیہ نے بچپن سے ہی حساس طبیعت پائی۔ اس نے کم عمری سے ہی ذمہ داریاں اپنے نازک کاندھوں پر اٹھالیں حسان کو دونوں بہنوں سے محبت تھی پر گھر میں ہونے والی یہ ناانصافی اسے بہت بری لگتی۔ وہ اس بات کو ناجائز سمجھتا کہ ایک بہن تو مکمل آرام کرے اور دوسری اتنا زیادہ کام۔ وہ ماں سے لڑتا۔ سامیہ نے باپ بھائی کی ضرورتوں کا اتنا زیادہ خیال رکھا کہ وہ خود بخود، ان سب کی اہم ضرورت بن گئی۔ اب ہر کام کے لیے اس کی پکار مچتی تو اس بات پر بھی رافعہ کا منہ بن جاتا۔

حسان کے آواز اٹھانے پر ثمینہ نے کچن کے کاموں کے لیے بوا رکھ لی تو سامیہ کو بھی سکون ملا۔

☆☆☆

علی اصغر آج کل بہت مصروف رہتے۔ اپنے ٹانکوں کے بزنس کو مزید وسعت دینے کے لیے انہوں نے ایک پرانے دوست کے ساتھ پارٹنر شپ اختیار کی تھی جو کافی فائدے مند ثابت ہوئی۔ اس وقت ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔ جب نجیب خان نے اس دیرینہ دوستی کو رشتے داری میں بدلنے کا عندیہ دیا اور اپنے بیٹے قرار کا رشتہ رافعہ کے لیے مانگا۔

''یار۔ میں کیا کہوں۔ تمہارا شکریہ۔ جو تم نے ہم سے رشتے داری جوڑنے کا سوچا۔'' علی اصغر نے دوست کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے گلے لگالیا۔ وہ کیا کہتے کہ بیٹا، رافعہ سے شادی کی ضد لگائے بیٹھا ہے۔

☆☆☆

قرار نجیب نے رافعہ کو ایک بزنس ڈنر میں دیکھا تو دیکھتا رہ گیا، وہ اپنے والدین کے ساتھ شرکت کے لیے آئی ہوئی تھی۔

سفید لباس میں ملبوس لیے دیے سے ایک کونے میں کھڑی وہ پری پیکر اس کے دل میں اترتی چلی گئی۔ نجیب خان اور ان کی اہلیہ بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کے لیے بے تاب تھے مگر وہ راضی نہیں ہوتا تھا۔ کوئی لڑکی اس کے دل کو بھاتی ہی نہیں تھی۔

''ہم۔ ایک کی وجہ سے باقیوں کی خوشیوں کا راستہ تو نہیں روک سکتے تھے۔'' نجیب خان نے بیٹے کو ملامت کی۔

''پاپا۔ سب کی شادی کردیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ پر جب تک مجھے اپنی پسند کی لڑکی نہیں ملتی میں شادی نہیں کروں گا۔'' نجیب خان قرار کی ضد سے ہار گئے۔ انہوں نے باقی دونوں بیٹوں اور ایک بیٹی کی شادی کردی۔

قرار خان کے چھوٹے دونوں بھائی ایک ایک بچے کے باپ بن چکے تھے، مگر اس کی نیا ہنوز بیچ منجدھار میں پھنسی تھی۔ قرار ایسے جیون ساتھی کا متلاشی تھا جس پر پہلی نظر ڈالتے ہی وہ عاشق ہو جائے۔ رافعہ کو دیکھتے ہی اس پر کچھ ایسی ہی کیفیت طاری ہوئی۔

اب جو گھر والے اس کی شادی کی طرف سے مایوس ہونے لگے، تو اس نے اچانک شادی کرنے کا عندیہ دیا۔

''ماں صدقے۔ ماں واری۔ میرے بیٹے کے لیے کوئی کمی تھوڑی ہے۔ بس تیرے راضی ہونے کا انتظار تھا۔'' منورہ نجیب نے اس کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔

''بھائی، چلو۔ اب آپ کو بھی پتا چلے گا کہ زندگی کیسے امتحان لیتی ہے؟'' چھوٹے بھائی نے اپنی بیوی کو دیکھ کر چھیڑ چھاڑ کی۔

''اف۔ مذاق چھوڑ۔'' منورہ نے چھوٹے کو ڈانٹا۔

''بیٹا دیکھنا۔ میں کیسی پیاری دلہن ڈھونڈ کے لاتی ہوں۔'' بڑے جوش سے قرار کو دیکھ کر کہا۔

''میری دلہن۔ رافعہ کے سوا کوئی نہیں بنے گی'' قرار نے چھوٹے بھائی کی گپلوسی بیٹی سے کھیلتے ہوئے ایک شرط رکھ دی، سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، مگر کوئی اعتراض نہیں اٹھایا۔

☆☆☆

نجیب خان خوشی خوشی دوست کے پاس قرار کی رشتے کی بات لے کر پہنچ گئے۔ انہوں نے اتنا اتاؤلا پن دکھایا کہ فوری طور پر منگنی کی تاریخ طے کرنے پر زور دینے لگے۔ دوست کی دوستی اپنی جگہ مگر علی اصغر زمانے کے ریتی رواج کے ساتھ چلنے والے انسان تھے، وہ پہلے بیوی سے بات کرتے، حسان کو بتاتے، اس کے بعد کوئی جواب دے پاتے۔ انہوں نے

دوست سے سوچنے کے لیے وقت مانگا۔ انہیں ذاتی طور پر قرار بہت پسند تھا۔ وہ بیٹی کے الٹے دماغ کے بارے میں بھی اچھی طرح سے جانتے تھے، اس لیے تھوڑا جھجکے، جس پر نجیب کا منہ بھی بنا مگر وہ اپنی جگہ پر مجبور تھے۔

علی اصغر کو یہ رشتہ رافعہ کے لیے یوں بھی مناسب لگا کہ قرار ایک سمجھدار لڑکا تھا۔ وہ شروع سے ہی بہت محنتی تھا، اس نے کم عمری کے باوجود باپ کے کاروبار کو جیسے سنبھالا تھا وہ قابلِ تعریف تھا۔ سیدھا سادہ، نس مکھ سا قرار، پیسے کی فراوانی کے باوجود کسی برے فعل میں شریک نہ تھا۔

باپ ہونے کی حیثیت سے انہیں رافعہ کے بچپنے اور ضدی پن کو سنبھالنے کے لیے قرار جیسا سوبر لڑکا موزوں لگا۔

علی اصغر کی دولت اور رافعہ کی کم عمری اور خوبصورتی کی وجہ سے جلد ہی لوگ اسے پسند کر لیتے، مگر رافعہ نے شادی کے لیے جو عجیب و غریب شرط رکھی تھی، اس کی وجہ سے ان کی خاندان میں پہلے ہی کافی جگ ہنسائی ہو چکی تھی۔

"اس لڑکی پر چھوڑ دیا تو سب تباہ ہو جائے گا۔ مجھے رافعہ سے سختی سے نمٹنا پڑے گا۔" علی اصغر کے ماتھے پر پُرسوچ لکیریں ابھریں۔

☆☆☆

"بجو۔ آپ نے شادی کے لیے کیسی شرط لگائی ہے۔ آخر مسئلہ کیا ہے؟" سامیہ پریشان ہو کر بہن سے پوچھتی۔

"بھئی سمی۔ میں تو لڑکے کا انتخاب خود کروں گی۔ لڑکے کو ہمارے یہاں خود چل کر آنا پڑے گا۔" وہ خوشگوار موڈ میں بولی۔

"بجو۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایسا نہیں ہوتا۔" سامیہ نے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے گھورا۔

"تم ٹینشن نہ لو۔ اس بار ایسا ہی ہوگا۔ میں رافعہ علی۔ زمانے کا چلن بدل کر رکھ دوں گی۔" اس نے اٹھلا کر کہا۔

"بجو۔ پلیز۔ کچھ تو سوچیں، لوگ ویسے ہی بہت باتیں بنا رہے ہیں۔" سامیہ نے اسے سمجھانا چاہا۔

"میں لوگوں کی پروا نہیں کرتی۔ تم چھوڑو ساری باتیں اور سنو۔ میں تو کسی شہزادے سے شادی کروں گی۔ جس کا رنگ گورا اور آنکھیں نیلی ہوں۔" رافعہ نے اچھے موڈ میں بہن کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے گھماتے ہوئے دل کی بات کہہ دی۔

"اللہ۔ میری بہن کے لیے دور دیس سے ایک شہزادہ بھیج دے۔" سامیہ کو گول گول گھومنے سے چکر آیا تو دیوار کا سہارا لیتے ہوئے زور سے دعا مانگی۔

"آمین" رافعہ نے زور سے بول کر منہ پر ہاتھ پھیرا، دونوں بہنیں کھلکھلا اٹھیں۔

☆☆☆

رافعہ نے شادی کے لیے ایک عجیب و غریب شرط رکھ دی۔ وہ لڑکا خود دیکھ کر پسند کرے گی۔ گھر والوں نے اس شرط پر اختلاف کیا تو وہ شادی سے انکار کر بیٹھی مجبوراً ثمینہ رشتے والیوں کو خطیر رقم دے کر لڑکے کو بھی ساتھ بلوانا شروع کر دیا۔

کچھ روشن خیال گھرانوں کو اس شرط پر اتنا خاص اعتراض نہیں ہوتا۔ اماں، بہنیں۔ لڑکے کو بھی ساتھ لے کر آتے، اچھا ہے دونوں ایک دوسرے کو دیکھ لیں۔ تاہم ابھی بھی کچھ ایسی وضعدار خاندان تھے جو لڑکی کی اس شرط کو ماننے سے انکار کر دیتے۔ وہ ایسی بہو گھر لانے کے خواہش مند نہ تھے جو خود سے لڑکے کا انٹرویو کرے۔

ثمینہ نے بیٹی کو زمانے کی ریت کے بارے میں سمجھانے کی بڑی کوشش کی مگر وہ ضد کی پکی نکلی۔ اس معاملے میں اپنی ضد کرتی رہی۔

لڑکا سامنے موجود ہوتا تو وہ اس سے خوب سوال جواب کرتی، پسند نہ آنے پر انکار کر دیتی۔

لڑکے کی ماں بہنیں اپنے بیٹے یا بھائی کی ایسی درگت پر رافعہ کو باتیں سنانے لگتیں تو وہ بھی خراب لہجے میں لڑکے کے عیب گنوانا شروع کر دیتی۔ ثمینہ سیز فائر کی کوشش میں ہلکان ہو جاتیں۔

حسان ایسے موقع پر گھر سے ہی چلا جاتا۔ اسے بجو کی یہ روش قطعی برداشت نہ ہو پاتی۔ والدین کی وجہ سے اسے خاموشی اختیار کرنی پڑی، ورنہ اس کا بس چلتا تو روز روز کی نوٹنکی بند کروا کر کسی اچھے لڑکے کے ساتھ اپنی بجو کو وداع کر چکا ہوتا۔

ثمینہ کے دل میں خوف خدا تھا۔ انہیں بیٹی کا یہ رویہ بہت برا لگتا۔ پھر اس مسئلے کی وجہ سے رافعہ کی خوب بدنامی ہوئی۔ اس کی جن لوگوں سے منہ ماری ہوتی وہ دوسرے گھروں میں جا کر ایک کی چار لگاتے۔ رشتے کے خواہش مند گھرانے لڑکی کے یہ نرالے ڈھنگ دیکھ کر کان پکڑتے۔ اگر علی اصغر کی پوزیشن اتنی مضبوط نہ ہوتی تو رافعہ کا تماشا ایک پل نہ چل پاتا۔

☆☆☆

"رافعہ تم یہ کر کیا رہی ہو؟ اپنی زندگی سے ایسا کھلواڑ کوئی بے وقوف لڑکی ہی کر سکتی ہے۔" ثمینہ نے ایک دن بیٹی کو

بٹھا کر سمجھانا چاہا۔

"امی، میں نے کیا کیا؟" اس نے بھولی سی شکل بنا کر پوچھا۔

"یوں۔ گھر آئے مہمانوں کی بے عزتی کرنا۔ لڑکوں سے ایسے پیش آنا۔ کوئی اچھی بات نہیں۔" ثمینہ نے بیٹی کو جھڑکی دی۔

"ایک بات تو بتائیں؟ جب یہ لڑکے والے گھر گھر جا کر ناشتہ پانی اڑا کر بیچاری لڑکیوں کو ریجیکٹ کرتے ہیں تو ان پر اخلاقیات کا کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا؟ اگر میں نے ایسا کرلیا تو بری بن گئی۔" رافعہ ماں کی جھاڑ پر اپنا راگ الاپتی۔

"بیٹا، اگر ایک فریق غلط کرتا ہے تو کیا تم بھی ویسی ہی روش اختیار کروگی؟" ثمینہ نے منہ کھول کر اسے دیکھا۔

"امی پلیز۔ میں ایسے لوگوں کی نفسیات کو اچھی طرح سے جان گئی ہوں۔ اپنا کالا پیلا لڑکا بھی چاند بنا کر پیش کرتی ہیں اور دوسرے کی لڑکی کو انچ ٹیپ سے ناپ ناپ کر پسند کرتی ہیں، کہیں ذرا سی بھی کسر نہ رہ جائے۔" رافعہ کے اندر کم عمری کا جذباتی پن چھلک اٹھا۔

"توبہ میرے مالک۔ اس لڑکی کو کیسے سمجھاؤں۔ اچھا ایک بات یاد رکھنا۔ ہمارے معاشرے میں مرد کی بڑی سی بڑی غلطی کی بھی کوئی پکڑ نہیں مگر عورت کی حرمت ایک ایسی سفید چادر کی طرح ہے جس پر کوئی داغ لگ جائے تو سات سمندر کے پانی بھی اسے صاف نہیں کرسکتے۔" ثمینہ نے اپنے خاندان کی بڑی بوڑھیوں کی مثال ڈھونڈ کر نکالی۔ مگر اس پر کیا اثر ہوتا، وہ کاندھے اچکا کر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

رافعہ کو اپنے حسن اور قابلیت پر بہت ناز تھا، اس کا خیال تھا کہ اسے ہمیشہ ایسے ہی چاہا جائے گا۔ وہ آنے والے وقت سے انجان بنی، آئینہ دیکھ دیکھ کر اپنی خوبصورتی کو خراج پیش کرتی۔

اب تو وچولن خالہ بھی لڑکے والوں کو یہاں لاتے ہوئے گھبرانے لگی، رافعہ کی بدسلوکی کا خمیازہ اسے یوں بھگتنا پڑا کہ کئی لوگوں نے اس کا خرچا پانی بند کردیا، جس پر اس کا گزارہ تھا۔ ثمینہ ان حالات سے بیمار رہنے لگی۔ بیٹی کے بارے میں سوچ سوچ کر ان کی شوگر ہائی ہوجاتی۔ وہ ڈرتیں کہ کہیں بیٹی کو ایسی ٹھوکر نہ لگ جائے کہ اس کا غرور اور طنطنہ دھرا کا دھرا رہ جائے۔

آخر ایک دن وہ شوہر کا ہاتھ تھام کر بری طرح سے رو دیں۔ سامیہ کو گھر کے حالات اور بڑی بہن کی ضد سے ہول اٹھتے، حسان الگ غصے میں بہن کو سمجھاتا مگر سب بے کار۔

ان حالات میں علی اصغر بھی پریشان رہنے لگے۔ رافعہ کو بٹھا کر سمجھایا بھی، وہ باپ کی بات پر بیٹھی سر ہلاتی رہی مگر کرتی اپنے دل کی۔ ایسے میں قرار کا رشتہ نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا۔

☆☆☆

علی اصغر نے قرار کے معاملے پر خوب سوچا اور گھر میں بات کرنے سے قبل تنہائی میں قرار سے ایک ملاقات کی خواہش کی۔

"لو جی۔ اب تو یہ تمہارا بیٹا بھی ہے۔ اجازت کی کیا ضرورت ہے، جب دل چاہے ملاقات کرلو؟" نجیب خان نے مسکرا کر دوست کے کاندھے پر ہاتھ مارا۔

"اگر آج ہی یہ کام ہوجائے تو" علی اصغر نے جھجک کر دوست کی طرف دیکھا۔ اب معاملہ کچھ اور ہوچکا تھا۔

"ہاں، کیوں نہیں۔" نجیب نے ہامی بھری۔ بیٹے کو کال کرکے بلایا اور کیبن سے باہر چلے گئے، تاکہ دونوں آرام سے بات کرلیں۔

وہ ایک دوسرے کی جانب متوجہ ہوئے، تھوڑی ملکی سیاست اور بزنس پر گفتگو ہوئی۔ چپراسی نے چائے لاکر رکھی، اس کے بعد علی اصغر نے کچھ محتاط اور قدرے ہلکے پھلکے انداز میں قرار کو بیٹی کی بچگانہ طبیعت کے بارے میں بتایا۔

"انکل، آپ اتنا پریشان کیوں ہورہے ہیں؟ یہ کوئی عیب تھوڑی ہے، تسلی رکھیں۔ شادی کے بعد سب ٹھیک ہوجائے گا۔" قرار کے جواب پر ان کے اندر سکون پھیل گیا۔

قرار تو اس وقت رافعہ کی خوبصورتی کے سحر میں گرفتار تھا۔ اسی لیے وہ ساری باتوں پر خوش دلی سے سر ہلاتا رہا۔ علی اصغر اس طویل ملاقات کے بعد بہت مطمئن اور خوش خوش گھر لوٹے مگر انہیں یہ خبر نہیں تھی کہ آگے قسمت ایسا کھیل کھیلنے والی ہے جو ان کے خاندان کی بنیادیں ہلا دے گا۔ پتا ہوتا تو شاید بات یہیں ختم کرکے اٹھتے۔

☆☆☆

"کیا؟ کیا میں اس انکل سے شادی کروں گی؟" رافعہ نے جیسے ہی قرار کا نام سنا بھنا اٹھی۔ والدین کا بھی لحاظ نہ کیا۔

"رافعہ۔ ہوش کے ناخن لو۔" ثمینہ نے بیٹی کو دانت کچکچا کر دیکھا۔

"بیٹا، قرار اچھا لڑکا ہے، تم اس کے ساتھ خوش رہو

گی۔'' علی اصغر نے غصے پر قابو پاتے ہوئے نرمی سے کہا تو وہ مزید شیر ہوگئی۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔شکل دیکھی ہے۔کالا، گنجا۔ آپ لوگوں کو ہو کیا گیا ہے؟'' رافعہ نے صاف انکار کر دیا، جس پر گھر میں نیا ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔

''ہم نے تمہیں ایک سال تک مرضی کرنے دی۔ کبھی کسی بات پر اعتراض نہیں کیا۔ کتنے لڑکے دکھائے گئے مگر تم نے انکار کر دیا۔'' علی اصغر جرح پر اتر آئے۔

''پاپا۔اس کا مطلب یہ تو نہیں۔'' رافعہ نے بلبلا کر کہنا چاہا مگر علی اصغر نے اس کی بات کاٹ دی۔

''تمہاری بہت سن لی گئی ہے۔اب تم چپ ہو کر میری سنو، قرار بہت سمجھدار اور اچھا لڑکا ہے۔ویسے بھی تمہاری ہاؤس جاب شروع ہوگئی ہے۔میں اس سال تمہارے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں، تم ہماری اکیلی اولاد نہیں ہو۔تمہارے بعد مجھے سامیہ کی شادی بھی کرنی ہے۔'' علی اصغر نے ہاتھ اٹھا کر سخت لہجے میں بات ختم کر دی۔

''بجو، پاپا ٹھیک کہہ رہے ہیں'' حسان باپ کے برابر میں کھڑا تھا فوراً بولا مگر رافعہ نے اسے کھا جانے والی نگاہوں سے گھورا۔

''سب سن لیں، مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔'' وہ صاف انکار کرنے لگی۔

''تمہارا بہت دماغ خراب ہو چکا ہے۔ایک سامیہ بھی تو اسی گھر کی ہے۔مجال ہے جو ہمیں کبھی اس کی وجہ سے پریشانی اٹھانی پڑی ہو۔'' علی اصغر نے اس کی بات پر غصہ دکھایا۔

''ایسا کریں، آپ لوگ پہلے سامیہ کی ہی شادی کر دیں۔'' رافعہ کا ضدی لہجہ اور بدمزاجی عود آئی۔اسے باپ کا چھوٹی بہن کی مثال دینا بہت برا لگا۔

''خاموش ہو جاؤ۔ہمارے خاندان کی لڑکیاں شادی کے مسئلے پر اتنا نہیں بولتیں، جتنا تم بول رہی ہو۔شاید ہمارے بے جا لاڈ پیار کا نتیجہ ہے۔جو یہ دن دیکھنا پڑ رہا ہے۔'' علی اصغر زندگی میں پہلی بار رافعہ پر چیخے، وہ ایک دم خوف زدہ رہ گئی۔

''قرار سونے کا بھی بن کر آجائے میں یہ شادی نہیں کروں گی۔'' وہ بہتے آنسو پونچھ کر اٹل لہجے میں بولی۔

''خاموش ہو جاؤ۔اس گھر کا سربراہ میں ہوں۔تم نہیں کہ تمہارے فیصلے مانے جائیں۔اب ایک لفظ بھی منہ سے نکلا تو میں کسی کا لحاظ نہیں کروں گا۔'' وہ فیصلہ کن انداز میں بولے اور سامنے پڑی میز کو پاؤں سے ٹھوکر مار کر باہر نکل گئے۔

علی اصغر کو آج احساس ہوا کہ ان کے پیار اور غلط حمایت نے بیٹی کا دماغ خراب کر کے رکھ دیا، اس کے اندر کا توازن بگڑ گیا ہے۔

''اب رافعہ کی بھلائی کے لیے سختی ناگزیر ہوگئی ہے'' علی اصغر کے سینے میں یہ سب سوچتے ہوئے درد سا اٹھا۔وہ اپنے مؤقف پر سختی سے ڈٹ گئے۔یہی ان کی بھول تھی۔معاملہ سلجھنے کی جگہ الجھتا چلا گیا۔

☆☆☆

''کیا اب دنیا میں میرے لیے یہی ایک نمونہ رہ گیا ہے؟'' ثمینہ نے جیسے ہی بتایا کہ قرار کے گھر والے باقاعدہ بات طے کرنے کے لیے آنا چاہ رہے ہیں وہ رو دی۔

اس نے تو سوچا تھا کہ شور ہنگامے کے بعد یہ معاملہ دب گیا ہوگا مگر اب تو بات منگنی تک جا پہنچی تھی۔

''بس بیٹا اب ضد چھوڑ دو۔ہاں کر دو۔مبارک گھڑی ہے۔'' ثمینہ نے پیار سے اسے اپنے ساتھ لگایا۔

''نہیں۔یہ ممکن نہیں۔'' اس نے اپنے گھنے شہد آگیں بالوں کو بل دے کر کیچر لگایا۔دوبارہ محاذ پر ڈٹ گئی۔

''بیٹا۔قرار بھی اچھا لڑکا ہے؟ تھوڑی بہت کمی بیشی تو ہر انسان میں ہوتی ہے۔'' ثمینہ نے بیٹی کو چمکارا۔

''امی، اب اس آدمی کو لڑکا تو نہ کہیں۔آپ کیا چاہتی ہیں؟ میں شادی کے بعد اپنی دوستوں میں مذاق بن کر رہ جاؤں؟'' رافعہ نے اپنی ستواں ناک چڑھا کر غرور سے کہا تو پاس بیٹھی سامیہ کو انجانا دکھ اٹھا۔

''اللہ کا خوف کرو بجو۔اب قرار بھائی اتنے بھی برے نہیں جیسا آپ سمجھ رہی ہو۔وہ گنجے تو نہیں ہیں۔ہاں بال تھوڑے کم ہیں اور رنگ بھی ہلکا سانولا ہے۔یہ کالا تو نہیں کہلائے گا۔'' سامیہ نے پیار سے بہن کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''رہنے دو اپنی چاپلوسی، یہ سب تمہاری وجہ سے ہی ہوا ہے۔ورنہ میرے پاپا ایسے نہ تھے۔ان کو یہ ہی فکر ہے نا کہ میری شادی کی وجہ سے تمہارا راستہ رکا ہوا ہے تو پہلے تمہاری شادی کر دیں۔میں اسٹامپ پیپر پر لکھ دوں گی کہ مجھے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔'' اس نے کہا تو سامیہ کا رنگ خوف سے پیلا پڑ گیا۔

''بجو، کیا کہہ رہی ہو، میرا وہ مطلب نہیں تھا۔'' سامیہ نے صفائی دینے کی کوشش کی۔
حسان جو قریب بیٹھا ٹی وی پر میچ دیکھ رہا تھا، ایک دم بد مزہ ہو کر بڑی بہن کو غصے سے گھورنے لگا۔
''بجو بس، اپنا غصہ سامیہ پر مت نکالو۔'' حسان نے اسے تنبیہ کی۔
''اب تم سب ایک ساتھ نہ شروع ہو جاؤ۔'' معاملہ بگڑتا دیکھ کر ثمینہ نے سب کو خاموش کرانا چاہا۔
''یہ۔ بات۔ آپ بجو کو سمجھا دیں۔'' حسان نے ٹیبل سے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آف کرتے ہوئے کہا۔
''بات کچھ اور ہو رہی تھی، تم لوگ ایک نیا جھگڑا لے کر بیٹھ گئے۔'' ثمینہ نے سر پر ہاتھ مارا۔
''میں خوب سمجھتی ہوں۔ تمہیں قرار اتنا ہی اچھا لگ رہا ہے تو اس سے خود کر لو نا شادی۔'' اسے تو بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا۔
''رافعہ۔ ہوش میں رہ کر بات کرو۔'' ثمینہ کو ایک دم غصہ آ گیا۔
''امی، سچ تو کہہ رہی ہوں۔ پاپا بھی خوش ہو جائیں گے اور میری جان بھی چھوٹ جائے گی۔ ویسے بھی تمہارے ساتھ اس کی جوڑی سجے گی بھی خوب۔'' اس نے بہن کے سانولے روپ پر چوٹ کی۔
''بجو۔'' سامیہ کپکپا اٹھی۔ وہ بہن جیسی حسین نہ سہی پر بڑی پُرکشش تھی۔
''اف۔ اتنی ذلت۔'' وہ ماں سے لپٹ کر بری طرح سے رو دی تو ثمینہ نے اسے قہر بھری نگاہوں سے دیکھا۔
''ہاں تو خود ہی تو قرار کی اتنی خوبیاں گنوا رہی ہے۔'' رافعہ نے کاندھے اچکائے۔
''اپنے بڑے ہونے کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ، بولتے وقت یہ تو سوچ لیا کرو کہ کیا بول رہی ہو؟'' حسان غصے سے دھاڑا۔
''میں تم سے بات نہیں کر رہی، اس لیے تم اس معاملے میں ٹانگ نہ اڑاؤ'' اسے ہمیشہ سے بھائی کی حمایت بری لگتی۔ اس وقت تو وہ مزید چڑ گئی تھی۔
''کیوں کیا میں اس گھر کا فرد نہیں ہوں۔ حسان نے بہن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ترکی بہ ترکی جواب دیا اور تن کے اس کے سامنے جا کر کھڑا ہوا۔
''مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔ تم یہاں سے جاؤ۔''
رافعہ کی آواز تیکھی ہوئی۔
''کیوں آپ جس کو جو دل چاہے سناتی جائیں۔ اب مزید ایسا نہیں چلے گا۔ جہاں تک سامیہ کی شادی کی بات ہے، آپ یہ فکر کرنا چھوڑ دیں۔ میں اس کے لیے ایک شہزادہ ڈھونڈ کر لاؤں گا۔'' حسان نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی۔
''تمہارا جو دل چاہے کرو، میرے معاملے میں مت پڑو۔'' رافعہ نے اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے اور وہاں سے جانے لگی۔
''ایک منٹ۔ بات سن کر جائیں۔ یہ مسئلہ ابھی حل نہیں ہوا ہے۔ وہ چاہے کالے ہو یا پیلے۔ آپ کو قرار بھائی سے ہی شادی کرنی پڑے گی۔ سب گھر والے اس بات پر متفق ہیں تو آپ کو بھی ہم سب کی بات ماننی پڑے گی۔ اگر آپ بے وقوفی کر رہی ہیں تو اس میں کوئی آپ کا مزید ساتھ نہیں دے گا۔ ہم آپ کو فضول سی بات پر اتنا اچھا رشتہ ٹھکرانے نہیں دیں گے۔ ابھی وقت ہاتھ میں ہے۔ نکل گیا تو روتی رہ جائیں گی۔'' حسان نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بڑی بہن کا ہاتھ تھاما اور رسانیت سے سمجھایا۔
''میں کوئی موم کی گڑیا نہیں جسے جیسے دل چاہے موڑ دو۔ اگر۔ میرا دل قرار کے لیے راضی نہیں تو مجھے کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔'' رافعہ نے بھائی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پتھریلے لہجے میں کہا۔
''میں دیکھتا ہوں کہ آپ پاپا کے خلاف کیسے کھڑی ہو پاتی ہیں؟'' حسان نے ایک دم رافعہ کا ہاتھ چھوڑا، اسے وارن کیا اور روتی ہوئی سامیہ کو سہارا دے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس نے چیلنج دیا تھا۔
''رافعہ کو کون ہرا سکتا ہے؟ میرے ساتھ زبردستی کرنا اتنا آسان نہیں۔ اب تو قرار کی شادی ہو گی مگر مجھ سے نہیں۔''
اس نے بڑے آرام سے بوا کا لایا ہوا اورنج جوس کا گلاس خالی کیا، اس کی تہہ میں جھانکتے ہوئے مصمم ارادہ کیا۔
ایک عجیب سا تاثر اس کے خوبصورت چہرے پر پھیلا، ثمینہ نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

☆☆☆

''ایسے موقع پر جب۔ شادی کی تیاریاں زور و شور سے چل رہی ہیں۔ اس ملاقات کی تک سمجھ میں نہیں آئی۔'' قرار کافی سنجیدہ مزاج کا مالک تھا۔ وہ یوں ہونے والی بیوی کے اچانک بلاوے پر حیران رہ گیا۔
''کوئی ایسے ملتے دیکھ لے تو جانے کیا سوچے گا۔'' رافعہ

کے آنے سے پہلے وہ۔ ساحل کی لہروں کو آتے جاتے دیکھ کر اسی بات پر کڑھتا رہا۔
رافعہ نے اسے فون پر ساحل سمندر کے نزدیک واقع گولڈ کارنر پر پہنچنے کی ہدایت دی تھی۔
"جی۔ اب بتایئے۔ مجھے یہاں کیوں بلوایا، شادی کی ڈیٹ فکس ہوچکی ہے۔ ایسے میں ملنا ضروری نہیں تھا؟" رافعہ نے بتائی ہوئی جگہ جاکر کرسی سنبھالی، قرار نے خاصے خشک انداز میں اس کا استقبال کیا۔ اس کا لہجہ بے چینی کا مترشح تھا۔
"قرار صاحب اتنی جلدی بھی کیا ہے؟ بتاتی ہوں گھڑی بھر دم تو لیں۔" رافعہ نے پانی کا گلاس ایک سانس میں ختم کرتے ہوئے شوخی دکھائی۔ ویسے بھی وہ جو کچھ کرنے جارہی تھی۔ اس کے لیے بڑے حوصلے کی ضرورت تھی۔
"اچھا، چائے منگواؤں یا جوس۔" قرار کو مہمان نوازی کا خیال آیا۔
"جی چائے۔" اس نے بیگ کو کاندھے سے اتارا قرار نے پہلی بار اس کا بغور جائزہ لیا، خوشبوؤں میں بسی آئس گرین جدید سوٹ میں مکمل تیاری کے ساتھ دل میں بسی جارہی تھی۔
اس نے ایک طویل سانس لی، یوں لگا جیسے انتظار کی ساری کلفتیں ختم ہوگئیں، سارے اعتراضات اس کے ذہن سے محو ہوگئے، یاد رہی تو اس کی نشیلی نیلی آنکھیں، دلکش سراپا، سحر انگیز شخصیت، وہ ان میں کھونے لگا۔
"کیا آپ مجھ سے محبت کے دعویدار ہیں۔" رافعہ نے چائے کا سپ لیتے ہوئے بڑی ادا سے پوچھا۔
"کیا۔ مطلب۔ محبت کا دعویدار؟" قرار حیران ہوا۔ وہ اپنی نوک پلک سنوار کر پوری تیاری کے ساتھ ایک فیصلہ کرکے، ایک فیصلہ کروانے کا عزم لیے ہوئے یہاں آئی تھی۔
"جی۔ جناب۔ یہ ہی پوچھا ہے؟" اس نے اب ایک لاکھ کی مسکراہٹ بھی اس پر نچھاور کی۔ قرار کی نگاہیں اس کے چہرے کی بلائیں لینے لگیں۔
"رافعہ، صرف دعویٰ نہیں یہ میری زندگی کی سب سے بڑی سچائی ہے۔ میں واقعی آپ سے محبت کرنے لگا ہوں۔ جب ہی تو سیدھا راستہ اختیار کیا۔ اب آپ کے ساتھ زندگی کی خوشیاں شیئر کرنا چاہتا ہوں۔" قرار کا لہجہ محبت میں چور چور ہوا۔
"مجھے اس بات پر یقین نہیں، سب یہ ہی کہتے ہیں مگر جب محبت میں امتحان دینے کا وقت آئے تو پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔" رافعہ نے اپنے لمبے گھنے بالوں میں مخروطی انگلیاں نرمی سے پھیریں۔
ادا سے بالوں کو جمع کرکے ایک سائیڈ پر ڈالتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ کافی سنجیدگی سے چیلنج دیا۔ قرار مسحور ہوا۔ اس کا ہر روپ انوکھا لگا۔
"یہ ایک مرد کی زبان ہے۔ آپ چاہیں تو ہزار بار امتحان لے سکتی ہیں۔ میں پورا اتروں گا، مایوسی نہیں ہوگی۔" قرار اس کے بنے ہوئے روپہلے تانے بانے میں پھنستا چلا گیا۔ وہ دلکشی سے مسکرائی۔
"قرار جی، ہزار نہیں، بس ایک۔ سوچ لیں، یہ نہ ہو کہ جو میں مانگوں، اسے دینا آپ کے لیے مشکل ثابت ہو۔" رافعہ نے آخری تیر چلایا جو ٹھک کرکے نشانے پر جالگا۔
"یہ میرا وعدہ ہے کہ تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا۔ تم ایک بار کہہ کر دیکھو۔" قرار نے تکلف کی دیواریں تیزی سے گرائیں۔ آپ سے تم تک آگیا۔ اس کا نازک موی ہاتھ پر اپنا بھاری مردانہ ہاتھ رکھ کر یقین دہانی کروائی۔
"ہونہہ۔" رافعہ کو کافی ناگواری محسوس ہوئی، موی ہاتھوں پر اس کا سانولا بھاری مردانہ ہاتھ۔ بڑا تضاد تھا۔ اس نے نرمی سے اپنا ہاتھ الگ کیا۔
"ایک بار پھر۔ سوچ لیجیے۔" اب کی بار آتش شوق کو بھڑکایا۔
پلیز، اب بتادو ناں، کیا بات ہے؟" اس کے ڈرامائی انداز نے چونکایا۔ اندیشوں نے سر اٹھایا۔ تو وہ تھوڑا فکر مند ہونے لگا۔
"اچھا تو۔ سنیں۔ آپ مجھ سے نہیں۔ میری چھوٹی بہن سامیہ سے شادی کرنے والے ہیں" اس نے ایک توقف کے بعد جملہ پورا کیا اور قرار کی حالت سے لطف اندوز ہونے لگی جو اس کی بات سن کر بے ہوش ہوتے ہوتے بچا، اس کے دل و دماغ کے کسی گوشے میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ شادی سے پندرہ دن پہلے کوئی لڑکی اپنے ہونے والے دولہا سے ایسی فرمائش کرے گی۔
"آپ کو پتا بھی ہے کیا بول رہی ہیں؟ اگر یہ مذاق ہے تو نہایت ہی بے ہودہ ہے۔" قرار اب کچھ سنجیدہ ہوا۔ اس کے چہرے پر انتشار پھیلا نظر آیا۔
"جی۔ میں پورے ہوش و حواس میں اپنی محبت کا دعویٰ کرنے والے ایک انسان سے سوال پوچھ رہی ہوں" اس نے

تمسخر اڑایا۔
"میں۔ اس بات کے پیچھے چھپی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔"
قرار نے بے چین ہو کر رافعہ کو دیکھا۔
"میری ایک چھوٹی سی خواہش ہے۔ آپ کی محبت کا امتحان۔ بس۔" رافعہ نے ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"پلیز، اتنا ظلم نہ کریں۔ کچھ تو سوچیں۔ میں تو صرف آپ کا ہونا چاہتا ہوں۔" وہ مرد ہو کر تڑپنے لگا مگر وہ چپ رہی ایک ناگواری خاموشی ان کے بیچ چپکے سے چلی آئی۔
"ایک بات کہوں۔ سامیہ آپ کو سوٹ کرے گی، وہ بہت کیئرنگ اور لونگ ہے۔ میں آپ کے لیے بالکل مناسب نہیں۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔ قرار کے پاس بولنے کے لیے کچھ نہیں بچا مگر بے چینی اس کی نگاہوں سے عیاں ہوئی۔
"بس۔ بولتی بند ہوگئی، وہ آپ کیا کہہ رہے تھے کہ" یہ مرد کی زبان ہے، وغیرہ وغیرہ۔" رافعہ کا لہجہ مذاق اڑانے لگا۔
قرار کے اندر کا مرد بیدار ہوا۔ محبت اپنی جگہ یہاں بات زبان اور عزت نفس پر آگئی۔ آخری بار اسے جی بھر کر دیکھا اور ہمیشہ کے لیے منہ موڑ لیا۔
"مجھے منظور ہے۔" قرار نے دل ٹوٹنے کی صدا کے ساتھ، اسے بھی نظر انداز کیا جس نے اس کی محبت کی کلی کو کھلنے سے پہلے ہی مسل دیا۔
"میرا نام لیے بغیر پاپا کو بھی اس بات کے لیے آپ ہی راضی کریں گے۔" رافعہ کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ چھا گئی۔ اس نے اپنا پرس میز پر سے اٹھایا اور بغیر مڑ کر دیکھے وہاں سے چل دی۔ قرار سر تھام کر بیٹھ گیا، اسے حقیقی زندگی میں یہ فلمی سچویشن عذاب سے بدتر لگی۔

☆☆☆

قرار کا مطالبہ سن کر علی اصغر سمجھ گئے دال میں کچھ کالا ہے۔ انہوں نے قرار سے مل کر ساری بات اگلوالی۔ بیٹی کی دیدہ دلیری کا سن کر ہکا بکا رہ گئے۔ قرار کو یقین دلایا کہ وہ رافعہ کو اس شادی کے لیے منا کر دم لیں گے، پر اب وہ اس لڑکی سے کیسے شادی کرتا جس نے اپنے منہ سے خود انکار کیا۔
قرار نے صاف انکار کر دیا۔ ہال بک ہو چکا تھا، خاندان میں شادی کی باتیں پھیل چکی تھیں۔ ایسے وقت میں علی اصغر نے سر جھکا کر چھوٹی بیٹی سے التجا کی اور اس نے باپ کا مان رکھا۔ یوں سامیہ قرار کے سنگ وداع ہوگئی۔
قرار نے اپنا قول نبھایا۔ کئی محاذوں پر لڑ کر سامیہ سے شادی کی مگر وہ اس سے کھنچا کھنچا رہتا۔ دو سال تو سامیہ نے بڑی خاموشی سے گزارا کیا، اس کی ہر بات کو مقدم جانا، بہن کے ہاتھوں کچلی اس کی انا پر محبت کے پھائے رکھے۔ پیار و محبت سے گھر کے دوسرے لوگوں کو اپنا بنایا۔
قرار نے آخر اسے بیوی کا درجہ دے دیا۔ وہ رافعہ کے دیئے ہوئے دکھ بھولتا چلا گیا اور سامیہ کے پیار میں دیوانہ بن گیا۔
"میرے مالک کا شکر ہے جو تمہاری بہن نے مجھے تم سے شادی کے لیے مجبور کیا۔" رات کی تنہائی میں سامیہ کا ہاتھ تھام کر پیار سے کہتا تو وہ ہنس دیتی۔
"میری کسی نیکی کا صلہ ہے جو سامیہ سے میری شادی ہوئی۔" وہ گھر والوں کے سامنے برملا اظہار کرتا اور اسے معتبر کر دیتا۔
مگر سامیہ کے دل کا خلاء بھرتا ہی نہیں۔ "بجو تم نے مجھے کتنا۔ ارزاں کر دیا تھا۔ انا کے کھیل میں جیتنے کے لیے میری زندگی کو ہی داؤ پر لگا دیا۔" سامیہ بہن کے عمل پر اکثر دکھی ہو کر سوچتی اور اکیلے بیٹھ کر رونے لگتی۔ اس شادی کو کامیاب بنانے کے لیے اسے اپنے میکے سے ناتا توڑنا پڑا، شادی کی پہلی رات ایک یہ ہی شرط تو قرار نے رکھی تھی، اس کے پاس کوئی دوسری چوائس ہی نہیں تھی، سر ہلا کر اقرار کر لیا۔
قرار نے سامیہ کو دنیا کی ہر خوشی دی۔ وہ خاص موقعوں کے علاوہ کبھی اپنے میکے کا رخ نہیں کرتی۔ سامیہ کو اندازہ تھا کہ قرار رافعہ کا سامنا کم سے کم کرنا چاہتا ہے، اسی لیے پلٹ کر میکے جانے کی ضد نہ کی۔
قرار کی پابندی کی وجہ سے زیادہ تر علی اصغر اور ثمینہ ہی بیٹی سے ملنے چلے جاتے۔ حسان بھی رافعہ سے ناراض تھا، وہ بڑی بہن سے بہت مختصر یا کام کی بات کرتا، جس نے اسے نیچا دکھانے کے لیے قرار کو زبردستی سامیہ سے شادی پر مجبور کیا۔
اسے جب بھی چھوٹی کی یاد آتی تو وہ خود ہی اس سے ملنے چلا جاتا۔ پر بہن کے گھر بار بار جانا کچھ مناسب نہیں لگتا۔ کئی بار دل مار کر بھی بیٹھ جاتا۔
"میرا کیا قصور تھا؟ مجھے شطرنج کا مہرہ کیوں بنایا گیا؟" سامیہ کی پیاسی آنکھیں اکثر ماں جائے سے یہ سوال پوچھتی۔ حسان مٹھیاں بھینچ کر رہ جاتا۔

☆☆☆

علی اصغر کے، کاروبار میں اچانک گھاٹا ہوا۔ پارٹنرشپ ختم ہوگئی۔ قرار نے بھلے ساری باتیں بھلا دی ہوں، پر نجیب خان کو دوست سے بہت گلہ تھا، قرار نے گھر میں جب سامیہ

سے شادی کی بات اٹھائی تو وہ بیٹے سے بہت ناراض ہوئے مگر اس نے ساری بات اپنے اوپر لے لی۔

علی اصغر حالات سے لڑتے لڑتے ایسا نڈھال ہوئے کہ ایک دن ایسا سوئے کہ دوبارہ نہ اٹھ سکے۔ حسان بھی مزید پڑھائی کے لیے یوکے چلا گیا۔ بعد میں مائرہ سے شادی کرکے وہیں سیٹل ہوگیا۔ اس کی بیوی بہت اچھی لڑکی تھی۔ اس نے حسان کو پیاری سی بیٹی اور ایک بیٹا دے کر فیملی مکمل کردی۔ وہ دونوں خوش وخرم زندگی گزار رہے تھے۔ سب اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف ہوگئے۔

صرف تنہائیاں رافعہ کا مقدر ٹھہریں، وقت کی الٹی گنتی شروع ہوگئی۔ تقدیر نے اپنے ترکش کے تیر ایک ایک کرکے چلانا شروع کردیے، اب زخم کھانے کی باری اس کی تھی۔ چہرے پر ایسی الرجی پھیلی کہ رنگت جھلس گئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے جسم نے بھی پھیلنا شروع کردیا، وہ اپنی عمر سے کہیں بڑی لگنے لگی۔ اب تو لوگ آتے اور اسے دیکھ کر انکار کرجاتے، ثمینہ بیٹی کی حالت زار پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتی مگر کیا فائدہ۔ جس وقت ان کو روکنا تھا روکا نہیں اب ان کے اختیار میں کچھ نہیں رہا۔

☆☆☆

''ارے آسیہ خالہ۔ آپ کا کیا خیال ہے، میں ان آنٹی سے شادی کروں گا، معاف کردیں، ابھی مجھ پر اتنا برا وقت نہیں آیا ہے۔''

دراز قد، خوش شکل قدرے عمر چور امریکا پلٹ مراد نے چائے پیش کرتی، رافعہ کو بغور سر سے پاؤں تک جانچا اور بغیر کسی جھجک کے سفاکانہ تبصرہ کیا، ویسے بھی وہ جس سرد ملک سے آیا تھا، وہاں ''صاف گو'' ہونا انسانی خوبی میں شمار ہوتا تھا، چاہے یہ صاف گوئی کسی کی جان بھی لے لے۔

رشتے والی خالہ منہ دیکھتی رہ گئیں مگر وہ دونوں بہن بھائی اچھی خاصی بے عزتی کرنے پر تل گئے۔

''بھیا، تم دونوں نے ہی تو پڑھی لکھی لڑکی کی خواہش کی تھی۔'' آسیہ خالہ کو ان کا انداز گفتگو بہت ناگوار گزرا۔ اس لیے کمر پر ہاتھ جما کر بولیں۔

''جی کہا تھا مگر ہمیں پڑھی لکھی کم عمر، خوبصورت لڑکی چاہیے، کیا پوری بات آپ نے نہیں سنی تھی؟'' مراد نے منہ بنا کر طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''اے لو بیٹا، تم خود کون سے کم عمر ہو۔ کیا میں جانتی نہیں ہوں؟ برسوں سے تمہارے گھر میرا آنا جانا ہے۔ اسی لیے تو مجھے رافعہ تمہارے جوڑ کی لگی۔ اتنی نیک بچی ہے، پھر تمہیں شادی کرکے واپس جانے کی بھی جلدی ہے۔ اب جیسی تمہاری پسند ہے۔ اتنی ساری خصوصیت ایک لڑکی میں تو ہونا مشکل ہے، تم ایسا کرو ایک سانچہ خرید کر خود ہی ایسی لڑکی ڈھال لو'' آسیہ خالہ نے چشمے میں سے گھورا اور دونوں بہن بھائی کو کھری کھری سنائیں۔

وہ خود دو بیٹیوں کی ماں تھیں۔ رافعہ بھی ایک لڑکی تھی۔ اس کی تذلیل پر ان کا دل دکھ کر رہ گیا۔

سامنے بیٹھی رافعہ ان لوگوں کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ کھو سی گئی۔ ماضی کی بازگشت اسے اذیت دینے لگیں۔ بیچ میں سات سال حائل ہوگئے۔ اتنی جلدی وقت گزرتا گیا اور سب کچھ بدل گیا۔ خاموش سر جھکائے لاتعلق بیٹھی ان سب کے بیچ میں ہوتے ہوئے بھی غائب ہوگئی۔ جیسے یہاں اس کی نہیں کسی اور لڑکی کی بات کی جارہی ہو۔

''بیٹا۔ آپ کو یوں ہمارے گھر میں بیٹھ کر ایسی باتیں کرنے کا کوئی حق نہیں۔'' ثمینہ نے چہرے پر آئے پسینے کو صاف کرتے ہوئے تھوڑا سختی سے کہا۔

''سوری آنٹی مگر یہ آسیہ خالہ کا قصور ہے۔ انہوں نے تو آپ کی بیٹی کی تعریف میں زمین وآسمان ایک کردیے تھے۔'' سنبل نے ڈھٹائی سے کہا۔

''اے۔ چلو یہاں سے جاؤ۔ ایسے لچھن رہے تو ہوچکی تمہارے بھائی کی شادی۔'' آسیہ خالہ بھی انہیں آئینہ دکھانے پر تل گئیں۔

''یہ لوگ کیا سمجھیں گے؟ ہر انسان ٹھوکر کھا کر پہلے سنبھلتا پھر سمجھتا ہے۔'' رافعہ نے ان دونوں کی طرف دیکھ کر دل میں خود کا محاسبہ کیا۔

''چلو مراد چلیں، ویسے خالہ۔ میں اپنے بھائی کے لیے پڑھی لکھی، کم عمر اور خوبصورت لڑکی ڈھونڈ کے دکھاؤں گی، جب پیسا پاس ہو۔ تو ہر کام آسان ہوجاتا ہے۔'' سنبل نے منہ بگاڑ کر کہا۔

''میرا بھائی تو اتنا ہینڈسم ہے۔ اسے کسی بات کی کمی نہیں۔ یہ رشتہ کروانے والیاں بھی خوب ہوتی ہیں۔ اپنی فیس کے چکر میں سامنے والے کا معیار بھی نہیں دیکھتیں۔'' سنبل بڑبڑ کرتی بغیر کچھ کھائے پیئے بھائی کو بازو سے پکڑ کر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

''میرے مالک۔ اب علی اصغر کے خاندان پر ایسا برا وقت بھی آنا تھا۔'' ثمینہ نے ہاتھ ملتے ہوئے دکھ سے مرحوم

شوہر کو یاد کیا۔

ٹرالی میں رکھے، کباب، کیک بسکٹ اور پیسٹری ان چھوئے اداس پڑے تھے، مہمانوں کی تواضع کا شرف حاصل نہ کرسکے۔ کرسٹل کے گلاسوں میں موجود کولڈ ڈرنک کی برف اس طرح گھلی، جیسے رافعہ کئی برسوں سے غم سے گھل رہی تھی۔ کمرے میں موت کا سا سناٹا چھا گیا۔ ثمینہ تو ایسی ہو گئی کہ کاٹو تو بدن میں خون نہیں، آسیہ الگ فق چہرہ لیے صوفے پر بیٹھی۔ ان ماں بیٹی کو تسلی دینے کے الفاظ ڈھونڈنے میں ناکام رہی۔

رافعہ سب سے بے نیاز اپنی ہاتھوں کی لکیروں میں قسمت کو ڈھونڈنے لگی جسے اس نے خود سے بگاڑا۔ اسے مراد کی بہن کے لہجے میں چھائی نخوت ماضی کی یاد دلا گئی۔ رافعہ کا طرزِ تکلم لڑکے والوں کے ساتھ اس سے بھی زیادہ خراب ہوتا تھا۔ اسے اور بھی بہت کچھ یاد آنے لگا۔

رافعہ چھوٹی بہن کو جب بھی کسی خاندانی تقریب میں قرار کے پہلو میں خوش و خرم کھڑا دیکھتی تو اس کے دل کو کچھ ہونے لگتا۔ سامیہ پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو گئی تھی اور قرار بھی ہینڈسم لگتا۔ رافعہ نادانی میں قسمت کو شکست دینے چلی اور خود اپنی زندگی برباد کر بیٹھی۔ کتنے دلوں کو دکھایا، تنہائی میں اپنا احتساب کیا تو خود سے نفرت محسوس ہوئی کہ قرار کو انکار کر کے اپنی قسمت پر تالا لگا دیا۔

☆☆☆

رافعہ کا مزاج وقت کی ٹھوکروں نے بدل کر رکھ دیا، باپ کی موت کا بھی اثر ہوا۔ تنک مزاجی کی جگہ انکساری نے لے لی، وہ بدل گئی۔ پر لوگوں کی سوچ تو نہیں بدلی۔ انسان کی ظاہری شخصیت اور خوبصورتی کے شیدائی۔ آتے، اسے دیکھتے، کھاتے پیتے اور انکار کر کے چلے جاتے۔

اس بار رشتے والی خالہ آئیں تو ان کے بتائے ہوئے رشتے پر ثمینہ رو دی۔ دل پر پتھر رکھ کر سوچنے کا وقت مانگا۔

''خالد ایک اچھا لڑکا ہے۔ بیوی کا دو سال پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ اپنے بیٹے کے لیے اسے ماں کی ضرورت ہے۔ ان لوگوں کو جلدی ہے، بقرعید کے بعد شادی کرنی ہے مجھے یقین ہے جو کچھ گزر چکا ہے، اس کے بعد تم انکار نہیں کرو گی۔'' بیمار ثمینہ نے بستر پر لیٹی رافعہ کا ہاتھ تھام کر التجائیہ انداز میں پوچھا۔

''امی، آپ کو جو بہتر لگے وہ کریں۔'' رافعہ کا سر اقرار میں جھک گیا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر باہر نکل گئی

''شاید سب کچھ ایسا ہی ہونا لکھا ہو۔ میری ضد اور غلط فیصلوں نے دہکتے انگاروں سے میرا دامن بھر دیا۔ اب شکوہ کروں بھی تو کس سے؟'' وہ آسمان پر ٹنکے تاروں کی برات کو دیکھتے دیکھتے رو دی۔ ثمینہ سونے کی تیاری میں مصروف تھی، بیٹی کے دل کا حال جان گئیں۔ کبھی تو وہ بیٹی کی نافرمانی پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتی پھرتیں۔ آج انہیں رافعہ کی فرمانبرداری نے رلا دیا۔

''حسان تو بڑی بہن کا نام سننے کو تیار نہ تھا تو اس کی بیوی سے کیا اُمید رکھی جا سکتی تھی مگر سامیہ ضرور بہن کو معاف کر دے گی۔'' انہوں نے رات دیر تک سوچا۔ صبح اٹھ کر سب سے پہلے قرار کے موبائل پر کال ملائی۔ پہلے داماد سے کچھ باتیں کیں۔ اس کے بعد سامیہ کو فون پر بلوایا۔

''بیٹی۔ انسان دشمن کو بھی معاف کر دیتا ہے، وہ تو تمہاری بہن ہے۔'' انہوں نے روتے ہوئے کہا اور دل کا بوجھ ہلکا کرتی چلی گئیں۔

''امی۔ ابھی کسی رشتے کے لیے ہاں یا نہ نہیں۔ کہیے گا۔ میں اگلے ہفتے آپ کے گھر رہنے آؤں گی۔ پھر تفصیل سے بات ہو گی۔ ویسے آپ دونوں کے لیے ایک سرپرائز بھی لے کر آؤں گی۔'' سامیہ نے جیسے ان کے جسم میں توانائی بھر دی۔

انہوں نے رافعہ سے ساری باتیں چھپائیں اور خوشی خوشی چھوٹی بیٹی کے استقبال کی تیاریوں میں لگ گئیں۔

''کتنے سالوں بعد سامیہ عید قرباں پر آ رہی ہے۔'' انہوں نے کلینڈر پر نشان لگاتے ہوئے سوچا، وہ بیٹی کے آنے کے دن گن رہی تھیں۔

☆☆☆

''میری ضد نے اس گھر کو کیسا سونا کر دیا ہے، کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہا، ورنہ یہاں کتنی ہلچل مچی ہوتی تھی۔'' رافعہ نے بستر پر لیٹے لیٹے پورے گھر پر ایک نگاہ ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں ماضی کے مناظر گھومنے لگے اور کانوں میں آوازیں۔

''ثمینہ بھئی۔ آج تو دال کے پکوڑے ہونے چاہیے۔'' علی اصغر شام کی چائے پر بیوی سے فرمائش کرتے۔

''امی پلیز۔ میرا دودھ کا گلاس فریج میں رکھ دیا کریں۔ یہ اتنا گرم ہے کہ ٹھنڈا ہونے میں ہی سال لگ جائے گا'' حسان جم سے آنے کے بعد ماں کو ہدایت دیتا۔

''کیا مصیبت ہے۔ میں اتنے آئلی سموسے نہیں کھاتی، اسے تل کر پیپر پر کیوں نہیں نکالا۔'' اسے اپنا نخوت بھرا لہجہ اور

انداز یاد آیا۔
"ٹھک۔ٹھک" وہ ایک دم چونکی، چپل پاؤں میں اڑس کر باہر بھاگی۔کوئی بہت زور سے دروازہ بجائے جا رہا تھا۔
بیل ایک ہفتے سے خراب پڑی تھی مگر گھر میں مرد نہ ہونے کی وجہ سے ان کے مرمت کے کام یوں ہی ادھورے پڑے رہ جاتے۔
"امی، امی کہاں ہیں؟ جلدی باہر آئیں۔" رافعہ کو اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آیا۔
"اوہو۔کیا ہو گیا، کیوں چیخ رہی ہو۔" ثمینہ گھبرا کر باہر نکلی تو صحن میں قرار، سامیہ، اس کے دو بچوں، کے ساتھ حسان اور اس کی بیوی بچوں کو دیکھ کر خوشی سے جھوم اٹھیں۔ پورے گھر پر شادمانی سی چھا گئی۔
☆☆☆
"بیٹا۔خالد کے رشتے کا کیا کروں؟" ثمینہ نے چھوٹی بیٹی کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے پوچھا۔وہ دونوں سستی سے ایک ہی جگہ لیٹی تھیں۔
"امی، ابھی رک جائیں۔ایک اور اچھا رشتہ ہے میری نگاہ میں پر بجو نے جو اپنا حال بنا لیا ہے۔ پہلے اسے تو درست کر دوں۔" سامیہ نے ماں کو نرمی سے جواب دیا اور فون اٹھا کر اپنے پارلر سے ٹائم لیا۔
"امی کیا سوچ رہی ہیں۔" وہ فون سے فارغ ہوئی تو ماں کو سوچوں میں گم پا کر پیار سے پوچھا۔
"حسان کی بیوی مائرہ اچھے مزاج اور کھلے دل کی ہے، سب کو زبردستی عید کی شاپنگ کے لیے اپنے ساتھ مارکیٹ لے گئی ہے۔" انہوں نے مسکرا کر اعتراف کیا۔
"یہ بات تو ٹھیک ہے۔ہم دونوں کی تو بہت بات چیت ہوتی ہے۔" سامیہ نے کھلکھلا کر کہا۔
"بس بیٹا۔تم سب کو خوش دیکھ کر میں اپنے اللہ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔ایک رافعہ کا بھی کچھ ہو جائے تو میں چین سے مروں۔"
"امی پلیز۔اللہ آپ کا سایہ ہم سب پر سدا سلامت رکھے۔" سامیہ نے دہل کر ماں کو دیکھا۔
"بیٹا ایسا تو ہونا ہی ہے۔خیر رافعہ اب بہت بدل گئی ہے۔اس میں پہلی سی کوئی بات ہی نہیں رہی، شاید اندر کی ملامت اسے چین لینے نہیں دیتی۔اس کو ناخوش دیکھ کر مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔" ثمینہ چھوٹی بیٹی کے آگے اپنے دل کے در در پرت در پرت کھولتی گئیں۔
"بجو کی اتری شکل دیکھ کر مجھے بھی ایسے ہی لگتا ہے۔" سامیہ نے ماں کے پاؤں دباتے ہوئے سر ہلایا۔
"ایک بات پوچھوں؟" ثمینہ تھوڑا جھجک کر بولیں اور پاؤں سمیٹ لیے۔
"آپ قرار کے بارے میں بات کرنا چاہ رہی ہیں؟" سامیہ نے ماں کی سوچ پڑھ لی۔
"ہاں۔وہ خود بھی یہاں آ کر ایک دن رہ کر گیا اور تمہیں بھی اتنے دنوں کے لیے چھوڑ گیا، وہ اس کی شرط؟" ثمینہ نے تجسس سے پوچھا۔
"میں نے قرار کو کئی بار سمجھایا کہ جو ہونا تھا ہو چکا۔آپ سب کچھ بھلا کیوں نہیں دیتے؟" سامیہ نے ٹھنڈی آہ بھری۔
"اچھا پھر؟" ثمینہ کی مکمل توجہ بیٹی کی جانب ہوئی۔
"ان پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا مگر ایک دن فریحہ نے منہ کھول کر باپ کو طعنہ دیا کہ میری ساری فرینڈز۔اپنی ویکیشنز پر نانی کے گھر جاتی ہیں۔ہم کیوں نہیں جاتے، گھر کے دوسرے بچے عید بقر عید پر نانی خالہ سے عیدی مانگتے ہیں؟ آپ ہمیں کیوں نہیں جانے دیتے؟" علی اصغر کی بیٹی کا دکھ شاید ان کے لیے اتنا بڑا نہ تھا جتنا قرار کو اپنی بیٹی کی بات سن کر دھچکا لگا۔
"میرا بچہ کیوں فکر کرتی ہو۔اس بار ہم بھی آپ کی نانی کے یہاں بقر عید کے مزے کرنے کے ساتھ ایک بار بی کیو پارٹی ارینج کریں گے۔" قرار نے بچوں کے ساتھ پلاننگ کی۔
"چلو جو بھی ہو تمہیں یہاں آ کر رہنے کی اجازت تو ملی۔" ثمینہ نے خوشی کا اظہار کیا۔
"جی امی۔مرد اپنی بیوی کو تو نفسیاتی مریض بنا سکتا ہے، پر اپنی اولاد کی نفسیات میں کوئی کجی دیکھنے کا قائل نہیں ہوتا۔" سامیہ کے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ رینگ گئی۔
☆☆☆
عید قرباں کی رات کی اپنی چہل پہل تھی، بچے بکروں اور دنبوں سے کھیل کر محظوظ ہو رہے تھے۔سامیہ، مائرہ اور رافعہ جلدی جلدی کچن کے کام نمٹا رہی تھیں۔تاکہ مہندی لگوانے اور چوڑیاں پہننے بازار جا سکیں۔حسان نے بڑی خوشی سے استری کی ذمہ داری اٹھائی اور وہ اپنے اور سارے بچوں کے کپڑے استری کر کر کے ہینگ کرنے لگا۔وہ ہفتہ بھر قبل دو بکرے اور ایک دنبہ خرید کر لایا، سارے بچے ان کی خدمت میں مصروف رہتے، چارا کھلایا جاتا، سینگ پر گلابی

رنگ کیا اور گلے میں ہار بھی پہنایا گیا۔
"رافعہ ابھی سے پیاز کاٹ کر رکھ دینا تا کہ صبح کلیجی بنانے میں مشکل پیش نہ آئے۔" ثمینہ جو عشاء کی نماز میں مشغول تھیں دعا مانگتے ہی حسان کو بلا کر دم کیا پھر کچن کی جانب منہ کر کے بولیں۔
"جی امی۔" اس نے مسالہ پیستے ہوئے جواب دیا۔
"اچھا۔ میوہ بھگو دیا۔ شیر خرمہ بھی بنے گا۔" ان کے لہجے میں اطمینان اور خوشی کی بوچھاڑ تھی۔
"امی، میں ان تینوں کو کچن سے نکالتا ہوں۔ ایسا کریں آپ وہاں جا کر خود کر لیں سارے کام۔" حسان جو بہت دیر سے ماں کی پریشانی دیکھ رہا تھا شرارتی ہوا۔
"کیا کروں۔ میرے بچے اتنے سالوں بعد نگاہوں کے سامنے جمع ہوئے ہیں۔ دل چاہ رہا ہے دنیا بھر کی خوشیاں ایک جگہ جمع کر دوں۔ ان لمحوں کو ترس گئی تھی۔" ثمینہ کی آنکھوں میں خوشی کے موتی چمکے۔ حسان نے دل ہی دل میں خود کو ملامت کی۔ ایک ضد کے پیچھے کتنے سال ایسی خالص محبتوں سے دور رہا۔
"فکر نہ کریں۔ آپ کی بہو اور پوتا پوتی یہاں آ کر اتنے خوش ہیں کہ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہر سال عید میں یا پھر بقر عید میں پاکستان کا چکر لگائیں گے۔" اس نے ماں کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

☆☆☆

"شکر ہے میرے مالک۔ آج کتنے دنوں بعد یہاں بھی خوشیوں کا سماں بندھا۔" ثمینہ نے نواسے، نواسی، پوتے اور پوتی کو گلے لگانے کے بعد ان کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔
"امی۔ ہمیں بھی پردیس میں عید۔ عید نہیں لگتی تھی۔ روکھی پھیکی سی۔ میں آپ سب کو اس دن بہت مس کرتا تھا۔" سفید کرتہ شلوار میں ملبوس حسان ماں سے لپٹ گیا تو سب کی آنکھ بھر آئی۔
"دادی امی۔ یہ ریڈ کلر۔ کتنا اچھا لگ رہا ہے نا۔" تانیہ نے اپنی سرخ ہتھیلی پر بنے بیل بوٹے دکھائے تو ثمینہ نے اس کے چھوٹے چھوٹے گلابی ہاتھ چوم لیے، جس پر مہندی کے بیل بوٹے کھل رہے تھے۔
حسان باہر نکل گیا، اسے قسائیوں کے ساتھ کھڑے ہو کر قربانی کروانی تھی۔
"چلیں۔ ناشتا لگا دیا ہے۔" رافعہ نے اعلان کیا تو سب۔ خوش دلی سے مسکرا کر ڈائننگ روم کی جانب بڑھ گئے۔
"بھئی واہ بجو مزہ آ گیا۔" مائرہ نے اپنے بیٹے کو گود میں اٹھا کر بجی ٹیبل دیکھتے ہوئے کہا۔
رافعہ نے ناشتے میں کچھ زیادہ ہی اہتمام کیا تھا۔ ٹیبل پر، کچوری، مٹھائی، نمکو، کباب،، شیر خورمہ سجے ہوئے تھے۔
ان سب نے ہلہ بولنا چاہا۔ اپنے بچوں کو ایک جگہ جمع ہنستا مسکراتا دیکھ کر ثمینہ کا سیروں خون بڑھ گیا۔ ان کی زندگی میں کتنے سالوں بعد ایسا مسرتوں سے لبریز تہوار آیا تھا۔

☆☆☆

"ایک منٹ۔ سب وہیں رک جاؤ۔ کوئی بھی شیر خرمہ کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔" حسان سب کو وارننگ دیتا ہوا اندر داخل ہوا۔
"اللہ۔ خیر کیا ہو گیا؟" ثمینہ نے گھبرا کر پوچھا۔
"حضرات پہلے فریڈ سے ملیں۔" حسان کسی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ مائرہ بڑھ کر فریڈ کے گلے لگ گئی۔
"توبہ۔ یہ کس انگریز کو لیے چلے آ رہے ہو۔" ثمینہ نے جلدی سے سر پر دوپٹا رکھ کر بیٹے کو جھاڑا۔
"مائرہ۔" وہ بڑبڑائیں۔ انہیں بہو کی حرکت بھی ناگوار گزری۔
"اسلام علیکم آنٹی۔ میں الحمدللہ مسلمان ہوں۔ مائرہ کا بڑا بھائی ہوں۔" اس انگریز کے منہ سے اتنی صاف اردو سن کر رافعہ چونک اٹھی۔
"امی۔ یہ میرے بڑے اور اکلوتے سالے ہیں۔ انہیں ہم نے مدعو کیا ہے۔ کیوں سامیہ؟" حسان کی شوخی عروج پر تھی۔ سامیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ رافعہ نے بھائی کے ساتھ کھڑے انگریز کو دیکھا، نیلے کرتے شلوار میں گورا چٹا، نیلی آنکھوں والا لمبا چوڑا فریڈ بہت ہینڈسم دکھائی دے رہا تھا۔
"ایں۔ اچھا۔ اچھا آؤ بیٹھو۔" وہ پل بھر کے لیے اپنی بدگمانی پر شرمندہ ہوئیں پھر مہمان نوازی دکھائی۔
"چلو۔ بیٹا۔ ناشتا شروع کرتے ہیں۔" ثمینہ نے پلیٹ اس کے سامنے رکھی، سب نے ایک ساتھ کھانے پینے کی چیزوں پر دھاوا بولا۔
"یہ گرم کباب لے لیجیے" رافعہ نے مہمان نوازی دکھائی۔ ایسا لگ رہا تھا کھانے والوں میں مقابلہ جاری ہے۔
"شکریہ۔ آپ لوگ بھی آ جائیں۔" اس نے رافعہ کا بغور جائزہ لیتے ہوئے بے تکلفی سے جواب دیا۔
یہ اتفاق تھا یا سامیہ کی شرارت کہ رافعہ نے بھی نیلے رنگ

کا اسٹاکش سوٹ پہنا تھا۔اس نے بہن کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے وزن میں کمی کی تھی۔اسکن کا علاج کروانے سے چہرہ بھی کسی حد تک صاف ہوگیا تھا۔وہ پہلے جیسی تو نہیں مگر بہت پیاری لگ رہی تھی۔رافعہ نے محسوس کیا کہ وہ جہاں جہاں جاتی فریڈ کی نگاہیں اس کا پیچھا کرنے لگ جاتیں، بہت سالوں بعد۔اس کا دل ایک نئی لے پر ناچ اٹھا۔

☆☆☆

''بجو۔مجھے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' حسان نے اسے لان میں تنہا بیٹھا دیکھا تو خود بھی پاس بیٹھ گیا۔

''ہاں کہو۔کیا بات ہے؟'' رافعہ نے نرمی سے جواب دیا۔

''آپ۔بہت اچھی ہوگئی ہو۔'' وہ محبت سے بہن کا ہاتھ تھام کر کہنے لگا۔آج کی رافعہ میں کل کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔''

''پگلے۔یہ ضروری بات کہنی تھی۔'' اس نے حسان کے بالوں کو شرارت سے مٹھی میں جکڑا، وہ ہنس پڑا۔

''نہیں۔ایک اور بات سنیں۔فریڈ بھائی کا لندن میں کافی اچھا بزنس ہے۔دیکھنے میں بھی بہت ہینڈسم ہیں۔اور۔اور۔'' اس نے سسپنس پھیلایا۔

''اور کیا؟'' رافعہ کا دل ڈگمگایا۔

''اور۔وہ آپ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔'' حسان نے بم پھوڑا۔وہ ایک ٹک دیکھتی رہی پھر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔

''پہلے پوری بات سنیں۔پھر ہاں یا نہ کریئے گا۔'' حسان نے ہاتھ اٹھا کر اسے چپ کروایا۔

''مائرہ کی تین بہنیں اور ہیں۔سب شادی شدہ ہیں۔برسوں قبل ان کے والدین میں علیحدگی ہوگئی۔وہی پرانی کہانی۔انکل حیدر نے ایک انگریز سے شادی کی تھی۔وہ اسے بہت چاہتے تھے مگر ان کی مما جیسی آزادی پسند نکلی۔پاکستانی شوہر کو بہت عرصے برداشت نہ کر سکیں۔کورٹ سے ڈائیورس لے لی۔اس کے بعد انکل کا دل دنیا سے اچاٹ ہوگیا، وہ بچوں کی بھی پروا نہیں کرتے۔ایسے میں فرید بھائی جنھیں اب وہاں سب فریڈ کے نام سے پکارتے ہیں بہنوں کو سنبھالا۔مغربی ملک میں رہنے کے باوجود ان کے اندر ہماری جیسی غیرت وحمیت ہے۔عزت سے بہنوں کی شادی کرنے میں ان کی زندگی کے کئی سنہری سال بیت گئے۔حالاں کہ یہ ابھی بھی شہزادوں سے کم نہیں۔وہاں کئی لڑکیاں ان پر مرتی ہیں مگر ماں کی وجہ سے ان کا دل مغربی عورتوں کی طرف مائل نہیں ہوتا۔یہ کسی مشرقی لڑکی کو جیون ساتھی بنانا چاہتے ہیں۔میں نے مائرہ سے آپ کا ذکر کیا۔وہ راضی ہوگئی، یہاں آئی تو اسے آپ فرید بھائی کے لیے مناسب لگیں۔اس نے بھائی کو بلوالیا۔پہلے وہ سامیہ سے ملے تو خوش ہوگئے۔سامیہ کو بھی وہ کافی اچھے لگے۔ہم دونوں نے پلاننگ کی اور کل کی دعوت آپ دونوں کو ملوانے کی ایک کڑی تھی۔ہمارا منصوبہ کامیاب رہا۔ان کو آپ بہت پسند آئیں۔اب وہ جلد از جلد شادی کرنا چاہتے ہیں۔آپ کے پاس صرف دو منٹ ہیں۔جلدی سے فیصلہ کریں۔'' حسان کا بولتے بولتے حلق خشک ہوگیا۔آخر میں شرارت سے بولا۔رافعہ بھائی کی باتوں کو غور سے سنتے ہوئے، اس کا روم روم کانپ اٹھا۔

''میں کیا کہوں؟ جیسی تم لوگوں کی مرضی۔'' اس نے بھائی کے سامنے سر جھکا کر کہا تو وہ خوش ہوگیا، اٹھ کر بہن کا ماتھا چوما۔

''سامیہ کے لیے تو نہیں۔پر میں نے اپنی بجو کے لیے واقعی ایک۔شہزادہ ڈھونڈ نکالا ہے'' وہ شوخی پر آمادہ ہوا اور ماضی کی بات یاد دلائی۔

رافعہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ہنسے یا روئے، حسان نے بہن کو کانپتے دیکھا تو اپنے ساتھ لگالیا، دونوں بھائی بہن رودیے ... مگر اس بار آنکھ سے نکلنے والے آنسو خوشی کے تھے۔

☆☆☆

''چلو۔سیٹ بیلٹ باندھو۔پلین لینڈنگ کرنے والا ہے''۔فرید، نے اس کا ہاتھ دبایا تو وہ ماضی کے سفر سے لوٹ آئی۔

''آپ۔اٹھ گئے۔'' وہ چونک کر شوہر سے مخاطب ہوئی۔

''ہم تو کافی پہلے جاگ گئے تھے مگر آپ سوتی رہ گئیں۔'' فرید کا لہجہ اس کی محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔

''جی۔شکر ہے۔خوابِ غفلت سے جاگ اٹھیں ہوں۔'' رافعہ نے دل میں سوچا اور مسکرادی۔

وقت بڑا ستارہ گر ہے۔عام کو خاص بناتا ہے۔جیسے سونا، آگ میں تپ کر کندن بنتا ہے۔مصائب اور پریشانی کی بھٹی میں پکنے کے بعد ہی انسان مکمل ہوتا ہے۔رافعہ کی زندگی میں پھول کھل اٹھے۔اس کے نصیب میں بھی ایک شہزادہ لکھ دیا گیا تھا۔یہ اور بات ہے کہ اس تک پہنچنے کے لیے اسے بڑے ٹیڑھے میڑھے راستوں سے گزرنا پڑا۔ملن کی گھڑی مشکل ضرور، پر ممکن ہوئی۔

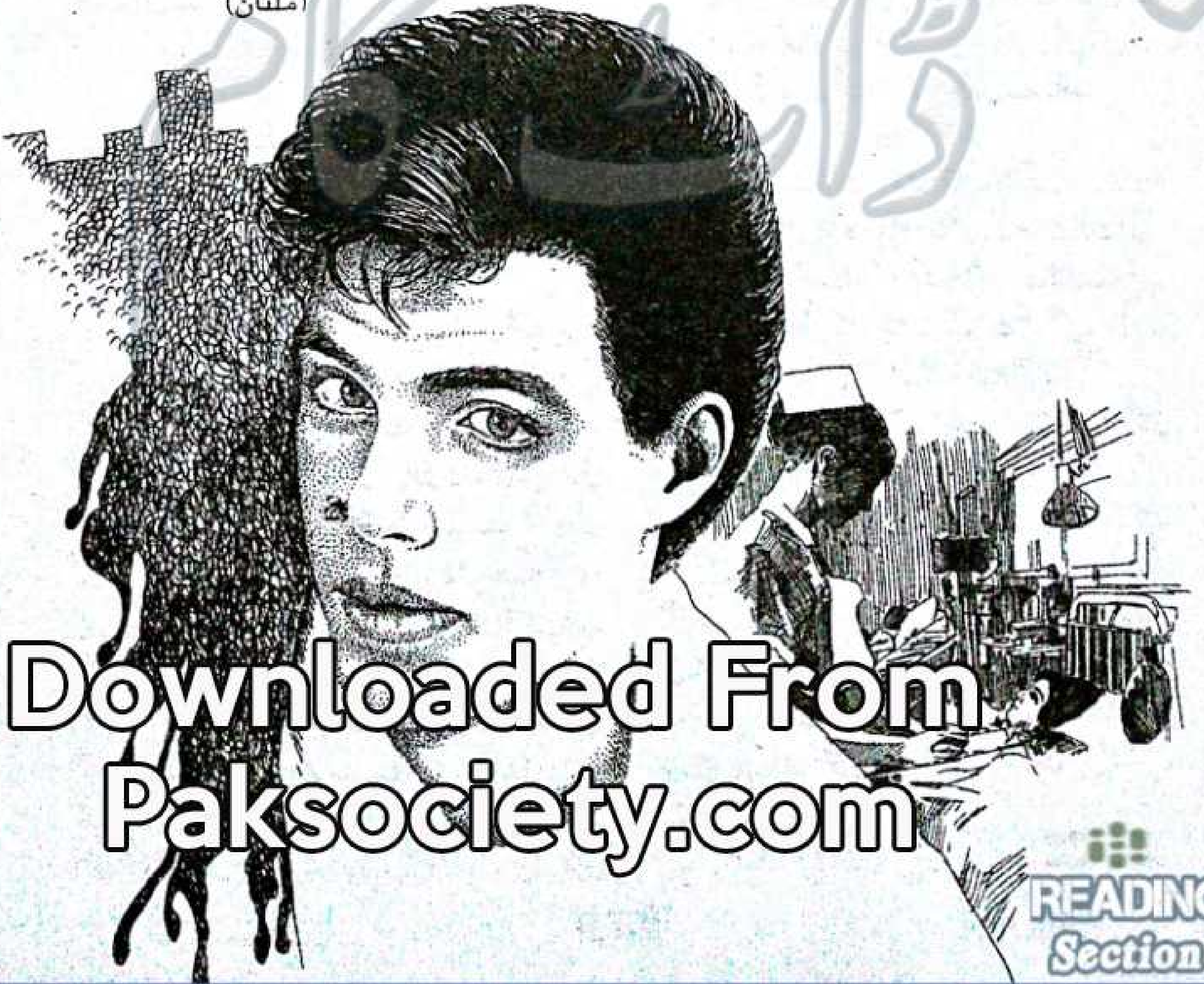
حقیقی مسیحا

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم
یہ سرگزشت میری اپنی ہے۔ صرف اس لیے بھیج رہا ہوں کہ آج کل مسیحائی کے نام پر ڈاکٹروں نے جو لوٹ مار مچا رکھی ہے اس پر بھی کچھ روشنی پڑ سکے۔

مجید احمد جائی
(ملتان)

گرمی جوبن پر تھی۔ سورج کے چڑھتے ہی چرند پرند اپنے اپنے ٹھکانوں میں دبک جاتے تھے۔ کہیں کوئی بندہ بشر بھی نظر نہ آتا۔ گلیاں سنسان تھیں۔ سڑکیں محلے میں ایسی خاموشی تھی جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ کوئی جب بیمار ہوتا ہے تو اسے نظروں میں رکھا جاتا ہے۔ یہ سوچ کر اس کا خیال رکھا جاتا ہے کہ نہ جانے کب اسے کسی چیز کی ضرورت پڑ جائے۔ اس کی جاب کو پورا کرنے کے لیے ہر کوئی ہمہ وقت تیار رہتا ہے مگر بیماری طول کھینچ جائے تو تیماردار بھی بےزار ہو جاتے ہیں۔ یہی میرے ساتھ ہوا تھا۔ اماں ابا کے نہ چاہنے کے باوجود دوسروں کے آرام کا خیال کر کے مجھے ڈیرے پر پہنچا دیا جاتا تھا تاکہ میری چیخ و پکار سے دوسرے لوگ ڈسٹرب نہ ہوں۔ اس وقت بھی میں حویلی کے باہر ڈیرے پر لگے کیکر کے گھنے درخت کے نیچے چارپائی پر پڑا درد سے تڑپ رہا تھا۔ رو رو کے میری ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ کوئی بھی تو نہیں تھا جو میری آواز سن پاتا۔ بھوک سے انتڑیاں اینٹھ رہی تھیں۔ پیاس سے حلق خشک تھا۔

درد سے میری چیخیں نکل رہی تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے میرا کوئی دشمن مجھے بجلی کے جھٹکے لگا رہا ہو۔ آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر



گالوں پر اپنے نشان چھوڑ چکے تھے۔ کپڑے پسینے اور آنسوؤں سے تر بتر تھے جیسے شریر بچے ابھی ابھی ٹیوب ویل سے نہا کر نکلے ہوں، انہی کی طرح میرے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔

میں درد کی کشتی میں سوار، آنسوؤں کے سمندر میں ہچکولے کھا رہا تھا کہ عین اسی لمحے موٹر سائیکل پر میرے چاچا اور اس کا دوست پٹواری آ گئے۔ میرے چچا کے لیے میرا رونا، چیخنا، چلانا فریاد کرنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ یہ سلسلہ تو پچھلے چار سال سے چل رہا تھا۔ روز کیپسول، گولیاں اور کڑوے شربتوں کے بڑے بڑے گلاس میرے اندر انڈیلے جاتے تھے۔ مگر مرض تھا کہ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ پیروں، فقیروں کے جادو ٹونے، منتر بھی آزمائے گئے تھے۔ کبھی تعویذ نکالے جاتے، کبھی پہنائے جاتے۔ کوئی دم کر کے چلا جاتا تھا تو کوئی میٹھی روٹی پڑھ کر دے جاتا تھا۔

حکیم، پیر، فقیر اپنے اپنے نسخے آزما رہے تھے۔ پاکستان کے تمام بڑے سرکاری، نیم سرکاری اسپتالوں کی ہوا کھا چکا تھا۔ نام نہاد پروفیسروں، ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا۔ سفید وردیوں میں من کے کالے یہ ڈاکٹر نوکریوں کے لیے منت سماجت، رشوت دیتے نظر آتے ہیں۔ جب نوکری ان کی چوکھٹ کی زینت بنتی ہے تب ان کی آنکھوں پر سیاہ پٹی بندھ جاتی ہے۔ احساس نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ ہوس پرستی غالب آ جاتی ہے۔ اپنے پیٹ بھرنے کے لیے غریبوں کے پیٹ چاک کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

ہزاروں مریض ان کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ کوئی رو رہا ہوتا ہے تو کوئی فریاد کر رہا ہوتا ہے۔ کوئی ہاتھ جوڑے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے واسطے دے رہا ہوتا ہے۔ کسی کی ماں اپنا زیور بیچ کر آئی ہوتی ہے تو کسی کی بیوی اپنا جہیز فروخت کر کے رقم لائی ہوتی ہے لیکن یہ منہ کے چٹے من کے کالے شیطانوں کو کون سمجھائے، جانوروں کی طرح انسانوں کو کاٹ رہے ہوتے ہیں۔ ضمیر رکھتے ہوئے بھی بے ضمیر بن جاتے ہیں۔ یہ سفید وردی میں مسیحا نہیں قسائی ہوتے ہیں جو بے دردی سے انسانوں کے گلے کاٹ رہے ہوتے۔ یہ مسیحا نہیں انسانوں کے روپ میں حیوان ہوتے ہیں۔ پاگل ہیں وہ جو ان کو مسیحا کا لقب دیتے ہیں۔ مسیحا ایسے ہوتے ہیں کیا؟

میں بتاتا ہوں حقیقی مسیحا کیسے ہوتے ہیں۔ وہ پٹواری اس حقیقی مسیحا کا دوست تھا۔ ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا جس کا نام تھا۔ اللہ تعالیٰ اسے ہر خوشی عطا کرے، جو میرے لیے وسیلہ بن کر آیا تھا۔ پٹواری نے میرے چچا سے پوچھا۔ یہ کس کا لخت جگر ہے۔ اس کا کوئی نہیں ہے کیا؟ اس کی یہ حالت......؟

میں جو سوکھ کر لکڑی بن چکا تھا۔ تن پر کپڑا ڈالنے، ہٹانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ پاس پڑے پانی کے جگ سے دو گھونٹ پانی نہیں لے سکتا تھا۔ بازو کندھوں کے ساتھ مل گئے تھے۔ جبڑے جڑ گئے تھے۔ رنگت زردی مائل ہو چکی تھی۔ ٹانگیں کولہوں کے ساتھ لگ رہی تھیں۔ دیکھنے والے یہی کہتے تھے آج مرا کل مرا۔ کیونکہ نشتر اسپتال والوں نے بھی لاعلاج قرار دے دیا تھا۔

میں وہ وقت اب تک نہیں بھولا ہوں۔ نشتر اسپتال کے جنرل وارڈ کے بستر پر پڑا میں درد سے کراہ رہا تھا کہ بڑے ڈاکٹر صاحب راؤنڈ پر آ گئے۔ میری کراہ گریہ و زاری نے انہیں متوجہ کر لیا۔ وہ میرے بیڈ کے قریب آئے مگر میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی ساتھ والے ڈاکٹر پر برس پڑے۔ ”یہ مریض یہاں کیوں ہے۔ اسے فوراً ڈسچارج کریں۔“

”مگر سر یہ بہت تکلیف میں ہے۔“ ڈیوٹی نرس نے کہا۔

”تو میں کیا کروں، اس کے بچنے کی اُمید زیرو پرسنٹ ہے۔ یہاں مرا تو اسپتال کے رجسٹر میں ایک نام کا اضافہ ہو گا۔ فوراً چلتا کرو۔“

اب خود سوچیں مریض کے سامنے نااُمیدی کی باتیں کی جائیں تو اس کے ذہن پر کیا اثر ہو گا؟ میں مزید حوصلہ ہار بیٹھا تھا اور موت کے آنے کا شدت سے منتظر تھا۔ گھر والے بھی اب بے زار بے زار سے رہنے لگے تھے۔

”یہ میرا بھتیجا ہے۔ چار سال سے بستر مرگ پر ہے۔ کوئی دوا سود مند نہیں ہوتی، کوئی دعا اثر نہیں کرتی، کوئی منتر نہیں چلتا۔ درجنوں خون کی بوتلیں اس کی رگوں میں جا چکی ہیں۔ مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ گھر کے جانور بک گئے۔ بوڑھے باپ کا چھابہ ختم ہو گیا۔ اب تو گھر کے برتن بکنے لگے ہیں۔“ میرے چچا نے جواب دیا۔

”میرے یار، رب تعالیٰ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں، اسے میرے دوست ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا کے پاس لے چلو۔ اُمید پہ دنیا قائم ہے۔ میرے رب نے چاہا تو ضرور صحت ملے گی۔ میرا دوست حکیم بھی ہے اور روحانی علاج بھی کرتا ہے۔ اسی مہربان کے پاس اسے لے چلو، میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“ پٹواری نے کہا۔

”نہیں میرے دوست، اب یہ زندگی کی آخری اسٹیج پر ہے۔ اس کا ٹھیک ہونا ناممکن ہے اور نہ ہی ہمارے پاس اب رقم ہے جو اس پہ لگا سکیں۔“ چچا نے دوٹوک کہہ دیا۔

"" ناامیدی کفر ہے۔میری مانو! اسے ایک بار صرف ایک بار ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا کے پاس لے چلو۔ آپ بے شک دوائی کے پیسے نہ دینا لیکن اُمید ہے اللہ تعالیٰ ضرور صحت دے گا۔"

پٹواری حساس دل والا تھا۔قسمت بدلتے دیر نہیں لگتی۔جہاں انسان کی سوچ ختم ہوتی ہے وہاں سے آگے رب رحمان کے جلوے شروع ہو جاتے ہیں۔رب تعالیٰ اپنے جلوے، اپنی رحمت کا خاص نزول فرماتا ہے۔

چچا مختیار بجھے دل کے ساتھ پٹواری کے ہمراہ مجھے گاڑی میں ڈال کر ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا کے کلینک کی طرف روانہ ہوئے۔شام، اپنی چادر زمین پر بچھانے والی تھی۔دن بھر کا تھکا ماندا سورج اپنی کرنیں سمیٹ کر آرام کے لیے مغرب کی گود میں سر ڈال چکا تھا۔غموں کا آہوں کا، مایوسیوں کا، ناامیدیوں کا یہ آخری سورج تھا جو اپنی تمام رعنائیوں کو لیے اپنی نگری میں جا چکا تھا۔کالی سیاہ رات کے بعد آنے والا سورج نئی زندگی، نئی اُمیدیں، نئی امنگیں لیے اپنی کرنیں بکھیرنے کے لیے بے تاب تھا۔

موٹر گاڑی مجھے لیے کھیتوں، باغوں، ندی نالوں کو پیچھے چھوڑتی منزل کی طرف گامزن تھی۔میں درد سے کراہ رہا تھا۔ایسا لگ رہا تھا جیسے زندگی کا دھاگا ٹوٹنے کو ہے۔موت اپنے پر پھیلائے نزدیک آ رہی ہو۔سوچوں کی یلغار تھی اور میں تھا۔چچا اور پٹواری اپنی باتوں میں محو تھے۔گھر سے تیس کلومیٹر دور بدھلہ سنت کی جانب چاہ رجب والا گاؤں ہے جہاں ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا کا کلینک تھا۔

ہماری گاڑی اپنی مسافرت مکمل کر چکی تھی۔رجب والا آ گیا تھا۔گاڑی پکی اینٹوں سے بنے مکان کے سامنے رک چکی تھی۔ مکان کے سامنے انگوروں کی بیلیں لگی ہوئی تھیں۔گلاب کے پھول لہلہا رہے تھے۔ساتھ ہی آموں کے درخت آموں سے لدے ہوئے جھوم رہے تھے۔آموں کے درختوں کے نیچے گائے اور بھینسیں بندھی ہوئی تھیں۔دوسری طرف کدو کی فصل تیار تھی۔کلینک کے دوسری طرف چند گھر تھے۔شاید یہ ڈاکٹر صاحب اور اس کی برادری والوں کے تھے۔خوبصورت نظارہ تھا۔مگر میں کیا کرتا۔جو موت کے سرہانے کھڑا ہو وہ ان نظاروں سے کیسے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔گاڑی کے دروازے کھل گئے۔مجھے چار مردوں نے کندھوں پر اٹھا لیا۔جیسے مرنے والے کے جنازے کو اٹھاتے ہیں۔میری آنکھیں تمام منظر اپنی میموری میں سیو کر رہی تھیں۔

کلینک کا دروازہ کھلا اور ہم اندر داخل ہوئے۔اندر کا ماحول دوائیوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔خوبصورت چھوٹا سا کلینک تھا جس کے در و دیوار مختلف پوسٹروں سے سجے ہوئے تھے۔بیماریوں سے آگاہی، ان کا تدارک، بچاؤ کے طریقے لکھے تھے۔ایک طرف ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا کی تمام اسناد آویزاں تھیں۔کلینک کے ایک کونے میں دوائیوں کے لیے الماری بنی ہوئی تھی۔جس میں دوائیاں سلیقے سے رکھی تھیں۔لیڈیز کے لیے پردے کا خاص انتظام تھا۔ایک طرف آنے والے مریضوں کے بیٹھنے کے لیے کرسیاں رکھی تھیں۔دو لڑکے ہیلپ کرنے پر معمور تھے جن کو ڈاکٹری زبان میں ڈسپنسر کہتے ہیں۔گھومنے والی کرسی پر سفید لٹھے میں ملبوس ایک خوبرو صحت مند، دل کش نین نقش والا بال سنوارے بُرجمان تھا۔

شام کا وقت تھا، کلینک پر مریضوں کا رش تھا۔حالانکہ کافی اندھیرا ہو گیا تھا۔نجانے دن بھر کیا سلسلہ رہا ہوگا۔

مجھے تو یہ دوسرے حکیموں، ڈاکٹروں جیسا لگا۔جن سے میں زخم کے مندمل کی دوائیاں لینے گیا تھا مگر جگر زخموں سے چھلنی چھلنی کروا کر لوٹا تھا۔اسی لیے میرے اندر نفرت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔میری نظریں حقارت سے اسے تکے جا رہی تھیں۔

مجھے دیکھتے ہی اس نے سبھی مریضوں کو باہر ویٹنگ روم میں بھیج دیا اور مجھے ساتھ پڑی ٹیبل پر لٹا دیا۔پھر حکم صادر کیا۔اس کے کپڑے اتارو۔میں مرض ور رہا تھا۔لیکن کبھی کے سامنے کپڑے اتارنا شرمندگی کا باعث تھا۔میں نے انکار کر دیا۔تبھی ڈاکٹر صاحب نے صرف قمیص اتارنے کو کہا۔میرے چچا نے میری قمیص اتار دی۔اندر سے چینٹیوں کا پہلوان نکل آیا۔ہڈیاں آسانی سے گنی جا سکتی تھیں۔پسلیوں کی شرارتیں بخوبی دیکھی جا سکتی تھیں۔کالی چمڑی ہڈیوں کے ساتھ چمٹ گئی تھی۔

ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا مجھے دیکھتے ہی پریشان سے ہو گئے۔مایوسی کے بادل ان کے چہرے کا طواف کرنے لگے۔"اُف! یہ حالت، یہ نوجوان تو موت کی گود میں بیٹھا ہے۔نبض پہ دائیں ہاتھ کی انگلیاں دبا کر خلاء میں گھورنے لگے۔چند ساعتیں یونہی گزر گئی تھیں۔پھر یکدم مخاطب ہوئے۔ اللہ بہتر کرے گا۔وہ بڑا کارساز ہے۔"ایک دم ان کے تاثرات ناامیدی سے اُمید میں بدل گئے۔جیسے رب تعالیٰ کی طرف سے پیغام مل گیا ہو۔جیسے کوئی الہام ہوا ہو۔

کہنے لگے۔" میں دوائی دے رہا ہوں۔اسے کھلاؤ۔اللہ تعالیٰ شفا دے گا۔"

گولیوں، کیپسول کڑوے شربتوں سے شاپر بھر دیا۔ساتھ ہی پندرہ پڑیاں بنا دیں۔ہر پوڑی میں دو ننھی ننھی گولیاں رکھی گئی تھیں۔کہنے لگے۔"ان میں سے ایک پوڑی تب لینی ہے جب درد اٹھنے لگے۔ورنہ ہو تو نہیں کھانی۔"

"جو حکم جناب کا۔" میرے چچا نے جواب دیا۔

انہوں نے ڈسپنسر کو آواز دی کہ پانی کا گلاس لاؤ۔

حکم ملتے ہی ڈسپنسر نے تعمیل کی۔اپنے ہاتھوں سے دو ننھی گولیاں پانی کے ساتھ میرے حلق سے بمشکل اتروائیں کیونکہ جبڑے ایک دوسرے کے ساتھ ایسے جڑے تھے جیسے ایلفی سے جوڑ دیئے گئے ہوں۔میں تو خوراک بھی مشروب کی صورت لیتا تھا۔

قدرت خدا کی دو ننھی گولیاں جسے میں حقیر سمجھ رہا تھا۔کام کر گئیں۔میرا خیال تھا کہ بڑی بڑی گولیاں کچھ نہ کر پائی تھیں یہ کیا کرتیں مگر یہ میری سوچ تھی،حقیقت کچھ اور تھی۔جہاں بڑے بڑے پروفیسر ناکام ہو گئے تھے۔ان کے بڑے بڑے کیپسول گولیاں کام نہ کر سکیں وہاں دو ننھی سی گولیاں بازی لے گئیں۔اسی لیے تو کہتے ہیں جہاں میں رب تعالیٰ نے کوئی چیز بے کار نہیں بنائی۔

وہ شام میرے لیے باعثِ مسرت تھی۔نجات کی رات تھی غموں سے،دکھوں سے،عذابِ مسلسل سے۔رب تعالیٰ نے میری امی جان،میرے عزیزوں کی دعائیں قبول کر لی تھیں۔وہ دعائیں قبول ہو رہی تھیں جو میری امی جان نے راتوں کو مصلے پر بیٹھ کر گڑگڑا کر مانگی تھیں۔میں نے اپنی گناہگار آنکھوں سے دیکھا تھا امی جان کی آنکھیں دعا مانگتے ہوئے بھیگ جاتی تھیں۔آنسوؤں کے سیلاب سے دامن بھیگ جاتا تھا۔ان رشتے داروں،عزیزوں،دوستوں کی دعائیں جن کو میں دل و جان سے عزیز تھا۔دوستوں کے علاوہ دشمن بھی مجھے دیکھتے تو دشمنی بھول کر میری زندگی کی دعائیں ضرور مانگتے تھے۔دوستوں،دشمنوں کی دعائیں رنگ لائی تھیں۔قبولیت ہو چکی تھی۔رب تعالیٰ نے انسانی روپ میں مسیحا بھیج دیا تھا۔حقیقی مسیحا۔

آپ یقین کریں یا نہ کریں ان دو گولیوں کے بعد میں نے آج تک درد کی گولیاں نہیں کھائیں اور نہ کھانے کی ضرورت پیش آئی۔باقی دوائی کھاتا رہا۔لیکن وہ چودہ پوڑیاں واپس کر دیں۔آنے والا سورج میرے لیے خوشیاں لیے کھڑا تھا۔وہ

جڑ

پودوں اور درختوں کا وہ حصہ جو زمین کے نیچے پھیلتا چلا گیا ہو۔جڑوں کی دو خاص قسمیں ہیں۔موسلی جڑ اور بیرونی جڑ۔شاخ در شاخ زمین پر پھیل جاتی ہے۔جو جڑیں ان کے علاوہ پودے کے کسی حصے سے نکل سکتی ہوں وہ بیرونی جڑیں کہلاتی ہیں۔جڑیں پودے کو زمین میں مضبوطی سے گاڑے رکھتی ہیں اور زمین سے غذا اور پانی جذب کرتی ہیں۔ان میں غذا کو جمع رکھنے کا خزانہ بھی ہوتا ہے بعض صورتوں میں انہی کی مدد سے پودے پانی میں تیرتے ہیں۔بعض پودوں مثلاً شیشم اور شہتوت کی جڑیں افزائشِ نسل کے کام آتی ہیں۔جڑ نہایت زود حس حصہ ہے۔پانی، روشنی اور کیمیائی اشیاء کسی بھی ٹھوس چیز سے ٹکرا جائے تو پودے کی بالیدگی پر اس کا برا اثر پڑتا ہے۔جڑ کی ایک خاص صفت یہ ہے کہ روشنی سے دور اندھیرے کی طرف بڑھتی ہے اور پانی کی طرف بھی رغبت رکھتی ہے۔اس کے راستے میں کوئی سخت چیز حائل ہو جائے تو اپنے آپ کو بچانے کے لیے راستہ بدل لیتی ہے۔

مرسلہ: اکبر جرجانی۔سبی

رات،میں نے سکون سے گزاری۔میں جو چار سال سے مسلسل درد سے تڑپ رہا تھا،چیخ رہا تھا۔آرام کی نیند سویا۔

میری امی جان نے بھی شکرانے کے نفل ادا کیے۔بڑی خوش تھیں،ڈاکٹر کو دعائیں دے رہی تھیں۔صبح ہوتے ہی محلے کے بچوں کو اکٹھا کیا اور مٹھائی اور ٹافیاں بانٹیں۔وہ رات ایسی گزری کہ جیسے کبھی کوئی تکلیف تھی ہی نہیں۔جو بھی آتا مجھے پُرسکون دیکھ کر رب تعالیٰ کے حضور شکر بجا لاتا۔سبھی کی خوشی دیدنی تھی۔اُمیدیں جاگ اٹھی تھیں۔میں موت کے منہ سے نکل کر زندگی کی طرف لوٹنے لگا تھا۔

ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا کے کہنے پر میں نے علاج جاری رکھا۔اخراجات کی سکت نہیں تھی۔لیکن اس حقیقی مسیحا نے کہہ دیا تھا۔"مجید!میں دوائی کے پیسے تب لوں گا جب تم خود کما کر مجھے دو گے۔ورنہ ایک روپیا تک مجھ پر حرام ہے۔اسے اُمید تھی یقین تھا کہ میں مکمل ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

دو سال مسلسل دوائی لیتا رہا۔مگر ایک روپیا تک نہیں دیا تھا۔دو سال بعد میرا جسم بھرا بھرا ہو گیا۔ہڈیوں پر گوشت چڑھ گیا۔رگوں میں خون گردش کرنے لگا۔میرا چہرہ،میرا جسم

دیکھنے کے لائق ہوگیا تھا۔ میرے بازوں، میری ٹانگیں آہستہ آہستہ سیدھی ہوتی گئیں۔ ان میں جان آگئی۔ تمام جسم حرکت میں آگیا۔ اب مجھے سہارے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میں اپنی مدد آپ کے تحت چلنے پھرنے لگا تھا۔ میرے جبڑے کھل گئے۔ روٹی چبانے لگا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے میں مریض سے تندرست نوجوان بن گیا۔

میری منگیتر صائمہ جسے لوگ کہتے تھے کہ مجید اب نہیں بچے گا، تم کہیں اور شادی کرلو۔ مگر وہ تھی کہ مجھ سے آس لگائے بیٹھی تھی۔ مجھے صحت کی طرف لوٹتا دیکھ کر اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سمارہی تھی۔ سہیلیوں کو پارٹیاں دے رہی تھی۔ قسمت کی دیوی نے اسے بھی بہت رُلایا تھا۔ پہلے ماں اسے چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے پاس چلی گئی تھی۔ ابھی ماں کی جدائی کے زخم ہرے تھے کہ باپ بھی دیارِ غیر میں جدائی کے آنسو دے گیا۔ سعودی عرب حج کرنے گئے تو زندہ پلٹ کر نہ آئے۔ جنت البقیع میں دفن ہوگئے۔ باقی بہن بھائی شادی شدہ تھے۔ کوئی خبر نہیں لیتا تھا۔ تنہائی اس کا مقدر بن گئی تھی۔ اسے اُمید تھی تو صرف اور صرف میرے سہارے کی، میرے سپنے دیکھتی تھی۔ میری منتظر تھی۔ جس کا سب کچھ میں ہی تھا۔ اس کی سوچوں کا محور، اس کی اُمیدوں کا صلہ، اس کا سہارا، اس کا ہم سفر، اس کی خوشیاں مجھ سے تھیں۔ بچپن سے میرا انتظار کررہی تھی۔ باپ کی لاج رکھنی تھی، ماں کی زبان پالنی تھی۔ ورنہ دُنیا میں مجھ سے حسین اور بھی تھے۔

دو سال ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا سے علاج جاری رہا۔ یہاں تک کہ میں تندرست وتوانا ہوگیا۔ دیکھنے والے یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ میں چار سال تو کیا ایک دن بھی بیمار ہوا تھا۔ میں صحت یاب ہوکر کام کرنے لگا۔ ہر ماہ تنخواہ جو بھی ملتی اس میں ایک حصہ ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا کو دے آتا۔ اسی طرح میں نے تمام رقم ادا کردی۔

دکھ سکھ زندگی کا حصہ ہوتے ہیں۔ ملنا بچھڑنا زندگی کا دستور ہے۔ جو روح زمین پر آئی اسے واپس بھی پلٹنا ہے۔ موت کا مزہ ہر جاندار نے چکھنا ہے۔ موت آکر ہی رہتی ہے۔ پیر، پیغمبر، شہنشاہ، امیروں، فقیروں سب کو مرنا ہے۔ سب کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ میں موت کے چنگل سے نکل آیا تھا اور بھرپور زندگی گزار رہا تھا کہ وہی موت ایک دن میرے ابو کو لے گئی۔

چوبیس اگست قیامت خیز دن تھا، صبح سویرے میں کام پر تھا کہ میری چھوٹی بہن نے کال کی کہ ابو کی طبیعت بہت خراب ہے، جلدی گھر آجاؤ۔ میں گھر نہ آیا بلکہ فوراً ابو کو اسپتال لانے کو کہا۔ بڑا بھائی ابو کو اسپتال چھوڑنے آرہا تھا اور میں رقم کا بندوبست کررہا تھا۔ کہتے ہیں اسپتال اور تھانے میں پیسا پانی کی طرح بہایا جاتا ہے۔ اسی لیے میں پیسوں کے بندوبست میں لگ گیا تھا اور ایک مہربان کی مہربانی سے مجھے بیس ہزار ادھار مل گئے۔ میں اسپتال پہنچ کر ابو کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد بھائی ابو کو لے کر آگئے۔ ابو کو ایڈمٹ کرایا اور بھائی کو کام پر بھیج دیا۔ میں بھوکا پیاسا ابو کی تیمارداری کرنے لگا۔ ڈاکٹر نے ڈریپ لگادی تھی اور انجکشن لگارہا تھا۔ دن بارہ بجے ابو کی طبیعت قدرے سنبھل گئی تھی کہ دن ایک بجے ابو کی طبیعت پھر بگڑ گئی۔ ڈاکٹرز نے بڑے اسپتال لے جانے کو کہا۔ میں فوراً ابو کو قصبہ مڑل اسپتال لے گیا۔ سرکاری اسپتال تھا۔ بجلی گئی ہوئی تھی۔ مریض تڑپ رہے تھے۔ خیر ڈاکٹروں نے ابو کا چیک اپ کیا۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ انہوں نے نشتر اسپتال لے جانے کو کہا۔

ابھی نشتر اسپتال ایمرجنسی پہنچے ہی تھے کہ ابو لمبی لمبی سانس لینے لگے۔ میں نے ڈاکٹر کی توجہ کروائی تو کہنے لگے بیٹا حوصلہ کرو مگر ایمرجنسی لے جاتے ہوئے ابو نے دم توڑ دیا۔ اُف میرے خدایا! یہ دن بھی دیکھنے تھے۔ میں اکیلا تن تنہا، ابو کے لاشے سے لپٹ کر رو رہا تھا۔ میرے بابا کب کے بے سدھ پڑے تھے اور میں انہیں جاگنے کے لیے التجائیں کر رہا تھا۔ وہ تو میٹھی نیند سوگئے تھے۔ ایسی نیند جس سے آج تک کوئی نہیں جاگ سکا۔ بیچارے تن تنہا ہزاروں پریشانیوں، بیماریوں سے لڑتے لڑتے زندگی کی بازی ہار گئے تھے۔ میں روتا چیختا ایمبولینس سے ابو کی ڈیڈ باڈی واپس گھر لے آیا۔ صرف چار گھنٹوں میں ابو جان اس جہان سے اُس جہان چلے گئے۔ نمازِ جنازہ کے بعد میں تدفین کے لیے قبرستان چلا گیا۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے بابا جان کو، منوں مٹی تلے دفن کردیا میں تنہا زمانے کی رسمیں نبھانے لگا۔ ابو جان کے مرگ پر اٹھنے والا خرچ میں نے ہی کیا، زمانے کی زبان کو لگام دینے کے لیے ادھار لے کر ابو جان کے مرگ کا خرچا اٹھایا۔ وقت تھا کہ ہزاروں زخم دے کر گزر گیا۔ مگر میں سوچتا ہوں کہ مجھے ایک معمولی سے کلینک میں بیٹھنے والا ڈاکٹر موت کے منہ سے کھینچ لایا اور میرے ابو کو بڑے بڑے ڈاکٹر بھی بچا نہ پائے۔ اصل مسیحا کون ہوا، موٹی موٹی تنخواہ لینے والے ڈاکٹر یا وہ ایک معمولی سا ڈاکٹر؟



درِ توبہ

محترم معراج رسول
السلام علیکم
اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ غلطیوں پر غلطیاں کرتے جاتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ دنیا آخر نہیں ہے۔ آخرت میں بھی جواب دینا ہے۔ یہ خدا کا احسانِ عظیم ہے کہ مجھے یہ توفیق ملی اور عین وقت پر میری زندگی نے نیا موڑ لے لیا۔

وقار علی
(فیصل آباد)

میرے والد محکمۂ پولیس میں ملازم تھے۔ انتہائی ایمان دار اور فرض شناس افسر تھے۔ رشوت لینا تو دور کی بات ہے، وہ اس کا نام سننا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ ہمارا خاندان خاصا بڑا تھا۔ ہم پانچ بھائی چار بہنیں اور ابا اماں سمیت گیارہ افراد تھے۔ سب سے بڑا میں تھا اور سب سے چھوٹی رضوانہ تھی۔ اس کی اور میری عمر میں پندرہ سال کا فرق تھا۔

ابا گزرے وقت کی کہانی سناتے ہوئے کہا کرتے۔ ”وہ تو نسبتاً بھلا زمانہ تھا۔ مگر وہ لوگ بھی چھپ چھپا کر رشوت لیتے تھے اور مجھ جیسے لوگوں سے خوف زدہ بھی رہتے تھے۔ اب وہ زمانہ نہیں ہے۔ آج کل تو لوگ رشوت بھی یوں لیتے ہیں جیسے اپنا پرانا قرض وصول کر رہے ہوں۔ اسی لیے مجھے زیادہ عرصہ ایک تھانے میں ٹکنے نہیں دیا جاتا۔ کیونکہ میری وجہ سے بہت سے لوگوں کی آمدنی ماری جاتی ہے۔“

”لیکن ابا!“ میرا چھوٹا بھائی عارف کہتا۔ ”اس سے آپ کو فائدہ کیا ہوا۔“

”فائدہ۔“ ابا کو غصہ آجاتا۔ ”یہ کیا کم فائدہ ہے کہ مرنے کے بعد میں اللہ کے سامنے سرخرو ہوسکوں گا۔“

اس دن بھی ابا حسبِ معمول دفتر گئے تھے اور رات کے نو بجے تک لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ یہ کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں تھی۔ ابا تو اکثر راتوں کو بھی گھر سے باہر رہتے تھے۔

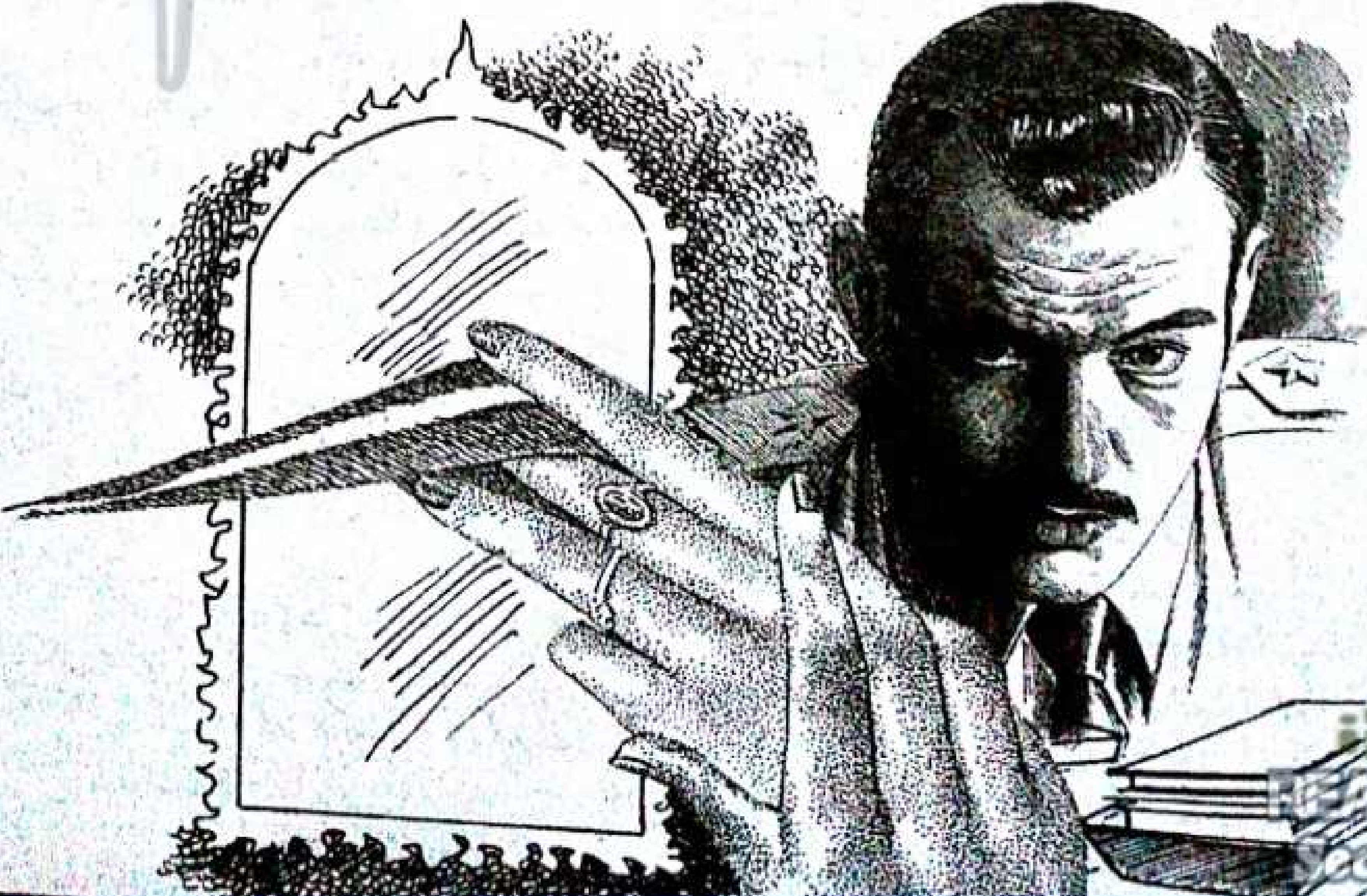
ان دنوں میرے بی اے کے امتحانات ہو رہے تھے۔ صرف دو پرچے رہ گئے تھے۔ میں امتحانات کی تیاری کر رہا تھا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی تو میں یہ سمجھا کہ شاید ابا واپس آگئے ہیں۔ لیکن یہ دستک کچھ مختلف تھی۔ اس دن شدید سردی تھی۔ میں کانوں پر مفلر لپیٹ کر باہر نکلا۔ دروازے پر ایک سب انسپکٹر کھڑا تھا میں سمجھا ابا کا کوئی پیغام لایا ہوگا۔ ان دنوں سیل فون نہیں آیا تھا۔

”جی انکل!“ میں نے پوچھا۔ ”کوئی خاص بات؟“

ان کے چہرے کی پریشانی دیکھ کر میں بھی پریشان ہوگیا تھا۔

”وقار بیٹے! تم ذرا میرے ساتھ چلو۔ تمہارے ابا پولیس مقابلے میں زخمی ہوگئے ہیں۔ اس وقت وہ اسپتال



میں ہیں۔''

میں بری طرح بوکھلا گیا۔ ''انکل! ابا زیادہ زخمی تو...... نہیں ہوئے ہیں...... تشویش کی کوئی بات تو نہیں...... وہ......''

''بیٹا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم میرے ساتھ چل کر خود دیکھ لو۔'' انہوں نے کہا۔

''ایک منٹ ٹھہریں۔ میں امی کو تو بتا دوں اور کپڑے بدل لوں۔''

''جلدی کرو بیٹا، ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔''

''انکل آپ اندر تو آئیں۔'' میں نے کہا۔

''میں باہر جیپ میں بیٹھا ہوں۔'' انکل نے کہا۔ ''تم جلدی سے کپڑے بدل کر آجاؤ۔''

امی اس وقت جاگ رہی تھیں۔ وہ ابا ہی کا انتظار کر رہی تھیں۔ میں نے ان کو بتایا کہ ''ابا پولیس مقابلے میں زخمی ہو گئے ہیں۔ میں اسپتال جا رہا ہوں۔''

امی گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔ ''زخمی ہو گئے؟ وہ زیادہ زخمی تو نہیں...... وہ...... ٹھیک تو ہیں؟''

''امی! فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ غلام رسول انکل بتا رہے تھے کہ ابا معمولی زخمی ہوئے ہیں۔ وہ مجھے بلا رہے ہیں۔''

''چلو میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں وقار!'' امی نے کہا۔

''امی آپ تو بہت پریشان ہو گئیں۔ ابا معمولی زخمی ہیں۔ آپ وہاں جا کر انہیں پریشان کر دیں گی۔ ویسے بھی وہ آپ کا وہاں جانا پسند نہیں کریں گے۔''

امی کو بہ مشکل تمام اسپتال جانے سے روکا اور خود جیکٹ اور اونی ٹوپی پہن کر باہر نکل گیا۔

ہم اسپتال پہنچے تو وہاں پولیس کے کئی افسران بھی موجود تھے۔ ابا کے زخمی ہونے پر اتنے بڑے بڑے افسران آئے ہیں۔ میں نے حیرت سے سوچا۔

کرائم برانچ کے ڈی آئی جی خورشید علی خان صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا اور بولے۔ ''وقار، تمہارا نام وقار ہی ہے نا؟''

''جی سر! میں ہی وقار ہوں، انسپکٹر ابرار احمد کا سب سے بڑا بیٹا۔''

''دیکھو بیٹا! میری بات ذرا ہمت اور حوصلے سے سننا۔ بہن بھائیوں میں تم سب سے بڑے ہو اس لیے۔''

''سر!'' میں نے گھبرا کر کہا۔ ''جو کچھ کہنا ہے آپ پلیز جلدی سے کہہ دیں۔'' میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ بات کچھ اور ہے۔

''بیٹا! تمہارے ابا انتہائی فرض شناس اور نڈر افسر تھے۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔''

مجھے ایسا لگا جیسے میرا سانس گھٹ رہا ہو۔ شدید سردی کے باوجود میرا چہرہ پسینے میں تر ہو گیا تھا۔ شاید میری آنکھوں سے آنسو بھی بہہ رہے تھے لیکن مجھے ان کا قطعاً احساس نہیں تھا۔

''حوصلہ رکھو بیٹے۔'' ڈی آئی جی صاحب نے کہا۔

''اب اپنے ابا کی ذمے داریاں تم ہی کو سنبھالنا ہیں۔'' انہوں نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر کسی کو آواز دی۔ ''احسن صاحب...... وقار کو وہاں لے جاؤ۔''

احسن انکل نے میرا ہاتھ پکڑا تو میں گویا نیند کی کیفیت میں ان کے ساتھ چلنے لگا۔

ابا کو پانچ گولیاں لگی تھیں۔ دو سینے میں دو ہاتھوں میں اور ایک گولی گلے میں پیوست ہو گئی تھی۔ اتنی گولیاں لگنے کے بعد بھی ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

میں ابا کی میت لے کر گھر پہنچا تو پورے محلے میں کہرام مچ گیا۔ دوسرے دن ظہر تک ہم نے ابا کو منوں مٹی کے نیچے دبا دیا۔

اکثر رشتے دار تیسرے ہی دن روانہ ہو گئے۔ میرے ایک چچا اور ماموں البتہ ایک ہفتے تک ہمارے ساتھ رہے۔

اب سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ہمارا گزارا کیسے ہو گا؟ مجھے فوری طور پر تو ملازمت مل نہیں سکتی تھی اور ملتی بھی تو کون سی گورنری مل جاتی۔ میں نے تو ابھی گریجویشن بھی نہیں کیا تھا۔ یہ تو اچھا تھا کہ ابا اپنی زندگی میں دو بڑی بہنوں کی شادیاں کر گئے تھے۔ رضوانہ ابھی بہت چھوٹی تھی لیکن گھر کے اخراجات کے لیے پیسے تو چاہیے تھے۔

میں نے اخبار میں دیکھ کر کئی جگہ ملازمت کی درخواست دے دی اور مختلف دفتروں کے چکر لگاتا رہا۔

ہمارا تو مکان بھی کرائے کا تھا۔ راشن کے ساتھ مکان کے کرائے اور الیکٹرک، گیس وغیرہ کے بل کی ادائیگی بھی بہت ضروری تھی۔

میں صبح گھر سے نکلتا اور شام تک سڑکیں ناپتے اور دفتروں کی سیڑھیاں چڑھتے اترنے میں نڈھال ہو جاتا۔

اس دن بھی میں تھکا ہارا باہر سے آیا تھا اور آتے ہی صحن میں پڑے ہوئے تخت پر ڈھیر ہو گیا تھا۔ امی میرے لیے چائے لے کر آئیں تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت

دروازے پر دستک ہوئی۔ مجھ سے پہلے عارف دروازے پر چلا گیا۔ وہ فوراً واپس آگیا اور مجھ سے بولا۔ ''بھائی جان پولیس کے ایک سب انسپکٹر ہیں۔ وہ آپ کو بلا رہے ہیں۔''

''سب انسپکٹر! تم نے ان کا نام نہیں پوچھا؟''

''نام تو میں نے نہیں پوچھا۔''

میں چائے کا کپ رکھ کر اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ باہر مجھے ایک اجنبی چہرہ نظر آیا۔ میں اکثر ابا کے پاس جاتا رہتا تھا یوں بیشتر پولیس افسران سے میری واقفیت تھی۔

''جی فرمایئے؟''

''وقار آپ ہی کا نام ہے؟''

''جی ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں ہی وقار ہوں۔''

''آپ کو آئی جی صاحب نے کل صبح نو بجے ہیڈ آفس میں بلایا ہے۔''

''کس سلسلے میں سر؟'' میں نے تشویش سے پوچھا۔

''بھئی اب یہ تو آئی جی صاحب ہی کو معلوم ہوگا۔ مجھے تو آئی جی صاحب نے حکم دیا کہ ابرار کے بیٹے کو بلوا لو۔''

''او کے سر۔'' میں نے کہا۔ ''میں حاضر ہو جاؤں گا۔'' پھر میں نے سب انسپکٹر صاحب کو اندر بیٹھنے کی دعوت دی لیکن وہ کچھ جلدی میں تھے، سو مجھ سے معذرت کر کے رخصت ہو گئے۔ جانے سے پہلے انہوں نے ایک دفعہ پھر وقت پر آئی جی صاحب کے پاس پہنچنے کی تاکید کی۔

اس وقت تک میرے امتحانات بھی ختم ہو گئے اور مجھے کوئی خاص مصروفیت بھی نہیں تھی۔

دوسرے دن میں ساڑھے آٹھ بجے صبح پولیس ہیڈ آفس پہنچ گیا۔ آئی جی صاحب کے پی اے نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور بولا۔ ''وقار صاحب! آپ وقت سے آدھا گھنٹا پہلے ہی پہنچ گئے، آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔''

ٹھیک نو بجے پی اے نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اس وقت دو افسران کمرے سے باہر آئے تھے۔

آئی جی صاحب کے ساتھ ڈی آئی جی خورشید علی خان بھی موجود تھے۔ آئی جی صاحب نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولے۔ ''وقار آج کل آپ کی کیا مصروفیات ہیں؟''

''سر میں ابھی بی اے فائنل کا امتحان دے کر فارغ ہوا ہوں اور آج کل کوئی خاص مصروفیت نہیں ہے۔''

''میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ ہمارا ڈیپارٹمنٹ ہر پولیس افسر کے ایک بیٹے کو جاب دینے کا پابند ہے۔ ہاں اگر آپ جاب نہ کرنا چاہیں تو بات اور ہے۔''

جاب کا نام سن کر میں ایک دم خوش ہو گیا۔ میں نے کہا۔ ''سر! میں تو خود جاب تلاش کر رہا ہوں۔''

''او کے!'' آئی جی صاحب نے اپنے سامنے رکھی ہوئی ایک فائل پر کچھ نوٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ ایس ایس پی اکرام سے مل لیں۔ یہ معاملات ان ہی کی ذمہ داری ہیں۔''

میں نے رخصت ہونا چاہا لیکن اس وقت آئی جی صاحب کا اردلی چائے کی ٹرے لے کر آ گیا۔ اس دوران میں نے جو تھوڑی بہت بات کی وہ آئی جی صاحب سے کی۔ خورشید صاحب خاموش ہی رہے۔

آئی جی صاحب نے گھڑی دیکھی اور مجھ سے بولے۔ ''آپ ایس ایس پی اکرام صاحب سے مل لیں۔'' یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ انٹرویو کا وقت ختم ہو گیا۔ مجھے پہلی ہی ملاقات میں یہ احساس ہو گیا کہ آئی جی صاحب وقت کے بہت پابند ہیں۔

ایس ایس پی اکرام خاصا چاق و چوبند اور اسمارٹ پولیس افسر تھا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ ہنس کر بولا۔ ''مجھے آئی جی صاحب کے احکامات مل چکے ہیں۔'' انہوں نے مختلف فارمز کا ایک پلندہ میری طرف بڑھا دیا اور بولے۔ ''انہیں بہت احتیاط سے فِل کیجیے گا۔ کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو مجھ سے پوچھ لیجیے گا۔''

وہاں کمرے میں ایک خالی میز بھی تھی۔ شاید اسے استعمال کرنے والا آج چھٹی پر تھا۔

''وقار صاحب! آپ اطمینان سے اس ٹیبل پر بیٹھ جائیں۔''

میں فارم فِل کر رہا تھا کہ اکرام صاحب اچانک کھڑے ہو گئے۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ ڈی آئی جی صاحب کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ میں بھی احتراماً کھڑا ہو گیا۔

''آپ لوگ تشریف رکھیں۔'' انہوں نے نرم لہجے میں کہا اور اکرام صاحب سے کوئی سرکاری گفتگو کرنے لگے۔

میں نے بیس منٹ میں وہ فارم فِل کر دیے، پھر دوبارہ نظرِ ثانی کرنے کے بعد وہ فائل اکرام صاحب کی

طرف بڑھا دی۔
آئی جی صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ''وقار! تمہارا باپ بہت فرض شناس اور ایمان دار آدمی تھا۔ مجھے اُمید ہے کہ تم بھی اپنے باپ ہی کی طرح فرض شناس اور ایماندار افسر بنو گے۔''
''یس سر!'' میں نے کہا۔ ''آئی وِل ٹرائی مائی بیسٹ!''
دو چار ہدایتیں مزید دینے کے بعد ڈی آئی جی صاحب چلے گئے۔
اکرام نے بھی اس وقت فارمز کی چیکنگ کر لی تھی۔ جس میں، میں ایک آدھ جگہ دستخط کرنا بھول گیا تھا۔
''مسٹر وقار۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ نے آپ کو اسسٹنٹ سب انسپکٹر (اے ایس آئی) کے عہدے پر تقرر کیا ہے۔'' اکرام نے کہا۔ ''آپ کو پولیس ٹریننگ کے لیے دس تاریخ کو شہداد پور جانا ہے۔''
یوں مجھے پولیس میں ملازمت مل گئی۔
میں ٹریننگ مکمل کر کے واپس آیا تو مجھے ائرپورٹ تھانے میں تعینات کر دیا گیا۔ پولیس کی وردی پہن کر مجھے عجیب سے تفاخر کا احساس ہوتا۔ ایک ہفتہ تو مجھے کام سیکھنے میں ہی لگ گیا۔ پھر ائرپورٹ پر میری ڈیوٹی لگا دی گئی۔ اس تھانے میں میرے علاوہ دو سب انسپکٹر، دو اسسٹنٹ سب انسپکٹر، تین حوالدار اور بارہ سپاہی تھے۔ ایس ایچ او رانا شکور خان بہت سینئر آفیسر تھے۔ وہ ابا کو بھی جانتے تھے بلکہ ان کی ماتحتی میں کام کر چکے تھے اس لیے میرا بہت خیال رکھتے تھے۔
میں ائرپورٹ کے پارکنگ لاٹ کا گشت کر رہا تھا کہ مجھے مشکوک قسم کا ایک شخص نظر آیا۔ وہ سیاہ رنگ کی ہنڈا سٹی سے اتر رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑی تو جلدی سے دوبارہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کی اس حرکت سے میں چونک گیا۔
کچھ فاصلے پر جا کر اس کے دوبارہ نیچے اترنے کا انتظار کرنے لگا لیکن وہ گاڑی سے باہر نہیں آیا۔ میں خود ٹہلتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا اور گاڑی کا بند شیشہ آہستہ سے کھٹکھٹایا۔ وہ شخص ڈرائیونگ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کے آنکھیں موندھے بیٹھا تھا۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور جلدی سے شیشہ نیچے سرکا دیا۔ ''کیا بات ہے؟'' اس نے اکھڑ لہجے میں کہا۔
اس کے لہجے پر میری کھوپڑی گھوم گئی لیکن میں نے غصے پر قابو پا کر اس سے کہا۔ ''آپ ذرا گاڑی سے باہر آئیں۔''
''کیوں؟'' وہ پھر درشتی سے بولا۔
اسے گاڑی سے اتارنے کا میرے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ میں نے یوں ہی کہا۔ ''مجھے گاڑی کی تلاشی لینا ہے۔''
''تت...... تلاشی...... وہ کیوں؟'' وہ اچانک گھبرا گیا۔
اس کے رویے سے میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے قدرے درشت لہجے میں کہا۔ ''مجھے اس گاڑی پر شبہ ہے یوں۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔
''دیکھیے انسپکٹر صاحب...... میں...... اس گاڑی کا مالک نہیں ہوں میں تو......''
''مجھے صرف گاڑی کی تلاشی لینا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ مالک ہیں یا ڈرائیور یہ تو میں بعد میں معلوم کروں گا۔''
وہ شخص ہچکچاتا ہوا باہر آ گیا۔ وہ درمیانے قد اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ اس نے جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ گلے میں سونے کی ایک چین جھول رہی تھی۔
وہ گاڑی سے اترا تو میں نے پہلے اس کی تلاشی لی۔ مجھے یہ دیکھ کر تھوڑی حیرت ہوئی کہ اس کی جیب سے پاکستانی اور غیر ملکی کرنسی کے علاوہ ایک ٹی ٹی پسٹل بھی برآمد ہوا۔
اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ میں نے جائزہ لیا۔ وہ خاصا قیمتی پسٹل تھا۔ میں نے اس کی نالی سونگھی۔ اس سے کوئی فائر نہیں کیا گیا تھا۔
''اس پسٹل کا لائسنس ہے تمہارے پاس؟'' میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔
''میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں اس گاڑی کا مالک نہیں ہوں۔'' اس نے اعتماد سے عاری لہجے میں کہا۔
''گاڑی سے اس پسٹل کا کیا تعلق؟'' میں نے جھنجلا کر پوچھا۔ ''اس پسٹل کا لائسنس ہے تمہارے پاس؟'' میں نے اپنا سوال دہرایا۔ ''پسٹل اس کی ملکیت سمجھا جاتا ہے جس کے قبضے میں ہو۔''
''اس کا لائسنس تو میرے پاس نہیں ہے۔'' اس نے مری مری آواز میں کہا۔
''تو پھر تمہیں میرے ساتھ پولیس اسٹیشن تک چلنا ہو گا۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔
''چلیں صاحب!'' اس نے منہ بنا کر کہا۔ ''آپ

بادشاہ لوگ ہیں۔ کسی کو بھی تھانے لے جا سکتے ہیں۔''
اس وقت میرے دو ماتحت وہاں آ نکلے۔ ان میں سے ایک بولا۔ ''خان صاحب! آپ یہاں ہیں ہم آپ کو ادھر لا ؤنج میں ڈھونڈ رہے ہیں۔''
''کرم داد!'' میں نے ایک سپاہی کو مخاطب کیا۔ ''تم لوگ اچھی طرح اس گاڑی کی تلاشی لو۔''
کرم داد نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ پھر گاڑی کی طرف بڑھا تو گاڑی والا جلدی سے بولا۔ ''آپ لوگ گاڑی کی تلاشی کیوں لے رہے ہیں؟''
کرم داد نے اس کے منہ پر بے رحمی سے تھپڑ مارا اور کرخت لہجے میں بولا۔ ''ہمیں ہمارا کام مت سکھا اور یہ کیوں اور کیسے مت کر۔ جب ہمارے آفیسر نے کہہ دیا کہ گاڑی کی تلاشی لینی ہے تو ضرور ہوگی۔''
''میں کسی چھوٹے موٹے آدمی کا ملازم نہیں ہوں۔'' وہ شخص بولا۔ ''گاڑی کی تلاشی تم لوگوں کو بہت مہنگی پڑ جائے گی۔'' اس میں نہ جانے کیسے اتنی جرأت آ گئی کہ وہ ہم سے بحث کرنے لگا۔
کرم داد نے پھر اس کے منہ پر تھپڑ مارا اور بولا۔ ''تیرے مالک کو بھی دیکھ لیں گے اور رہا سوال تلاشی مہنگی پڑنے کا تو ہم نے آج تک کوئی سستا سودا نہیں کیا ہے۔''
گاڑی کی ڈگی میں دو بڑے بڑے بیگ تھے۔ ایک بیگ میں ڈالرز، پاؤنڈز، جاپانی ین اور کویتی دینار بھرے ہوئے تھے۔ دوسرا بیگ نسبتاً بڑا تھا اس میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ گویا گاڑی کا مالک صاحب ذوق بھی تھا۔
''نام کیا ہے تمہارا؟'' میں نے اس شخص سے پوچھا۔
''میرا نام ماجد ہے۔'' اس نے جواب دیا۔
''اور گاڑی کا مالک کون ہے؟ اس کا نام بتاؤ۔''
''فکر مت کریں سر۔'' ماجد نے کہا۔ ''صاحب پولیس اسٹیشن خود ہی آ جائیں گے۔''
میں اسے تو گاڑی سمیت پولیس اسٹیشن لے آیا۔ اس وقت ڈیوٹی پر سب انسپکٹر رشید تھا۔ وہ بہت نڈر آدمی تھا اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔
اس نے ماجد سے نام پوچھا اور بولا۔ ''ماجد! اب اس کا نام بھی بتا دو۔''
''اس کا نام چودھری غفور حسین ہے۔'' اس نے یوں کہا جیسے چودھری غفور حسین امریکا کا صدر ہو۔
میں نے چودھری غفور حسین کا نام سنا تھا وہ برسر اقتدار پارٹی کا خاص آدمی تھا۔

ایک لمحے کو سب انسپکٹر رشید بھی خاموش ہو گیا۔ پھر وہ فوراً ہی سنبھل کر بولا۔ ''چودھری صاحب کا ٹیلی فون نمبر بتاؤ۔ میں انہیں بھی یہیں بلا لیتا ہوں۔''
آدھے گھنٹے بعد ایک لینڈ کروزر پولیس اسٹیشن کے احاطے میں داخل ہوئی۔ پھر اس کے چاروں دروازے ایک ساتھ کھلے اور چار آدمی باہر آ گئے۔ فرنٹ سیٹ سے اترنے والا شخص چودھری غفور تھا۔ میں نے اس کی تصویر اخباروں میں دیکھی تھی۔ وہ خاصا باوقار شخص تھا۔ قیمتی بوسکی کا کرتہ اور سفید براق شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ کلائی میں انتہائی قیمتی گھڑی تھی۔
میں اس وقت برآمدے ہی میں کھڑا تھا۔ وہ رعونت بھرے انداز میں سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں آیا اور مجھ سے بولا۔ ''ایس ایچ او بیٹھا ہے؟''
''جی نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''وہ علاقہ گشت پر گئے ہیں۔''
''ڈیوٹی افسر کون ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''ڈیوٹی پر اس وقت سب انسپکٹر رشید ہیں۔'' میں نے کہا۔
''ماجد کو گرفتار کس نے کیا ہے؟'' اس نے یوں تحقیر آمیز لہجے میں پوچھا جیسے ماجد کو گرفتار کرنے والے کو بھی الٹا لٹکا دے گا۔
''ماجد کو میں نے گرفتار کیا ہے۔'' میں نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔
''میں چودھری غفور ہوں۔'' اس نے کہا۔
''اچھا، تم ہو وہ چودھری غفور۔ وہ گاڑی تمہاری ہے؟'' میں نے سامنے کھڑی ہوئی ہنڈا اسٹی کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے جان بوجھ کر اسے تم کہہ کر مخاطب کیا تھا۔
''ہاں، وہ گاڑی میری ہے اور اس میں جو سامان تھا وہ بھی میرا ہے۔ کہو تو یہ سب لکھ کر دے دوں؟''
میں نے بلند آواز میں کہا۔ ''کرم داد!''
''جی سر!'' کرم داد کی آواز آئی پھر وہ خود بھی وہاں پہنچ گیا۔
''چودھری صاحب کو گرفتار کر لو۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے، کیا ملازمت سے دل بھر گیا ہے؟''
''کرم داد! چودھری صاحب کو لاک اپ میں بند کر دو۔''

''میں پورے تھانے کو معطل کرادوں گا۔'' چودھری ہذیانی انداز میں چیخا۔ ''اور تو......'' اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ ''تجھے تو ایسی سزا دوں گا کہ دوسروں کے لیے عبرت بن جائے گا۔''

اس کی چیخ پکار سن کر تھانے میں موجود کئی سپاہی وہاں پہنچ گئے۔ سب انسپکٹر رشید شاید کہیں باہر تھا لیکن وہ بھی اس وقت وہاں پہنچ گیا تھا۔

''میں پورے تھانے کو جیل بھجوا دوں گا۔'' چودھری پھر چیخا۔

اچانک سب انسپکٹر رشید آگے بڑھا اور بولا۔ ''چودھری صاحب...... چودھری صاحب...... وقار ابھی بچہ ہے۔ اس کی طرف سے میں معافی چاہتا ہوں۔ آیئے آپ میرے آفس میں آیئے۔''

انسپکٹر رشید کا لہجہ اس وقت کچھ اجنبی اجنبی سا تھا۔

وہ چودھری کو اپنے آفس میں لے گیا۔

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اس وقت ایس ایچ او رانا صاحب آگئے۔ میں انہیں دیکھ کر خوش ہو گیا کہ وہ ضرور اس سلسلے میں کچھ کریں گے۔

میں نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے مسکرا کر میرے سلام کا جواب دیا۔ پھر بولے۔ ''وقار بیٹا کوئی پریشانی ہے کیا؟''

میں نے انہیں بتایا کہ ''آج میری ڈیوٹی کا پہلا دن تھا اور آج ہی میں نے ایک کیس پکڑلیا ہے۔''

''ویری گڈ!'' وہ خوش ہو کر بولے۔

میں نے شروع سے آخر تک پوری روداد سنا دی، بس چودھری کا نام نہیں لیا۔

وہ تیز تیز قدم رکھتے ہوئے آفس میں چلے گئے۔

میں نے کچھ دیر رک کر انتظار کیا۔ پھر میں نے ایک سپاہی سے چائے لانے کو کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے رانا صاحب نے بلایا۔ میں ان کے کمرے میں پہنچا تو وہاں سب انسپکٹر رشید بھی موجود تھا۔ میں نے رانا صاحب سے پوچھا۔ ''انکل! آپ نے چودھری کے خلاف ایف آئی آر درج کروائی؟'' میں انہیں سر کی بجائے انکل کہتا تھا۔

''وہ میں دیکھ لوں گا۔'' انہوں نے کہا۔ ''تم اپنی ڈیوٹی پر جاؤ۔''

''لیکن انکل! کورٹ میں چالان تو مجھے پیش کرنا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔

''تم اس کی فکر مت کرو۔'' انہوں نے کہا۔ ''تم اپنی ڈیوٹی پر جاؤ۔ وہاں اس وقت کوئی ڈیوٹی افسر نہیں ہے۔''

مجھے ایسا لگا جیسے رانا صاحب مجھے وہاں سے ہٹانا چاہتے ہوں۔ ممکن ہے اس کیس کا کریڈٹ وہ خود لینا چاہتے ہوں۔

مجھے تذبذب میں دیکھ کر انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''اچھا! رہنے دو۔'' میں وہاں سب انسپکٹر نعیم کو بھیج دیتا ہوں۔ ''تم میرے ساتھ آؤ۔''

میں الجھا الجھا سا رانا صاحب کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا ان کے آفس میں پہنچا۔

رانا صاحب اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے اور مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا تو وہ خاموشی سے بیٹھے کچھ سوچتے ہوئے پھر بولے۔ ''وقار بیٹا! تمہارے ابا نے جس دور میں ملازمت کی ہے۔ اس دور میں کئی لوگوں نے ان کی ٹانگ کھینچنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے لیکن آج کے حالات بالکل مختلف ہیں۔ اب جائز طریقے سے پیسا کمانا بہت مشکل ہے۔''

''انکل!'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''بات کچھ اور ہے۔ آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔''

''بیٹا چودھری بہت بارسوخ آدمی ہے۔ اس کے خلاف چالان ہوا تو مجھ سمیت کئی افراد کی ملازمت جائے گی۔''

''تو اس قسم کے لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے؟'' میں نے پوچھا۔

''تم خود سمجھ دار ہو۔'' رانا صاحب نے کہا۔ ''تمہارے باپ نے حالات سے سمجھوتا نہیں کیا اور وہ زندگی بھر پریشانیوں میں مبتلا رہا۔''

اس رات میں ایک لمحے کو نہ سو سکا بس میرے دل و دماغ میں ایک جنگ جاری رہی آخر میں، میں ایک فیصلہ کر کے سو گیا۔

صبح میں سو کر اٹھا تو ایک نیا وقار تھا۔

میں تیار ہو کر پولیس اسٹیشن پہنچا تو سب انسپکٹر رشید واپسی کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے چونک کے مجھے دیکھا۔ پھر نظریں جھکا لیں۔ اس کا خیال تھا کہ میں چودھری کے بارے میں کچھ پوچھوں گا۔

اس کے جانے کے بعد ڈیوٹی افسر کا چارج میرے پاس تھا۔

اس وقت ایک ادھیڑ عمر شخص اور دو لڑکے پولیس

اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوئے۔ میں برآمدے میں کھڑا تھا۔ انہیں دیکھ کر، میں درشت لہجے میں بولا۔ ''کون ہو تم لوگ اور اندر کیسے آئے؟''

ظاہر ہے وہ اپنی کسی غرض سے آئے ہوں گے۔ کوئی بھی انسان شوقیہ تو تھانے آتا نہیں ہے۔

''وہ...... ہمارے...... گھر میں...... ابھی تھوڑی دیر پہلے ڈکیتی ہوگئی ہے۔'' ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔ ''میں اس کی ایف آئی آر درج کرانے آیا ہوں۔''

''ڈکیتی کس وقت ہوئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''میں نے وقت پوچھا ہے بڑے صاحب!'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

''آٹھ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔'' اس لڑکے نے جواب دیا۔ ''میں اس وقت اپنی گھڑی کا ٹائم سیٹ کر رہا تھا۔'' لڑکے کے لہجے میں باپ سے زیادہ اعتماد تھا۔

''ڈاکو کیا کیا لے گئے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ پوچھیے ڈاکو کیا نہیں لے گئے ہیں۔ میری بیٹی کی شادی ہونے والی ہے۔ اس کے جہیز کا پورا سامان تھا۔ اس کے علاوہ گھر کا سامان تھا اور......''

''آپ کے پاس اس سامان کی رسیدیں تو ہوں گی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں جو سامان اور زیورات میں نے حال ہی میں خریدے تھے اس کی تمام رسیدیں میرے پاس ہیں۔'' ادھیڑ عمر شخص نے جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ اس میں سے کچھ سامان ایسا تھا جس کی رسیدیں آپ کے پاس نہیں ہیں؟'' میں نے کہا۔

''رسیدیں تو ضروری ہیں بڑے صاحب۔'' پھر میں نے ایک سپاہی سے کہا۔ ''بڑے صاحب کو ہیڈ محرر کے پاس لے جاؤ وہ انہیں بتائے گا کہ ایف آئی آر درج کرانے کے لیے کیا کچھ ضروری ہوتا ہے؟''

میں اپنے کمرے میں آگیا اور ٹیلی فون پر اپنے ایک دوست سے گپ شپ کرنے لگا۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ وہ ادھیڑ عمر شخص پھر میرے کمرے میں داخل ہوا اور بلند آواز میں بولا۔ ''انسپکٹر صاحب، وہ آپ کا ہیڈ محرر......''

میں نے اشارے سے اسے روک دیا اور ٹیلی فون پر بات کرتا رہا۔

وہ کچھ دیر میرے فارغ ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ پھر بیزاری سے بولا۔ ''انسپکٹر صاحب اگر آپ میری بات......''

میں نے ہاتھ کے اشارے سے پھر اسے خاموش کر دیا۔

اس سے ضبط نہ ہوسکا اور وہ چیخ کر بولا۔ ''آپ کس قسم کے آدمی ہیں آپ کی بے معنی گفتگو ختم ہی نہیں ہوتی میں کب سے......''

''میں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں۔'' میں نے اپنے دوست سے کہا اور ریسیور کریڈل پر پٹخ کر ادھیڑ عمر شخص سے بولا۔ ''آپ تھانے میں کھڑے ہیں۔ اپنے گھر میں نہیں ہیں جہاں آپ کا حکم چلتا ہے۔ آپ مجھے سکھائیں گے کہ مجھے کیا بات کرنی ہے اور کیا نہیں کرنی ہے؟''

''آپ کا ہیڈ محرر مجھ سے پیسے مانگ رہا ہے۔'' وہ ناگواری سے بولا۔

''نام کیا ہے آپ کا؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا نام اصغر ہے اور میں دو مہینے پہلے ہی سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوا ہوں۔''

''دیکھیے اصغر صاحب! ہماری بھی کچھ ریکوائرمنٹس ہوتی ہیں۔ ہیڈ محرر اگر کچھ کہہ رہا ہے تو کچھ سوچ کر ہی کہہ رہا ہوگا۔'' میں نے سنا تھا کہ تھانے میں ایف آئی آر بھی پیسے لے کر درج کی جاتی ہے لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ میں اس کام میں ملوث ہوا تھا۔

''یہ محکمے کی ضرورت نہیں بلکہ رشوت ہے۔'' اصغر بھی بھنا کر بولا۔

اچانک ایک سنتری نے انتہائی غیر مہذب انداز میں کہا۔ ''تم لوگ آواز نیچی کرو، یہ تھانہ ہے اور......''

''ہاں صرف تم ہی لوگوں کو بولنے کا حق ہے۔'' اصغر صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔ پھر بولا۔ ''مجھے نہیں درج کرانی ایف آئی آر۔'' اس نے اپنے بیٹے کو مخاطب کیا۔ ''چلو بیٹا۔''

اس کے جانے کے بعد میں نے ہیڈ محرر کو بلایا اور اس سے پوچھا۔ ''ابھی جو صاحب یہاں ایف آئی آر درج کرانے آئے تھے تم نے ان سے کتنے پیسے مانگے تھے؟''

''میں نے تو صرف ان سے چائے پانی کے پیسے مانگے تھے۔'' ہیڈ محرر جلدی سے بولا۔ ''اور یہ یہاں کے دستور میں داخل ہے۔''

میں نے سمجھ لیا تھا کہ اگر ابا کی راہ پر چلا تو خالی ہاتھ رہ جاؤں گا۔ جدھر کی ہوا ہے ادھر چلنا چاہیے اس لیے میں نے سب کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔

گویا میرے منہ کو خون لگ گیا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ائرپورٹ کا پولیس اسٹیشن کراچی کے چند انتہائی منافع بخش پولیس اسٹیشنز میں سے ایک ہے اور لوگ یہاں ٹرانسفر کے لیے افسران بالا کو بھاری رقم ادا کرتے ہیں۔

چند ہی ماہ میں میرے گھر میں پیسے کی ریل پیل ہو گئی۔

میں نے وہ علاقہ چھوڑ کر گلشن اقبال کے ایک پوش علاقے میں مکان لے لیا۔

امی شاید سب جانتی تھیں کہ میرے پاس اتنا پیسا کہاں سے آرہا ہے لیکن اب تک انہوں نے مجھ سے کچھ پوچھا نہیں تھا۔

دو سال بعد میرا ٹرانسفر ہو گیا۔ وہ پولیس اسٹیشن تو ایک طرح سے سونے کی کان تھا۔ میں نے اپنا ٹرانسفر رکوانے کی کوشش کی تھی لیکن میری جگہ جس سب انسپکٹر کی تقرری ہوئی تھی۔ سنا ہے اس نے خاصی بھاری رقم دی تھی۔

رانا صاحب ان دنوں اسی علاقے میں تعینات تھے۔ انہوں نے اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے مجھے پولیس اسٹیشن میں بلالیا۔

میں اس وقت تک سب انسپکٹر ہو چکا تھا اور خاصا گھاگ بھی ہو گیا تھا۔ اب میرے پاس جدید ماڈل کی گاڑی بھی تھی اور میرا معیار زندگی بھی بہت بلند ہو چکا تھا۔

مجھ سے چھوٹا بھائی انجینئرنگ کر چکا تھا اور اب وہ جاب کی تلاش میں تھا۔ اس سے چھوٹا مظہر ایم بی بی ایس کے تھرڈ ایئر میں تھا اور سب سے چھوٹی بہن افشاں ابھی صرف آٹھویں میں تھی۔ میں گلشن چھوڑ کر اب کلفٹن کے علاقے میں رہ رہا تھا۔

ان ہی دنوں اماں کو میری شادی کی سوجھی۔ وہ تو خیر ایک عرصے سے میری شادی کرنا چاہتی تھیں لیکن میں خود ہی تیار نہیں تھا۔

اماں نے پھر ایک دن شادی کی بات نکالی تو میں پھر انہیں ٹال گیا۔

"وقار!" اماں سنجیدگی سے بولیں۔

"تو کیا بڑھاپے میں شادی کرے گا؟"

"اماں! کون سی میری عمر نکلی جارہی ہے۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔ "پھر شادی کرنے کے لیے کوئی ڈھنگ کی لڑکی بھی دیکھو۔"

"لڑکیاں تو میں نے کئی دیکھ رکھی ہیں۔" اماں نے کہا۔ "تو ہاں تو بھر۔"

"یہ بات چیت ناشتے کی ٹیبل پر ہو رہی تھی۔ میں نے جان چھڑانے کو کہا۔" اماں اس وقت تو میں ایک کیس کے سلسلے میں مصروف ہوں۔ بعد میں بات کروں گا۔"

اس بات کو تقریباً ایک مہینا گزر چکا تھا۔ میں اس دن ڈیوٹی پر تھا جب ایک لڑکی دستک دے کر میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ انتہائی حسین لڑکی تھی۔ چہرہ اتنا حسین تھا کہ نظریں ہٹانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ دراز قد اور پرکشش جسم کی مالک تھی۔ اس نے جدید تراش کا قیمتی لباس پہن رکھا تھا لیکن چہرے پر معصومیت نہیں تھی۔

"جی فرمایئے؟" میں نے سنبھل کر پوچھا۔

"مجھے ایک رپورٹ لکھوانا ہے۔" لڑکی نے کہا۔

"کیسی رپورٹ؟" میں نے پوچھا، پھر جلدی سے بولا۔ "آپ پلیز تشریف رکھیے کھڑی کیوں ہیں؟"

اس لڑکی نے مڑ کر کہا۔ "آیئے امی، بیٹھیں۔"

تب مجھے احساس ہوا کہ وہ تنہا نہیں ہے بلکہ اس کی والدہ بھی ساتھ ہیں۔

"میرا ایک بنگلا ہے۔" بوڑھی عورت نے کہا۔ "میں نے اس کا ایک پورشن کرائے پر اٹھا دیا تھا، کرائے دار چند ماہ تو پابندی سے کرایہ دیتے رہے، پھر اس میں وقفہ آنے لگا۔ اب انہوں نے گزشتہ چھ ماہ سے کرایہ ادا نہیں کیا ہے۔ میں نے جب زیادہ زور دیا تو انہوں نے کرایہ ادا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اب میں تنہا عورت ان لوگوں کا کیا بگاڑ سکتی ہوں۔"

"آپ کے کرائے دار کرتے کیا ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"باپ کسی کالج میں پڑھاتا ہے، دو بچے ہیں۔ ایک لڑکی اور لڑکا دونوں پڑھ رہے ہیں۔ ان کی ماں بھی کسی اسکول میں پڑھاتی ہے۔" بوڑھی عورت کے لہجے میں حقارت تھی۔

"لوگ تو شریف ہوں گے۔ پڑھنے پڑھانے والے لوگ عام طور پر شریف ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ارے توبہ کریں وقار صاحب؟" لڑکی نے منہ بنا کر کہا۔ "پرویز صاحب کالج کے بعد ٹیوشن پڑھاتے ہیں۔ پڑھنے والی زیادہ تر لڑکیاں ہیں۔ وہ اس عمر میں بھی اپنی اوچھی حرکتوں سے باز نہیں آتے۔ بیٹا بھی انتہائی آوارہ ہے۔ اس کے دوست بھی ہر وقت گھر میں گھسے رہتے ہیں۔"

میں نے اپنا پیڈ سنبھالتے ہوئے کہا۔ "اپنا ایڈریس بتائیں۔" لڑکی نے ایڈریس بتایا۔ پھر بولی۔ "میرا نام

رخشندہ ہے۔"
"بنگلا کس کے نام ہے؟" میں نے پوچھا۔"اس کا نام لکھوائیں۔"
"بنگلا تو ان کے نام ہے۔ مسز سیدہ صدیقی۔"
"دیکھیے مس رخشندہ۔" میں نے کہا۔"یہ کیس ہمارا نہیں ہے۔ اس کے لیے کورٹ جانا پڑے گا آپ کو۔"
"وقار صاحب! یہ تو میں بھی جانتی ہوں۔" رخشندہ نے کہا۔"لیکن جب تک کیس کا فیصلہ ہوگا، اس وقت تک تو میں بوڑھی ہو جاؤں گی۔ آپ بااختیار آفیسر ہیں۔ پلیز کچھ کریں اور ان بدمعاشوں سے ہماری جان چھڑائیں۔"
"مجھے کچھ سوچنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔"ایسا کریں۔ آپ کل اسی وقت یہاں آجائیں ابھی تو میں ایک میٹنگ میں جا رہا ہوں۔"
"چلیے کل ہی سہی۔" رخشندہ نے کہا اور بہت ادا سے بال جھٹک کر لہراتی ہوئی روانہ ہوگئی۔
اس قسم کے کیس قابل دست اندازی پولیس نہیں ہوتے، ہاں اگر مالک مکان اور کرائے دار میں جھگڑا ہو جائے تو پھر ہم مداخلت کر سکتے ہیں۔
میں کافی دیر اس مسئلے پر غور کرتا رہا۔ اس وقت انسپکٹر نصیر بھی آگیا۔ نصیر انتہائی شیطان قسم کا پولیس افسر تھا۔ وہ ہر قسم کا جائز ونا جائز کام کرنے میں ماہر تھا۔ میں نے اس سے تذکرہ کیا تو بولا۔"مسئلہ ہی کوئی نہیں۔ پارٹی اگر دو لاکھ روپے دے دے تو میں ایک ہفتے میں بنگلا خالی کرا سکتا ہوں۔"
"یار دو لاکھ زیادہ نہیں ہیں؟" میں نے پوچھا۔
"زیادہ؟" نصیر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔"میں تو پانچ لاکھ کہنے والا تھا لیکن تمہارے ان لوگوں سے تعلقات ہیں اس لیے میں نے دو لاکھ روپے کہے ہیں۔ پھر یہ دو لاکھ میں اکیلا تو نہیں کھاؤں گا۔ تم جانتے ہو اس بنگلے کی کم سے کم مالیت کیا ہوگی؟" نصیر نے کہا۔"وہ اس وقت ایک ڈیڑھ کروڑ کی مالیت کا ہوگا۔ ممکن ہے اس سے بھی زیادہ کا ہو۔"
دوسرے دن رخشندہ اکیلی آئی تھی۔ وہ آج کچھ زیادہ ہی بن سنور کر آئی تھی۔ اس نے بے تکلفی سے میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔"انسپکٹر صاحب! آپ نے ہمارے بارے میں کچھ سوچا؟"
"جی ہاں، میں اس وقت آپ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے کل بھی آپ کو بتایا تھا کہ کام پولیس کا نہیں ہے، لیکن میں آپ کا کام کرا دوں گا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔"اس کے لیے آپ کو کچھ پیسے خرچ کرنا ہوں گے۔"
"پیسوں کی آپ فکر مت کریں۔" رخشندہ جلدی سے بولی۔"آپ بس ہمارا کام کردیں۔" پھر وہ ہنس کر بولی۔"بائی دا وے کتنا خرچ آجائے گا۔"
"پانچ لاکھ۔" میں نے یوں کہا جیسے پانچ ہزار ہوں۔
"پانچ لاکھ کچھ زیادہ نہیں وقار صاحب؟" پھر وہ کچھ سوچ کر بولی۔"چلیں، ہم یہ رقم بھی دے دیں گے لیکن کام ہونا چاہیے۔ مجھے ایک ہفتے کے اندر قبضہ چاہیے۔"
"کام ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔"لیکن رقم آپ کو ایڈوانس میں دینا ہوگی۔"
"آپ کو مجھ پر اتنا تو اعتبار کرنا چاہیے۔" لڑکی نے منہ بنا کر کہا۔"اوکے، میں رقم ایڈوانس میں دے دوں گی۔ کیا ابھی دے دوں؟"
"ابھی اتنا کیش آپ کے پاس نہیں ہوگا اور میں صرف کیش لیتا ہوں۔"
"چلیے پھر میں کل آپ کو پے منٹ کر دوں گی۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔
اس کے جانے کے بعد میں سوچتا رہا کہ پہلی نظر میں مجھے یہ لڑکی بہت اچھی لگی لیکن آج تو مجھے کوئی پیشہ ور لڑکی لگ رہی تھی۔
نصیر یہ سن کر اچھل پڑا کہ میں نے دو کی بجائے پانچ لاکھ مانگے ہیں۔ میں نے کہا۔"رقم تو خیر مل ہی جائے گی، تم نے ان کا بنگلا خالی کرانے کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"
"ارے یار! وہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ کل ہی کچھ آدمیوں کو بھیج دوں گا۔ وہ ان لوگوں کا سامان باہر پھینک کر چابی مالک کے حوالے کر دیں گے۔ یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ جس کا قبضہ ہوتا ہے وہی مالک ہوتا ہے۔
رخشندہ دوسرے دن آئی مگر اس کی ماں بھی ساتھ تھی۔ رخشندہ نے اپنے شولڈر بیگ سے نوٹوں کی پانچ گڈیاں نکالیں اور بولی۔"گن لیں، پورے پانچ لاکھ ہیں۔"
"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا اور نوٹ اٹھا لیے۔
دو دن بعد ادھیڑ عمر کی ایک خاتون اور ایک نوعمر لڑکا تھانے آیا۔ خاتون نے بتایا کہ"کل رات ان کے گھر پر بدمعاشوں نے حملہ کیا تھا۔ توڑ پھوڑ بھی کی، زیورات لوٹے پھر سامان اٹھا کر باہر پھینک دیا۔"

''سامان باہر پھینک دیا؟'' میں چونکا تھا۔
''نہ صرف سامان پھینکا بلکہ گھر میں تالا لگا کر چلے گئے۔''
''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ تالا توڑ دو۔''
''انسپکٹر صاحب!'' خاتون نے کہا۔ ''ہم اصل میں کرائے پر رہتے تھے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ سب مالک مکان نے کرایا ہے۔ چار مہینے پہلے ہم نے یہ مکان ان سے خرید لیا تھا۔ پھر شاید مالک مکان کی نیت خراب ہوگئی ہو۔''
میں چونک کر بولا۔ ''اپنا ایڈریس بتایئے۔'' میں نے اپنا پیڈ سنبھالا۔ رخشندہ نے جو ایڈریس لکھوایا تھا وہ بھی پیڈ پر موجود تھا۔
انہوں نے ایڈریس بتایا تو میرے شبے کی تصدیق ہو گئی۔ یہ وہی پتا تھا جو رخشندہ لکھوا چکی تھی۔
''کیا آپ لوگ مکان کی پوری قیمت ادا کر چکے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔
''ان کے صرف پانچ لاکھ روپے باقی ہیں۔ ان سے یہ بھی طے ہوا تھا کہ بقیہ رقم وصول کرنے کے بعد وہ ہمیں مکان کا قبضہ دے دیں گی۔''
''آپ ایک درخواست لکھیے اور اس میں سب کچھ تفصیل سے لکھ دیجیے۔'' پھر میں کچھ سوچ کر بولا۔ ''آپ کے پاس اس کا ثبوت تو ہوگا؟''
''جی ہاں، پروفیسر صاحب کے پاس رسیدیں اور وہ اسٹیمپ پیپر موجود ہے جس پر مسز صدیقی کے بھی دستخط ہیں۔''
''اس کے لیے آپ کو عدالت جانا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔
''مکان کے لیے تو میں عدالت میں جاؤں گی ہی میں تو اس توڑ پھوڑ اور ڈکیتی کی رپورٹ درج کرانے آئی تھی۔ گھر کا فرنیچر اور زیورات پانچ چھ لاکھ روپے سے کم نہیں ہوں گے۔''
اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے درخواست لکھی اور میرے حوالے کردی۔
اس کے جانے کے بعد میں سوچتا رہا کہ رخشندہ اور اس کی ماں کا بیان تھا کہ پروفیسر صاحب ان کے کرائے دار ہیں۔ دوسری پارٹی کا دعویٰ تھا کہ وہ مکان خرید چکی ہے۔ ظاہر ہے ان دونوں میں سے کوئی غلط بیانی سے کام لے رہا تھا۔

اس وقت نصیر آگیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''نصیر تم نے وہ بنگلا خالی کرانے کسے بھیجا تھا؟''
''کیوں؟'' اس نے الجھ کر پوچھا۔
''ان لوگوں نے وہاں توڑ پھوڑ تو کی ہی ہے، وہ وہاں سے زیورات، نقد رقم اور قیمتی سامان بھی لے گئے ہیں۔''
''ہاں تو پھر؟''
''پھر یہ کہ دوسری پارٹی ڈکیتی اور توڑ پھوڑ کی رپورٹ درج کرانے آگئی ہے۔'' پھر میں کچھ سوچ کر بولا۔ ''مجھے یہ معاملہ گڑبڑ لگ رہا ہے۔'' یہ کہہ کر میں اپنے آفس سے باہر نکل آیا۔ رخشندہ کے بنگلے کا ایڈریس میرے پاس ہی تھا۔ میں نے کچھ سوچے سمجھے بغیر اپنی گاڑی کا رخ رخشندہ کے بنگلے کی طرف کر دیا۔
اس وقت رخشندہ اور اس کی ماں لان میں بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے کوئی خاص گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ رخشندہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''جی انسپکٹر صاحب کیسے آنا ہوا؟''
''میں اس طرف آیا تھا تو سوچا کہ آپ لوگوں سے بھی ملتا چلوں۔'' پھر موضوع بدل کر بولا۔ ''آپ کا کام تو ہو گیا نا؟''
''ہم نے رقم بھی تو آپ کو منہ مانگی دی تھی۔'' رخشندہ نے رعونت سے کہا۔ اس وقت تو رخشندہ وہ رخشندہ نہیں لگ رہی تھی جو پولیس اسٹیشن آئی تھی۔ وہ غضب کی اداکارہ تھی۔
میں نے ہنس کر کہا۔ ''ویسے یہ بنگلا پروفیسر صاحب نے خرید لیا تھا؟''
''ہاں، وہ لوگوں سے یہ بھی کہتا ہے۔ اس بنگلے کے تو دعوے دار اور بھی ہیں۔'' مسز صدیقی (رخشندہ کی ماں) نے منہ بنا کر کہا۔
''ویسے اب تو آپ کا کام ہو گیا ہے۔ مجھ سے تو حقیقت نہ چھپائیں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ نے ان لوگوں سے بنگلے کی پوری قیمت لے لی۔ یہ بات آپ کو نہیں چھپانا چاہیے تھی۔''
''مما!'' لڑکی نے کہا۔ ''یہ صاحب مزید پیسوں کے چکر میں ہیں۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔
''آپ نے ہمارا کام کردیا اور اس کا معاوضہ بھی وصول کرلیا۔ اب آپ چلتے پھرتے نظر آئیں۔ میں نہیں چاہتی کہ لوگ پولیس کو یہاں دیکھ کر باتیں بنائیں۔''

’’مجھے صرف یہ بتانا ہے کہ آپ نے مکان کا سودا پروفیسر صاحب سے کیا تھا یا نہیں؟‘‘ میں نے مسز صدیقی سے پوچھا۔
’’مما! لگتا ہے یہ آفیسر بغیر ہڈی کے نہیں ٹلے گا۔‘‘
’’اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔‘‘ میں نے کہا۔
مسز صدیقی نے اپنا پرس کھولا اور اس میں سے نوٹوں کی نئی گڈیاں نکال کر میری طرف پھینک دیں۔ ’’اب یہ اٹھاؤ اور آیندہ ادھر کا رخ مت کرنا۔‘‘
’’نہیں کروں گا لیکن آپ یہ تو بتا دیں کہ......‘‘
’’ہاں، وہ پروفیسر یہ مکان خرید چکا ہے لیکن مجھے اس سے زیادہ اچھا گاہک مل گیا ہے۔‘‘
’’او کے مسز صدیقی۔ اور ہر جگہ نوٹوں کی نمائش مت کیا کریں۔ اپنے پیسے اٹھالیں۔‘‘ یہ کہہ کر میں باہر نکل آیا۔
میرے دماغ میں آگ سی لگی ہوئی ہے۔ اس گھٹیا، فاحشہ لڑکی نے میری یوں بے عزتی کر دی تھی جیسے میں اس کا خانگی ملازم ہوں۔ اچانک میرے اندر سے آواز آئی۔
’’وقار صاحب! آپ پہلے کب قابلِ عزت تھے۔‘‘ پھر ابا کی آواز کانوں میں گونجی۔ ’’وقار بیٹا! ایماندار لوگوں کی ایک عزت ہوتی ہے۔ رشوت خوروں کو تو چار پیسے کھلا کر ہر آدمی ذلیل سمجھتا ہے۔‘‘ اس سے قبل میں نے کبھی اتنا نہیں سوچا تھا۔ مجھے رہ رہ کر رخشندہ کی بات یاد آرہی تھی۔ ’’مما! یہ آفیسر ہڈی کے بغیر نہیں ٹلے گا۔‘‘ گویا اس نے مجھے میرے منہ پر کتا کہہ دیا تھا۔
گھر پہنچتے پہنچتے میں فیصلہ کر چکا تھا کہ آج کے بعد میرے لیے بالائی آمدنی کا ایک روپیا بھی حرام ہے۔ میں صرف اور صرف اپنی تنخواہ میں گزارا کروں گا۔
دوسرے دن آفس پہنچ کر میں نے اشرف کو ٹیلی فون کیا اور اسے فوراً تھانے پہنچنے کو کہا۔
اشرف شہر کا چھٹا ہوا غنڈہ تھا۔ وہ کئی دفعہ جیل بھی جا چکا تھا۔
وہ پندرہ منٹ کے اندر اندر میرے سامنے بیٹھا پوچھ رہا تھا آج میں آپ کو کیسے یاد آگیا سر؟
’’اشرف! مجھے تم سے ایک ضروری کام ہے۔ مجھے ایک بنگلا خالی کرانا ہے۔‘‘
’’یہ تو میرا روزمرہ کا کام ہے سر۔‘‘ اشرف یہ کہہ کر بے ڈھنگے پن سے ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔ ’’صاحب! آپ برا نہ مانیں تو میں ایک بات کہوں؟‘‘
’’ہاں ہاں بولو۔‘‘ میں نے کہا۔
’’میں کام کا معاوضہ ایڈوانس لوں گا۔‘‘
مجھے اس کی بات پر غصہ تو آیا لیکن میں برداشت کر گیا۔
’’صاحب! ابھی کچھ دن پہلے نصیر صاحب نے بھی ایسا ہی کام کرایا تھا۔ انہوں نے پیسے اب تک نہیں دیے۔‘‘
میں نے دراز کھولی تو چونک اٹھا۔ اس میں رخشندہ کے دیے ہوئے پیسے موجود تھے۔ مجھے اپنے بھلکو پن پر غصہ آیا کہ اتنی بڑی رقم یوں میز کی دراز میں چھوڑ دی۔ میں نے اس میں سے رقم نکال کر اشرف کو دے دی۔
’’اس مکان کا پتا بتاتا ہوں جسے خالی کرانا ہے۔‘‘
میں نے اسے بنگلے کا پتا بتایا تو اشرف کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ میں نے ہنس کر کہا۔ ’’حیران بعد میں ہو لینا۔ اب جاؤ اور اس مکان کی چابی میرے حوالے کرنا۔‘‘
اس کے جانے کے بعد میں نے پروفیسر صاحب کو ٹیلی فون کرنے کا ارادہ کیا، پھر خود ہی وہاں جانے کا فیصلہ کرلیا۔ میرے پاس ان کا موجودہ ایڈریس تھا۔ میں اس دن وہاں نہ جاسکا فرصت ہی نہیں ملی۔ دوسرے دن شام کو میں وہاں پہنچ گیا۔
پروفیسر صاحب اس وقت گھر پر موجود نہیں تھے، ان کی بیگم تھیں۔ انہوں نے بہت خندہ پیشانی سے میرا استقبال کیا۔ میں انہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا اس لیے انہیں کچھ نہیں بتایا۔ وہ لوگ اس وقت عارضی طور پر شیریں جناح کالونی کے انتہائی خستہ حال مکان میں رہ رہے تھے۔
اچانک ایک لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ میں اسے دیکھ کر اپنی نظریں ہٹانا بھول گیا۔ وہ انتہائی خوب صورت اور پُرکشش لڑکی تھی۔ اس نے سر پر اسکارف باندھ رکھا تھا جو اس کے حسن اور معصومیت میں اضافہ کر رہا تھا۔
’’یہ میری بیٹی نورین ہے۔‘‘ پروفیسر صاحب کی بیگم نے کہا۔
اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ میں نے اسکرین پر نظر ڈالی وہ اشرف کا فون تھا۔ میں نے بٹن دبا کر کال ریسیو کرلی۔ ’’ہاں اشرف کیا خبر ہے؟‘‘
’’کام ہوگیا ہے صاحب۔‘‘ اشرف نے ان دونوں ماں بیٹی کو سرجانی ٹاؤن کے ایک مکان میں بند کر دیا ہے۔
’’تم تین تلوار پر پہنچو میں بھی وہاں پہنچ رہا ہوں۔‘‘

میں نے سلسلہ منقطع کردیا اور بولا۔ ''میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔ آپ کے لیے ایک خوش خبری ہے۔ میں واپس آکر بتاؤں گا۔ اس وقت تک پروفیسر صاحب بھی آچکے ہوں گے۔''

☆......☆

میں بنگلے کی چابی لے کر واپس پہنچا تو دروازہ نورین نے کھولا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی کشش تھی۔ میں اسے مبہوت ہوکر دیکھتا رہا۔

''کون ہے بیٹی؟'' اندر سے کسی مرد کی آواز آئی۔

''ابو یہ پولیس آفیسر ہیں۔'' نورین نے کہا۔

دوسرے ہی لمحے بولنے والا وہاں آگیا۔ میں انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ پروفیسر شمس الدین صاحب تھے۔ وہ ابا کے بہت اچھے دوست تھے اور میرے استاد بھی رہ چکے تھے۔

میں نے جلدی سے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے میرے سلام کا جواب دے کر پوچھا۔ ''تم...... ابرار کے بیٹے ہو؟''

''جی ہاں سر۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں انہی کا بیٹا ہوں۔''

''آؤ اندر آجاؤ۔'' وہ مجھے چھوٹے سے ایک کمرے میں لے گئے جو ڈرائنگ روم، سٹنگ روم اور بیڈروم کے طور پر استعمال ہورہا تھا۔

ان کی بیگم بھی آگئیں اور ہنس کر بولیں۔ ''مجھے بھی کچھ شبہ تو تھا کہ تم وقار ہو۔''

''اور بیٹا آج کل کس پولیس اسٹیشن میں ہو؟'' پروفیسر صاحب نے پوچھا۔

''میں درخشاں میں ہوں سر۔'' میں نے کہا۔ پھر میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر بنگلے کی چابیاں نکالیں اور ان کے سامنے رکھ دیں۔

''یہ...... کیا ہے؟'' پروفیسر صاحب سرد لہجے میں بولے۔

''یہ آپ کے مکان کی چابیاں ہیں سر۔'' میں نے کہا۔ ''جیسے ان لوگوں نے آپ سے مکان خالی کرایا تھا اسی طرح میں نے بھی مکان خالی کرالیا ہے۔''

''گویا ان کو ڈرا دھمکا کر؟'' پروفیسر صاحب نے ناگواری سے کہا۔ ''مجھے یہ ہی کچھ کرنا ہوتا برخوردار تو بہت پہلے کرچکا ہوتا۔ پھر مجھ میں اور ان لوگوں میں فرق ہی کیا رہ جاتا۔ مجھے شرم آتی ہے یہ سوچ کر کہ تم ابرار کے بیٹے ہو۔ تم نے اپنے باپ سے کچھ بھی نہیں سیکھا؟ یہ چابیاں انہیں واپس کردو۔ میری حلال کی کمائی ہے۔ اگر اللہ کو منظور ہوا تو مجھے میرا مکان واپس مل جائے گا۔''

''سر! میں نے تو......''

''چابیاں اٹھاؤ اور یہاں سے جاؤ۔'' وہ یکدم برہم ہوگئے۔

میں چابیاں لے کر بوجھل قدموں سے باہر نکل گیا۔

میں نے اشرف کو چابیاں واپس دیں تو وہ بھی حیران ہوگیا اور بولا۔ ''صاحب! میں نے اتنی محنت سے یہ کام کیا تھا اور آپ......''

میں نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے استعفیٰ لکھا اور اسے ڈی آئی جی صاحب کو بھیج کر خود گھر آگیا۔ میرا جتنا بینک بیلنس تھا، وہ سب میں نے رفاہی اداروں کو دے دیا۔ میں گلشن سے فیڈرل بی ایریا کے ایک مکان میں شفٹ ہوگیا تھا۔ وہ مکان چھوٹا سا تھا لیکن مجھے وہاں سکون ملتا تھا۔ میں ملازمت تلاش کرنے لگا۔

ایک دن میں دفتروں کے دھکے کھاتے کھاتے تھکا ہارا گھر واپس آیا تو پروفیسر صاحب کو اپنے گھر میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

میں نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے بڑھ کر مجھے گلے لگالیا اور بولے۔ ''اب مجھے لگ رہا ہے کہ میں ابرار کے بیٹے سے مل رہا ہوں۔''

انہیں نہ جانے کہاں سے معلوم ہوگیا تھا کہ میں نے پولیس کی ملازمت چھوڑ دی ہے۔ پھر مجھے ایک سیکیورٹی ایجنسی میں خاصی معقول ملازمت مل گئی۔

اچھی گزری ہوئی زندگی اب مجھے ایک ڈراؤنا خواب لگتی ہے۔ مجھے حرام کے پیسے سے گھن آتی ہے۔ میں اپنے بیٹے کو بھی ہمیشہ ایمان داری کی تلقین کرتا ہوں۔ جی ہاں میری شادی کو پانچ سال ہوچکے ہیں۔ میں ایک بیٹے اور ایک بیٹی کا باپ ہوں اور صرف ایک بیوی کا شوہر ہوں۔ آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ میری بیوی کون ہے۔ جی ہاں میری بیوی نورین ہے۔ یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ایک کالج میں لیکچررشپ کرلی تھی۔ میرا چھوٹا سا خوب صورت گھوارہ ہے کہ در توبہ ابھی بند نہیں ہوا۔

میری شادی کو کئی سال ہو گئے تھے۔ میں کئی بچوں کی ماں بن گئی تھی کہ ایک دن خبر آئی، میری ماں مجھے چھوڑ کر دنیا سے چلی گئی ہے۔ یہ صدمہ میرے لیے بڑا جانکاہ تھا۔ بہت دنوں کے بعد بہت آہستہ آہستہ میں نارمل ہوئی۔ اس میں بھی میرے شوہر کا بڑا ہاتھ تھا۔ کچھ عرصے کے بعد امی کے ترکے سے مجھے میرا حصہ ملا۔ یہ ایک خاصی معقول رقم تھی۔ میں نے یہ رقم شاہد کو دینا چاہی تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔

''نہیں، یہ تمہاری امانت ہے تم اپنے ہی پاس رکھو۔''

''میں کیا کروں گی اس رقم کا۔ میری ہر ضرورت تو آپ پوری کر دیتے ہیں۔''

ایک دن شاہد نے کہا۔ ''تم اس رقم سے ماں کے نام پر کوئی فلاحی ادارہ قائم کردو یہ تمہاری جانب سے تمہاری ماں کے لیے صدقۂ جاریہ ہوگا۔''

بے توقیر جنت

جناب مدیراعلی

السلام علیکم

میں قلمکار نہیں ہوں اور نہ کبھی کسی رسالے میں کوئی کہانی لکھی ہے۔ پہلی بار ایک کہانی لکھ رہی ہوں۔ یہ کہانی سو فیصد سچ پر مبنی ہے۔ مریم اولڈ ہاؤس کے نام سے میں نے ایک اولڈ ہاؤس کھول رکھا ہے۔ یہیں میری اس سے ملاقات ہوئی اور میں اس کی روداد کو کہانی کی شکل میں بھیج رہی ہوں اگر کوئی غلطی نظر آئے تو اسے درست کرلیں۔

بنت مریم

(کراچی)



مجھے ان کی یہ بات پسند آئی اور میں سوچنے لگی۔ مجھے کس نوعیت کا فلاحی ادارہ قائم کرنا چاہیے۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ مجھے اولڈ ہوم قائم کرنا چاہیے جس میں بے سہارا ماؤں کی رہائش اور دیگر سہولتوں کا بندوبست ہو۔ میں نے اپنے شوہر کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا تو انہیں نہ صرف یہ آئیڈیا پسند آیا بلکہ انہوں نے اس کا نام بھی تجویز کر دیا۔

''بنت مریم اولڈ ہاؤس۔ یہ نام کیسا رہے گا؟''

''بہت اچھا۔''

واضح رہے کہ میری والدہ کا نام مریم زمانی تھا۔ ایک خاصی بڑی اور کئی منزلوں پر مشتمل بلڈنگ خرید کر اس میں ہم نے بنت مریم اولڈ ہاؤس قائم کر دیا۔ میری اصل کہانی اس اولڈ ہاؤس سے ہی شروع ہوتی ہے۔ اس اولڈ ہاؤس کو چلاتے ہوئے مجھے کئی سال بیت گئے ہیں۔ اس دوران مجھے بڑے عجیب وغریب قسم کے تجربات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

یہ بتانا میں ضروری سمجھتی ہوں کہ میں نے اپنے اس اولڈ ہاؤس کو صرف بے سہارا خواتین کے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔ مردوں کا داخلہ یہاں ممنوع ہے۔

دنیا اتنی ترقی کر گئی ہے۔ آج کی عورت کوئی بھی ایسی فیلڈ نہیں جس میں مردوں سے پیچھے ہو، اس کے باوجود آج بھی عورتوں کی بہت بڑی تعداد مظلوم ہے۔ اس پر ایک نہیں طرح طرح کے مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔ اگر بیٹے کو جنم نہ دے تو یہ بھی اس کا قصور۔ اس کی سزا اسے دی جاتی ہے۔ اپنے جائز حقوق مانگنے والی بھی سزا کی مستحق قرار دی جاتی ہے۔ اپنے بال بچوں کی روزی روٹی کے لیے گھر سے نکلنے والی عورت کو شک و شبے کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اس پر بہتان لگا کر اس کو مورد الزام ٹھہرا کر عورت کی تذلیل کی جاتی ہے۔ بالغ اور جوان لڑکی اگر اپنی پسند سے اپنے شریکِ حیات کا انتخاب کر لے تو یہ بھی اس کا ناقابلِ معافی گناہ ہوتا ہے۔

طرح طرح سے ستائی ہوئی عورتیں میرے اولڈ ہاؤس میں پناہ لینے آتی ہیں مجھے سب سے ہمدردی ہوتی ہے اور میں سب کے زخموں پر مرہم رکھنے کی بھرپور کوشش کرتی ہوں لیکن سب سے زیادہ دکھ مجھے اس وقت ہوتا ہے جب کوئی ضعیف اور عمر رسیدہ خاتون کو اس کی اپنی اولاد اس اولڈ ہاؤس میں چھوڑ جاتی ہے۔ میں ایسے بدنصیب بیٹے یا بیٹی کو سمجھاتی ہوں کہ ایسا نہ کرو جس ماں نے تمہیں جنم دیا، پال پوس کر بڑا کیا، لکھا پڑھا کر انسان بنایا، اس کا تم پر احسانِ عظیم ہے۔ تمہیں چاہیے کہ اس وقت ان کی خدمت کرو، اللہ نے اگر تمہیں اس کا موقع دیا ہے کہ تم ان کے احسانات کا بدلہ چکاؤ تو تم خود کو اس سے کیوں محروم رکھتے ہو؟ تمہاری جنت تو تمہاری ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ تم اس جنت کو پانے کے لیے اسے حاصل کرنے کے لیے اپنا کردار ادا کیوں نہیں کرتے؟ بوڑھی ماں کی خدمت کیوں نہیں کرتے؟ اس سے پیچھا چھڑانے کی کیوں کوشش کر رہے ہو؟ اسے اولڈ ہاؤس میں داخل کروا کر کیوں اپنے لیے عذابِ عظیم مول لینا چاہتے ہو؟

میری باتوں سے متاثر ہو کر اکثر لڑکے لڑکیاں اپنی ماں کو ہمارے اولڈ ہاؤس میں داخل کرانے کا ارادہ ملتوی کر دیتے ہیں اور اپنی ماں کو اپنی جنت کو اپنے گھر واپس لے جاتے ہیں۔

پھر یوں ہونے لگا کہ اپنی ماں کو اولڈ ہاؤس لانے والے اپنے آپ کو اپنی ماں کی اولاد ہی ظاہر نہیں کرتے۔ کوئی کہتا دور پار کے رشتے دار ہیں۔ کوئی بتاتا۔ ہم نے تو محض انسانی ہمدردی کے تحت انہیں یہاں پہنچایا ہے۔ ان کے آگے پیچھے کوئی نہیں۔ یہ بے چاری در در کی ٹھوکریں کھا رہی تھیں۔ اس لیے ہم انہیں یہاں لے آئے کہ یہاں وہ سہولت کے ساتھ اپنی زندگی کے باقی دن گزار لیں۔ بعد میں مجھے معلوم ہوتا کہ یہ یا ایسی باتیں کرنے والے اس مظلوم اور بدنصیب عورت کی اپنی اولاد ہے۔ جو اب انہیں اپنے ساتھ رکھنا اور ان کی خدمت کرنا نہیں چاہتی۔ انہیں اپنے لیے بوجھ سمجھتے ہیں۔ بعض مائیں یہ بتاتیں کہ انہیں بیٹے بہو اس لیے اپنے ساتھ رکھنا نہیں چاہتے کہ بڑے اور بزرگ ہونے کے ناتے ہم انہیں اور ان کے بچوں کو ناپسندیدہ باتوں سے روکتے ٹوکتے تھے۔

ہمارا یہ کہنا انہیں ناگوار ہوتا تھا کہ دوپٹا سر اور سینے کو ڈھکنے کے لیے ہوتا ہے گلے میں بیٹے کی طرح ڈالنے کے لیے نہیں ہوتا۔ ہم اگر یہ کہتے کہ سیانی لڑکیوں کو اتنی آزادی نہ دو کہ بعد میں وہ تمہاری شرمندگی کا سبب بنے تو بیٹی کے ساتھ ماں باپ کو ہماری بات زہر لگتی تھی۔ بہو کو جو اونچ نیچ سمجھاتی تھی، فیشن، سیر و تفریح اور سہیلیوں کے لیے بےکار وقت ضائع کرنے کی بجائے گھر بار اور بال بچوں کے لیے ایک اچھی بیوی اور اچھی ماں کا کردار ادا کرنے کی ہدایت کرتی تو بہو بیگم ہمیں اپنی آزادی کے راستے میں روڑا تصور کرتی۔ ایسے میں وہ لوگ اپنے گھر میں ہمارا وجود کیسے گوارا

کر سکتے تھے؟

ایسی ہی ماؤں میں ایک ماں فریدہ بیگم بھی ہیں۔ جنہیں ایک دن ایک خاتون لے کر ہمارے اولڈ ہاؤس آئیں اور بتایا کہ یہ میری خالہ ہیں۔ جب کہ فریدہ بیگم انہیں مسلسل بٹی کہہ کر مخاطب کر رہی تھیں۔ مجھے اس بات پر شبہ گزرا۔ میں نے خالہ کہنے والی خاتون سے کہا۔

''آپ تو انہیں اپنی خالہ بتاتی ہیں مگر یہ آپ کو بیٹی کہہ کر پکارتی ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟''

خاتون نے جواب دیا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ خالہ دس سال سے میرے پاس ہیں اس لیے یہ مجھے بیٹی ہی کہتی ہیں۔''

پھر جب خاتون نے بنت مریم اولڈ ہاؤس کا فارم پُر کیا تو فریدہ بیگم کے شوہر اور خاتون کے والد کے خانوں میں لکھے گئے نام ایک ہی تھے۔ شاید وہ یہ غلطی بے دھیانی میں کر گئی تھیں۔ میں نے جب ان کی توجہ اس جانب مبذول کرائی تو وہ چونکیں۔ ''ارے میں یہ کیا لکھ گئی۔ میرے والد کا نام تو......''

میں نے انہیں ٹوکا۔ ''دیکھیے خاتون اگر یہ آپ کی حقیقی ماں ہیں اور آپ خالہ بتا کر مجھے دھوکا دینے کی کوشش کر رہی ہیں تو آپ بہت بڑا جرم کر رہی ہیں۔ ہمارے ہاں پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا کے لوگ آتے رہتے ہیں۔ انہوں نے اصل حقیقت دنیا کو دکھا دی تو آپ بڑی مشکلوں میں پھنس جائیں گی۔''

مگر وہ بڑی ڈھیٹ عورت تھی۔ بڑی ڈھٹائی سے بولی۔ ''آپ کو اگر میری بات کا یقین نہیں تو میں انہیں کہیں اور داخل کرادوں گی۔''

مجھے فریدہ بیگم کی حالتِ زار دیکھ کر ترس آگیا۔ ان کے ہاتھ پیر کے ناخن بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ کپڑے بے حد گندے اور پھٹے ہوئے تھے۔ بال سوکھے اور الجھے ہوئے تھے۔ چہرے پر اداسی اور مردنی چھائی ہوئی تھی۔

میں نے خاتون سے پوچھا۔ ''فریدہ بیگم کا کوئی والی وارث نہیں؟''

''ان کی اولاد ہے مگر پوچھتی نہیں۔ میرے گھر چھوڑ کر گئے تو پھر پلٹ کر نہیں آئے۔''

میں نے جب انہیں احساس دلایا۔ ''خالہ بھی تو ماں کی طرح ہوتی ہے۔ پھر انہیں آپ اپنے گھر میں رکھنا کیوں نہیں چاہتیں؟''

''آپ نہیں جانتیں۔'' انہوں نے بڑے دکھ کے ساتھ کہا۔ ''میں سسرال میں رہتی ہوں، اس لیے اپنے کسی عزیز رشتے دار کو زیادہ دنوں اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتی۔ ان کی وجہ سے کئی بار معاملات بڑے سنجیدہ ہو گئے۔''

خاتون کے جانے کے بعد ہم نے فریدہ بیگم کو نہلایا دھلایا، صاف کپڑے پہنائے، ان کے بڑھے ہوئے ناخن کاٹے، سر میں تیل ڈال کر کنگھی کی۔ اس طرح انہیں بڑا سکون ملا مگر خوش ہونے کی بجائے ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا اور وہ ٹھنڈی آہیں بھرنے لگیں۔

ایک ہفتے بعد صبر وضبط کا یہ رہا سہا بندھن بھی ٹوٹ گیا اور بیٹی کا نام لے لے کر وہ رونے پیٹنے لگیں۔ ''ہائے میری قسمت! مجھ بدنصیب کو کیا معلوم تھا کہ جس بیٹی کو جنم دینے سے لے کر اسے اس کے گھر کی رانی بنانے تک اپنی راتوں کی نیندیں اور دن کا چین مدتوں برباد کیا وہ بیٹی میرے اس بڑھاپے میں میری خدمت کرنے کی بجائے مجھے اس طرح گھر بدر کر دے گی۔''

''تو کیا وہ آپ کی بھانجی نہیں؟''

''نہیں، وہ جھوٹی ہے، مکار ہے، میں اس کی خالہ نہیں اس کی ماں ہوں، حقیقی ماں ہوں۔''

''اگر یہ بات ہے تو آپ کو اس کی موجودگی میں جب وہ آپ کو یہاں لے کر آئی تھی اسی وقت کہہ دینا چاہیے تھا۔ یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ میں اس کی حقیقی ماں ہوں۔''

''کیسے کہہ دیتی۔ اس نے تو مجھے یہاں لانے سے پہلے یہ کہہ دیا کہ وہاں میں آپ کو اپنی خالہ بتاؤں گی اور دھمکی دی تھی کہ اگر آپ نے وہاں مجھے جھٹلانے کی کوشش کی تو گھر واپس لا کر ایک کمرے میں قید کر دوں گی اور بھوکا پیاسا رکھ کر ماردوں گی۔''

''اف میرے خدا۔'' میں لرز کر رہ گئی۔ ''تیری دنیا میں ایسی ظالم بیٹیاں بھی ہوتی ہیں جو اپنے پاس اپنی ماں کا وجود برداشت نہیں کر سکتیں جو بھوکا پیاسا رکھ کر مارنے کی دھمکی دیتی ہیں۔''

پھر یوں ہوا کہ کئی دن بعد فریدہ کی بہن کا دبئی سے فون آیا تو ان سے معلوم ہوا۔ انہوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ فریدہ بیگم کو اولڈ ہوم پہنچانے والی ان کی بھانجی نہیں، سگی بیٹی ہے۔

اس کے بعد جب ایک بار بدنصیب بیٹی کا فون آیا اور اس نے پوچھا کہ ''میری خالہ خیریت سے تو ہیں؟''

تو میں نے اس سے کہا۔ تمہاری خالہ کا ٹیلی فون دبئی سے آیا تھا۔ انہوں نے تمہارے سفید جھوٹ کا پول کھول دیا ہے۔ انہوں نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے کہ فریدہ بیگم تمہاری سگی ماں ہیں۔

اب اس نے اپنی غلطی تسلیم کی۔ اعتراف کیا کہ ہاں وہ میری ماں ہی ہیں مگر ساتھ ہی یہ عذر بھی پیش کیا کہ یہ سب کچھ میں نے اپنی مجبوریوں کے تحت کیا ہے۔ ہماری مالی حالت ایسی نہیں کہ ہم ان کی کفالت کر سکیں۔

اس کا یہ عذر میرے لیے قابلِ قبول نہیں تھا۔ اس کے لائف اسٹائل سے ہرگز اس بات کا احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کوئی غریب عورت ہے اور اس کے وسائل اتنے محدود ہیں کہ اپنی ماں کی کفالت بھی نہ کر سکے۔

بنتِ مریم اولڈ ہاؤس میں اکثر میڈیا کے لوگ آتے ہیں اور یہاں کی مظلوم خواتین سے مل کر ان کی کہانیاں سنتے ہیں جنھیں بعد میں اپنے اخبار یا چینل میں پیش کرتے ہیں۔

فریدہ بیگم کی حالت یہ ہے کہ کسی کی بھی آہٹ سنتی ہیں تو چونک پڑتی ہیں۔ ''تمہیں میری بیٹی نے تو نہیں بھیجا۔ وہ کیسی ہے؟ اسے اور اس کے بچوں کو دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔ مجھے اس کے پاس لے چلو۔''

''بڑی مہربانی ہوگی بیٹے! مجھے میرے گھر پہنچا دو۔''

ایک دن ایک صحافی آیا تو اسے دیکھ کر بھی فریدہ بیگم رونے پیٹنے لگیں۔ ''تمہیں میری بیٹی نے بھیجا ہے نا؟ وہ میرے لیے بہت بے چین ہوگی۔ میں بھی اس کے اور اس کے بال بچوں کے لیے بہت تڑپتی ہوں۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔''

فریدہ بیگم کی حالت دیکھ کر صحافی نے پوچھا۔ ''کیا انہیں کوئی زور زبردستی چھوڑ گیا ہے؟ ان کے بال بچوں سے انہیں جدا کر دیا ہے؟''

''جس بیٹی اور اس کے بال بچوں کے لیے وہ تڑپتی ہیں، اسی بدنصیب بیٹی نے انہیں یہاں لا کر چھوڑا ہے۔'' میں بولے بغیر نہ رہ سکی۔

''اوہ!'' صحافی نے حیرت کا اظہار کیا۔ ''ان کی کیا کہانی ہے؟''

''بڑی نصیبوں جلی ہیں بے چاری۔ آپ انہی سے پوچھیے ان کی روداد غم۔''

صحافی نے پہلے تو فریدہ بیگم سے بڑی محبت اور اپنائیت کا اظہار کیا اور کہا۔ ''میں آپ کی ہر ممکن طریقے پر مدد کروں گا۔ آپ کو آپ کے بچھڑے ہوئے عزیزوں سے ملاؤں گا لیکن پہلے آپ اپنے بارے میں میرے ہر سوال کا جواب دیجیے۔''

''پوچھیے! مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔''

''پہلے آپ اپنے اور اپنے شوہر کے بارے میں بتائیے۔''

''میری پیدائش اجمیر شریف کی ہے۔ میرے شوہر کا تعلق دہلی سے تھا۔ ہم لوگ ہجرت کر کے پاکستان آئے تو میرے شوہر نے ایک بینک میں ملازمت کر لی۔ یہاں ہمارا بڑا اچھا وقت گزر رہا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہم دونوں ماشاء اللہ پانچ بچوں کے ماں باپ بن گئے۔ دو بیٹے اور تین بیٹیاں۔ بچوں کو ہم نے پڑھانے لکھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہمارے ہنستے بستے گھر میں ایک دن کہرام مچ گیا جب ہمارا ایک جوان بیٹا دہشت گردی کا شکار بن گیا۔ خودکش بم دھماکے میں جہاں دوسرے بے گناہ لوگ لقمۂ اجل بن گئے، وہاں ہمارے گھر کا بھی ایک روشن چراغ بجھ گیا۔ ابھی بیٹے کا صدمہ کم نہیں ہوا تھا کہ میرے شوہر بھی ایک حادثے کا شکار ہو کر ہمارا ساتھ چھوڑ گئے۔ میری تو دنیا ہی اندھیر ہوگئی۔ میرا دوسرا بیٹا کویت میں اور دو بیٹیاں لندن میں رہتی ہیں۔ اس لیے شوہر کے گزر جانے کے بعد مجھے اپنی تیسری بیٹی کے گھر میں رہنا پڑا۔ میں یہاں اپنی قسمت پر روتی اور آنسو بہاتی رہتی تھی۔ زمانے کی ستم ظریفی دیکھیے کہ مجھ دکھیاری کا رونا دھونا بھی اس گھر کے لوگوں سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ یوں تو سب ہی لوگ کہتے۔ مرنے والوں کو کب تک روئیں گی؟ مگر خاص طور پر بیٹی کی نندیں میری گریہ و زاری کا بہت زیادہ برا مناتی تھیں۔ ان سب کا کہنا تھا بس بہت رو دھو چکیں۔ اب ہنسیے بولیے۔

مگر جس کا جواں بیٹا مر جائے، جس کا سہاگ اجڑ جائے وہ بھلا کیسے ہنسے بولے؟ بجائے اس کے کہ کوئی میری دلجوئی کرتا۔ سب اپنی اپنی دھن میں مگن رہتے۔ بیٹی اپنی ملازمت میں مصروف رہتی۔ اس کی نندیں اور میری نواسیاں کالج اور یونیورسٹی چلی جاتیں۔ میں اکیلے گھر میں اپنی قسمت پر آنسو بہاتی رہتی۔''

''پھر یہاں پہنچانے کا پروگرام کیسے بنا؟''

ایک دن بیٹی نے کہا۔ ''امی! ہم آپ کو ایک ایسی جگہ لے جاتے ہیں جہاں آپ کا ماحول تبدیل ہو جائے گا۔ آپ کی طبیعت بہل جائے گی۔ وہاں آپ کا خیال رکھا جائے گا۔

وہاں آپ ہنسیں گی، بولیں گی۔ آپ کا دل غموں کے بوجھ سے ہلکا ہو جائے گا۔''

مجھے اس کی باتیں سن کر اس بات کی خوشی ہوئی کہ میری بیٹی کو میرے دکھوں کا احساس ہے۔ وہ مجھے غم والم کے اندھیرے سے نکالنا چاہتی ہے۔ اس لیے کسی اچھی جگہ مجھے لے جانا چاہتی ہے۔

''تو آپ کو یہاں آنے تک اس بات کا علم نہیں تھا کہ آپ کی بیٹی آپ کو اولڈ ہاؤس میں لانے والی ہے؟''

''نہ صرف علم نہیں تھا بلکہ اس نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ وہاں میں آپ کو اپنی خالہ بتاؤں گی۔''

''اس کے بعد بھی آپ کو کوئی شک وشبہ نہ ہوا؟''

''اس کے بعد تو نہیں، البتہ جب راستے میں اس نے کہا۔ ''اگر آپ نے میری کسی بات کی تردید کی یا جھٹلانے کی کوشش کی تو گھر واپس آکر میں آپ کو بھوکا پیاسا رکھ کر مار دوں گی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میری بیٹی مجھے کوڑا کچرا سمجھ کر کہیں پھینکنے جا رہی ہے۔''

''مجھے یہ بتایئے، جس بیٹی نے آپ کو اپنے گھر سے اس طرح نکال باہر کیا، اس کے گھر، اس کے پاس جانے کے لیے آپ کیوں تڑپتی ہیں؟''

''کیا کروں، میری مجبوری یہ ہے کہ میں ماں ہوں۔ اس لیے بیٹی کے بدترین سلوک کے باوجود اس کے لیے دل تڑپتا ہے۔ اس کے بچوں سے ملنے، ان سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ان سے باتیں کر کے بہت سکون ملتا تھا۔ اس کے چھوٹے بچے جو ابھی دنیاداری سے واقف نہیں۔ میرے پاس آکر بڑی معصومیت سے کہتے تھے۔''

''نانو! کیوں رو رہی ہیں؟ بھوک لگی ہے یا چیز کھانے کو دل چاہ رہا ہے؟''

''نہیں بیٹا! نہ بھوک لگی ہے نہ چیز کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔'' میں اسے گود میں لے کر پیار کرتی تو وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے میرے آنسو پونچھ کر کہتے۔

''تو پھر کسی نے آپ کو ڈانٹا ہوگا۔ ممانے تو نہیں۔''

''آپ کا ایک بیٹا کویت میں ہے۔ آپ اس کے پاس کیوں نہیں چلی جاتیں؟ بیٹوں پر تو ماں باپ کی زیادہ ذمہ داری ہوتی ہے۔''

''ماں باپ جب بوڑھے ہو جاتے ہیں تو بہت سی باتیں ان کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتیں۔ بچے بڑے ہو کر اپنے آپ کو ماں باپ سے بھی بڑے سمجھنے لگتے ہیں۔ ان کی مرضی کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔ میرے شوہر کے مرنے کے بعد جب میرا مسئلہ سامنے آیا کہ اب میں کس کے پاس رہوں گی تو بیٹے بہو نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے دیا کہ کویت بڑی مہنگی جگہ ہے ہمارے اپارٹمنٹ میں ہماری اپنی رہائش ہی بڑی مشکل سے ہوتی ہے۔ امی کو ہم اپنے ساتھ لے جائیں تو رکھیں گے کہاں؟ لندن والی بیٹیوں نے بھی کچھ اسی قسم کی عذرداریاں پیش کیں اور یہ بھی کہا۔ وہاں سے آنے جانے کے اخراجات بھی بہت زیادہ ہیں۔ امی کو اگر ہم لے بھی گئے تو ان کی واپسی مسئلہ بن جائے گی اس لیے یہی بہتر ہے کہ وہ یہیں رہیں۔''

''تو ان سب کے انکار کے بعد آپ کو اس بیٹی کے پاس رہنا پڑا۔ اس نے کوئی عذر پیش نہیں کیا؟''

''کیسے نہ کرتی۔'' اس نے کہا۔ ''میں تو سسرال میں رہتی ہوں۔ میرے پاس امی دو چار دن تو مہمان بن کر رہ سکتی ہیں۔ ان کی مستقل رہائش میرے سسرالیوں کو پسند نہیں ہوگی۔'' اس پر اس کے بھائی بہنوں نے کہا۔ ''اگر ہم لوگ ہر ماہ امی کے اخراجات کے لیے کچھ پیسے بھیج دیا کریں تب تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟'' اس پر وہ رضامند ہو گئی۔ اتنے دنوں جو اس نے اپنے پاس رکھا یونہی نہیں رکھا۔''

''اماں جی!'' صحافی نے کہا۔ ''اس طرح کا مسئلہ صرف آپ کے ساتھ نہیں۔ ایک ماں باپ اپنے کئی بچوں کو پال پوس کر لکھا پڑھا کر اپنی ذمہ داری نبھا دیتے ہیں لیکن کئی اولادیں مل کر اپنے بوڑھے والدین کی ذمہ داری نہیں نبھاتے۔ آج کے دور میں اولڈ ہاؤسوں کا قیام اس تلخ حقیقت کی زندہ مثال ہے کہ بچے، بوڑھے ماں باپ کو فالتو چیز سمجھ کر اولڈ ہاؤسز میں انہیں چھوڑ جاتے ہیں۔''

''مگر میرے بیٹے ایسا کیوں ہوتا ہے؟'' فریدہ بیگم بولیں۔ ''ہم نے تو اپنے ماں باپ کا جب تک وہ زندہ رہے بہت خیال رکھا۔ ان کی بڑی خدمت کی۔ میں نے تو اپنی ماں کو کبھی دکھ نہیں دیا۔ ہمیشہ ان کا ہر حکم بجالائی۔ ان کا سارا کام عبادت سمجھ کر کیا۔ پھر میرے ساتھ میری اولاد ایسا برتاؤ کیوں کرتی ہے؟ میں اپنی باقی عمر اپنے بچوں کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔ میں اس انتظار میں ہر دن گزارتی ہوں کہ وہ آئیں گے اور مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گے مگر میری بیٹی مجھے یہاں پہنچانے کے بعد ایک بار بھی مجھ سے ملنے نہیں آئی۔ کیا اب وہ یہاں میری میت لے جانے کے وقت ہی آئے گی؟''

''فریدہ بیگم! کیا ضروری ہے کہ تمہاری بیٹی تمہاری میت لے جانے کے وقت ہی آئے؟'' مگر یہ بات میں نے فریدہ بیگم کو مخاطب کر کے نہیں کہی بلکہ دل ہی دل میں کہی۔ ''ایسا بھی تو ہو سکتا ہے وہ کفن دفن کا بندوبست کرنے والے کسی ادارے کو یہ کام سونپ دے۔''

''اماں جی! اب تو آپ کے لیے یہی بہتر ہے کہ آپ اپنے بچوں سے کسی بہتری کا خیال دل سے نکال دیں اور اس اولڈ ہاؤس میں، ہر غم، ہر دکھ کو بھلا کر باقی زندگی ہنسی خوشی کے ساتھ گزار دیں۔'' صحافی نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ ''اگر انہوں نے آپ کو فالتو چیز سمجھ کر یہاں پھینک دیا ہے تو آپ بھی یہ سمجھیے کہ آپ کا کوئی تھا ہی نہیں اور تھا تو مر کھپ گیا ہے۔''

ذرا دیر تک یہ کہنے والے صحافی کو وہ عجیب نظروں سے دیکھتی رہیں۔ پھر یوں بولیں کہ ان کے لب اور ان کی آنکھیں بیک وقت بول رہی تھیں۔ ''میرے بارے میں کوئی کچھ سمجھے مگر میں اپنی اولادوں کے بارے میں کیسے سمجھ لوں کہ وہ موجود نہیں۔ اللہ انہیں سلامت رکھے۔'' اتنا کہہ کر وہ ذرا رکیں پھر بولیں۔ ''بس بیٹا! تم یہاں آئے ہو تو میرا یہ کام کر دو کہ واپس جاتے وقت مجھے میرے گھر چھوڑ دو۔ چھوڑ دو گے نا؟''

اس سے پہلے کہ صحافی کچھ کہتا میں بول پڑی۔ ''آپ بھی کمال کرتی ہیں آپ جسے اپنا گھر کہہ کر وہاں جانا چاہتی ہیں۔ وہاں سے تو کوئی ایک بار بھی آپ سے ملنے کو نہیں آیا۔ آپ وہاں جائیں گی تو پھر ایک بار ذلیل وخوار ہو کر نکالی جائیں گی۔''

''بات دراصل یہ ہے میڈم کہ میری بیٹی بے حد مصروف رہتی ہے۔ اس لیے شاید نہ آسکی اور اس نے تو یہاں مجھے اس لیے پہنچایا تھا کہ میرا ماحول بدل جائے۔ میں بہت سے لوگوں کے درمیان پہنچ کر شاید اپنے دکھوں کا بوجھ ہلکا کر سکوں۔''

''ماں بھی بڑی عجیب شے ہوتی ہے۔ وہ بیٹی جس نے ماں کو خالہ بنا کر پیش کیا۔ ماں کی بار بار تذلیل کی۔ اسی بیٹی کی حمایت میں بات کر رہی تھی۔ مامتا حقیقتاً کس جذبے کو کہتے ہیں فریدہ بیگم سے مل کر بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ بیٹی جو اسے ماں کہنے سے منکر ہوئی اور دو مہینوں میں کبھی ان سے فون پر بات کرنا گوارا نہیں کی۔ وہ ماں ایک لمحے کو بیٹی کی نافرمانی اور اولڈ ہاؤس چھوڑے جانے پر کبھی سراپا احتجاج ہوتی ہے تو کبھی اپنے دل میں اس اُمید کا دیا بھی روشن کر دیتی ہے کہ تم اسے فون تو کرو اور کہو تو سہی دیکھنا وہ مجھے لینے آجائے گی۔ تم مجھے میرے گھر تو لے چلو۔ اب وہ مجھے رکھ لے گی۔''

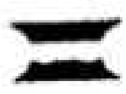
جب میں اس ممتا کی ماری ماں سے کہتی ہوں۔ ''اگر آپ کی بیٹی نے آپ کو اپنے پاس رکھنا ہی ہوتا تو وہ آپ کو یہاں چھوڑ کر ہی کیوں جاتی؟''

تو یہ ماں بیٹی کے جرم پر پردہ ڈالنے میں دیر نہیں لگاتی۔ اس کی حمایت میں صفائیاں دینے لگتی ہے۔ ''وہ...... بات یہ ہے میڈم! اسے یہ خبر نہیں تھی کہ یہاں آکر میں روتی رہوں گی۔ وہ تو یہاں مجھے آرام پہنچانے اور میرا ماحول تبدیل کرنے کے لیے مجھے یہاں چھوڑ گئی تھی۔''

جب صحافی فریدہ بیگم سے انٹرویو کر رہا تھا تو ان کی گفتگو بنتِ مریم اولڈ ہاؤس کی مکین ایک اور خاتون بھی سن رہی تھی۔ یہ ایسی بدنصیب خاتون تھی جو بے اولاد تھی۔ لہٰذا آخری عمر میں اسے اولڈ ہاؤس کا سہارا لینا پڑا۔ اس اولڈ ہاؤس میں ایسی اور بھی لاوارث خواتین موجود ہیں۔ یہ خاتون دونوں کی باتیں سننے کے دوران میں ایک بار بے ساختہ کہہ اٹھی۔

''اگر اولاد ایسی ہی ہوتی ہے تو ہم بے اولاد ہی اچھے۔''

صحافی نے جب یہ دیکھا کہ فریدہ بیگم مصر ہیں کہ وہ انہیں ان کے گھر پہنچا دے تو اس غریب نے بے بسی کے ساتھ مجھے دیکھا۔ میں نے کہا۔ ''آیئے! میں آپ کو ایک اور ماں سے ملواتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں اسے اپنے ساتھ لے کر ایک دوسرے کمرے میں پہنچی۔ وہاں موجود ایک ضعیف خاتون سے ملاتے ہوئے میں نے کہا۔ ''یہ سات بچوں کی ماں ہیں۔ سب بیرونِ ملک مقیم ہیں سوائے ایک بیٹے کے۔ یہ بیٹا معذور ہے اور کسی مزار پر رہتا ہے۔ ان کے سب بچوں کے حصے میں ان کی جائیداد کے معقول حصے آئے جب کہ معذور بیٹے کے حصے میں ماں آئی۔ وہ ہر دس پندرہ دنوں کے بعد ماں سے ملنے آتا ہے اور امی جان، امی جان کہتا ہوا دیر تک ان کے پاس بیٹھا ان کے ہاتھ پاؤں چومتا رہتا ہے۔ جب کہ بیرون ملک عیش وعشرت کی زندگی بسر کرنے والے اس کے بھائی بہن کبھی پلٹ کر ماں کی خبر لینے نہیں آئے۔''





میرے خواب

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم
میری خواہش ہے کہ میری آپ بیتی سرگزشت کے قارئین تک پہنچے، کیونکہ میری یہ کہانی میری اپنی ہے ضرور مگر اس میں میری ہم دم و ہم راز کے خواب پنہاں ہیں۔ عورت کی زندگی کیا ہے۔ اس کہانی میں صاف نظر آئے گی۔ پلیز میری کہانی کو ضرور شائع کریں۔

احسن علی رضا
(کراچی)

ایم بی اے کرنے کے بعد میرا ارادہ امریکا میں مزید چند سال رہنے کا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہاں عملی تجربہ حاصل کروں لیکن ابو کی اچانک وفات کی وجہ سے مجھے واپس آنا پڑا۔ ابو کے انتقال کے بعد ہماری آبائی کوٹھی، زمین، جائیداد اور ابو کے تمام کاروبار پر تایا ابو نے قبضہ کرلیا تھا۔

ہمارے پاس کل اثاثہ امی کے زیورات اور بینک میں جمع نقد روپے تھے۔ جو ابو ہر ماہ امی کے اکاؤنٹ میں جمع کراتے رہتے تھے اور یہ خاصی بڑی رقم تھی۔ تایا ابو کی آنکھیں پھیرنے کا زخم بڑا گہرا تھا۔ ہم تقریباً مفلس ہو گئے تھے۔ یوں تو ہمارے پاس اس وقت بھی اچھا خاصا روپیا نقد اور

خاصی مالیت کے زیورات تھے۔ مگر ہمارے دل جذبوں، خواہشوں اور امنگوں سے بالکل خالی ہو گئے تھے۔ رشتے، ناتوں پر سے اعتبار اٹھ گیا تھا۔ ہم نے آبائی کوٹھی چھوڑ دی اور کسی رشتے دار کے گھر جانے کی بجائے سب سے بہت دور کراچی آ گئے۔

کچھ عرصہ تو ہم گلشن اقبال کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہے۔ امی اس طرح کے مکانوں میں رہنے کی عادی نہیں تھیں۔ وہ پرانی طرز کے مکانوں کو پسند کرتی تھیں۔ جن میں صحن ہو، درخت ہوں اور گھر کشادہ اور ہوادار ہو۔ میں نے ان کی پسند کے مطابق مکان کی تلاش جاری رکھی۔ ساتھ ہی آمدنی کے لیے بھی کوشاں رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کوئی کاروبار کروں یا نوکری۔ امی سے میں نے مشورہ کیا تو انہوں نے فی الوقت نوکری کرنے کی رائے دی۔

امی بڑی صابر، متحمل مزاج اور باحوصلہ عورت تھیں۔ انہوں نے ابو کی موت کا صدمہ، تایا ابو کے لگائے ہوئے زخم اور سب عیش و آرام چھوڑنے کا دکھ چپ چاپ سہہ لیا تھا۔ وہ مجھے ہر وقت ڈھارس دیتی رہتی تھیں مگر میں جانتا تھا کہ وہ میرے سامنے جتنی حوصلہ مند نظر آتی ہیں تنہائی میں اپنے غم برداشت نہیں کر پاتیں۔ وہ مجھ سے چھپ چھپ کر روتی تھیں۔

جلد ہی مجھے ایک پرائیویٹ فرم میں اچھی نوکری مل گئی۔ تنخواہ معقول تھی، پھر مکان کا کرایہ اور پیٹرول کا خرچ الگ تھا۔ میں نے سوچا کہ مکان کا کرایہ تو کمپنی دے رہی ہے، کچھ رقم اپنے پاس سے شامل کر کے کوئی بڑا مکان کرائے پر لے لیا جائے۔ یوں امی کی مرضی کا مکان مل سکتا ہے۔ جلد ہی ڈیفنس کے علاقے میں ایک خوب صورت بنگلا مل گیا۔

وہ بنگلا کسی باذوق نے بنوایا تھا۔ نہایت خوب صورت، مضبوط اور جدید طرز تعمیر کا نمونہ تھا۔ ہسپانوی طرز کے اونچے برآمدے، کشادہ اور ہوادار کمرے، سب کھڑکیوں کا رخ بنگلے کے خوب صورت لان کی جانب تھا۔ امی کو بنگلا بہت پسند آیا۔

ابو کا چھوڑا ہوا روپیا نئی زندگی بنانے میں خاصا معاون ثابت ہوا۔ ہم نے بنگلے کا ایڈوانس اسی رقم سے دیا۔ فرنیچر، قالین، پردے اور دوسری ضروریات زندگی کی چیزیں بھی کچھ نئے سرے سے خریدا تھا۔ میں نے ایک چھوٹی سی سوزوکی خرید لی تھی پھر بھی اکاؤنٹ میں کچھ روپیا باقی رہ گیا تھا جو امی نے میری شادی کے اخراجات کے لیے الگ کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنے زیورات پہلے ہی بہو کے لیے رکھ چھوڑے تھے۔ امی کو اٹھتے بیٹھتے میری شادی کی فکر رہتی تھی۔ میں فی الوقت شادی کے حق میں نہیں تھا۔ وہ روز ہی کسی نہ کسی انداز سے میری شادی کا ذکر چھیڑ دیا کرتی تھیں۔ کبھی اپنی تنہائی کے حوالے سے اور کبھی پوتے پوتیوں کو کھلانے کی خواہش کے حوالے سے۔

بنگلے کے مالک کیانی صاحب بڑے نفیس، خوش اخلاق اور محبت کرنے والے آدمی تھے۔ وہ کرایہ لینے خود آتے تھے۔ اس بات سے مجھے بڑی شرمندگی ہوتی تھی۔ میں نے ان سے کئی دفعہ کہا کہ کرایہ میں خود پہنچا دیا کروں گا مگر وہ ہنس کر ٹال دیتے اور کہتے کہ ایک ہی بات ہے۔ اس بہانے میری ٹہل بھی ہو جاتی ہے۔ کرایہ وصول کرنے اور چائے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ چلنے لگتے تو میں انہیں گھر چھوڑنے کی پیشکش کرتا، وہ بڑے اخلاق سے میری پیشکش کو رد کر دیتے اور مجھے دعائیں دے کر رخصت ہو جاتے۔ میں نے ہمیشہ انہیں سادہ لباس میں دیکھا تھا۔ بعض اوقات مجھے تجسس ہونے لگتا کہ وہ مجھے اپنے گھر بلانے سے گریز کیوں کرتے ہیں۔ انہوں نے مجھے اپنے گھر کا پتا بتانے سے بھی ہمیشہ احتراز کیا تھا۔

میں نے اس سلسلے میں امی سے بات کی تو انہوں نے میری بات کو اتنی اہمیت نہ دی۔ انہوں نے کہا میں نے بھی ان سے یہی کہا تھا کہ کرایہ ہم خود پہنچا دیا کریں گے مگر انہوں نے یہ منظور نہیں کیا۔ ویسے امی ان کی شرافت اور اخلاق کی معترف تھیں۔

ایک شام کو میں دفتر سے آ کر اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا کہ امی نے آ کر بتایا کہ آج کیانی صاحب کی بجائے ان کی بیٹی کرایہ لینے آئی ہے۔ کیانی صاحب کو بخار ہے اس لیے وہ نہیں آئے۔

پھر تو مجھے ان کی مزاج پرسی کے لیے جانا چاہیے۔ میں نے امی سے کہا مگر مجھے ان کا پتا تو معلوم نہیں ہے۔

پتا بھی مل جائے گا، پہلے اس سے تو مل لو۔ گھر پھر کسی دن چلے جانا۔ امی نے معنی خیز انداز میں کہا۔

میں امی کے انداز پر الجھ سا گیا اور اپنے بال درست کرتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو لڑکی دروازے کی طرف پشت کیے گھوم پھر کر در و دیوار کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے پرنٹڈ لان کا سادہ شلوار قمیص کا سوٹ پہن رکھا تھا۔

دوپٹا بھی اسی کپڑے کا تھا، کندھے پر تھیلا نما بیگ لٹک رہا تھا۔

امی نے اسے یوں گھر کا جائزہ لیتے ہوئے دیکھا تو ہنس کر بولیں۔ ''بیٹی! ہمارے گھر میں فی الحال ایسا کوئی فرد نہیں جو گھر کی دیواریں خراب کرے۔''

''نہیں آنٹی! ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' اس نے پلٹتے ہوئے جواب دیا۔ وہ مجھے دیکھ کر ٹھٹک سی گئی تھی۔ میری شخصیت ہی ایسی تھی کہ لڑکیاں متاثر ہوجاتی تھیں۔

''یہ میرا بیٹا علی رضا اور علی، یہ کیانی صاحب کی بیٹی اسل صبا ہے۔'' امی نے تعارف کرایا۔

''بیٹھیے!'' میں نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ امی کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں اس کے سامنے کاؤچ پر بیٹھ گیا۔ ''کیانی صاحب کیسے ہیں، کیا انہیں بخار زیادہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں معمولی بخار ہے البتہ کمزوری زیادہ ہوگئی ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

میں اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ عام سی لڑکی تھی۔ اس میں چونکا دینے والی کوئی بات نہیں تھی۔ صاف رنگ، تیز چمکدار بڑی بڑی آنکھیں، درمیانہ قد، گھنے بال، اس نے بالوں کو لپیٹ کر جوڑا بنایا ہوا تھا۔ وہ بالکل سادہ تھی۔ غالباً سادگی ہی نے اس کی شخصیت میں کشش پیدا کردی تھی۔ اس کی گفتگو، انداز اور رکھ رکھاؤ سے خوداعتمادی جھلکتی تھی۔

''کیا کرتی ہو بیٹی؟'' امی نے پوچھا۔

''آنٹی! میں نے بی اے کیا ہے۔ آج کل فارغ ہوں۔ اس لیے گھر کے نزدیک ہی ایک مونٹیسوری اسکول میں پڑھا رہی ہوں۔''

''بہت اچھا کرتی ہو بیٹی! لڑکیوں کو کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیے۔'' امی نے پیار سے کہا۔ ''کھانا پکانا اور کچھ سینا پرونا بھی آتا ہے؟'' امی نے مخصوص سوالات شروع کردیے۔ آج کل وہ ہر لڑکی کو اپنی بہو کے سانچے میں تولنے لگی تھیں۔

''جی آنٹی! یہ کپڑے جو میں نے پہنے ہوئے ہیں میں نے خود ہی سیے ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے کوکنگ اور سجاوٹ کا خصوصی کورس بھی کیا ہے۔'' اس نے کن انکھیوں سے مجھے دیکھتے ہوئے امی کو جواب دیا۔

''بہن بھائی کتنے ہیں تمہارے؟'' امی نے مزید کریدا۔

''میری ایک بہن اور تین بھائی ہیں۔ میں سب سے بڑی ہوں۔ میرے بعد حنا ہے، تینوں بھائی چھوٹے ہیں اور ابھی اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ حنا انٹرمیڈیٹ، پری میڈیکل کررہی ہے۔ اگر اس کی پوزیشن اچھی آگئی تو انشاء اللہ ڈاکٹر بن جائے گی۔ ویسے وہ محنت تو بہت کررہی ہے۔''

میں اس کی طویل اور فضول گھریلو سی گفتگو سے اکتا گیا تھا۔ اس نے شاید یہ بات محسوس کرلی تھی کیوں کہ وہ امی سے باتیں کرتے وقت بار بار میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میری بے زاری کا احساس ہوتے ہی وہ کھڑی ہوگئی اور امی سے رخصت کی اجازت مانگنے لگی۔ امی نے اسے اور تھوڑی دیر روکنا چاہا مگر وہ رکی نہیں۔ اس کے جانے سے پہلے امی نے مجھ سے کہا کہ تم صبا کو گھر چھوڑ آؤ مگر میں نے انکار کردیا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں اسے گھر ڈراپ کرنے کی پیشکش کرتا وہ فوراً آمادہ ہوجاتی۔ میری طرف اس کا بار بار دیکھنا مجھ سے متاثر ہونے کی دلیل تھا مگر میں نے خود ہی اس کے ساتھ جانے سے گریز کیا۔ ایک تو اس لیے کہ صبا نے مجھے زیادہ متاثر نہیں کیا تھا۔ دوسرے امی کا رویہ، وہ کوشش کررہی تھیں کہ کسی طرح صبا مجھے پسند آجائے۔

اس کے جانے کے بعد امی نے بغور مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا خیال ہے بیٹا! صبا اچھی لڑکی ہے نا، خوب صورت اور ہنرمند بھی۔''

''امی!'' میں نے بے زاری سے کہا۔ ''آپ ہر لڑکی کو دیکھ کر اسے بہو بنانے کے خواب نہ دیکھا کریں۔ میں نے ایک دفعہ کہہ دیا کہ مجھے ابھی شادی نہیں کرنا ہے تو بس! آپ تو پیچھے ہی پڑجاتی ہیں۔''

امی ایک دم خاموش ہوگئیں۔ انہوں نے خلاف توقع مجھ سے کوئی بحث نہیں کی۔ نہ مجھے قائل کرنے کی کوشش کی اور نہ صبا کی خوبیاں گنوائیں۔ مجھے ان کی خاموشی سے فوراً اپنی زیادتی کا احساس ہوگیا۔ جب وہ کسی بات پر بہت ناراض ہوتی تھیں تو عادتاً چپ ہوجاتی تھیں۔ میں نے بہت کوشش کے بعد بالآخر انہیں منا ہی لیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''بیٹا! میں تیری شادی میں جلدی اس لیے کررہی ہوں کہ مجھے اپنی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں، معلوم نہیں کس وقت......''

''امی! خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کریں۔'' میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''آپ اب تک ناراض ہیں۔ یقین کریں میں شادی سے صرف اس لیے گریز کررہا ہوں

کہ ابھی میں اپنا کیریئر بنانا چاہتا ہوں۔''
''تو بیٹا شادی کیریئر میں رکاوٹ تو نہیں بنتی۔ تمہارے باپ نے سب کچھ شادی کے بعد ہی کیا تھا۔ بیوی اگر اچھی مل جائے تو کیریئر بنانا اور آسان ہو جاتا ہے۔'' انہوں نے مجھے قائل کرنے کے لیے دلیل دی۔
''ٹھیک ہے امی! جو آپ مناسب سمجھیں کریں مگر شرط یہ ہے کہ لڑکی مجھے پسند آنی چاہیے۔'' میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔
''ارے تو فکر ہی نہ کر، ایسی چاندی بہولاؤں گی کہ تو مسحور ہو جائے گا۔ سمجھدار بھی ایسی ہوگی کہ ہر قدم، ہر مشکل میں تیری معاون و مددگار ثابت ہو گی۔'' انہوں نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو مجھ پر چھوڑ دے اور سن کل دفتر سے واپس آتے ہوئے کیانی صاحب کی عیادت کرتے آنا۔ ان کا پتا میری ڈائری میں لکھا ہوا ہے۔''
میں نے امی کی طرف دیکھا۔ شادی پر میری رضا مندی سے خوشی ان کی آواز اور انداز سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ امی کی گفتگو سے مجھے احساس ہوا کہ غالباً انہوں نے کوئی لڑکی پسند کر رکھی ہے۔ اس لیے وہ اس کی خوبیوں کو اعتماد سے بتا رہی ہیں۔
دوسرے دن شام کو میں کیانی صاحب کی مزاج پرسی کے لیے ان کے گھر گیا۔ ان کا مکان ڈھونڈنے میں دقت تو ہوئی مگر مکان مل گیا۔ وہ ناظم آباد بڑا میدان کے پیچھے اورنگ آباد کے چھوٹے کوارٹروں میں رہتے تھے۔ ان کوارٹروں میں دو ہی کمرے تھے اور ایک چھوٹا سا صحن۔ یہ کراچی کے پسماندہ لوگوں کی بستی تھی، جہاں زیادہ تر غریب لوگ آباد تھے۔
مجھے شدید حیرت تھی کہ ڈیفنس جیسے علاقے میں جدید نمونے کے خوب صورت بنگلے کے مالک کیانی صاحب خود ایسے پسماندہ علاقے میں رہتے ہیں۔ میں دیر سے ان کے دروازے پر کھڑا اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ دستک دوں یا نہیں۔ مجھے یہ خیال آ رہا تھا کہ کیانی صاحب اسی لیے خود مکان کا کرایہ لینے آتے تھے۔
میں واپس پلٹنے ہی والا تھا کہ دروازہ کھلا اور اندر سے تقریباً دس گیارہ سال کا ایک چھوٹا لڑکا نکلا وہ مجھے دروازے پر کھڑے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ میں نے کھلے دروازے سے اندر نظر دوڑائی تو صبا کمر سے دوپٹا باندھے شلوار کے پائنچے اونچے کیے فرش دھوتی نظر آئی۔ اس نے بھی شاید مجھے دیکھ لیا

تھا۔ وہ جھاڑو ہاتھ سے رکھ کر لپک کے دروازے پر آئی۔ میں نے دیکھا اس کے چہرے پر ذرا بھی شرمندگی یا پشیمانی نہیں تھی۔ اس نے مسکرا کر پُرتپاک انداز میں کہا۔ ''آیئے رضا صاحب اندر آ جایئے نا۔''
میں حیرت زدہ سا گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ اس نے شاید میری حیرت کو محسوس کر لیا تھا۔
''آپ اتنے حیران کیوں ہیں؟'' صبا نے بغور مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''یہاں بھی انسان رہتے ہیں۔ رضا صاحب بھوت پلید نہیں۔''
''مگر اتنے خوب صورت گھر کے ہوتے ہوئے آپ لوگ یہاں کیوں رہتے ہیں۔'' یہ سوال بے ساختہ میری زبان پر آ گیا۔
''اس کی کوئی وجہ تو ہو گی ہی ورنہ کس کا جی نہیں چاہتا کہ وہ ایسے شاندار گھر میں رہے۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
اس کے چہرے پر بکھری سنجیدگی نے اس کے حسن میں انوکھا وقار سا پیدا کر دیا تھا۔ میرا دل آپ ہی دھڑکنے لگا۔
''آپ کچھ بھی کہیں، حقیقت تو یہ ہے وہ گھر آپ کا ہی ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔
وہ بھی ہنس دی پھر کہنے لگی۔ ''میرا تو صرف مکان ہے گھر تو آپ کا ہے۔''
میرے عام سے فقرے کو اس نے نہایت خوب صورت معنی پہنا دیے تھے۔ میں اس کی سمجھداری اور گفتگو کے انداز کا قائل ہو گیا۔ میں اس کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ جانے کیوں اس وقت وہ آپ ہی آپ اچھی لگنے لگی یا شاید میں ہی ایسے ستائشی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
میری وارفتگی کو محسوس کر کے اس کے گالوں پر سرخی سی دوڑ گئی۔ پھر وہ وہیں سے بلند آواز میں بولی۔ ''اماں! رضا صاحب آئے ہیں ہمارے کرائے دار۔'' کرائے دار کہتے ہوئے اس نے میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ اس کا انداز مجھے اچھا لگا۔ ''ذرا جلدی سے چائے بنا دیں۔'' یہ کہہ کر وہ مجھے اندر کمرے میں لے آئی۔ وہ سادا سا کمرا تھا۔ وہاں ایک اور لڑکی بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ ''یہ حنا ہے میری چھوٹی بہن۔'' صبا نے تعارف کرایا۔ سیکنڈ ایئر پری میڈیکل کا امتحان دے رہی ہے۔''
حنا نے سلام کیا اور کتابیں سمیٹ کر باہر چلی گئی۔

''کیانی صاحب گھر میں نہیں ہیں، کیا کہیں باہر گئے ہوئے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔
''انہیں باہر کہاں جانا ہے۔'' اس نے ٹھنڈا سانس لے کے کہا۔ ''ایک ہفتے کے بخار نے انہیں اتنا کمزور کر دیا ہے کہ بستر سے کھڑے ہوتے ہیں تو چکر آنے لگتے ہیں۔ روزانہ ڈاکٹر کو گھر بلا کر دکھاتے تھے مگر آج ان کی طبیعت قدرے بہتر تھی اس لیے چھوٹے بھائی کے ساتھ ڈاکٹر کے کلینک گئے ہیں۔ بس اب آتے ہی ہوں گے کلینک زیادہ دور نہیں ہے۔''
''آپ نے ابھی سے خوامخواہ چائے بنوالی۔ کیانی صاحب آجاتے تو پھر ہم ساتھ ہی چائے پیتے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔
''مٹی کے تیل کا چولہا جب تک آنچ دے گا، ابو بھی اس وقت تک آجائیں گے۔ اس لیے میں نے ابھی سے چائے کے لیے کہہ دیا ہے۔''
''یہاں سوئی گیس نہیں ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔
''ہے تو!'' اس نے مسکرا کر کہا لیکن ہم نے مناسب سمجھا کہ یہ سہولت پہلے آپ کو مہیا کر دی جائے۔ آخر مٹھی بھر کر کرایہ جو آپ سے لیتا تھا، ہم تو عادی ہیں ایسی زندگی کے۔ ہاں آرزو ضرور ہے کہ شاید کبھی اس گھر میں رہنا نصیب ہو۔ یہ کہتے ہوئے صبا خوابوں میں جیسے کھوسی گئی تھی۔ اس کے چہرے پر مسرت یا دکھ کی بجائے اعتماد اور عزم جھلک رہا تھا۔
میرے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ بیدار ہونے لگا تھا۔ میں نے عہد کر لیا کہ اگر صبا ذہنی اعتبار سے اتنی سمجھ دار ثابت ہوئی جتنی بظاہر معلوم ہو رہی ہے تو میں ضرور اس کا خواب پورا کروں گا۔ اس سے شادی کر کے اسے ایک روز اسی گھر میں بساؤں گا۔
''کل آنٹی نے کہا تھا کہ آپ ابو کو دیکھنے آئیں گے، مجھے آپ کے آنے کا بالکل یقین نہیں تھا۔ آپ کے چہرے پر اتنی بے زاری تھی کہ مجھے اُمید نہیں تھی۔''
''پھر آپ کو حیرت نہیں ہوئی مجھے دیکھ کر۔ آپ نے کیا محسوس کیا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
''آپ کو دیکھ کر مجھے بے انتہا خوشی ہوئی لیکن میری حیرت، آپ کے چہرے کی حیرانی دیکھ کر جاتی رہی۔''
''میں معافی چاہتا ہوں۔'' میں نے خلوص دل سے کہا۔ ''مجھے واقعی ایسا نہیں ظاہر کرنا چاہیے تھا۔''
''نہیں نہیں۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''آپ نے اچھا کیا جو سوال کر لیا اگر آپ صرف سوچ کر رہ جاتے تو میں کیا کر لیتی۔ اب میں آپ کو اچھی طرح جواب تو دے سکوں گی۔''
''کیا آپ گھر آئے مہمانوں کو ہمیشہ خوب اچھی طرح جواب دیتی ہیں۔'' میں نے شوخی سے پوچھا۔
''ہر مہمان کو نہیں۔'' اس نے ہاتھ سے ماتھے پر گرے ہوئے بالوں کو پیچھے کرتے ہوئے کہا۔
''شکریہ!'' میں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ''آپ نے مجھے خاص سمجھا۔''
وہ ایک لمحے کے لیے ساکت سی رہ گئی۔ پھر اس کے چہرے پر ایک دم حیا کی سرخی پھیل گئی۔ آنکھوں میں چمک سی لہرا گئی۔ وہ مجوب سی ہو کر بولی۔ ''دیکھئے رضا صاحب یہ دنیا کا نظام ہے کہ ہر شے اپنے اپنے محور پر ایک دائرے میں گھومتی ہے۔ اس دائرے میں کچھ حصے بلند ہوتے ہیں اور کچھ پست، دائرے میں گردش کرتے رہنے کی وجہ سے کچھ عرصے بعد تاریک حصے روشنی میں آجاتے ہیں اور پست بلند

ہو جاتے ہیں۔'' وہ کسی مفکر کی طرح پُراعتماد طریقے سے بول رہی تھی۔

''میرے دادا کی بڑی وسیع جائیداد تھی جو یقیناً ان کے آباؤ اجداد نے بڑی محنت سے بنائی ہوگی۔ پھر دادا نے بھی اپنی محنت سے اس میں اضافہ کیا ہوگا۔ میرے ابو دادا کی اولاد میں سب سے چھوٹے تھے۔ دادا کے انتقال کے بعد میرے دونوں تایاؤں نے اس جائیداد کے بل بوتے پر خوب عیش کیے۔ انہوں نے محنت کر کے اس جائیداد میں اضافہ کرنے کی بجائے اسے اپنی عیاشیوں میں اڑانا شروع کر دیا۔ وہ تعلیم حاصل کرنا یا کوئی کام کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ ابو نے بھی بمشکل میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ تایاؤں کی عیاشیاں رنگ لائیں۔ آخر ایک دن سب روپیا پیسا اور جائیداد ختم ہوگئی۔ ابو کو وہ پہلے ہی گھر سے نکال چکے تھے۔ ابو نے جتنی تعلیم حاصل کی تھی اس سے وہ صرف کلرک ہی بن سکتے تھے۔ لہٰذا ایک سرکاری محکمے میں وہ کلرک لگ گئے۔ میں نے عہد کیا تھا کہ میں ایک بار پھر وہی عروج حاصل کروں گی جو ہمارے بڑوں نے اپنی عاقبت نااندیشی سے گنوا دیا تھا۔ میں ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔ ممکن تھا میں انٹر امتیازی نمبروں سے پاس کر لیتی لیکن میں امتحان نہ دے سکی کیوں کہ گھر کے معاشی حالات نہایت ابتر تھے۔ انہی دنوں ابو کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ ہم گھر کے اخراجات میں تنگی کر کے ان کا علاج کراتے رہے۔ اس طرح امتحان کی فیس نہ جمع کی جا سکی۔ میں ڈاکٹر بننے کا خواب چھوڑ کر ایک اسکول میں ٹیچر ہوگئی اور پرائیویٹ انٹر کرنے کے بعد بی اے کی تیاری کرتی رہی۔'' بولتے بولتے وہ سانس لینے رکی پھر بولی۔ ''میں جب یہ محسوس کروں گی کہ آپ بور ہو رہے ہیں تو موضوع گفتگو بدل دوں گی۔''

میں پوری توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کے اور میرے حالات میں کافی مماثلت تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میں جدوجہد میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ ابھی کامیابی کے مرحلے سے دور تھی۔ اس کے اس طرح کہنے سے میں چونک اٹھا تھا۔ ایک لمبا سانس لے کر میں نے کہا۔ ''کیا آپ اب تک یہ سمجھ رہی ہیں کہ میں بور نہیں ہو رہا؟''

وہ ایک دم ہنس پڑی کہنے لگی۔ ''میں چہرے پڑھنے کی ماہر تو نہیں ہوں لیکن آپ کے چہرے کے تاثرات بخوبی سمجھ میں آجاتے ہیں مجھے فوراً احساس ہو جائے گا کہ آپ بےزار ہونے لگے ہیں۔''

''جی! جیسے کل آپ کو احساس ہو گیا تھا۔'' میں نے پشیمانی سے کہا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں نے گزشتہ روز اس سے اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔

''آپ شرمندہ نہ ہوں، میں ایسے سلوک کی عادی ہوں۔'' اس نے ایک دفعہ پھر میرے چہرے سے درست اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''بہرحال میں آپ کو بتا رہی تھی کہ ہم عالیشان بنگلے کے ہوتے ہوئے اس گھٹیا مکان میں کیوں رہتے ہیں۔ ان دنوں حنا اور تینوں چھوٹے بھائی اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ میں نے عہد کیا کہ میں نے تو اپنے خوابوں کو چھوڑ دیا ہے لیکن میں حنا اور تینوں چھوٹے بھائیوں کو زندگی میں بلند مقام حاصل کرنے کے مواقع ضرور مہیا کروں گی۔ میں نے پرائیویٹ بی اے کیا تو ملازمت میں بھی ترقی ہو گئی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ حنا کو ضرور ڈاکٹر بناؤں گی۔ وہ محنت بھی کرتی ہے۔ مجھے اُمید ہے تینوں بھائی بھی کسی اچھے مقام پر ضرور پہنچیں گے۔ میں جب حنا اور چھوٹے بھائیوں کو اچھے دنوں کی اُمید اور حوصلہ دلا رہی تھی۔ تو خود حوصلہ ہار بیٹھی تھی۔''

''کیوں؟'' میں نے بے ساختہ سوال کر کے اس کے بولنے کا تسلسل توڑ دیا۔

اس نے میری طرف دیکھا اور میری محویت کو محسوس کر کے مسکرائی اور بولی۔ ''ابو ریٹائرڈ ہو گئے تھے ان کی ملازمت بلکہ آمدنی ختم ہو جانے سے ہم سب پریشان ہو گئے تھے۔ میرے خواب ایک بار پھر بکھرنے لگے تھے۔ لگتا تھا حنا کو بھی تعلیم چھوڑ کر ملازمت کرنا پڑے گی۔ پھر ابو کو جلد ہی پینشن مل گئی۔ امی کا خیال تھا کہ اس پیسے سے کوئی دکان کھول لیتے ہیں۔ مگر میرے ذہن میں دوسری بات تھی۔ دکان لگانے کا مطلب تو یہ تھا کہ ہم رینگ رینگ کر زندگی گزارتے رہیں۔ میں نے ابو سے کہا کہ اس پیسے سے زمین خرید لیں۔ پھر ہم ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن سے لون لے کر مکان کی تعمیر کر لیں گے۔ اسے کرائے پر دے کر قرضے کی قسط اور سب کی تعلیم کے اخراجات پورے کریں گے۔ گھر کے خرچ کے لیے میری تنخواہ کافی ہے۔ جو کمی ہے وہ میں ٹیوشن کر کے پوری کر لوں گی۔ یہ تجویز سب کو پسند آئی۔''

''ابو کے ایک دوست مستقل طور پر امریکا جا رہے تھے۔ ڈیفنس میں ان کی بہت پہلے کی خریدی ہوئی زمین تھی۔ انہوں نے ابو کو وہ زمین بہت سستی بیچ دی۔ ہم نے

ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن سے لون لیا۔ پھر وہ بنگلا میں نے اور ابو نے خود کھڑے ہو کر اپنی نگرانی میں خوابوں، ضرورتوں اور خواہشوں کے مطابق بنوالیا۔ اس بنگلے کا جو کرایہ آپ دیتے ہیں اس سے حنا اور تینوں بھائیوں کی تعلیم کے اخراجات کے علاوہ صرف لون کی قسط ادا کی جاتی ہے۔

گھر کے اخراجات کے لیے ابو بچوں کو ٹیوشن پڑھاتے ہیں، میں بھی ملازمت کے علاوہ کچھ ٹیوشن کرلیتی ہوں۔ اس بنگلے کی ایک ایک اینٹ میں میرے خواب جڑے ہیں۔ اس دن بھی میں دیواروں کا جائزہ نہیں لے رہی تھی بلکہ وہاں پہنچ کر اپنے خوابوں کو متحرک دیکھ رہی تھی۔ اس بنگلے میں رہنے کا خواب جانے کب پورا ہوگا......'' اس نے حسرت و یاس میں ڈوبے لہجے میں بات ادھوری چھوڑ دی۔

میں نے بے اختیار چاہا کہ اس سے کہہ دوں کہ تمہارا خواب ضرور پورا ہوگا۔ میں تمہیں اپنے ساتھ اپنی دلہن بنا کر اس بنگلے میں لے کر جاؤں گا مگر میں نے خود پر بمشکل ضبط کیا۔ میں فیصلوں میں جلد بازی کا قائل نہیں۔ بے شک وہ خوب صورت تھی، ذہین تھی، ہنر مند سلیقہ شعار پڑھی لکھی اور تمام اونچ نیچ سے واقف تھی۔ اس میں بہترین بیوی بننے کی بہت صلاحیت تھی۔ تاہم میں دو تین ملاقاتیں مزید کرنا چاہتا تھا تا کہ مجھے اندازہ ہو سکے کہ وہ میری ذات میں دلچسپی لیتی ہے یا بنگلے میں رہنے کے خواب نے اسے میری جانب راغب کردیا ہے۔ اس کی گفتگو سے مجھے بخوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ بنگلا اس کے لیے بے انتہا جذباتی حیثیت رکھتا ہے۔

چائے اور کیانی صاحب ساتھ ہی ساتھ آئے۔ کیانی صاحب مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ میرے خیال کے برعکس مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر فکر و تردد کے کوئی آثار نہیں تھے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ احساسِ کمتری کی وجہ سے مجھے اپنا پتا بتانے سے گریز کرتے ہیں لیکن اس وقت ان کے چہرے سے خوشی چھلکی پڑ رہی تھی۔

حنا چائے کی ٹرے میز پر رکھ کر پلیٹیں میز پر لگا رہی تھی۔ چائے کے ساتھ خاصے لوازمات تھے۔ گھر کے بنے ہوئے چپس، کباب اور کسٹرڈ۔ میں نے دل کھول کر کھایا اور خوب تعریف کی۔ مجھے بھوک بھی شدید لگ رہی تھی۔ میں دفتر سے سیدھا یہیں آیا تھا۔ میں چلنے لگا تو کیانی صاحب اور صبا مجھے دروازے تک چھوڑنے آئے۔ میں نے صبا کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ ہماری طرف آیا کیجیے نا، وہ آپ ہی کا گھر ہے۔'' میرے ذو معنی فقرے سے اس کے گال حیا سے سرخ ہو گئے۔ پھر میں نے کیانی صاحب کو مخاطب کیا۔ ''امی نے آپ کی طبیعت کی بہتری کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا ہے اور کہا تھا کہ میں ان کی جانب سے آپ کو اور صبا کو گھر آنے کی دعوت دوں۔ امی صبا سے مل کر بہت خوش ہوئی تھیں۔'' پھر میں چلا آیا مجھے خدا حافظ کہتے ہوئے صبا کی آنکھوں میں چمک سی تھی۔

میں گاڑی چلاتے ہوئے صبا اور اس کی گفتگو کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ حنا کو ڈاکٹر بننے کے لیے چھ سال درکار ہیں۔ چھ سال بعد اسے ملازمت ملی تو تنخواہ کتنی ہوگی اور اگر اس نے شادی کرلی تو پھر وہ اپنے شوہر کی پابند ہو جائے گی۔ کیا معلوم وہ صبا کے خواب کو پورا کرنے میں معاون ثابت ہو بھی سکے گی یا نہیں اور یہ بھی کسے معلوم کہ اپنی پسند اور خواہش کے مطابق بنوائے ہوئے اس گھر میں جا کر رہنے کا صبا کا خواب پورا بھی ہوتا ہے کہ نہیں یا وہ اپنے چھوٹے سے گھر میں کسی آدمی سے شادی کر کے بس جائے۔ پھر آنے والے وقت میں اس کے تینوں بھائی اپنی اپنی بیویوں کے ساتھ اس گھر میں راج کریں۔ کیا معلوم صبا بیگم تمہاری تمام قربانیاں رائیگاں چلی جائیں۔ انہی سوچوں میں الجھا ہوا میں گھر آ گیا۔ امی میری منتظر تھیں۔ میں نے

امی کو سب باتیں تفصیل سے بتا دیں۔ یہ ساری باتیں سن کر وہ گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔

ایک دن میں اور امی لان میں بیٹھے تھے۔ میں نے چائے کے لیے خالہ زینب کو دوسری بار آواز دی۔ ''امی آپ کے پیار نے خالہ کو بہت سر پر چڑھا دیا ہے، بتائیے کتنی دفعہ چائے کے لیے کہہ چکا ہوں مگر ان کے کان پر جوں ہی نہیں رینگتی۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔

امی مجھے مسکرا کر دیکھنے لگیں۔ ''یہ تمہیں آج کل بات بات پر غصہ کیوں آنے لگا ہے۔'' انہوں نے بغور مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

اسی وقت صبا گیٹ سے اندر داخل ہوتی نظر آئی۔ وہ حسبِ معمول سادہ لباس میں تھی۔ کاندھے پہ اب بھی وہی تھیلا نما بیگ لٹک رہا تھا۔

امی نے بڑے تپاک سے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر پوچھا، ''پہلے یہ بتاؤ اب تمہارے ابو کی طبیعت کیسی ہے؟''

''اللہ کا شکر ہے آنٹی، اب ٹھیک ہے۔'' اس نے کن انکھیوں سے مجھے دیکھتے ہوئے امی سے کہا۔

امی بڑے غور سے ہم دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔ میرا تھوڑی دیر پہلے کا غصہ صبا کو دیکھتے ہی ہوا ہو گیا تھا۔ اب میرے چہرے پر خوشی اور طمانیت کے تاثرات تھے۔ صبا بھی اپنے تئیں امی سے نظریں بچا کر بار بار مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر اچانک امی کے چہرے پر خوشی سے مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''کبھی اپنی امی کو بھی لے کر آؤ نا۔'' انہوں نے صبا سے کہا۔

''جی ضرور۔'' صبا نے سعادت مندی سے جواب دیا۔ پھر جھجکتے ہوئے بولی۔ ''کبھی آپ بھی ہمارے گھر آئیں نا۔''

''ویسے تو یہ بھی تمہارا ہی گھر ہے۔'' امی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اور اگر تم شرط رکھ ہی رہی ہو کہ پہلے میں ہی تمہارے گھر آؤں، پھر تم اپنی امی کو لے کر آؤ گی تو ٹھیک ہے میں کسی دن رضا کے ساتھ آ جاؤں گی۔ پھر تمہیں میرے پاس آنا پڑے گا۔ بولو آؤ گی نا!''

امی کی بات واضح بھی تھی اور الجھی ہوئی بھی۔ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ یونہی سرسری طور پر بات کر رہی ہیں یا ان کا اس بات سے کوئی خاص مطلب ہے۔ میں نے دیکھا صبا کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور اس کے چہرے پر کہکشاں رقص کر رہی تھی۔ شاید لڑکیوں کی حس اس معاملے میں بہت تیز ہوتی ہے۔ وہ پل بھر میں معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتی ہیں۔

''صبا!'' امی نے اسے مخاطب کیا تو وہ چونک اٹھی۔

''چائے پیو گی یا کافی؟''

''جو مرضی آپ کی۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ پھر بولی۔ ''میں بنا لاؤں آنٹی؟''

''نہیں بیٹی! آج رہنے دو، آئندہ بناتی رہنا۔'' امی نے ایک مرتبہ پھر اشارتاً گہری بات کہہ دی۔ ''میں خود زینت کو دیکھتی ہوں اسے اب تک چائے لے آنا چاہیے تھی۔'' یہ کہہ کر وہ اندر چلی گئیں۔

امی کے جانے کے بعد میں نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا۔ آج وہ اور بھی زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔ ''میرا تو خیال تھا کہ آپ کے ہاتھ کی کافی ہو ہی جاتی، اس دن تو آپ نے باتوں پر ہی ٹرخا دیا۔ وہ تو آپ کی امی اور حنا کو خیال آ گیا ورنہ......؟''

''جناب باتیں بھی تو ضروری ہوتی ہیں۔'' وہ مسکرائی۔ ''اور ویسے کسی دن پھر آ جایئے۔ اپنے ہاتھ سے کافی بنا کر پلا دوں گی۔''

''واقعی! وعدہ کرتی ہیں آپ۔'' میں نے شوخی سے کہا۔

''بالکل! پکا وعدہ۔'' اس نے بھی شرارت سے کہا۔

ہم دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اسی وقت امی واپس آ گئیں۔ ان کے پیچھے پیچھے خالہ زینب چائے کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی آ رہی تھی۔ ''خالہ! آج تو آپ نے بھوکا مار دیا۔'' یہ کہہ کر میں نے ٹرالی میں سے کئی چیزیں جلدی جلدی اپنی پلیٹ میں منتقل کر لیں اور کباب کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''سوری صبا! تم کوئی خیال نہ کرنا، میں اس وقت بہت بھوکا ہوں۔''

میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی امی اور صبا چونک کر مجھے دیکھنے لگے۔ مجھے بھی فوراً احساس ہو گیا کہ میں نے نادانستگی میں صبا کو انتہائی بے تکلفی سے مخاطب کر لیا ہے۔ میں چپ چاپ گردن جھکائے اپنی پلیٹ صاف کرتا رہا۔ میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ میں امی یا صبا سے نظر ملا سکوں۔

تھوڑی دیر بعد جب صبا جانے لگی تو امی نے مجھ سے کہا۔ ''رضا جاؤ صبا کو گھر چھوڑ آؤ۔''

صبا نے امی کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آنٹی یہ تکلف نہ

کریں میں خود ہی چلی جاؤں گی۔
''میں نے اس کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا اور لپک کر کار کی چابی اٹھالایا۔اس کی حوصلہ افزا مسکراہٹ اور انداز دیکھ کر میرا اندازہ تھا کہ وہ میری آفر کو رد نہیں کرے گی۔ میں جو چاہوں اس سے منوا سکتا ہوں۔''صبا! میں معافی چاہتا ہوں میری بے تکلفی آپ کو گراں گزری ہوگی۔''
اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔تھوڑی دیر مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔''مجھے اچھا لگا۔''
''شکریہ! آیئے میں آپ کو چھوڑ دوں۔'' میں نے کہا۔
''جی نہیں! میں خود چلی جاؤں گی۔'' اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔
''کیوں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔''کوئی حرج ہے کیا۔''
''حرج تو کوئی نہیں بس مجھے پسند نہیں ہے، میں ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہتی کہ بعد میں اپنے ضمیر کے خلاف مجھے لوگوں کو جواب دینا پڑے۔میں آپ کے ساتھ گھر میں گھنٹوں باتیں کرسکتی ہوں لیکن کسی پارک یا ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر باتیں کروں گی تو نہ اپنے آپ کو اس کام پر آمادہ کر سکوں گی اور نہ لوگوں کو مطمئن کرسکوں گی کہ میں گھر چھوڑ کر ہوٹل میں کیوں آگئی ہوں۔''
''آپ نے تو دوٹوک بات کردی۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ ہم باہر چل کر چائے پیتے، کچھ باتیں ہوتیں اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملتا۔''
''کیا ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے باہر چائے پینا، کھانا کھانا، ہوٹل میں بیٹھنا یا پارک میں گھومنا ضروری ہے؟'' اس نے سنجیدگی سے پوچھا پھر ہنس کر کہنے لگی۔''میرا خیال ہے کہ ہم گھر میں بیٹھ کر اچھی خاصی باتیں کرلیتے ہیں۔''
''میں صرف بات چیت بھی نہیں کرسکتا۔اچھی خاصی تو دور کی بات ہے۔'' میں نے قدرے مایوسی سے کہا۔''میں جو باتیں کہنا چاہتا ہوں وہ نہ تمہارے گھر والوں کی موجودگی میں کرسکتا ہوں نہ اپنی امی کے سامنے۔'' میں نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
اس کے چہرے پر میری بے تکلفی کے سبب شرم سے سرخی پھیل گئی۔وہ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولی۔''کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟''
''یہ تو میرے کہنے کے بعد ہی تم کو معلوم ہوگا۔'' میں نے شوخی سے کہا۔''بہر حال ضد نہ کرو، میں تمہیں گھر چھوڑ دوں گا۔'' میں نے ایک بار پھر اس اُمید پر کہا کہ شاید اب وہ انکار نہ کرے۔
''نہیں رضا صاحب!'' اس کی سنجیدگی برقرار تھی۔
''رضا صاحب نہیں، صرف رضا!'' میں نے نہایت اپنائیت سے مسکرا کر کہا۔
وہ محجوب سی ہوکر بولی۔''رضا!میں نہ آپ کے ساتھ جاؤں گی اور نہ باہر کہیں بیٹھوں گی۔''
''اچھا!'' میرے لہجے میں مایوسی در آئی۔''پھر تو ہمارا ایک دوسرے کو سمجھنا بڑا مشکل ہے۔''
''میرے خیال میں تو قطعی مشکل نہیں۔'' وہ مسکرائی پھر آہستہ سے بولی۔''اگر آپ اب بھی نہ سمجھیں تو دوسری بات ہے۔''
اس کا لہجہ معنی خیز ہوگیا تھا۔پھر وہ خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔ مجھے اس کے محتاط رویے سے خوشی ہوئی۔ بظاہر میں مایوسی کا اظہار کررہا تھا مگر درحقیقت اس کی صاف گوئی، اعتماد اور محتاط رویے کو دل ہی دل میں سراہ رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ اس نے اپنی شخصیت کو میری نظروں میں ہلکا نہیں ہونے دیا تھا۔میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں امی کو کہہ دوں گا کہ وہ صبا کو اپنی بہو بنالیں۔
امی صبا کو ویسے بھی بہت پسند کرتی تھیں۔اس کے حق میں میری رائے سن کر تو وہ خوشی سے اچھل ہی پڑیں۔ دوسرے ہی دن وہ مٹھائی لے کر صبا کے گھر جا پہنچیں اور میرے لیے صبا کو کیانی صاحب سے مانگ لیا۔ کیانی صاحب نے اسی وقت اپنی بیگم سے مشورہ کیا۔ دونوں اس رشتے سے بہت خوش اور مطمئن تھے۔انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔وہ تو اسی وقت اپنی رضا مندی سے امی کو آگاہ کردیتے لیکن صبا نے اپنی امی کو مجبور کیا کہ وہ سوچنے کی مہلت مانگ لیں اور بعد میں اپنی رائے سے آگاہ کریں۔
ایک دن دفتر میں صبا کا فون آیا۔اس نے کہا کہ رضا! آپ آج گھر آسکتے ہیں۔ مجھے آپ سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔
''میں نے وعدہ کیا کہ میں پہنچ جاؤں گا۔شام کو میں اس کے گھر پہنچا تو کیانی صاحب بچوں کو ٹیوشن پڑھانے گئے ہوئے تھے۔ حنا اور اس کے تینوں بھائی مجھے سلام کر کے کمرے سے باہر چلے گئے۔میں اور صبا کمرے میں اکیلے رہ

گئے۔ اس کی امی اب تک میرے سامنے نہیں آئی تھیں۔ میں اس کے چہرے کے مختلف اتار چڑھاؤ کو بغور دیکھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے ذہن میں بہت سی باتیں الجھی ہوئی ہیں اور وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی ہے کہ بات کہاں سے شروع کرے۔

''کیا بات ہے صبا؟'' میں نے نرم لہجے میں سوال کیا۔ ''کچھ الجھی الجھی سی نظر آرہی ہو۔ کوئی پریشانی ہے؟ مجھے کھل کر بتاؤ میں ہر ممکن طور پر تمہاری مدد کروں گا۔''

میرے ذہن میں اندیشے سر سرانے لگے۔ مجھے جانے کیوں یہ احساس ہونے لگا تھا کہ وہ میرے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتی اور صاف صاف انکار کرنے میں اسے ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی ہے۔

''رضا! آپ کو معلوم ہے نا کہ آپ کی امی ہمارے یہاں......''

''یہ سب مجھے معلوم ہے۔'' میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''تم اصل بات بتاؤ کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔''

''رضا!'' اس نے اپنے اندر کا تمام پیار سموتے ہوئے مجھے پکارا۔ ''وہ مکان میرے لیے بڑی جذباتی حیثیت رکھتا ہے اس میں رہنا میرا خواب ہے، شدید تمنا ہے۔ آپ سے شادی کے بعد میں اس میں رہ بھی سکتی ہوں مگر میں آپ سے شادی نہیں کرسکتی۔''

''کیوں؟'' اس کے انکار نے میرے اعصاب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔

''کیوں کہ مجھے آپ سے محبت ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ آئندہ کبھی آپ کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ میں نے آپ سے محض مکان میں رہنے کی خواہش پوری کرنے کے لیے شادی کی ہے۔'' اس نے وضاحت کی۔ ''دوسری بات یہ ہے کہ مکان میں رہنے کی شدید آرزو سے بھی زیادہ ایک اور مقصد ہے۔ وہ حنا اور چھوٹے بھائیوں کی تعلیم اور بہتر مستقبل کا مسئلہ ہے۔ میں خود غرض بن کر شادی کر کے اس مکان میں چلی گئی تو گھر کے اخراجات اور بھائیوں کی تعلیم کے لیے حنا کو اپنی تعلیم چھوڑ کر ملازمت کرنا پڑے گی۔ ابا کی ٹیوشنز سے تو یہ سب کچھ پورا نہیں ہوسکتا۔''

''میں شادی کے بعد کرایہ دینا بند نہیں کروں گا۔'' میں نے جلدی سے بلا سوچے سمجھے کہا۔

وہ میری بات سن کر ایک دم غصے میں آگئی۔ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''رضا صاحب! یہ ساری باتیں میں نے آپ سے اس لیے نہیں کی تھیں کہ میں آپ کو کرایہ دینے پر قائل کروں۔ معاف کیجیے گا مجھے آپ کے اس جملے سے بہت دکھ پہنچا ہے۔''

''سوری صبا۔'' میں نے خلوص سے معذرت کی۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میں نے واقعی غلط بات کہہ دی ہے۔ میں نے صبا سے کہا۔ ''میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا میں دراصل یہ کہنا چاہتا تھا کہ شادی کے بعد تم بے شک ان کے گھر سے رخصت ہو جاؤ گی لیکن رہو گی تو ان کی بیٹی! پھر تمہارے اور میرے دکھ سانجھے ہوں گے۔ میں ان کے بیٹے کی طرح ہوں تم جو کچھ ان کے لیے سوچتی اور کرتی رہی ہو وہ اب میں اپنا فرض سمجھ کر کروں گا۔'' میں سانس لینے کے لیے رکا۔ وہ میری طرف پوری طرح متوجہ تھی۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے والدین اور بہن بھائیوں کی تمام ذمہ داری میں پوری کروں گا۔''

میرے وعدے کے بعد اس کے چہرے پر طمانیت بھری مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ خوشی سے لبریز آواز میں بولی۔ ''شکریہ رضا! تمہاری ہمدردی کا بہت بہت شکریہ مگر شادی......''

''اگر مگر کچھ نہیں صبا۔'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں؟''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے گویا ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ ''مگر بعد میں مجھے کسی قسم کا طعنہ مت دینا۔''

جلد ہی ہماری شادی ہوگئی۔ صبا بے حد محبت کرنے اور ذرا ذرا سی باتوں کا خیال رکھنے والی بیوی ثابت ہوئی۔ اپنے خوابوں کے محل میں آکر خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹی پڑتی تھی۔ وہ ہر وقت گھر کو صاف ستھرا رکھتی تھی۔ خود ہی سارا کام کرتی، سجاتی، سنوارتی۔ وہ امی کا بھی بے حد خیال رکھتی تھی اور انہیں کوئی کام نہیں کرنے دیتی تھی۔

میں نے شادی کے بعد اسے ہنی مون کے لیے لے جانا چاہا مگر وہ راضی نہ ہوئی۔ اسے گھر سے جدائی پل بھر بھی گوارا نہ تھی۔ وہ اپنے گھر بھی جاتی تو شام کو لوٹ آتی تھی۔ کوئی رات اس نے مکان سے دور نہیں گزاری تھی۔ ہنی مون کے لیے ایک ماہ کی چھٹی میں نے اس کے ساتھ اسی مکان میں گزار دی۔

ایک ماہ بعد میں واپس ڈیوٹی پر آیا تو ہر شے بدلی ہوئی تھی۔ آفس کے سب پرانے لوگ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ میں اپنے کمرے میں داخل ہوا تو میری کرسی پر کوئی

اجنبی شخص بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے داخل ہوتے دیکھ کر اس نے مسکرا کر پوچھا۔ "جی فرمایئے۔"

"آپ کون ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ میری سمجھ میں یہ ماجرا نہیں آرہا تھا کہ دفتر میں سبھی لوگ ایک دم کیسے بدل گئے۔

میرے سوال کرنے پر وہ سوچتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اس فرم میں ملازمت کرتا ہوں اور ایک مہینے کی چھٹی کے بعد دفتر آیا ہوں، وہ مجھے لے کر مالک کے کمرے میں گیا۔ میں مالک کی کرسی پر اجنبی شخص کو بیٹھے دیکھ کر چونک اٹھا۔

"مسٹر!" مالک کی کرسی پر بیٹھا ہوا شخص رعونت سے بولا۔ "آپ پہلے یہاں کام کرتے تھے، مگر اب نہیں۔ اب یہ فرم میں نے خرید لی ہے۔ آپ کو ایک مہینے پہلے نوٹس جاری کردیا گیا تھا۔" اس نے بات ختم کرنے والی نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں خاموشی سے باہر آگیا۔ حجت کرنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔

میں بوجھل قدموں سے پارکنگ ایریا کی طرف جارہا تھا میرے ذہن میں فکر وتشویش کے سائے رینگ رہے تھے۔ میں نے صبا کے گھر والوں کی ذمہ داری قبول کی تھی تو اب کیسے اسے پورا کروں گا۔ میں اس وقت خود کو بالکل مجبور سمجھ رہا تھا۔ ابو کا چھوڑا ہوا نقد روپیا ہم پہلے ہی خرچ کر چکے تھے جو باقی بچا تھا وہ شادی پر ختم ہوگیا تھا۔

اچانک مجھے اپنے کندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس ہوا۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ وہ محبوب انصاری تھا۔ محبوب انصاری امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار کرتا تھا میں جس فرم میں ملازم تھا وہ اسی کے ذریعے مال منگواتی تھی۔ مجھے پریشان دیکھ کر اس نے سبب پوچھا تو میں نے اسے تمام صورتِ حال سے آگاہ کردیا۔ اس نے مجھے شام کو اپنے دفتر آنے کے لیے کہا۔ میں سارا دن فکرو پریشانی میں مبتلا سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا۔ شام کو کار کا رخ میں نے محبوب انصاری کے آفس کی طرف کردیا۔ اس نے مجھے نوکری کی پیشکش کی۔ تنخواہ پہلے کے مقابلے میں آدھی بھی نہیں تھی۔ نہ مکان کا کرایہ تنخواہ میں شامل تھا۔ البتہ پیٹرول کا خرچا وہ ادا کررہا تھا۔ میں نے فی الحال اس نوکری ہی کو غنیمت جانا۔

میں گھر لوٹا تو میرے چہرے پر عیاں پریشانی سب کے لیے تشویش کا باعث بن گئی۔ میں نے بمشکل صبا کو ٹالا۔ میں دیر تک امی کے کمرے میں ان کے پاس بیٹھا رہا۔ صبا سونے کے لیے چلی گئی تو میں نے امی کو تمام باتیں بتادیں۔ انہوں نے تحمل سے ساری باتیں سن کر مجھے ڈھارس دی۔ انہوں نے کہا کہ "اچھا برا وقت سب پر آتا ہے ہم یہ مکان چھوڑ دیں گے اور کسی چھوٹے مکان میں منتقل ہوجائیں گے۔ اس بنگلے کا کرایہ جو آئے گا اس سے صبا کے گھر والوں کے اخراجات پورے ہوجائیں گے، جو کمی ہوئی وہ ہم پوری کردیں گے۔" ان کی تسلی سے مجھے بڑا حوصلہ ہوا۔

میں اپنے کمرے میں آیا تو صبا جاگ رہی تھی۔ اسے جاگتا دیکھ کر میں ایک لمحے پریشان ہوگیا۔ جانے کیسے وہ میرے چہرے سے دل کا حال جان لیتی تھی۔ میں اسے ابھی یہ بتانا نہیں چاہتا تھا کہ وہ اب اپنے خوابوں کے محل میں نہیں رہ سکے گی میں جانتا تھا کہ اسے بہت صدمہ ہوگا۔

"کیا بات ہے رضا! بہت پریشان لگ رہے ہو؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

میں نے بھی جانے کیا سوچ کر اسے ساری بات بتادی۔ یہ جان کر کہ ہمیں اس مکان کو چھوڑ کر کسی معمولی گھر میں منتقل ہونا ہے۔ اس کے چہرے پر دکھ، صدمے، اذیت اور کرب کے تاثرات نمایاں ہوگئے۔ وہ روتی ہوئی اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ مجھے یکایک یہ احساس ہوا کہ میری ذات اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس کے سارے جذبے اس گھر سے بندھے ہوئے ہیں۔ یہ سوچ کر مجھے دکھ کا شدید احساس ہوا۔ تھوڑی دیر بعد میں باہر نکلا تو اسے سامان پیک کرتے دیکھ کر حیرت سے سن رہ گیا۔

"صبا......!" میں نے سرشار لہجے میں پکارا۔ میرے خیالات اس کے بارے میں غلط ثابت ہوئے تھے۔ میرے پکارنے پر وہ قریب چلی آئی۔ "تمہیں یہ گھر چھوڑنے کا بہت ملال ہے۔" اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھیں سرخ ہورہی ہیں اور سوجی ہوئی ہیں۔ "صبا! میں نے وفورِ جذبات میں اسے خود سے قریب کرتے ہوئے کہا ہم انشاء اللہ کبھی نہ کبھی اپنا گھر ضرور بنائیں گے۔ ہم دونوں مل کر اپنی پسند سے؟"

"ہم اپنے بچوں کی مرضی بھی اس میں شامل کریں گے۔" اس نے بے ساختہ کہا۔

"واقعی!" میں نے اس انداز سے کہا کہ وہ ایک دم شرما گئی۔ پھر کھل کر ہنسنے لگی میرے دل کا سارا بوجھ صبا کی ہنسی میں بہہ گیا۔

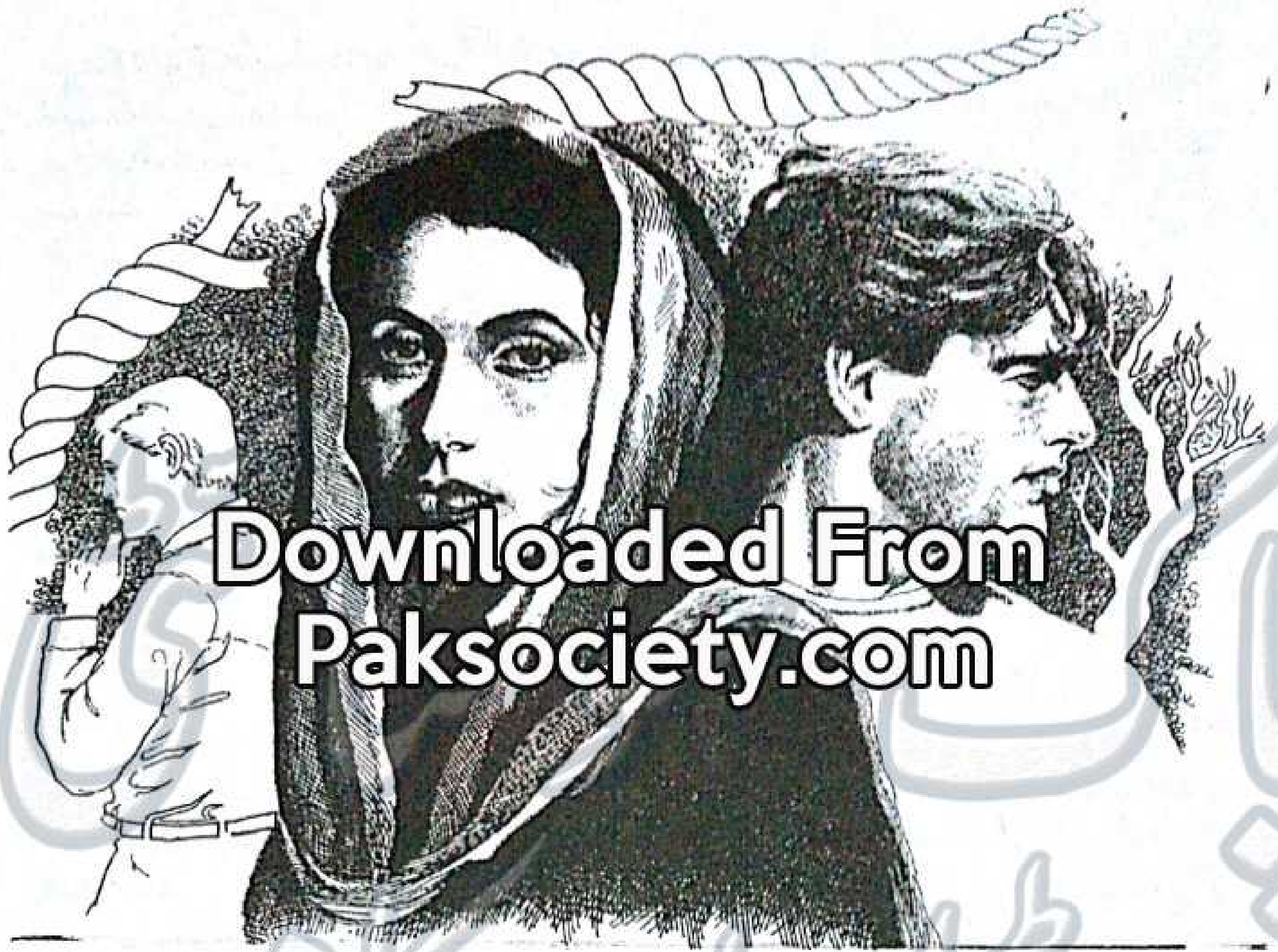
تکمیلِ عشق

محترم مدیر اعلیٰ
السلام علیکم
اس بار بھی ایک جداگانہ سی تحریر کے ساتھ حاضر ہوں۔ اس روداد میں کرداروں کے نام تبدیل کردیے ہیں۔ یہ سچ بیانی ہر لڑکی کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہیں۔

دانیہ صدیقی
(کراچی)

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ محبت کسی نہ کسی طرح آزماتی ضرور ہے، یا تو یہ دو انسانوں کے لیے نئی زندگی کی نوید بن کے آتی ہے یا پھر انہیں راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کردیتی ہے۔ احمر جسے میں نے زندگی کی ہر شے سے بڑھ کر چاہا جس کی خاطر اپنے والدین کو خفا کیا اور زمانے بھر کی ناراضگی مول لی، وہی دشمن جاں دنیا کی بھیڑ میں نجانے کہاں گم ہوگیا ہے۔ جس کی ایک آواز پر میں سب کام کاج چھوڑ کر دوڑی چلی جاتی تھی، جو اگر مجھ سے ناراض ہوجائے تو جب تک اسے منا نہ لوں میرے حلق سے پانی کا ایک گھونٹ نہیں اترتا تھا، جس کی گفتگو کی میں دیوانی تھی۔ جب وہ کسی کام میں مصروف ہوتا تو گھنٹوں اس کے سامنے بیٹھ کر چپ چاپ صرف اس کی صورت تکا کرتی۔ وہ اکثر میری دیوانگی پر ہنستا اور چھیڑتا۔ ”اگر کسی دن میں چلا گیا تو تم کیا کرو گی؟“ میرا دل جیسے کوئی مٹھی میں جکڑ لیتا اور میں تب تک روتی رہتی جب تک کہ وہ ہاتھ جوڑ کر مجھے منا نہ لیتا۔ میری زندگی کا محور صرف اور صرف اسی کی ذات تھی۔ میں کسی چکور کی مانند اپنے چاند کے گرد گردش کرتی رہتی۔ اس کی آنکھیں بہت بولتی تھیں، مانو دل کے سارے راز عیاں کردیتی ہوں۔ میں اکثر اس کی آنکھوں میں خود کو تلاش کرنے کی ناکام کوشش کرتی اور آخر تھک ہار کر اس سے سوال کرتی۔ ”احمر، تمہاری آنکھوں میں مجھے کبھی اپنے لیے کوئی جذبات نظر نہیں آتے۔ کیا تمہیں مجھ سے ذرا سی بھی محبت نہیں ہے؟“ مگر وہ میرے سوال کا کبھی سیدھے منہ جواب نہ دیتا۔ وہ بہت اچھے شعر بھی سناتا تھا لیکن اس کے یہ شعر ہمیشہ اداسی پر مبنی ہوتے جن کو سن کر میں بھی افسردہ ہو جاتی تھی۔ کبھی وہ چپ چاپ بیٹھا خلاؤں میں گھورتا رہتا اور میرے ٹوکنے پر اس کے ہونٹوں پر ایک حزنیہ سی مسکراہٹ پھیل جاتی۔ وہ اکثر عجیب سی نہ سمجھ میں آنے والی باتیں بھی کیا کرتا، کبھی وہ مجھ سے پوچھتا۔ ”مشعل، کیا یہ دنیا صرف جیتے جاگتے لوگوں کے لیے ہی ہے؟ کیا اس میں مجھ جیسے لوگ نہیں رہ سکتے؟ میں بھی تو انہی کی طرح جینا چاہتا ہوں بس میرے پاس دھڑکنیں نہیں ہیں۔“ یا کبھی وہ بولتا۔ ”ہر کوئی اپنی مرضی سے تو اس دنیا سے نہیں جاتا۔ کبھی کبھی کوئی ایسی مجبوری ہوجاتی ہے کہ انسان بے بس ہوجاتا ہے۔ میں بھی تو ایسے ہی کسی ایک کمزور لمحے کا قیدی ہوں۔“ میں اس کی باتوں میں چھپا رمز سمجھنے کی کوشش کرتی مگر میرے پلے کچھ نہ پڑتا۔

میں تو بس اس کی دیوانی تھی۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے کا اسٹائل، اس کا بولنا، اس کے کھانے کا طریقہ اور اس کا شعر پڑھنا غرض میرا بس چلتا تو میں کسی پجارن کی طرح دن رات اس کے چرنوں میں پڑی رہتی اور وہ تھا بھی تو پوجے جانے کے لائق، اسے دیکھ کر کسی یونانی دیوتا کا گمان ہوتا تھا۔ لڑکیاں اسے دیکھ کر آہیں بھر کر رہ جاتیں اور مرد اس کی دلکش پرسنالٹی دیکھ کر حسد کا شکار ہوجاتے۔ دیکھا جائے تو میں اس کے سامنے کچھ بھی نہیں تھی۔ آپ نے سورج کو شمع دکھانے کی مثل تو سنی ہے نا؟ میں تو اس شمع سے بھی گئی گزری



تھی۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب ایک روز ہمارے گھر پھپو رہنے کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ میں اس وقت محض آٹھ سال کی بچی تھی اور وہیں تخت پر بیٹھی اپنا ہوم ورک کر رہی تھی۔ تبھی مجھے محسوس ہوا کہ پھپو مجھے عجیب سی نظروں سے گھور رہی ہیں۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ واقعی میری ہی طرف دیکھ رہی تھیں۔ امی چائے لے کر آئیں تو وہ ان سے کہنے لگیں۔ ''اے ہے صالحہ، یہ تمہاری بیٹی کس پر چلی گئی ہے؟ ذرا غور سے اس کے نقوش تو دیکھو! اللہ بخشے نہ امی کے خاندان میں ایسے دبی دبی رنگت کسی نے پائی نہ ہمارے ابا ایسے مریل سے تھے! پھر ہم سارے بہن بھائی بھی ماشاءاللہ لاکھوں میں ایک۔ ساری بھابیاں بھی ہم چھان پھٹک کر لائے کہ کشمیری خون میں ملاوٹ ہمیں برداشت نہ تھی۔ تم بھی دودھ ملائی جیسی اور ہمارے بھیا کے تو کیا ہی کہنے مگر مشعل کو دیکھ کر تو میری عقل حیران ہے۔'' میں گو کہ اس وقت بہت چھوٹی تھی مگر پھپو کی ایک ایک بات میرے کلیجے پر برچھی کی طرح وار کر رہی تھی۔ کچھ میں بچپن سے بہت حساس بھی واقع ہوئی تھی یا آپ یوں کہہ لیں کہ احساس کمتری نے مجھے بہت حساس بنا دیا تھا۔ میں نہیں جانتی کہ امی نے کس طرح میرا دفاع کیا کیونکہ میں تو اپنی کتابیں سمیٹ کر کمرے میں چلی آئی تھی۔ ایک یہ واقعہ اور بعد میں ہونے والے پے در پے واقعات نے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ میں اپنی مختلف شخصیت بلکہ دیگر الفاظ میں کہا جائے تو بدصورتی کے باعث اپنے ہی خاندان کے لیے ناقابل قبول تھی۔ کبھی پیٹھ پیچھے تو کبھی سب کے سامنے میرے کزنز مجھے مذاق کا نشانہ بناتے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ سارے بے حد حسین تھے۔ خالص کشمیری سیبوں کا رس اور ڈل جھیل کی ساری دلکشی سمیٹے ہوئے! امی بتاتی تھیں کہ میں جب پیدا ہوئی تھی تب ان سب کی طرح ہی سرخ و سفید اور انتہائی خوبصورت تھی۔ ابو نے جب پہلی بار مجھے دیکھا تو بے اختیار کہہ اٹھے ''یہ تو اپنی روشنی سے سب کی آنکھیں خیرہ کرنے والی مشعل ہے!'' جب تک میں اسپتال میں رہی ڈاکٹرز مجھے خاص طور پر دیکھنے اور پیار کرنے آتیں۔ نرسز مجھے پیار سے روئی کی گڑیا یا کشمیری سیب کہہ کر پکارتیں۔ خاندان بھر میں مشہور ہو گیا تھا کہ منصور کے گھر ایک جیتی جاگتی پری نے جنم لیا ہے۔ تین سال تک میں ایسے ہی سب کی آنکھوں کا تارا بنی رہی پھر نجانے کس کی بری نظر لگی کہ مجھے آخری

درجے کا ٹائیفائیڈ ہوگیا۔ نوبت یہاں تک آ گئی کہ میری زندگی کے لالے پڑ گئے۔ جب ڈاکٹرز نے جواب دے دیا تو امی اور ابو وہاں سے مایوس ہو کر مزاروں اور درگاہوں پر لے جانے لگے۔ ایک دن امی مجھے ہائی وے پر واقع کسی دور دراز ویران سے مزار پر لیے بیٹھی تھیں۔ ابو نماز پڑھ رہے تھے جب اچانک میری طبیعت بگھڑنے لگی۔ بقول امی کے میں آخری سانسیں لے رہی تھی اور وہ مجھے گود میں لیے دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں تب اچانک مزار کے کسی کونے سے ایک ملنگ نمودار ہوا۔ اس نے امی کی حالت دیکھی اور مجھے ان کے ہاتھوں میں دم توڑتا دیکھا تو بولا ”بی بی، اس بچی کی بے انتہا خوبصورتی اس کی جان لے کر ہی ٹلے گی۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اس کا حسن کسی ناگ کی طرح اس کی گردن کے گرد لپٹا ہوا ہے جو اسے سانس نہیں لینے دے رہا اس ناگ کو ہٹانا پڑے گا ورنہ تمہاری بچی جان سے جائے گی۔“ اتنی دیر میں ابو بھی نماز ختم کر کے بھاگے چلے آئے تھے۔ انہوں نے ملنگ کی بات سنی تو ہاتھ جوڑ کر اس سے درخواست کی کہ وہ کچھ بھی کرے مگر کسی طرح ان کی بیٹی کی جان بچالے۔

اس نے پچھاڑیں کھاتی ہوئی امی کے ہاتھوں سے مجھے لیا۔ اس وقت تک میری نبض تقریباً ڈوب چکی تھی اور جسم برف کی مانند ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ اس نے میرے چہرے کی طرف منہ کر کے کچھ پڑھ کر پھونکا۔ اسی وقت مجھے بالکل سیاہ رنگ کی الٹی ہوئی اور تھوڑی ہی دیر میں میری ٹوٹتی ہوئی سانسیں بحال ہونے لگیں۔ میرے والدین مجھے لے کر اسپتال بھاگے جہاں ڈاکٹرز نے میرے مکمل چیک اپ کے بعد معجزانہ طور پر صحت مند قرار دے دیا۔ میں تیزی سے رو بصحت ہونے لگی تو میرے والدین نے دوبارہ اسی مزار پر جا کر اس ملنگ کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی تاکہ اس سے مل کر اس کا شکریہ ادا کر سکیں مگر انہیں ہر بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ادھر میری یہ کیفیت ہوئی کہ دن بدن میرا رنگ جلتا چلا گیا جبکہ چہرے اور گردن پر ہلکے ہلکے سے سیاہ تل نما دھبے نمودار ہونے لگے۔ ڈاکٹرز نے اسے دوائیوں کا ری ایکشن قرار دے کر مزید دوائیاں دیں مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بجائے وہ دھبے غائب ہوتے وہ مزید گہرے ہو کر میرے پورے جسم پر پھیل گئے، بال جھڑنے لگے اور میں سوکھ کر کانٹا ہوگئی۔

میرے والدین نے میری یہ حالت دیکھ کر مزید علاج کرانے سے توبہ کر لی اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔ جب میرے دبے دبے سے نقوش اور جلی ہوئی رنگت کا خاندان میں مذاق اڑایا جاتا تو اس وقت شدت سے میرا دل کرتا کہ اس ملنگ کو ڈھونڈ کر اسے قتل کر دوں جس نے مجھ سے میرا حسن چھین لیا تھا اور اس کے بدلے میں یہ محرومی بھری زندگی دی تھی۔ کبھی کبھی مجھے اپنے ماں باپ پر بھی غصہ آتا جنہوں نے سب جانتے بوجھتے اور عقل رکھتے ہوئے بھی مجھے اس حسن پرست دنیا کے ماتھے پر ایک بدنما داغ کی طرح سجا دیا تھا۔ میں دل ہی دل میں اپنی بدصورتی پر کڑھتی مگر میرے پاس اس کا کوئی علاج نہ تھا بلکہ ہر وقت کڑھتے رہنے سے میری رنگت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید جل گئی تھی اور میری جسامت بھی دھان پان سی ہو کر رہ گئی تھی۔

اسے میری خوش قسمتی کہیے یا بد قسمتی کہ میری پیدائش کے وقت کوئی ایسی پیچیدگی ہوگئی تھی جس کے باعث امی کے لیے مزید بچے پیدا کرنا ناممکن ہوگیا تھا اسی لیے میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہی رہی۔ اسکول اور کالج میں میری انتہائی عام سی شکل وصورت اور دبوسی شخصیت کے باعث کسی نے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا تو درکنار کوئی سیدھے منہ بات کرنا بھی پسند نہ کرتا تھا۔ میں اپنے آپ کو اس حسن پرست دنیا کے لیے مس فٹ سمجھتی تھی۔ کئی بار میں نے لوگوں کے طعنوں سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچا مگر یہاں میری بزدلی اور خود اعتمادی سے محروم فطرت آڑے آ گئی۔ گریجویشن کرنے کے بعد میری امی نے مجھے آگے پڑھنے کی اجازت نہیں دی۔ خود مجھے بھی پڑھنے کا زیادہ شوق نہ تھا اور سچائی تو یہ تھی کہ دنیا کی بے رحم نظروں اور ان کی زہر بھری باتوں کا سامنا کرنے کی مجھ میں مزید ہمت نہ تھی۔ ہمارے خاندان میں بیٹیوں کو غیروں میں بیاہنے کا رواج نہ تھا۔ امی کو یقین تھا کہ میرے ددھیال میں نہ سہی مگر ننھیال سے کوئی نہ کوئی میرا ہاتھ ضرور مانگے گا۔ اسی غرض سے وہ میرے رونے دھونے کو نظر انداز کر کے مجھے ہر دعوت میں بنا سنوار کر اپنے ساتھ لے جاتیں۔ وہاں جا کر میں اپنے آپ میں اور بھی سمٹ جاتی۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ امی کا خاندان بہت خوبصورت تھا۔ نہ صرف لڑکیاں بلکہ لڑکے بھی ایک سے بڑھ کر ایک تھے جن کے سامنے بڑے بڑے ماڈلز اور اداکار بھی پانی بھرتے نظر آتے۔ مجھے اپنی امی پر حیرت ہوتی کہ کیا وہ واقعی اولاد کی محبت میں اندھی تھیں یا پھر انتہائی خوش فہمی کا شکار تھیں۔ معاملہ جو بھی تھا کم از کم میں ان کی طرح جاگتی آنکھوں سے سپنے نہیں دیکھتی تھی۔ اس مصنوعی دنیا کے

طور طریقوں نے مجھے حقیقت پسند بنا دیا تھا۔ میں اپنے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہ تھی، جانتی تھی کہ ساری دنیا جھوٹی ہوسکتی ہے مگر میرا ہمدرد، میرا غمگسار آئینہ مجھ سے بھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اگر زندگی میں، میں نے کسی کو اپنا سچا دوست پایا تھا تو وہ یہی آئینہ ہی تھا جس نے تنہائی میں میرے آنسو پونچھے تھے، ایک وہی تھا جسے میں اپنے دل کے سارے درد بانٹا کرتی تھی لیکن پھر ایک دن احمر میری ویران زندگی میں بہار کی مانند آیا اور میں اس ظالم دنیا سے سارے شکوے شکایتیں بھلا بیٹھی۔

احمر سے میری ملاقات بڑے ڈرامائی انداز سے ہوئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب امی بھی میرے رشتوں کی طرف سے مایوس ہو کر بیٹھ گئی تھیں۔ میں جو شروع ہی سے تنہائی پسند واقع ہوئی تھی۔ اپنے والدین کو اپنی وجہ سے پریشان دیکھ کر مجھے اور شرمندگی ہونے لگتی تھی۔ خود کو ان کی پریشانی کا ذمہ دار مان کر میری کوشش ہوتی کہ ان سے کم سے کم سامنا ہو۔ اسی لیے میں اب زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی لیپ ٹاپ پر مصروف رہتی۔ ایک روز چیٹنگ کے دوران میری اور احمر کی بات چیت شروع ہوئی۔ مجھے وہ بہت اچھا لگا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کے والدین تین سال قبل ایک ہوائی حادثے کا شکار ہو کر اس دنیا سے چل بسے تھے اور وہ بھی میری طرح اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہی تھا۔ اس کا باقی خاندان پاکستان سے باہر تھا اور وہ خود ایک چھوٹا موٹا بزنس مین تھا۔

چند ہی دنوں میں میری اس سے اچھی دوستی ہوگئی۔ اب میں نے اس سے موبائل پر باتیں کرنی بھی شروع کر دی تھیں۔ میں رات بھر اس سے باتیں کرتی اور دن بھر اس کی طلسماتی باتوں میں کھوئی رہتی۔ اب مجھے اپنی بدصورتی کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔ احمر نے مجھ سے صاف کہہ دیا تھا کہ اس کے نزدیک خوبصورتی اور بدصورتی کے معیار کوئی اہمیت نہیں رکھتے کہ اصل خوبصورتی تو دل کی خوبصورتی ہوتی ہے۔ اس نے مجھے وہ اہمیت اور اعتماد دیا تھا جس کے بعد میں ہواؤں میں پرواز کر رہی تھی۔ جب میں پہلی بار اس سے ملی تو پلکیں جھپکنا بھول گئی تھی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ احمر اس قدر ہینڈسم ہوگا۔ وہ بالکل میرے خوابوں کے شہزادے کی طرح لگتا تھا۔ گو احمر کی شرط کے مطابق ہم رات کی تاریکی میں ملے تھے مگر اس کو پہلی نظر میں دیکھ کر ہی میں اس پر دل ہار بیٹھی تھی۔ اس سے ملاقات کے لیے میں بڑی مشکل سے مارکیٹ جانے کا بہانہ کر کے گھر سے نکلی تھی۔ آبادی سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک زیر تعمیر پروجیکٹ میں وہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے اس کی فرمائش کچھ عجیب سی تو لگی مگر اس کو ایک نظر دیکھ کر ہی میں سارے شکوے بھول گئی۔ ہم نے بمشکل دس منٹ باتیں کیں پھر میں اپنی بے قابو دھڑکنوں کو سنبھالتی جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ احمر مجھے مین گیٹ سے باہر میری کار تک چھوڑنے ساتھ آیا پھر اس نے ایک عجیب حرکت کی کہ وہ جانے کے بجائے واپس اندر چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یاد آیا کہ بوکھلاہٹ میں، میں نے اپنا پرس وہیں چھوڑ دیا ہے تو میں اس کو لینے کے لیے دوبارہ اندر گئی۔ مجھے اُمید تھی کہ احمر بھی اندر ہی ہوگا، اسی لیے بغیر ڈر اور خوف کے میں تیز تیز قدم اٹھاتی اندر چلی گئی۔ میرا پرس اسی چبوترے پر رکھا ہوا تھا جس پر پانچ منٹ قبل ہم بیٹھے ہوئے تھے۔ اپنا پرس تھام کر جب میں نے سر اٹھایا تو مجھے احساس ہوا کہ میں اس وسیع و عریض کھنڈر میں بالکل تنہا کھڑی ہوں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے احمر کو دو تین آوازیں دیں مگر جواب میں سرسراتی ہوئی ہوا اور اڑتے ہوئے پتوں کے علاوہ کوئی آواز نہ سنائی دی تو ڈر کے مارے میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اپنے خوف سے لرزتے وجود کو سنبھالتے، بڑی مشکلوں سے گرتے پڑتے میں گیٹ کی طرف بھاگی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا رات کے اندھیرے میں ہزاروں بدروحیں میرا پیچھا کر رہی ہوں۔ گیٹ سے باہر آ کر میں گاڑی میں بیٹھی اور پیچھے دیکھے بغیر سرپٹ گاڑی دوڑا دی۔ رات کو جب میری اس سے فون پر بات ہوئی تو میں نے اس سے پوچھا کہ اس وقت وہ کہاں تھا جب میں اس کے پیچھے ہی پرس لینے واپس اندر آئی تھی۔ اس پر اس نے شدید حیرت کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں نے اندر جاتے کسے دیکھ لیا تھا کیونکہ وہ تو اسی وقت سڑک سے ہوتا ہوا آگے چلا گیا تھا۔ بہرحال یہ سب سن کر میں اتنی خوفزدہ ہوئی تھی کہ دوبارہ اس موضوع پر بات ہی نہیں کی۔

احمر اور میری محبت بڑی تیزی سے پروان چڑھتی چلی گئی۔ میں تو اسے پا کر ساری دنیا کے غم ہی بھلا بیٹھی تھی۔ ہم لوگ اب اکثر ملنے لگے تھے مگر سب کی طرح ہم لوگ ہوٹلز یا پارکس میں نہیں ملتے تھے۔ بلکہ ہر مرتبہ وہ مجھے سنسان علاقوں میں ملنے آتا جہاں دور تک کسی انسان کا وجود نہ ہوتا۔ جب میں نے اس سے سوال کیا کہ ہم نارمل لوگوں کی طرح سی دیو

یا ریستوران وغیرہ میں کیوں نہیں مل سکتے تو جواباً اس نے بڑے پیار سے سمجھایا۔ ''جاناں، ہماری محبت روزِ اول سے پاکیزہ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ دنیا والے اس کو اپنی حاسد نظروں سے آلودہ کردیں۔ ہم اور تم صرف ایک دوسرے کی امانت ہیں۔ یوں گلی کوچوں میں مل کر میں اپنی محبت کو سب کے سامنے تماشا نہیں بنانا چاہتا کیونکہ ہماری محبت بہت خاص ہے اور اس معطر جذبے کو میں اس مطلبی زمانے والوں کی کثافت سے دور، بہت دور رکھنا چاہتا ہوں۔'' میں اس کی یہ تاویل سن کر خوشی سے پھولی نہ سمائی تھی۔ اس روز مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ احمر مجھے.... اور ہماری محبت کو لے کر کتنا حساس ہے۔ نتیجتاً ہم کبھی کسی ویران سے ریلوے اسٹیشن پر ملتے تو کبھی کسی قدیم اور کھنڈر ہوتے قبرستان میں ہماری ملاقات ہوتی۔ ملنے کی جگہ ہر بار وہ ہی مجھے بتاتا تھا، شروع شروع میں تو میں ایسی ویران جگہوں سے بہت خوفزدہ ہوتی تھی مگر اب عادی ہوگئی تھی۔ اب تو اس پر میرا اعتماد بھی پختہ ہوگیا تھا کیونکہ احمر نے کبھی بھی موقع کا غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کی تھی۔ میں اس پر زور دے رہی تھی کہ وہ شادی کے سلسلے میں میرے والدین سے ملے۔ اس بات کے چانسز بہت کم تھے کہ وہ برادری کے خلاف جا کر میری شادی اس سے کرتے مگر پھر بھی یہ کام تو کرنا ہی تھا۔ سب سے پہلے تو میں نے احمر کے لیے خود گھر کا ماحول سازگار بنانے کی ٹھانی اور ایک روز ڈرتے ڈرتے امی کے سامنے احمر کا ذکر کردیا۔ امی کا ری ایکشن میری توقعات سے بڑھ کر شدید تھا۔ یعنی انہوں نے نہ صرف میرا لیپ ٹاپ اور موبائل مجھ سے چھین لیا بلکہ گھر سے باہر میرے اکیلے آنے جانے پر مکمل پابندی لگادی۔ میں احمر سے کئی دنوں تک بات نہیں کر پائی، پھر ایک روز جب امی کسی کام سے پڑوس میں گئیں تو میں نے موقع دیکھ کر احمر کو فون کرلیا۔ احمر تو میری آواز سن کر بیتاب ہوگیا اور فوراً ملنے پر اصرار کرنے لگا لیکن میں نے اسے سمجھایا بجھایا اور جھوٹی تسلیاں دیں کہ شاید امی اور ابو کچھ عرصہ بعد مان جائیں اس لیے وہ تھوڑا صبر سے کام لے مگر میں اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ کبھی بھی نہیں مانیں گے۔ اس کے بعد میں نے اسی طرح موقع دیکھ کر کئی بار احمر کو فون کیا۔

وہ ہر بار مجھ سے گھر چھوڑ آنے پر اصرار کرتا اور اپنی محبت کے واسطے دیتا۔ وہ مجھ سے کہتا کہ اگر میں فوراً اسے نہ ملی تو وہ محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی جان دے، دے گا۔ ہم لوگ اسی طرح چھپ چھپ کر باتیں کرتے تھے اور جب ایک دن اس نے مجھے اسی رات خودکشی کی دھمکی دے ڈالی تو آخر کار میں نے اپنی زندگی کا سب سے انتہائی فیصلہ کرلیا۔

اس روز امی اور ابو میرے تایا کی عیادت کے لیے اسپتال گئے ہوئے تھے۔ میں سر درد کا بہانہ کرکے گھر پر ہی رک گئی تھی۔ ویسے بھی احمر والے واقعے کو گزرے تین، چار ماہ کا عرصہ بیت گیا تھا اور اس کے بعد میں نے ایک بار بھی گھر میں اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس لیے انہیں لگا تھا کہ میں راہ راست پر آگئی ہوں۔ ان کے جانے کے بعد میں جلدی جلدی ان کے کمرے کی طرف بڑھی۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ امی زیورات کہاں رکھتی ہیں۔ یہاں میں نے اس بات کا خیال رکھا کہ صرف اپنی شادی کے لیے خریدے گئے زیورات نکال کر بیگ میں رکھ لیے۔ ہم لوگ ماشاء اللہ سے کھاتے پیتے لوگ تھے اس لیے میرے لیے خریدا گیا سونا کم از کم بھی ستر، اسّی تولے سے کم نہ تھا۔ میں اپنے زیورات رکھ کر پلٹ رہی تھی کہ میری نظر ایک بکس پر پڑی جو وہیں کپڑوں کے نیچے دبا کونے پر رکھا تھا۔ بکس کو کھولنے پر میری آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس میں ایک طرف پرائز بانڈز اور دوسری طرف نوٹوں کی موٹی موٹی ہزار ہزار والی گڈیاں سلیقے سے جمی ہوئی تھیں۔ اس وقت گننے کا ٹائم نہ تھا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے پانچ چھ گڈیاں اٹھا کر بیگ میں ڈال لیں اور کچھ پرائز بانڈز اور سیونگ سرٹیفکیٹس بھی اٹھا کر بیگ کی نذر کردیئے۔ یہ سب کرتے ہوئے مجھے قطعی کوئی ندامت نہیں ہورہی تھی۔ آخر میرے والدین جہیز میں بھی یہ زیورات مجھے ہی دیتے اور رہے پیسے تو میری شادی پر خرچ بھی کرنا ہی پڑتا اس لیے وہ پیسے میں نے اپنا حق سمجھ کر اٹھائے تھے۔

میں احمر کو فون کرکے اسے گھر کے قریب اسٹاپ پر آنے کی ہدایت پہلے ہی کرچکی تھی اور اب انتہائی تیز رفتاری سے اپنی ضرورت کی اشیاء بیگ میں ٹھونس کر گھر سے نکل گئی۔ اسٹاپ پر وہ میرا انتظار کررہا تھا اور میں اس کے ساتھ کار میں بیٹھ کر بغیر بینڈ، باجے اور برات کے رخصت ہوگئی۔ احمر مجھے سیدھے ایک ہوٹل لے گیا۔ گھر نہ لے جانے کی وجہ اس نے یہ بتائی کہ پہلے وہ گھر کو میرے شایانِ شان سجا کر پھر مجھے لے جائے گا۔ اگلے ہی روز اس نے مجھ سے نکاح کرلیا اور ہم نے اگلے تین دن اسی ہوٹل کے ایک کمرے میں گزارے۔

احمر کو پا کر گویا میں نے ہفت اقلیم کی دولت پالی تھی۔ یہ

تین دن جیسے میری زندگی کے بہترین دنوں میں سے ایک تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے اس طرح گھر چھوڑ آنے کے بعد میرے والدین پر کیا بیتی، میں تو بس رنگ و نور کی اس دنیا میں پرواز کر رہی تھی جس کا تعلق اس دنیا سے نہ تھا بلکہ شاید میں تو ہلکی پھلکی ہو کر آسمان اور زمین کے بیچوں بیچ کہیں محو پرواز تھی۔ یہ تین دن ہم دونوں ایک دوسرے میں گم ایک بار بھی اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلے، یہاں تک کہ کھانا بھی انٹر کام پر ہی آرڈر کر کے منگوا لیتے۔

چوتھے روز ہم نے ہوٹل سے چیک آؤٹ کیا اور احمر مجھے شہر سے کافی دور بنے ایک جنگل نما علاقے میں لے گیا۔ وہاں اس کا ایک چھوٹا سا گھر تھا جہاں گزارے لائق فرنیچر تو موجود تھا مگر کچن وغیرہ کا سامان موجود نہ تھا۔ دیواروں پر کہیں کہیں مٹی جمی تھی جبکہ فرش پر جا بجا پھیلی گرد دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ کسی نے جلدی جلدی الٹی سیدھی جھاڑو لگانے کی کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ باتھ روم کی ٹونٹیاں تک ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کسی نے سالوں سے یہ مکان استعمال نہ کیا ہو۔ میں نے احمر سے اس بابت سوال کیا تو جواب دینے کے بجائے اس نے میرے ہاتھ تھام کر اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے جذب سے کہا۔

مجھے جینے کی اُمید دوبارہ دے دو،
میری ڈوبتی کشتی کو کنارہ دے دو،
میں درد کے ساحل پر تنہا کھڑا ہوں،
پھر آ کے اپنی بانہوں کا سہارا دے دو

اور میں ہمیشہ کی طرح اس کی سحر انگیز باتوں سے پگھلتی چلی گئی۔

مجھے احمر کے ساتھ اس کے گھر میں رہتے تقریباً بیس دن ہو گئے تھے۔ اس دوران کہیں گھومنے پھرنے کے لیے جانا تو درکنار وہ مشکل سے ہی تین چار بار کھانے پینے کی اشیاء لانے گھر سے باہر نکلا تھا۔ اس دوران بھی اس کی کوشش رہی تھی کہ وہ شام گہری ہونے کے بعد گھر سے نکلے۔ اکثر وہ آدھی رات کو اٹھ کر کھڑکی کے پاس کھڑا چاند کو چپ چاپ تکا کرتا۔ مجھے اس کی یہ حرکتیں بہت پُراسرار لگتیں اور میں اسے ٹوک بھی دیتی مگر میری بات کو سنجیدہ لینے کے بجائے وہ ہمیشہ میرا مذاق اڑاتا اور پھر ایک صبح جب میں سو کر اٹھی تو وہ میرے ساتھ بیڈ پر موجود نہ تھا۔ مجھے لگا کہ وہ شاید باتھ روم میں ہوگا مگر جب کافی دیر گزر گئی اور وہ نہیں آیا تو میں نے اٹھ کر باتھ روم چیک کیا۔ دروازہ کھلا تھا اور وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ میں نے اسے کچن میں جھانکا لیکن وہ وہاں بھی نہ تھا۔ پورا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ میں نے کچھ سوچ کر گیٹ سے باہر آ کر اس کی گاڑی چیک کی تو وہاں گاڑی کو نہ پا کر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کیونکہ اس سے پہلے وہ ایک بار بھی دن میں کہیں جانے کے لیے نہیں نکلا تھا۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا تھا کہ بزنس کی مصروفیات سے بھی اس نے چھٹی لے رکھی تھی تا کہ ہماری تنہائی میں کوئی مخل نہ ہو سکے۔

میری چھٹی حس مجھے کسی انہونی کا اشارہ کر رہی تھی۔ اپنے دل میں ابھرتے بے شمار خدشات کو دباتے میں بیڈ روم کی جانب بھاگی اور جیسے ہی میں نے کانپتے ہاتھوں سے دراز کھولی تو اسے خالی پا کر میرے بدترین خدشات کی تصدیق ہو گئی..... میرے تمام زیورات اور پیسے وہاں سے غائب تھے۔ یہاں تک کہ نکاح نامہ بھی غائب تھا۔ مجھے چکر سا آ گیا اور میں اپنے گھومتے ہوئے سر کو تھام کر وہیں بیٹھ گئی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ احمر مجھے اس طرح چھوڑ کر بھی جا سکتا ہے۔ مجھے زیورات اور پیسوں کی کوئی پروا نہ تھی۔ غم تھا تو صرف احمر کے اس طرح ساتھ چھوڑ کر چلے جانے کا تھا۔ میں نے اس کے موبائل پر کئی مرتبہ کال کی مگر ہر مرتبہ اس کا نمبر آف ملا۔ شدید غم اور مسلسل رونے کی وجہ سے بار بار میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا جاتا تھا۔ میں سارا دن بھوکی پیاسی گیٹ کے سامنے بیٹھی رہی کیونکہ مجھے ایک موہوم سی اُمید تھی کہ میرا احمر واپس آ جائے گا۔ آخر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ کیش اور زیورات بینک میں رکھوانے گیا ہو اور تھوڑی دیر میں واپس آ جائے۔ اسی آس میں وہاں بیٹھے بیٹھے شام ہو گئی۔ جب ہر طرف اندھیرا چھانے لگا تو میں اپنے خیالوں سے چونکی۔ احمر کا نمبر ابھی تک بند تھا اور اس کی واپسی کے کوئی آثار بھی نظر نہ آ رہے تھے۔ میں بڑی دقتوں سے خود کو سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس سنسان علاقے میں، آبادی سے اتنی دور گھر میں اکیلے رات گزارنے کا خیال ہی میرے لیے سوہانِ روح تھا۔ وہ رات میری زندگی کی سب سے بدترین رات ثابت ہوئی تھی۔ ایک پتا بھی کھڑکتا تو میں اچھل پڑتی، ہلکی سی آہٹ ہوتی تو سہم جاتی۔ آج سے پہلے مجھے اس گھر میں رہتے ہوئے اس علاقے کی ہولناکی کا احساس نہ ہوا تھا۔ میں تو بس احمر کی باتوں یا اس کے کاموں میں گم رہا کرتی تھی لیکن آج شدت

سے احساس ہو رہا تھا کہ یہ علاقہ رہنے کے لیے قطعی موزوں نہیں ہے۔ رات کے کسی پہر دو تین جنگلی کتے لڑتے لڑتے گیٹ کے سامنے پہنچ گئے اور انہوں نے اپنی بھیانک غراہٹوں اور آوازوں سے پورا آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی بھی وقت لڑتے لڑتے گیٹ سے کود کر گھر کے اندر پہنچ جائیں گے۔ میں سر سے پاؤں تک پسینے میں بھیگی ہوئی، لرزتی کانپتی بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا رواں تھا اور ہونٹوں پر قرآنی آیات تھیں۔ مجھے اس وقت خود پر جان چھڑکنے والے والدین بہت یاد آ رہے تھے جو میری ذرا سی تکلیف پر بے چین ہو جاتے تھے۔ ان کے شفیق اور مہرباں چہرے بار بار میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ میں رو رو کر با آواز بلند ان سے معافیاں مانگ رہی تھی۔ میں آج بھی اس ہولناک رات کا تصور کرتی ہوں تو کانپ کر رہ جاتی ہوں۔ اسی طرح روتے بلکتے اور تڑپتے ہوئے پتا نہیں کب میری آنکھ لگ گئی اور میں گہری نیند سو گئی۔

اگلی صبح جب میں جاگی تو سر میں شدید درد تھا اور جسم انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا پیا تھا۔ بڑی مشکلوں سے میں اٹھی اور جیسا تیسا ناشتا کر کے دوا کھا کر پھر بستر پر پڑ گئی۔ دو تین گھنٹوں تک بے سدھ پڑے رہنے کے بعد جب مجھے ہوش آیا تو میں خود کو کافی بہتر محسوس کر رہی تھی۔ بخار اتر گیا تھا اور سر میں درد بھی نہیں تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ آج کی رات اس گھر میں نہیں گزاروں گی۔ میرے بیگ میں ابھی کافی رقم موجود تھی۔ شکر تھا کہ احمر کا دھیان میرے بیگ کی طرف نہیں گیا تھا۔ پھر میرے گلے میں سونے کی موٹی زنجیر اور کلائیوں میں سونے کے دو بھاری کنگن بھی تھے۔ جن کی مالیت کُل ملا کر کم از کم بھی دو سے ڈھائی لاکھ روپے تھی۔ اب مجھے کچھ تقویت کا احساس ہو رہا تھا کہ میں بالکل خالی ہاتھ نہ تھی۔ میں نے فون کر کے ریڈیو کیب منگوائی اور اپنا سامان سمیٹ کر جانے کے لیے تیار ہو گئی مگر میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔

میں نے کیب کو شہر کے متوسط علاقے میں واقع ایک ہوٹل چلنے کا کہا۔ وہاں میں نے مینیجر سے جھوٹ بولا کہ میرے شوہر اسلام آباد میں ہیں اور میں کاروبار کے سلسلے میں کراچی آئی ہوں۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے اپنا سامان رکھا اور سب سے پہلے پولیس اسٹیشن کا رخ کیا۔ احمر کی کوئی تصویر میرے پاس موجود نہ تھی۔ آج مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں کتنی بیوقوف تھی کہ میرے پاس اس کا کوئی اتا پتا موجود نہ تھا۔ اس کی محبت میں، میں اتنی اندھی ہو گئی تھی کہ کبھی اس سے یہ نہ پوچھا کہ وہ تصویریں کھنچوانے سے کیوں کتراتا ہے۔ اس کے ماں باپ کیا کرتے تھے یا وہ اپنے خاندان کے کسی بھی فرد سے رابطے میں کیوں نہیں ہے۔ یہاں تک کہ گھر بھی اتنی دور ویرانے میں لینے کا کیا مقصد ہے۔ میرے پاس تو یہ ثبوت تک نہ تھا کہ میری اس سے شادی ہوئی ہے۔ شکر ہے کہ ایک مرتبہ جب وہ سو رہا تھا تو اس کے والٹ میں سے جھانکتے شناختی کارڈ پر میری نظر پڑ گئی تھی۔ جس سے پتا چلا تھا کہ اس کا پورا نام احمر علی قریشی تھا اور اس کی جائے پیدائش ملتان تھی جبکہ پتا بھی ملتان کے کسی محلے کا درج تھا۔ میں نے اس کے شناختی کارڈ کی تصویر لے لی تھی۔ مقصد صرف یہ تھا کہ وہ تو اپنی تصویریں لینے نہیں دیتا مگر اس کی ایک تصویر تو میرے پاس موجود رہے تاکہ جب وہ میرے پاس موجود نہ ہو تو میں اس کی تصویر دیکھ کر ہی دل بہلا لوں۔ میری یہی دیوانگی آج میرے کام آنے والی تھی۔

ڈیوٹی پر متعین پولیس انسپکٹر نے غور سے میری تمام کہانی سنی۔ اس نے احمر کے شناختی کارڈ کی تصویر بھی مجھ سے لے کر پرنٹ کروائی اور مجھے یقین دلایا کہ وہ جلد از جلد معاملے کی تہہ تک پہنچ کر مجھ سے رابطہ کرے گا۔ اس کے بعد میں واپس اپنے ہوٹل آ گئی۔ احمر کے ساتھ گزری اپنی زندگی کے وہ پل یاد کر کے میں پھر سے سسک اٹھی۔ مجھے ابھی تک یقین نہ آتا تھا کہ احمر مجھے دھوکا دے سکتا ہے۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے ایک مرتبہ پھر اس کا نمبر ملایا مگر پھر وہی میسج سن کر مایوس ہو کر فون رکھ دیا۔ میں نے آج اس کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوائی تھی۔ میری محبت کی انتہا اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے؟ صبح کو میں اس سے بدلہ لینے کا سوچ رہی تھی مگر دوپہر کو ایک مرتبہ پھر میں اپنی محبت کے سامنے بے بس ہو گئی اور چاہتے ہوئے بھی اس کے خلاف دھوکا دہی کا پرچا نہ کٹوا سکی۔

اس کے بعد مزید تین روز اسی طرح احمر کی یاد میں تڑپتے گزر گئے۔ میں دیوانوں کی طرح ہر اس ویرانے میں بھٹک رہی تھی جہاں میری اور احمر کی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ اس کی پسندیدہ جگہ یعنی سارے قبرستان بھی چھان مارے تھے کہ شاید کہیں اس کا کوئی نشان مل جائے مگر وہ کہیں نہ تھا۔ مجھے اپنے والدین کی بھی شدت سے یاد آ رہی تھی۔ ہمت کر کے دو تین بار اپنے گھر فون بھی کیا مگر ہر بار ابو کی

آواز سن کر فون رکھ دیا۔ ایک روز میں اپنے گھر کے سامنے بنے فیملی پارک میں چہرہ چھپائے کئی گھنٹے بیٹھی رہی کہ امی یا ابو کی ایک جھلک دیکھنے کو مل جائے مگر مایوسی ہوئی۔

چوتھے روز اسی پولیس انسپکٹر کا فون آیا۔ اس نے مجھے فوراً تھانے بلوایا تھا۔ میں گرتی پڑتی اس آس میں وہاں پہنچی کہ شاید پولیس نے میرے احمر کو ڈھونڈ نکالا ہے مگر وہاں ایک روح فرسا خبر میرا انتظار کر رہی تھی۔ پولیس کے مطابق احمر کو مرے ہوئے پانچ سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ اس کی موت دریا میں ڈوبنے سے واقع ہوئی تھی۔ جبکہ اس کے والدین نہ صرف زندہ تھے بلکہ وہ وہیں ملتان میں واقع اپنے آبائی گھر میں رہتے تھے۔ انہوں نے ثبوت کے طور پر مجھے احمر کے ڈیتھ سرٹیفکیٹ کی کاپی بھی دکھائی جس پر اس کی موت کا سبب پانی میں ڈوبنے کے باعث سانس کا بند ہو جانا درج تھا جبکہ تاریخ آج سے پانچ سال پہلے کی درج تھی۔

میں کتنی ہی دیر تک بے یقینی سے احمر کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ تھامے بیٹھی رہی۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ جس شخص کے ساتھ میں اٹھتی بیٹھتی تھی، بات چیت کرتی تھی، جب چاہے چھو سکتی تھی اور جس کے ساتھ میں نے کئی بار سہاگ کے انمول لحات گزارے تھے دراصل کوئی وجود ہی نہ رکھتا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ شاید پولیس سے کوئی غلطی ہوگئی ہے اور وہ کسی اور احمر نامی بندے کی معلومات اکٹھی کر لائے ہیں۔ جب میں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو اس پولیس انسپکٹر نے خاموشی سے احمر کی ایک تصویر نکال کر میرے سامنے رکھ دی جس میں وہ شاید اپنے والدین کے ساتھ کھڑا تھا۔ مجھے پھر بھی یقین نہیں آرہا تھا۔ احمر نے تو مجھے بتایا تھا کہ اس کے والدین کسی فضائی حادثے کا شکار ہو کر مر گئے تھے پھر وہ دوبارہ سے زندہ ہو کر کیسے اپنے گھر میں موجود تھے؟ اور اگر بالفرض وہ زندہ تھے بھی تو احمر کو مجھ سے اتنا بڑا جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے اپنے چکراتے ہوئے سر کو تھام کر پولیس انسپکٹر سے گزارش کی کہ وہ اسی وقت میرے ساتھ احمر کے گھر پر چلے جہاں پر جابجا میرے اور احمر کے قیام کے ثبوت مل جائیں گے۔ لامحالہ میرے اصرار پر وہ میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ہم دونوں پولیس کی سائرن بجاتی گاڑی میں وہاں پہنچے۔

وہاں پہنچ کر سب سے پہلے دھکا مجھے تب لگا جب میں نے گیٹ پر تالا جھولتے دیکھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں جب پریشانی میں وہاں سے نکلی تھی تو مجھے گیٹ لاک کرنے کا خیال بھی نہ آیا تھا مگر اب وہاں تالا دیکھ کر میں ششدر رہ گئی تھی۔ میں جلدی سے بولی۔ ”ہو سکتا ہے میرے جانے کے بعد احمر یہاں آیا ہو اور اس نے گیٹ کھلا دیکھ کر تالا لگا دیا ہو۔“ مگر انسپکٹر سوچتی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”نہیں بی بی، میں یہ نہیں مان سکتا کیونکہ ہماری مصدقہ اطلاعات کے مطابق وہ مر چکا ہے اور اس کو مرے ہوئے بھی پانچ سال گزر چکے ہیں۔ آپ یہ بات اپنے ذہن سے نکال دو کہ احمر نامی وہ بندہ زندہ ہے۔“

میں بے چارگی سے کبھی اسے اور کبھی گیٹ پر پڑے تالے کو دیکھتی رہی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کس طرح یقین دلاؤں کہ اب سے پانچ دن پہلے تک نہ صرف میں اور احمر یہاں رہ رہے تھے بلکہ اس نے میری فرمائش پر لاؤنج میں میری تصویر بھی لگائی تھی۔ یہ یاد آتے ہی میں انسپکٹر کے سر ہوگئی کہ وہ میرے ساتھ اندر چلے تاکہ میں اسے یہ تصویر دکھاؤں مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ اس طرح بغیر اجازت کسی کے گھر میں تالا توڑ کر داخل ہونے کا مجاز نہیں ہے چنانچہ وہ کل مالک مکان کے بارے میں معلومات لے کر اس کی اجازت سے گیٹ کھولے گا۔

یہ کہنا بیکار ہے کہ اگلے دن کیا ہوا۔ اس گھر کا مالک کوئی وسیم نامی شخص نکلا جو اسی شہر میں رہائش پذیر تھا۔ پولیس کے فون پر وہ دوڑا چلا آیا۔ اس کے بقول یہ گھر تو کئی سالوں سے بند پڑا تھا۔ اس کا کہنا غلط بھی نہ تھا کیونکہ جب میں ان لوگوں کے ساتھ اندر گئی تو سارا گھر دھول مٹی میں اٹ رہا تھا۔ مالک مکان بھی حیران حیران سا میری باتیں سن رہا تھا۔ لاؤنج میں میری کوئی تصویر تو دور سرے سے کوئی تصویر ہی موجود نہ تھی بلکہ فریم ٹانگنے کے لیے دیوار میں کیا گیا سوراخ تک نہ تھا۔ جو تھوڑا بہت فرنیچر موجود تھا وہ بھی میلی کچیلی چادروں سے ڈھکا تھا۔ ایسا لگتا ہی نہیں تھا کہ اس گھر میں کوئی کچھ دن پہلے تک ..... رہ رہا تھا۔ میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس گھر کے در و دیوار دیکھ رہی تھی جہاں سے میری کتنی حسین یادیں وابستہ تھیں۔ جب میں ان کے ساتھ اپنے بیڈروم میں پہنچی تو خود پر قابو نہ پا سکی اور بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ یہاں کچھ بھی ویسا نہ تھا جیسے میں چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ بیڈ، ڈریسنگ ٹیبل اور الماری یہاں تک کہ کوئی سامان موجود نہ تھا۔ اب تو خود مجھے بھی اپنی ذہنی حالت پر شبہ ہونے لگا تھا۔

وسیم کے مطابق اس نے یہ گھر کبھی بھی کرائے پر نہ چڑھایا تھا۔ ویسے بھی آبادی سے اتنا دور کوئی بھی اس اجاڑ سی جگہ پر بنے اس گھر میں آنے کو کون تیار ہوتا۔ اس کے بقول وہ اس گھر میں دس سال قبل تک رہا کرتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ اسے روزمرہ کی اشیاء خریدنے کے لیے پریشانی ہونے لگی۔ اس کی بیوی کو بھی یہ علاقہ ایک آنکھ نہ بھایا تھا اور پھر ایک مرتبہ جب اس کا بیمار بیٹا فوری طبی امداد نہ ملنے کے باعث مرتے مرتے بچا تو اس نے بالآخر یہاں سے شفٹ ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ تب سے یہ گھر یونہی بند پڑا ہے اور کوئی یہاں نہیں آتا جاتا۔ وہ تو بس بے یقینی سے منہ کھولے میری باتیں سن رہا تھا۔

ہوٹل واپس آنے کے بعد میں سارا دن روتی رہی۔ یہ بات میری سمجھ سے بالاتر تھی کہ ایک جیتے جاگتے بندے کو سب مردہ تسلیم کرنے پر کیوں تلے ہوئے تھے۔ احمر زندہ تھا، میں نے اس سے شادی کی تھی اور اس سے پہلے کوئی سال بھر تک اس سے چیٹنگ کی تھی پھر میں یہ کیسے مان لیتی کہ وہ پانچ سال پہلے ہی مر چکا تھا جبکہ وہ پچھلے ہفتے تک میرے ساتھ ہی موجود تھا۔ کیا میں پاگل ہوگئی ہوں؟ کیا احمر محض میرا ذہنی اختراع تھا؟ میں جتنا سوچتی اتنا ہی الجھتی جاتی اور پھر کافی سوچ بچار کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ ملتان جا کر اس کے والدین سے ملوں۔ اب میں نے اپنے طور پر تحقیقات کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ احمر کسی مصیبت میں مبتلا ہو اور میں یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے مزے سے بیٹھی ہوں۔ یہ خیال آتے ہی میں بے چین ہوگئی۔

میں اگلے ہی دن ملتان روانہ ہوگئی۔ وہاں پہنچ کر لوگوں سے پوچھتے پچھاتے میں اس کے گھر تک پہنچ گئی۔ احمر کے والد نے دروازہ کھولا تو میں نے انہیں اپنا جھوٹا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ میں احمر کے دوست کی بیوہ ہوں جسے اس نے کچھ پیسے قرض دیئے تھے۔ اب میں وہی پیسے لوٹانے آئی ہوں۔ انہوں نے مجھے حیرت سے دیکھا اور اپنے ساتھ لے کر ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ مجھے بٹھا کر وہ خود اندر چلے گئے۔ میں بیٹھی ڈرائنگ روم کا جائزہ لے رہی تھی۔ سامنے ریک پر رکھی بہت ساری تصویریں الگ الگ فریموں میں جڑی رکھی تھیں۔ احمر کی تصویریں دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ کسی میں وہ ٹرافی تھامے کھڑا تھا تو کسی میں دوستوں کے ساتھ اس کے گروپ فوٹو تھے اس کے علاوہ بہت ساری ٹرافیز اور شیلڈز بھی ترتیب سے سجی تھیں۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ احمر کو اسپورٹس میں بہت دلچسپی تھی کیونکہ زیادہ تر انعامات وغیرہ کھیلوں کے مقابلے میں جیتے گئے تھے۔ میں ابھی غور سے ان انعامات کو دیکھ ہی رہی تھی جب اچانک ایک تصویر کو دیکھ کر میں بے چین سی ہوگئی۔ اس تصویر میں وہ کسی لڑکی کے ساتھ کھڑا بے تکلفی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکرا رہا تھا۔

قدموں کی چاپ ابھری تو میں جلدی سے صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔ اندر آنے والی احمر کی امی تھیں جن کے ساتھ اس کے ابو بھی تھے۔ وہ دونوں آکر میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے۔ میں نے احمر کی امی سے وہی بات کی جو میں اس کے والد سے پہلے ہی کرچکی تھی۔ میری بات سن کر اس کی امی نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا پھر مجھ سے کہنے لگیں۔ ''بیٹا، تم کیا یہیں ملتان میں رہتی ہو؟''

میرے پاس اس سوال کا گھڑا گھڑایا جواب تیار تھا۔ ''نہیں آنٹی، میں تو اب کراچی میں رہتی ہوں۔ میرے شوہر احمر کے دوست تھے پھر ان کا کچھ عرصہ پہلے انتقال ہوگیا۔ انہوں نے آپ کے بیٹے سے کچھ پیسے ادھار لیے تھے جو اس وقت تو واپس کرنے ممکن نہ تھے مگر اب میں انہیں لوٹانے آئی ہوں۔'' اس کے بعد میں نے جلدی جلدی پرس کھول کر بھرپور ایکٹنگ کرتے ہوئے ان سے کہا۔ ''پلیز ذرا جلدی سے انہیں بلا دیں۔ مجھے شام کی فلائٹ سے واپس بھی جانا ہے۔''

احمر کے ابو گلا کھنکھار کر بولے۔ ''بیٹا ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کی یہ خواہش پوری نہیں کرسکتے کیونکہ احمر تو پانچ سال پہلے ہی دریا میں ڈوب کر مر چکا ہے۔'' انہوں نے اپنے تئیں بہت بڑا دھماکا کیا تھا اس لیے مجھے بھی تھوڑی بہت افسوس کی ایکٹنگ کرنی پڑی۔ سچ بتاؤں تو مجھے اس کے والدین ڈراما کرتے لگ رہے تھے۔ پتا نہیں کیوں مجھے قطعی نہیں لگ رہا تھا کہ یہ سچ بول رہے ہیں۔ میں نے اپنا تجسس دباتے ہوئے اس تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''آنٹی، اس تصویر میں احمر کس کے ساتھ کھڑا ہے؟'' جواباً ان کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی اور وہ ذرا درشتی سے بولیں۔ ''بس بیٹا کیا بتاؤں! یہ میری بہو تھی، یعنی احمر کی بیوی۔'' ان کی بات سن کر مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ اتار دیا ہو۔ اس کی امی میری حالت سے بے خبر بول رہی تھیں۔ ''بڑے چاؤ سے بیاہ کر [illegible] تھے ہم اسے، مگر اس نے تو گھر میں آکر وہ دنگے فساد

کیے کہ ہم نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگا لیے۔ شاید اس کے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ تھا۔ نیند کی گولیاں کھا کر سوتی تھی، پھر ایک دن کمبخت گولیاں کھا کر ایسی سوئی کہ اٹھی ہی نہیں۔ پولیس آئی اور میرے بیٹے کو اس کے قتل کے الزام میں دھر لیا۔ منحوس جاتے جاتے بھی میرے بچے کو خون کے آنسو رلا گئی۔ شکر ہے کہ بعد میں یہ ثابت ہو گیا کہ اس نے خودکشی کی تھی اور میرے معصوم بچے کی جان چھوٹی۔ لیکن دیکھو اس منحوس ماری کی بھٹکتی روح نے میرے لعل کی جان لے کر ہی چھوڑی۔ ہائے! کیسا خوشی خوشی پکنک پر گیا تھا، پھر دریا میں ایسی ڈبکی لگائی کہ اس کو موجوں نے ابھرنے ہی نہ دیا۔ رات کو کہیں جا کر اس کی لاش ملی تھی۔'' احمر کی امی آنکھوں پر دوپٹا رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ میرے لیے اب وہاں مزید بیٹھنا ناممکن ہو گیا تھا اس لیے میں اپنے سن پڑتے دماغ کے ساتھ واپسی کے لیے روانہ ہو گئی۔

ہوٹل واپس پہنچ کر میں نے سب سے پہلے تو موبائل میں موجود احمر کی وہ تصویریں دیکھیں جو میں نے آج صبح ڈرائنگ روم میں ان کے آنے سے پہلے ہی کھینچ لی تھیں۔ میری چھٹی حس چیخ چیخ کر کسی سازش کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ میں سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ آخر میرا ذہن کس گرہ میں الجھ گیا ہے۔ کچھ ایسا تھا جو میرے سامنے تھا مگر میں اسے دیکھ اور سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ میں اسی ادھیڑبن میں رات دیر تک جاگی اور پھر جب اگلی صبح میں اٹھی تو اپنی طبیعت کچھ گری گری سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اسے ٹینشن اور تھکن کا شاخسانہ مانتے ہوئے زیادہ توجہ نہ دی اور ناشتا کر کے پولیس اسٹیشن جا پہنچی۔ پولیس انسپکٹر کراچی پولیس کا سن کر برا سا منہ بنالیا۔ پولیس ریکارڈ اور پھر اسپتال سے کی جانے والی تصدیق سے ثابت ہو گیا تھا کہ احمر مر چکا ہے اس لیے اس کیس پر مزید سر کھپانا فضول تھا جبکہ میرے پاس کوئی ثبوت بھی نہ تھا کہ میرا احمر سے کبھی کوئی تعلق رہا تھا۔ اس روز میں دو تین گھنٹے پولیس اسٹیشن میں گزار کر واپس آ گئی۔ عجیب سی بے چارگی تھی، سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس کے سامنے اپنا دل کا... بوجھ ہلکا کروں۔ اپنے ماں باپ کو تو میں خود ہی چھوڑ آئی تھی تو اب کس منہ سے واپس جاتی اور پتا نہیں وہ مجھے دوبارہ قبول کرتے یا نہیں۔ امی ابو کی یاد آئی تو میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ کتنی ہنسی خوشی ہم ساتھ رہ رہے تھے پھر احمر کے پیار میں پاگل ہو کر میں نے ان کی مخلص محبت کو ٹھکرا دیا اور انہیں اتنا دکھ دیا۔ شاید اللہ مجھے اپنے کیے کی سزا دے رہا تھا جو میں اس طرح کیے بعد دیگرے پریشانیوں کی زد میں آ رہی تھی۔

میں واپس کراچی آئی اور اسی ہوٹل میں ٹھہری جہاں پہلے رکی تھی مجھے یقین ہو چلا تھا کہ آج جو میں اس طرح بے یار و مددگار ہوٹل کے کمرے میں تنہا پڑی اپنی قسمت پر آنسو بہا رہی ہوں تو یہ سب میرے والدین کی بددعاؤں کا اثر ہے۔ جب ان کو پتا چلا ہوگا کہ میں ان کو دھوکا دے کر بھاگ گئی ہوں تو ان کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ وہ تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہے ہوں گے۔ میرے ابو غصے کے بہت تیز تھے، انہوں نے تو شاید میری امی کو بھی آئندہ مجھ سے ملنے یا بات کرنے سے منع کر دیا ہوگا۔ پھر میری امی بھی تو دل کی مریضہ تھیں، انہیں ایک بار انجائنا کا اٹیک بھی ہو چکا تھا۔ پتا نہیں یہ خبر انہوں نے کیسے برداشت کی ہوگی۔ میں یہ سب سوچتی جا رہی تھی اور آنسو بہاتی جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے گھر کا نمبر ملایا۔ اس بار بھی ابو نے ہی فون اٹھایا مگر میں نے فون بند کرنے کے بجائے ہمت کر کے ہیلو کہہ دیا۔ ابو کی شفیق آواز دوبارہ میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''جی کون بول رہا ہے؟''

میں نے بڑی مشکلوں سے گلے میں پھنستے آنسوؤں کے گولے کو پیچھے دھکیلا اور رندھی ہوئی آواز سے صرف اتنا ہی بول سکی۔ ''ابو! میں مشعل!'' دوسری طرف سناٹا چھا گیا۔ میں اپنی سسکیاں دبائے ابو کا جواب سننا چاہ رہی تھی مگر جب خاموشی طویل ہو گئی تو میں سمجھی کہ شاید ابو نے فون رکھ دیا ہے۔ اسی لیے بولی۔ ''ہیلو ابو، آپ سن رہے ہیں نا؟ میں مشعل بات کر رہی ہوں۔''

اس بار ابو کی آواز سنائی دی۔ ''کون مشعل؟''

مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرا دل مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔

''ابو پلیز ایسے تو نہ بولیں میں آپ کی بیٹی، آپ کی مشعل بات کر رہی ہوں۔''

ابو کی جذبات سے عاری، برف کی سی ٹھنڈی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''دیکھیں محترمہ میں نہیں جانتا... آپ کس مشعل کے بارے میں بات کر رہی ہیں۔ میری بیٹی مشعل تو تقریباً ڈیڑھ ماہ قبل ہماری غیر موجودگی میں کرنٹ لگنے سے چل بسی ہے اور اس کے غم میں اس کی ماں بھی دو دن اسپتال میں موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہو کر مر گئی ہے۔ اگر آپ ان دونوں کے لیے کچھ کر سکتی ہیں تو برائے مہربانی ایک ایک سیپارہ پڑھ کر بخش دیں۔'' اس کے ساتھ

ہی دوسری طرف سے لائن کاٹ دی گئی اور میں ہاتھ میں فون تھامے اسی پوزیشن میں نجانے کب تک ساکت بیٹھی رہی۔

جب میں احمر کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی تھی تو میری امی اس وقت اسپتال میں لیٹیں زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھیں۔ وہ کیسے کیسے نہ تڑپی ہوں گی، کیا مجھے یاد نہ کیا ہوگا۔ ابو نے کس طرح اپنی رفیقۂ حیات کا جنازہ اٹھایا ہوگا۔ ان پر اس وقت کیا بیتی ہوگی۔ نہیں! میری امی طبعی موت نہیں مری تھیں، ان کا قتل ہوا تھا اور ان کی قاتل کوئی اور نہیں خود ان کی لاڈلی بیٹی تھی۔ وہی بیٹی جس کو انہوں نے اپنے لہو سے سینچا تھا۔ اپنی نیندیں قربان کر کے راتوں کو اٹھ اٹھ کر دودھ پلایا تھا۔ جن کے انگلی پکڑ کر میں نے چلنا سیکھا تھا اور جب میں بیمار پڑی تھی تو میری زندگی کی بھیک مانگتے وہ چلچلاتی دھوپ کی پروا کیے بغیر ننگے پیر درگاہوں اور مزاروں پر گھومی تھیں۔ آج اسی شفیق ہستی کی موت کی ذمہ دار میں تھی۔ مجھ سے بڑھ کر بدنصیب اور کون ہوگا جس نے اپنے خوابوں کا تاج محل اپنی ماں کی قبر پر تعمیر کیا تھا۔

میں ساری رات امی کو یاد کر کے تڑپ تڑپ کر روتی رہی یہاں تک کہ پردوں سے چھن چھن کر آتی سورج کی روشنی کمرے میں پھیل گئی۔ میں ساری رات رو رو کر اب بدحال سی بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ تب میری نظر غیر ارادی طور پر سامنے لگے آئینے پر پڑی۔ مجھے اس میں اپنا عکس نظر آیا اور پھر چشم زدن میں منظر بدل گیا۔ اب مجھے اس میں اپنی جگہ ایک قاتل کا چہرہ نظر آرہا تھا جو اپنا چہرہ نقاب میں چھپائے، ہاتھ میں خون آلودہ چھری تھامے کھڑا تھا پھر دیکھتے ہی دیکھتے آئینے میں میری امی نمودار ہوئیں۔ وہ بستر پر بیٹھیں نماز پڑھ رہی تھیں۔ تب اچانک اس قاتل نے چھری بلند کی، میں نے چیخ کر امی کو خبردار کرنے کی کوشش کی مگر اس سے پہلے ہی اس قاتل نے پے در پے وار کر کے امی کو خون میں نہلا دیا۔ میری چیخیں حلق میں ہی گھٹ گئیں اور میں آنکھیں پھاڑے، گنگ بیٹھی یہ تماشا دیکھتی رہی۔ پھر وہ قاتل پلٹا اور اس نے اپنے چہرے سے نقاب سرکانا شروع کیا۔ میں سانس روکے یہ تماشا اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا دیکھ رہی تھی۔ جب اس نے اپنے چہرے سے نقاب اتار دیا تو میں بے اختیار چیخنے لگی۔ نقاب کے اندر کوئی اور نہیں بلکہ میں ہی تھی جو اب نقاب اتار کر اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھے خاموش رہنے کا اشارہ کر رہی تھی تاکہ کسی کو خبر نہ ہو کہ امی کی قاتل دراصل میں ہوں۔ میں دیوانگی کے عالم میں چیختی چلاتی، چیزیں اٹھا اٹھا کر آئینے پر پھینکنے لگی۔ میں اپنی امی سے معافیاں مانگ رہی تھی اور ان سے وعدہ کر رہی تھی کہ ان کے خون کا بدلہ میں ضرور لوں گی۔ میں اور بھی پتا نہیں کیا کیا اناپ شناپ بک رہی تھی جب دروازے پر ابھرتی تیز دستک مجھے ہوش میں لے آئی۔ میں نے چونک کر دوبارہ آئینے کی جانب دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا، کمرے میں جگہ جگہ چیزیں بکھری پڑی تھیں، شاید کچھ لمحے قبل مجھ پر ہسٹریا کا شدید دورہ پڑا تھا۔ دروازے پر دستک لحہ بہ لحہ اونچی ہوتی جارہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ میرا نام بھی پکارا جارہا تھا۔ میں نے ہمت کر کے اٹھنے کی کوشش کی مگر دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی میرے حواس جواب دے گئے اور میں چکرا کر گر گئی۔

مجھے ہوش آیا تو میں لیٹی ہوئی تھی جبکہ ایک لیڈی ڈاکٹر میرے سرہانے موجود تھی اور پریشان سا ہوٹل کا منیجر بھی وہیں موجود تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو ڈاکٹر نے مجھے لیٹے رہنے کو کہا پھر خفگی سے بولی۔ ''مسز مشعل آپ کو اس حالت میں یوں اکیلے نہیں ٹریول کرنا چاہیے تھا۔ پھر دیکھیں آپ کے شوہر بھی آپ کے ساتھ نہیں آئے، اگر آپ کو اس طرح کے دورے پڑتے رہتے ہیں تو یہ تو آپ اور آپ کے بچے دونوں کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں۔''

مجھے ایسا لگا کہ میرے آس پاس زوردار دھماکے ہوئے ہوں اور میرا وجود پرخچوں کی مانند اڑ گیا ہو۔ میں نے بے یقینی سے ڈاکٹر کی شکل دیکھی تو وہ میری حیرت زدہ سی شکل دیکھ کر بولی۔ ''کیا آپ کو پتا نہیں کہ آپ اُمید سے ہیں؟'' میں نے بمشکل نفی میں سر ہلایا تو وہ بولی۔

''اوہ! اب میں سمجھی۔ خیر ایسا کبھی کبھی ہو جاتا ہے۔ آپ کل میرے کلینک پر آکر اپنا مکمل چیک اپ کروا لیجیے گا پھر میں حتمی رپورٹ بنا کر دے دوں گی لیکن پلیز تب تک آپ اپنا بہت خیال رکھیے گا اور اگر ممکن ہو تو اپنے شوہر کو بھی بلوا لیجیے۔'' اس کے بعد ڈاکٹر نے مجھے اپنی نگرانی میں ناشتا کروایا اور پھر اپنا کارڈ دے کر کل آنے کی ہدایت کر کے چلی گئی۔ ہوٹل منیجر نے خصوصی تاکید کر کے پھل اور دودھ وغیرہ میرے کمرے میں رکھوائے اور رخصت ہوگیا۔ اس دوران میرا وجود بالکل سن تھا، کون کیا بول رہا ہے، کیا کر رہا ہے میں تو بس کسی روبوٹ کی مانند ری ایکٹ کر رہی تھی۔

اس روز تو میں دواؤں کے زیرِ اثر زیادہ تر سوتی ہی

رہی جو میرے حق میں اچھا ہی ثابت ہوئی ورنہ میں جاگتی رہتی تو مجھے ہسٹریا کے مزید دو تین دورے لازمی پڑ چکے ہوتے۔ شام کو منیجر دوبارہ آیا اور اس نے مجھے اپنی نگرانی میں رات کا کھانا کھلا کر دوائیں دیں۔ بے چارہ اپنے تئیں پوری کوشش کر رہا تھا کہ میں بہتر محسوس کر سکوں جبکہ وہ تو جانتا ہی نہ تھا کہ اصل میں مجھے کیا غم اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ اگلے روز میں نیند سے بیدار ہوئی تو خود کو کافی بہتر محسوس کر رہی تھی۔ میں ناشتا کر کے اس ڈاکٹر کے کلینک پر جا پہنچی جہاں اس نے میرا چیک اپ کر کے رپورٹ بنا کر دے دی۔ میں اپنے اندر ایک خوشگوار تبدیلی محسوس کر رہی تھی، شاید یہ میرے اندر پرورش پاتے اس وجود کا احساس تھا جس نے میرے اندر جینے کی امنگ جگا دی تھی۔ ماں بننے کا احساس اتنا حسین ہوتا ہے مجھے آج پتا چلا تھا۔

میں رپورٹ لے کر دوبارہ پولیس اسٹیشن پہنچ گئی۔ پولیس انسپکٹر نے مجھے دیکھ کر ناگواری سے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر میں نے اسے کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر ہی اپنی پریگننسی رپورٹ اس کے سامنے پٹخ دی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟“

جواباً میں تلخی سے گویا ہوئی۔ ”انسپکٹر صاحب، آپ کو میرے اور احمر کے تعلق کا ثبوت چاہیے تھا نا؟ دیکھ لیجیے، آپ کے ہاتھ میں اس وقت وہ ثبوت موجود ہے۔“

انسپکٹر نے ایک نظر رپورٹ پر ڈالی اور اچھل پڑا۔ ”یہ، یہ کیسے ممکن ہے؟ تشعل صاحبہ یہ آپ کس کی رپورٹ اٹھا لائی ہیں؟“

میں نے حیرت سے کہا۔ ”میں کسی کی رپورٹ کیوں لاؤں گی۔ یہ میری رپورٹ ہے اور اس بچے کا باپ کوئی اور نہیں بلکہ احمر ہے۔ وہی احمر علی قریشی جو آپ کی مصدقہ.... اطلاعات کے مطابق مر چکا ہے۔ کیا آپ کو ایسا لگتا ہے کہ ایک بھٹکتی ہوئی روح کے لیے یہ سب کرنا ممکن ہے؟“

انسپکٹر نے شدومد سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں نہیں مان سکتا کہ اس بچے کا باپ احمر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ اس کیس کا رخ پھیرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ جب احمر کوئی وجود ہی نہیں رکھتا تو اس کا بچہ کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟“

اس کی یہ بات سن کر میں غصے سے پھٹ پڑی۔ ”انسپکٹر صاحب میں پہلے دن سے آپ کو کہہ رہی ہوں کہ احمر نہ صرف زندہ ہے بلکہ یہیں کہیں موجود بھی ہے۔ آپ لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھوک کر وہ کوئی بہت بڑا گیم پلان کر رہا ہے۔ جس کا ایک شکار میں بھی بنی ہوں۔ آخر آپ ایک ہی بات کو کیوں پکڑے بیٹھے ہیں کہ وہ دریا میں ڈوب کر مر چکا ہے جبکہ میں آپ کے سامنے جیتی جاگتی کھڑی یہ وثوق سے کہہ رہی ہوں کہ میں نے اسی احمر سے ڈیڑھ ماہ قبل شادی کی تھی اور اب اس کے بچے کی ماں بھی بننے والی ہوں۔ اگر احمر صرف میرے دماغ کا فتور تھا تو آج میں پریگننٹ کیسے ہوئی؟ جبکہ یہ رپورٹ بھی مجھے پانچ ہفتے کی حاملہ دکھا رہی ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وسیم اور احمر کے والدین بھی اس سازش میں شامل ہوں۔ آپ ایک بار اپنے طریقے سے تفتیش تو شروع کریں، ہو سکتا ہے کہ آپ کے ہاتھ کوئی سراغ لگ جائے جس سے یہ کیس ری اوپن ہو جائے۔“

انسپکٹر خاموش بیٹھا میری باتیں سنتا رہا۔ جب میرا غبار نکل گیا تو وہ نرمی سے گویا ہوا۔ ”ٹھیک ہے بی بی، آپ کے کہنے پر میں آخری مرتبہ تفتیش کرا لیتا ہوں۔ احمر اگر واقعی زندہ ہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ قانون کے شکنجے سے بچ نہیں پائے گا اور اگر پولیس کی اطلاع سچ نکلتی ہے اور وہ واقعی مر چکا ہے تو آئی ایم سوری، اس کے بعد میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔“

انسپکٹر کی یقین دہانی کے بعد میں وہاں سے باہر آ گئی۔ میں نے دل میں ٹھان لیا تھا کہ پولیس اس معاملے میں کچھ ...کرے نہ کرے مگر میں احمر کو ضرور ڈھونڈ نکالوں گی اور اس سے اپنے ایک ایک آنسو کا حساب لوں گی۔ میں نے اس سے جتنی شدید محبت کی تھی اب مجھے اس سے اتنی ہی نفرت تھی۔ شدید ترین نفرت! اس نے میری ہنستی بستی دنیا اجاڑ کر رکھ دی تھی۔ میرا باپ میری شکل نہیں دیکھنا چاہتا تھا بلکہ خاندان نے تو مجھے مردہ تسلیم کر لیا تھا، میری ماں میرے غم میں اس دنیا سے چل بسی اور خود میں بھی کون سا خوش رہ سکی۔ آج میں دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور تھی تو اس کا ذمہ دار صرف ایک شخص تھا، احمر! جسے میں نے اپنی زندگی کی ہر چیز اور ہر رشتے پر ترجیح دی مگر اس نے میرے ساتھ جو سلوک کیا اس کے لیے تو اسے جو بھی سزا دی جائے کم تھی۔ میں اپنی سوچوں میں مگن چلی جا رہی تھی تب اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں تو اپنے گھر کے سامنے کھڑی ہوں۔ میں بے خیالی میں چلتے چلتے یہاں تک پہنچ گئی تھی جبکہ پولیس اسٹیشن بھی یہاں سے اچھے خاصے فاصلے پر تھا۔ میں نے پلٹنا چاہا مگر میرے قدم جیسے .... من من بھر کے ہو گئے تھے۔ یہ وہی گھر تھا جس پر لعنت بھیج کر میں اپنی خوشیوں کی تلاش میں نکل

کھڑی ہوئی تھی اور آج اسی گھر کی شفیق چھاؤں میں تہی داماں سی لوٹ آئی تھی۔

نہ چاہتے ہوئے بھی میرا ہاتھ کال بیل کی جانب بڑھ گیا۔ بیل بجا کر میں دھڑکتے دل کے ساتھ گیٹ کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ میرے کان ابو کی مانوس چاپ کے منتظر تھے کہ اچانک کنڈی کھلنے کی آواز آئی اور کسی نوکرانی نما لڑکی نے باہر جھانکا اور لٹھ مار انداز میں بولی۔ ”ہاں، کس سے ملنا ہے؟“ میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ”وہ م۔م منصور خاں صاحب کو بلوا دیجیے۔“ اس پر وہ باہر نکل آئی اور سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لینے کے بعد بولی۔ ”وہ تو چلے گئے!“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”چلے گئے؟ کہاں چلے گئے؟ یہ تو ان کا گھر ہے۔“ اس پر وہ اپنا سر کھجاتے ہوئے کہنے لگی۔ ”منصور خاں تو یہ گھر ہمارے صاحب کو بیچ کر دو دن پہلے حج پر چلے گئے۔ سنا ہے بچاروں کے ساتھ بہت برا ہوا تھا۔ پہلے تو ان کی جوان بیٹی کرنٹ لگنے سے مر گئی پھر ان کی بیوی بھی دو دن بعد اس غم میں چل بسیں۔ صاحب بتا رہے تھے کہ اب وہ واپس نہیں آئیں گے بلکہ وہیں اپنی زندگی کے دن گزاریں گے۔ ہم نوکر لوگ تو یہاں پر سامان کی سیٹنگ کرنے آئے ہیں۔ صاحب خود تو ابھی تین دن بعد آئیں گے۔ مگر آپ نے بتایا نہیں کہ آپ ہو کون! اگر بتا دیتیں تو میں صاحب سے فون پر پوچھ لیتی۔“ وہ لڑکی بہت باتونی معلوم ہوتی تھی۔ میری آنکھوں سے چھلکتے آنسوؤں سے بے خبر وہ بولے چلی جا رہی تھی۔ آہ! میرے ابو بھی مجھ سے بہت دور چلے گئے تھے۔ میں نے تو سوچا تھا کہ ابو کے پیروں میں گر کر ان سے معافی مانگ لوں گی۔ ان کو ہاتھ پیر جوڑ کر منا لوں گی آخر کو میں ان کی اولاد تھی، وہ مجھے معاف کر دیتے مگر اب میں ان کو کہاں سے ڈھونڈ کر لاتی۔ احمر تم نے میرے ساتھ بہت ظلم کیا ہے! خدا تو شاید تمہیں معاف کر دے مگر میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔

میں اگلے دن سنار کے پاس پہنچی اور اپنے زیورات بیچ دیے۔ مجھے توقعات سے زیادہ پیسے ملے، سنار نے زیورات کی قیمت سوا تین لاکھ روپے تک لگائی تھی۔ میں رقم لے کر واپس لوٹ رہی تھی جب میرے موبائل پر اسی پولیس انسپکٹر کا فون آیا۔ اس کی آواز میں دبا دبا جوش تھا۔ ”مس مشعل، آپ کا شک بے بنیاد نہ تھا۔ احمر واقعی زندہ ہے!“ اس کی یہ بات سن کر مجھے کوئی اچنبھا نہ ہوا کیونکہ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ زندہ ہے اور مرے ہونے کا ڈھونگ رچا رہا ہے۔ انسپکٹر نے مجھے بتایا کہ آج سے چھ ماہ قبل کراچی کے ایک اور پولیس اسٹیشن میں احمر کے خلاف ایسی ہی رپورٹ درج کرائی گئی تھی۔ اس نے اخبار میں ضرورت رشتہ کا اشتہار دیکھ کر ان لوگوں سے کانٹیکٹ کیا تھا اور یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ بہت مصروف شخص ہے اور اس کے ماں باپ اور فیملی امریکا میں رہتے ہیں۔ اس کی ماں کی خواہش ہے کہ وہ کسی پاکستانی لڑکی سے شادی کرے اس لیے وہ دلہن لے کر امریکا جانا چاہ رہا ہے تاکہ ماں باپ کو سرپرائز دے سکے۔ اپنی دلنشین باتوں سے اس نے انہیں بھی شیشے میں اتار لیا۔ ان لوگوں نے بھی زیادہ چھان بین کرائے بغیر سادگی سے بیٹی کی شادی کر دی اور وہ فراڈ یا کچھ دنوں بعد سب زیورات اور پیسا سمیٹ کر ان کو بیوقوف بنا کر چلتا بنا تھا۔ پولیس نے ابتدائی چھان بین کے بعد یہ پتا لگایا تھا کہ احمر نامی وہ شخص تو مر چکا ہے اس لیے مزید تحقیقات نہیں کی گئیں۔ کچھ ان لوگوں کی بھی غلطی تھی کہ بدنامی کے خوف سے انہوں نے چپ سادھ لی اور کیس آگے نہ بڑھ سکا۔ بہرحال اب یہ کیس ری اوپن ہو گیا تھا اور پولیس اپنی تفتیش کا دائرہ کار بڑھا رہی تھی۔

مجھے اس بات سے کوئی غرض نہ تھی کہ پولیس احمر کو گرفتار کرنے کے سلسلے میں کیا اقدامات کر رہی ہے کیونکہ اب جو کرنا تھا مجھے ہی کرنا تھا۔ مجھے اب کچھ اندازہ تو ہو رہا تھا کہ احمر مجھے کہاں مل سکتا ہے مگر اس کے لیے پہلے منصوبہ ترتیب دینا تھا۔ سب سے پہلے تو میں نے ہوٹل چھوڑ دی اور ایک ورکنگ ویمن ہوسٹل میں شفٹ ہو گئی۔ اس ہوسٹل کے شرائط و ضوابط زیادہ کڑے نہ تھے اس لیے تھوڑے بہت پیسے کھلا کر مجھے آسانی سے رہنے کے لیے ایک موزوں کمرا مل گیا۔ میں نے گزارے کے لیے ایک مقامی اسکول میں نوکری بھی کر لی تھی جہاں کا پے اسکیل کافی اچھا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے ایک سیکنڈ ہینڈ لیپ ٹاپ بھی خرید لیا تھا۔ بیچ میں، میں ایک دو بار کیس کے بارے میں جاننے کے لیے پولیس اسٹیشن بھی گئی مگر ان کی وہی ازلی اور روایتی سست رفتاری دیکھ کر مجھے کافی تسلی ہوئی کہ تحقیقات اگر اسی رفتار سے ہوتی رہیں تو احمر اگلے دس سالوں تک بھی ان کے ہاتھ نہ لگنے والا تھا۔ ویسے بھی اب وہ میرا شکار تھا اور میں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اور اس پر ہاتھ ڈالے۔

میں اپنے منصوبے کے مطابق اسکول سے واپس آ کر لیپ ٹاپ پر مصروف ہو جاتی۔ میں تمام مقامی چیٹنگ اور

ڈیٹنگ سائٹس پر جاتی اور جس لڑکے پر بھی احمر ہونے کا شک ہوتا اس سے محبت کی پینگیں بڑھاتی۔ میں رات گئے تک اسی مشغلے میں مصروف رہتی۔ رات کو کمرے سے نکل کر کھانا کھاتی اور پھر کمرے میں بند ہوجاتی۔ ہوسٹل میں کئی لڑکیوں نے مجھ سے بات چیت کرنے کی کوشش کی تھی مگر میری سردمہری دیکھ کر خود ہی پیچھے ہٹ گئیں۔ میں ہوسٹل میں آدم بیزار اور تنہا بدروح کے ناموں سے مشہور ہوگئی تھی مگر مجھے ان سب باتوں کی کوئی پروا نہ تھی۔ مجھ پر جو گزری تھی اس نے میرے احساسات کو پتھر کا بنا دیا تھا، میری زندگی کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ تھا اپنے گنہگار کو جلد از جلد ڈھونڈ کر کیفر کردار تک پہنچانا!

میں معمول کے چیک اپ کے لیے اس لیڈی ڈاکٹر کے پاس بھی پابندی سے جاتی تھی۔ اس کو میں نے یہی بتایا تھا کہ میں اپنے خاوند سے لڑ جھگڑ کر یہاں آگئی ہوں اور اب میرا واپس اس کے پاس اسلام آباد جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ یہ میری پریگنینسی کا چھٹا مہینا تھا جب ایک دن ڈاکٹر نے خدشہ ظاہر کیا کہ بچے کی موومنٹ میں کوئی مسئلہ ہے۔ اس نے فوراً میرا الٹرا ساؤنڈ کروایا اور جب الٹرا ساؤنڈ رپورٹ سامنے آئی تو ایک روح فرسا خبر میری منتظر تھی۔ بچہ مر چکا تھا اور اس کو فوراً آپریٹ کرکے نکالنے کی ضرورت تھی ورنہ جسم میں زہر پھیل جاتا اور میں مرجاتی۔ آپریشن ہوا اور میرے وجود میں پنپتے میرے جگر گوشے کو مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا کردیا گیا۔ امی کے انتقال کے بعد یہ دوسری بار تھا جب میں بے تحاشا روئی تھی اور مجھ پر دیوانگی کے دورے پڑے۔ ڈاکٹر نے میری حالت کے پیشِ نظر مجھے تین دن اسپتال میں ہی رکھا اور اس کے بعد ڈھیروں ہدایات کے ساتھ ڈسچارج کیا۔

یکے بعد دیگرے ملنے والے شاکس کی وجہ سے اب میں رات کو سلیپنگ پلز لے کر سونے پر مجبور تھی ورنہ مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی تھی۔ جاب کی وجہ سے میں دن میں تو اینٹی ڈپریسنٹ نہیں لیتی تھی لیکن واپس آکر میں وہ گولیاں لے کر دنیا سے بے خبر ہوکر اپنے کمرے میں پڑی رہتی۔ ہوسٹل کی میٹرن میری حالت پر ترس کھا کر کھانا بھی میرے کمرے میں پہنچا دیا کرتی تھی۔ وہ ادھیڑ عمر کی ایک شفیق سی عورت تھی جسے سب پروین آنٹی کہتے تھے۔ اس پورے عرصے کے دوران پروین آنٹی نے میرا بہت ساتھ دیا، وہ میرا کمرا ٹھیک کردیا کرتیں، کپڑے دھلوا کر استری کروا دیا کرتیں اور شام کی چائے لے کر اکثر میرے پاس آکر بیٹھ جایا کرتیں اور میرا دل بہلانے کو ادھر اُدھر کی باتیں کیا کرتیں۔ شروع شروع میں تو میں بالکل خاموش بیٹھی رہتی تھی مگر اب میں بھی ان سے اِکا دُکا باتیں کرلیا کرتی تھی۔ وہ اکثر مجھ سے میرے والدین کے بارے میں پوچھتیں مگر میں ان کے اس طرح کے سوالات نظرانداز کردیا کرتی۔

تین چار ماہ بعد جاکر میری طبیعت کچھ سنبھلنے لگی اور میں نے ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق اینٹی ڈپریسنٹ لینی بند کردیں۔ اب میری پروین آنٹی سے بھی اچھی بات چیت ہو گئی تھی مگر انہیں میں نے ابھی تک خود پر بیتنے والی کہانی نہیں سنائی تھی۔ طبیعت بحال ہونے کے بعد میں واپس اپنے مشن پر لگ گئی تھی جبکہ پولیس کو ابھی تک احمر مل نہیں سکا تھا اور اس کے والدین سے کی گئی تفتیش بھی بیکار ثابت ہوئی تھی۔ اب تو مجھے بھی مایوسی ہونے لگی تھی، نجانے اسے زمین کھا گئی تھی یا آسمان نگل گیا تھا۔ اتنی کوشش کے باوجود بھی میں اسے کسی بھی چیٹنگ یا ڈیٹنگ سائٹ پر تلاش نہیں کرپائی تھی پھر ایک روز جب میں ٹی وی پر ایک آن لائن شادی کا پروگرام دیکھ رہی تھی تب میرے ذہن میں بجلی کے کوندے کی مانند یہ خیال آیا کہ ہوسکتا ہے اس بار وہ مجھے کسی میٹرومونیل سائٹ (ایسی ویب سائٹس جہاں پر شادی کے خواہشمند لڑکے اور لڑکیاں آن لائن ضرورت رشتہ کے اشتہار ڈالتے ہیں) پر مل جائے۔ میں نے جھٹ پٹ پاکستانی خواتین وحضرات کے لیے بنائی گئی ایسی تمام سائٹس سرچ کیں اور ان سب کا باری باری جائزہ لینا شروع کردیا۔ یہ ایک انتہائی صبر آزما کام تھا، میں باری باری تمام حضرات کے کوائف دیکھتی اور احمر نامی نوجوانوں کے نام کی لسٹ بناتی جاتی۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ احمر نے اپنے نام ہی سے یہاں کوائف ڈالا ہو، ہوسکتا ہے کہ اس نے اپنا نام تبدیل کرلیا ہو مگر مجھے یقین تھا کہ وہ ایسا نہیں کرے گا کیونکہ دونوں کیسز میں اس نے اپنا نام تبدیل نہ کیا تھا اور پھر اس طرح تو اسے دھوکا دینے میں بھی آسانی ہی ہوتی کیونکہ دنیا کی نظر میں تو وہ مرچکا تھا۔

تقریباً ایک مہینے کی انتھک محنت کے بعد میں لسٹ ترتیب دینے میں کامیاب ہوگئی۔ اگلے مرحلے میں، میں نے ان سب کو فون کرنا شروع کیا۔ جن پر بھی احمر ہونے کا گمان ہوا، ان کے ناموں پر میں لسٹ میں سرخ مارکر سے دائرے لگا دیتی اور باری باری ان سے مختلف مقامات پر فرضی نام بتا کر ملاقات بھی کرتی مگر ہر بار مایوسی کا سامنا ہوا۔ ان تمام

ملاقاتوں کے دوران میں مکمل نقاب میں تھی۔ لسٹ میں لوگ کم ہونے لگے مگر مجھے ابھی تک کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ شاید اس بار احمر نے اپنا شکار پھانسنے کے لیے کوئی نئی راہ اختیار کی تھی۔ میں سوچوں میں گم لسٹ پر نگاہیں دوڑا رہی تھی جس پر اب محض تین احمر نامی بندے ہی بچے تھے۔ میں نے ان کو فون کیا، جن میں سے دو بندے تو میری توقعات پر پورا نہیں اترے۔ اب فون کرنے کے لیے ایک آخری نام ہی بچا تھا مگر میری ہمت جواب دے چکی تھی۔ کیا ہوگا اگر یہ بھی وہی احمر نہ نکلا تو؟ پھر میں اسے کہاں ڈھونڈوں گی؟ میں نے نمبر ڈائل کیا اور کان سے لگایا مگر انگیج کی ٹون آرہی تھی۔ میں نے فون رکھ کر اس نام پر بھی کراس لگا دیا کیونکہ جانتی تھی کہ یہ بھی میرا مطلوبہ احمر نہ ہوگا۔

مجھ پر ایک مرتبہ پھر مایوسی اور ڈپریشن کا دورہ پڑ گیا۔ آخر اب کون سی راہ نکالوں جس سے احمر کا کچھ اتا پتا مل جائے۔ اب تو بس ایک ہی راستہ بچا تھا کہ صبر سے انتظار کروں کہ پولیس احمر کو ڈھونڈ کر گرفتار کرے اور اسے قرار واقعی سزا ملے مگر یہ کب ہوتا اور کبھی ہوتا بھی کہ نہ ہوتا یہ سب ایک بہت بڑا سوالیہ نشان تھا۔ میں آنسو بہاتی بستر پر پڑی تھی جب پروین آنٹی ہلکی سی دستک کے ساتھ کمرے میں آگئیں۔ وہ میرے لیے رات کا کھانا لے کر آئی تھیں۔ مجھے اس طرح روتا دیکھ کر وہ فکر مند ہوگئیں اور میرے سرہانے بیٹھ کر بہت اپنائیت سے رونے کی وجہ پوچھنے لگیں۔ اس روز مجھے پتا نہیں کیا ہوا کہ اتنے عرصے سے خود پر باندھے گئے ضبط کے تمام بند ٹوٹ گئے اور میں پروین آنٹی سے لپٹ کر اتنا روئی کہ انہیں مجھے سنبھالنا دشوار ہوگیا۔ میں نے جو تہیہ کر رکھا تھا کہ کسی سے اپنا درد نہیں بانٹوں گی اس روز پروین آنٹی کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ ان کے انداز میں مجھے اپنی امی کی جھلک نظر آتی تھی شاید اس لیے میں آخر کار ان سے اپنا درد بانٹنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ مجھ پر بیتنے والی داستان سن کر انہوں نے مجھے اپنے سینے سے لگالیا اس وقت ان کی آنکھیں بھی میرے غم پر اشکبار تھیں۔ ”مشعل میری بچی! بخدا جب میں نے تمہیں پہلی بار ہوسٹل میں دیکھا تھا تبھی تمہیں دیکھ کر میرا دل تمہاری طرف کھنچتا تھا، ایک اپنائیت کا احساس ہوتا تھا۔ اس لیے سب کے منع کرنے کے باوجود میں تمہارے پاس آکر بیٹھتی تھی، بس تم سے باتیں کرنا اچھا جو لگتا تھا۔ تمہارے جتنا غم برداشت کرنے کے لیے تو پہاڑ سا جگر چاہیے اور تم اب تک یہ سارے غم اپنے سینے میں چھپائے بیٹھی تھیں۔ جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا تب ہی سمجھ گئی تھی کہ تمہارے اداس سے چہرے کے پیچھے ضرور کوئی نہ کوئی کہانی چھپی ہے مگر یہ نہیں جانتی تھی کہ تمہارا دل درد سے اس قدر بھرا ہوا ہے۔ درد بانٹنے سے کم ہوتا ہے میرے بچے! بس آج سے تم مجھے اپنی ماں ہی سمجھنا، تمہیں کوئی بھی مسئلہ ہو، کوئی بھی پریشانی ہو سیدھی میرے پاس چلی آنا۔ میرے اپنے تو بچے ہیں نہیں اور میاں بھی اللہ بخشے طویل بیماری کے بعد دس سال پہلے ہی ساتھ چھوڑ گئے۔ میں اس دنیا میں بالکل اکیلی ہوں، بس دوسروں کے کام آکر خوشی ہوتی ہے تو دن رات اسی میں مصروف رہتی ہوں۔“

میں ان کی گود میں سر رکھے نڈھال سی پڑی تھی اور وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گی مگر ان کی گود میں سر رکھ کر مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری امی زندہ ہوگئی ہوں اور اپنے مہربان آنچل میں چھپائے تسلیاں دے رہی ہوں۔ اس روز نجانے کتنے عرصے کے بعد میں نیند کی گولیاں لیے بغیر ہی پروین آنٹی کی مامتا بھری آغوش میں سکون سے سوگئی۔

اگلے دن اتوار تھا اس لیے جب میں سو کر اٹھی تو اس وقت تک سورج اچھا خاصا بلند ہو چکا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ نیند کی گولی لیے بغیر ہی میں نہ صرف سوگئی تھی بلکہ بہت دنوں بعد اتنی طویل اور بھرپور نیند آئی تھی کہ میں خود کو فریش محسوس کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد پروین آنٹی نے کمرے میں جھانکا اور جھٹ پٹ میرے لیے ناشتا لے آئیں۔ انہوں نے اپنے سامنے مجھے ناشتہ کروایا، اس دوران ہم دونوں نے بہت ساری باتیں بھی کیں۔ ایک ہی رات میں وہ میرے دل کے بہت قریب ہوگئی تھیں۔ ناشتے کے بعد وہ مجھے آرام کرنے کا مشورہ دے کر چلی گئیں اور میں اپنا کمرا سمیٹ کر واپس بستر پر دراز ہوگئی۔ میں ہلکی سی اونگھ میں تھی تب اچانک میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال کوندا کہ میں نے ابھی تک لسٹ میں موجود اس آخری بچ جانے والے احمر نامی شخص سے بات نہیں کی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میری آنکھیں پٹ سے کھل گئیں۔ دل کو پختہ یقین ہونے لگا کہ یہ وہی احمر ہے! میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ ڈسٹ بن ٹٹولا جس میں کل غصے میں آکر میں نے یہ لسٹ پھینک دی تھی۔ غنیمت یہ تھا کہ چھٹی کی وجہ سے آج ماسی نہیں آئی تھی ورنہ اب تک تو یہ لسٹ کہیں کی کہیں پہنچ چکی ہوتی۔ میں نے نمبر ڈائل کیا اور ریسیور کو کان سے لگالیا۔ تیسری

.... چوتھی اور پھر پانچویں بیل بجی مگر کسی نے فون نہ اٹھایا۔ میں ایک بار پھر مایوس ہو کر فون کاٹنے لگی تھی تب اچانک فون ریسیو کر لیا گیا اور دوسری جانب سے دلکش سی مردانہ ہیلو کی آواز سنائی دی۔ میرے ہاتھ سے فون گرتے گرتے بچا، اس آواز اور اس انداز کو تو میں لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔ یہ سو فیصد اسی احمر کی آواز تھی! میرے وجود میں نفرت کی ایک لہر سی اٹھی اور میرا دل چاہا کہ میں فون پٹخ دوں۔ بڑی مشکل سے اپنی بدلتی ہوئی کیفیت پر قابو پا کر میں نے ریسیور پر ہاتھ رکھ دیا اور حتی المقدور اپنی آواز بدل کر بولی۔ ''کیا آپ 'میرا بیاہ ڈاٹ کام' والے احمر علی بات کر رہے ہیں؟''

جواباً اس نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''جی ہاں محترمہ، میں وہی گنہگار احمر علی بول رہا ہوں۔ گو اس بات کا تو مجھے اندازہ ہو ہی گیا ہے کہ آپ نے مجھے کس سلسلے میں فون کیا ہے لیکن بہر حال پوچھنا میرا فرض ہے اور دستور زمانہ بھی۔ سو، فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

اسے اس طرح چہکتے سن کر میرا دل کر رہا تھا کہ فون ہی سے اس کا گلا دبا دوں مگر جذبات کو کنٹرول کرتے ہوئے بڑی ادا سے بولی۔ ''احمر صاحب، ثانیہ اسد بول رہی ہوں، اسد انڈسٹریز اسد صدیقی کی اکلوتی بیٹی مگر یہ جان کر افسوس ہوا کہ آپ تو باقی لوگوں کی طرح زمانے کے پیروکار نکلے۔ مجھے تو یونیک لوگ پسند ہیں جنہیں ہر وقت کچھ نیا کرنے کی لگن رہتی ہے۔ خیر آپ تو میرے ٹائپ کے نہیں نکلے اسی لیے معذرت کے ساتھ اجازت چاہوں گی۔''

اس سے پہلے کہ میں فون رکھتی احمر گڑبڑا کر بولا۔

''ارے ارے محترمہ آپ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں۔ دو منٹ کے لیے میری بات تو سن لیجیے۔''

میں نے احسان جتانے والے انداز میں کہا۔ ''جی بولیے۔''

تو وہ اطمینان بھری سانس لے کر بولا۔ ''ذرہ نوازی ہے آپ کی، میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اگر ہم دونوں ایک بار مل لیں تو ایک دوسرے کو سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی اور شاید مل کر میں آپ کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھا سکوں کہ زمانے کا پروردہ ہونا کوئی اتنا بڑا گناہ بھی نہیں۔'' آخری جملہ اس نے شرارتاً کہا تھا، میں نے وہ جملہ نظرانداز کر دیا۔

''اوکے احمر صاحب، بات تو آپ کی معقول ہے مگر میں ہر کام کو بہت سوچ بچار کر کے کرنے کی عادی ہوں تو میں آپ کو ایک دو دن میں سوچ کر بتاؤں گی کہ آیا میں آپ سے ملنا چاہوں گی بھی کہ نہیں، اللہ حافظ!'' اور میں نے اس کا جواب سنے بغیر فون رکھ دیا۔

فون رکھ کر میں کتنی ہی دیر تک اپنے حواسوں پر قابو پاتی رہی ورنہ اس وقت تو میرا شدت سے دل کر رہا تھا کہ احمر سے مل کر اسے فوراً شوٹ کر دوں مگر اس طرح جلد بازی میں کام بگڑ بھی سکتا تھا۔ مجھے سب کچھ بہت سوچ سمجھ کر کرنا تھا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ میں نے جان بوجھ کر پروین آنٹی سے بھی اس بات کا ذکر نہ کیا تھا کہ احمر مجھے مل چکا ہے۔ میں نے دو کے بجائے تین دن لگا کر احمر کو فون کیا۔ وہ تو جیسے میری آواز سننے کے لیے بے چین تھا، پہلی ہی بیل پر فون اٹھالیا اور احمر کی بے تابانہ آواز آئی۔

''ہیلو مس گمنام، میں تو ڈر رہا تھا کہ اب آپ کا فون نہیں آئے گا۔ واللہ آج آپ کی آواز سن لوں گا تو پھر تو بیشک موت بھی آجائے تو بندے کو کوئی غم نہیں۔''

میں اس کی ڈرامابازی پر ہنس پڑی۔ ''باتیں خوب بنا لیتے ہیں آپ احمر صاحب، اب کچھ کام کی بات بھی ہو جائے؟''

جواباً وہ گویا ہوا۔ ''اجی! آپ کا فون آگیا بس سمجھ لیں آپ کا کام ہو گیا۔''

اس کی گہری بات سن کر میں نے کہا۔ ''کیا مطلب؟''

وہ ہنستا ہوا بولا۔ ''جی میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آپ نے یقیناً شرف ملاقات بخشنے کے لیے ہی ناچیز کو یاد کیا ہے۔ بے فکر ہو کر وقت اور جگہ بتا دیں، میں سر کے بل حاضر ہو جاؤں گا۔''

میں نے اگلے دن شام کو ایک ریسٹورنٹ میں آنے کا کہہ کر فون رکھ دیا۔

مجھے اب احمر جیسے منجھے ہوئے کھلاڑی کے لیے ایسا جال بچھانا تھا کہ اسے ذرا سا بھی شک نہ ہو۔ پہلا مرحلہ تو بخیر و عافیت نمٹ گیا تھا اب دوسرا مرحلہ تھا جس میں مجھے اسے اپنی محبت کے جال میں پھانسنا تھا اور تیسرا مرحلہ سب سے اہم اور فیصلہ کن ثابت ہوتا جس میں مجھے انتہائی مہارت سے اپنا پھیلایا ہوا جال سمیٹنا تھا کہ احمر جیسا شاطر آدمی اپنے ہی دام میں پھنس جائے۔ میں احمر سے اگلے روز مکمل پردے میں ملی۔ وہ دشمن جاں ویسا ہی مردانہ وجاہت کا پیکر تھا اور اب تو اس نے باڈی بھی بنالی تھی۔ میں نے نوٹس کیا تھا کہ

کتنی ہی لڑکیاں اس کو چپکے چپکے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ بہر حال اس خوبصورت اور معصوم چہرے کے پیچھے چھپا مکروہ چہرہ تو میں نے دیکھا تھا اس لیے مجھے اس کی اسمارٹنس سے کوئی فرق نہ پڑا۔ اس نے مجھ پر بہت زور دیا کہ میں اپنا نقاب اتار دوں مگر میں نے اس کو آئندہ کے وعدے پر ٹہلا دیا۔ ملاقات سے پہلے میں نے منہ میں ٹافی رکھ کر آواز بدل کر بات کرنے کی کافی پریکٹس کی تھی جو اب میرے کام آ رہی تھی۔ نیز میں نے اس پر یہ ظاہر کیا تھا کہ میں اس باپ کی بیٹی ہوں جسے اپنی عیاشیوں سے اتنی فرصت نہیں کہ اپنی جوان بیٹی پر توجہ دے سکے اور اس کی شادی کروائے اس لیے مجبوراً میں خود ہی اپنے لیے کوئی موزوں جیون ساتھی تلاش کر رہی تھی جس کے ساتھ اپنی زندگی ہنسی خوشی گزار سکوں۔ دوسرے الفاظ میں، میں نے خود کو احمر کے سامنے ایک بہترین اور ایزی ٹارگٹ کی صورت پیش کیا تھا جس کو وہ آرام سے اپنی باتوں اور خوبصورتی کے جال میں پھانس کر فائدہ اٹھا سکتا تھا۔

پہلی ملاقات کافی حوصلہ افزاء رہی۔ میں نے احمر کو ایسے چند اشارے دیئے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ میں اس سے بہت متاثر ہوئی ہوں اور مستقبل میں ہماری شادی کے امکانات کافی حد تک روشن ہیں۔ اس کے بعد ہم نے جلدی جلدی دو، تین ملاقاتیں اور کیں جس میں ہم مزید ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ اس نے مجھے اپنے بارے میں بتایا تھا کہ وہ پہلے لاہور میں رہتا تھا۔ اس کے والدین اس کی شادی اس کی کسی کزن سے کرنا چاہتے تھے جو اسے سخت ناپسند تھی، والدین نے دھمکی دے دی کہ اگر اسے ان کے ساتھ رہنا ہے تو اسے ان کی پسند سے شادی کرنی پڑے گی۔ چنانچہ اس نے خاموشی سے گھر چھوڑ دیا اور یہاں آ گیا۔ روپے پیسے کی ویسے بھی کوئی کمی نہ تھی اور یہاں آ کر اس نے اپنے دوست کے ساتھ کاروبار میں شراکت داری کر لی۔ اس لیے آج وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہے اور اسے اپنے ضدی والدین سے بھی کوئی ہمدردی نہیں ہے اس لیے وہ کبھی ان کے پاس واپس نہیں جائے گا۔ اس نے بتایا کہ وہ شادی کے لیے لڑکی کی اچھی صورت شکل والی بات کو اہمیت نہیں دیتا کیونکہ اصل خوبصورتی تو کردار کی ہوتی ہے، باقی تو سب دکھاوا ہے۔

ادھر میں نے اس پر یہ باور کروا دیا تھا کہ اس کی خاطر میں اپنے عیاش باپ کو چھوڑ کر آ سکتی ہوں۔ میرے نام سے کافی پیسے بینک اکاؤنٹ میں پڑے ہیں۔ شادی سے پہلے ہم چپکے چپکے ڈی ویو کے قریب واقع میرے نام پر جو اپارٹمنٹ ہے اس کو بھی بیچ دیں گے جو تقریباً آٹھ کروڑ روپے میں فروخت ہوگا اور ان پیسوں کو لے کر ہمیشہ کے لیے دبئی شفٹ ہو جائیں گے جہاں ہم اپنی باقی زندگی اطمینان سے گزاریں گے۔

اتنے سارے پیسوں کا سن کر تو احمر کے منہ میں پانی بھر آیا تھا اور اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ اس وقت وہ کسی خونی بھیڑیے کی مانند لگ رہا تھا جس کے سامنے اس کا شکار، اس کی موجودگی سے بے خبر گھوم رہا ہو۔ میں دل ہی دل میں اس کی کیفیت انجوائے کر رہی تھی، بس! یہ آخری بار ہے میری جان۔ اس کے بعد تو بس تم خواب ہی خواب دیکھا کرنا کیونکہ بہت فرصت ہوگی تمہارے پاس!

احمر کے ساتھ آج میری چوتھی اور آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد ہم دونوں اپنے منصوبے پر عملدرآمد کر کے شادی والے دن ہی ملتے۔ میری ساری تیاری مکمل تھی۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ آج اس کو اپنا چہرہ بھی دکھاؤں گی جس کو دیکھنے کے لیے وہ اُتاولا ہو رہا تھا۔ میں اس سے ہر ملاقات پر کرائے کی گاڑی لے جاتی۔ اس سے احمر پر بھی رعب پڑتا تھا کہ میرے پاس کئی رنگوں اور ماڈلز کی گاڑیاں موجود ہیں چنانچہ آج بھی میں نے شاندار سی گاڑی حاصل کی اور اس سے ملنے پہنچ گئی۔ بلیک ہائی نیک اور بلیو جینز میں رے بین کے قیمتی گلاسز لگائے آج وہ معمول سے بڑھ کر اسمارٹ لگ رہا تھا۔ بس یہ خوبصورتی اب چند لمحوں کی مہمان تھی، یہ سوچ کر کسی انجانے جذبے کے تحت میرے ہاتھ پاؤں سنسنانے لگے۔

سب سے پہلے میں نے اسے ڈی ویو کے قریب واقع ایک بلڈنگ میں اپنے شاندار سے فلیٹ کا سروے کروایا جسے میں نے ایک دن کے لیے کرائے پر حاصل کیا تھا۔ فلیٹ دیکھ کر اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ اس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ یہ فلیٹ کم سے کم بھی پانچ کروڑ میں فروخت ہوگا جبکہ میں دل ہی دل میں ہنس رہی تھی۔ اس کے بعد ہم پکنک منانے ہاکس بے روانہ ہو گئے۔ میں راستے بھر اس سے دلربا باتیں بھی کرتی جا رہی تھی تاکہ اس کا دھیان راستے کی طوالت پر نہ جائے۔ جب میری گاڑی ہاکس بے اور پھر پیراڈائز پوائنٹ سے کافی دور نکل گئی اور ویران اور پتھریلا سا علاقہ شروع ہو گیا تو وہ تھوڑا سا چونکا۔ ”جان تم نے تو کہا تھا

کہ تمہارے ابو کا ہٹ ہاکس بے پر ہے مگر اب تو ہم کافی آگے نکل آئے ہیں۔"

میں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے ہنس کر کہا۔ "سوری میں نے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ اصل میں ہم کہیں اور جارہے ہیں۔ سچ بتاؤں احمر تو مجھے تم سے یوں پبلک پوائنٹس پر ملنا کبھی اچھا نہیں لگتا تھا کیونکہ میں اور تم صرف ایک دوسرے کی امانت ہیں۔ یوں گلی کوچوں میں مل کر میں اپنی محبت کو سب کے سامنے تماشا نہیں بنانا چاہتی کیونکہ ہماری محبت بہت خاص ہے اور میں اس معطر جذبے کو اس مطلبی زمانے والوں کی کثافت سے دور، بہت دور رکھنا چاہتی ہوں۔"

میں دیکھ رہی تھی یہ سن کر ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا اور وہ کچھ بے چین سا ہو کر بولا۔ "وہ تو ٹھیک ہے مگر ہم ابھی کہاں جارہے ہیں؟"

میں دل ہی دل میں اس کی پریشانی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی۔ "ارے تم تو ایسے گھبرا رہے ہو جیسے میں تمہیں کہیں اغوا کر کے لے جارہی ہوں۔ آج ہماری شادی سے پہلے آخری ملاقات ہے اسی وجہ سے میں نے تمہارے لیے ایک زبردست سا سرپرائز پلان کیا ہے اور تم ہو کہ اسے برباد کرنے پر تلے ہو۔ ایک کام کرو کہ پیچھے رکھے تھرموس سے مجھے کافی نکال کر دو اور خود بھی پیو تاکہ کچھ ریلیکس ہو جاؤ۔"

میری بات کا اس پر کچھ اثر ہوا اور وہ تھرموس سے کافی نکالنے لگا۔ اس نے مجھے مگ تھمایا اور خود بھی خاموشی سے کافی کی چسکیاں لینے لگا۔ میں انکھیوں سے اسے کافی پیتا دیکھ رہی تھی۔ بس اب تھوڑی ہی دیر میں فیصلے کی گھڑی آنے والی تھی۔ اس نے اپنی کافی ختم کر کے میرا مگ اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اسے ویسے کا ویسے ہی بھرا دیکھ کر چونک گیا۔

"یہ کیا؟ تم نے کافی کیوں نہیں پی؟"

میں نے ایک ادا سے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔ "میں اس وقت تمہیں وہ سرپرائز دینے کے لیے بہت بے چین ہوں۔ کافی میں وہاں پہنچ کر پی لوں گی۔ بس یوں سمجھ لو کہ وہ ایسا سرپرائز ہے کہ جب تک زندہ رہو گے تب تک مجھے یاد کرو گے۔"

میری بات سن کر اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ "ہاں ہاں کیوں نہیں! ویسے بھی میری جان کی ہر بات ہی نرالی ہے۔ اب یہی دیکھو ہم شادی کرنے جارہے ہیں مگر تم نے ہمیں اپنے رخ روشن کا دیدار تک نہیں کرایا۔"

میں نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔ "چلو آج تو تمہاری یہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔ بس ڈر یہ ہے کہ تم مجھے دیکھ کر کہیں آپے سے باہر نہ ہو جاؤ۔" میری بات سن کر وہ قہقہے لگانے لگا، اب کی بار اس کی آواز میں جھلکتا نشہ صاف محسوس ہو رہا تھا۔ کافی میں بھاری تعداد میں موجود خواب آور گولیوں نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا اور پانچ منٹ بعد ہی وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر خراٹے لے رہا تھا اور منزل بھی اب کافی قریب آگئی تھی۔

تقریباً بیس منٹ بعد میں اس اجاڑ اور ویران سی نظر آنے والی عمارت کے سامنے کھڑی تھی جو کسی زمانے میں ریسٹ ہاؤس ہوا کرتا تھا مگر اب یہاں برسوں سے کسی انسان نے پاؤں نہ دھرا تھا۔ میں نے اسے انٹرنیٹ پر ڈھونڈا تھا اور کئی مرتبہ آ کر آس پاس کا اچھی طرح جائزہ بھی لے چکی تھی۔ شہر سے تقریباً چالیس میل دور یہ ویرانہ میرے حساب سے بالکل پرفیکٹ تھا۔ سب سے پہلے تو میں نے ڈگی میں سے نائلون کی باریک لیکن انتہائی مضبوط ڈوریاں برآمد کیں اور ان سے احمر کے ہاتھ پیر باندھ دیے۔ اگلا مرحلہ میری توقعات سے بڑھ کر مشکل ثابت ہوا تھا، احمر کو گاڑی سے گھسیٹ کر ریسٹ ہاؤس کے بالکل اندرونی حصے تک لے جانے میں مجھے دانتوں پسینا آگیا۔ میں اسے وہاں پہنچا کر کتنی ہی دیر تک بیٹھی ہانپتی رہی پھر وہیں بیٹھے بیٹھے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اس کا موبائل فون، والٹ، گھڑی اور سن گلاسز سب میں نے اپنے قبضے میں کر لیے۔ یہاں تک کہ اس کے شوز اور چمڑے کی بیلٹ بھی اتار لی۔ وہ اس وقت میرے سامنے گرد آلود فرش پر مکمل طور پر بندھا ہوا پڑا تھا اور اس کے منہ پر ٹیپ لگی تھی۔

اس وقت دن کے بارہ بجے تھے اور سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ میرے پاس ابھی بہت ٹائم تھا اسی لیے میں اطمینان سے گاڑی میں جا کر بیٹھ گئی۔ سینڈوچ وغیرہ کھا کر میں نے اپنا نقاب اتار کر ایک جانب رکھ دیا اور پھر اطمینان سے پانی پی کر بوتل ہاتھ میں لیے لیے واپس اندر آگئی جہاں دواؤں کے زیر اثر احمر ابھی تک بیہوش پڑا تھا مگر اب مجھ سے صبر نہیں ہو رہا تھا چنانچہ میں نے ہاتھ میں پکڑی پانی کی پوری کی پوری بوتل اس کے چہرے پر خالی کر دی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور جب اس نے ہلنے جلنے کی کوشش کی تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس نے گھبرا کر آس پاس نظر دوڑائی تو مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کا چہرہ

ڈھلے ہوئے لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا اور اس کے منہ سے غوں غاں کی عجیب سی آوازیں برآمد ہو کے رہ گئیں۔ میں سکون سے اس کے بدلتے تاثرات دیکھ رہی تھی، اسے یوں کسمپرسی میں مبتلا دیکھ کر میرے سینے میں ٹھنڈک سی اتر رہی تھی اور یہ تو بس شروعات ہی تھیں۔

میں نے آگے بڑھ کر ایک جھٹکے سے اس کے منہ سے ٹیپ ہٹا دی۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہوئے اور وہ حیرانگی سے بولا۔ ''تم؟ تم نے ایسا کیوں کیا مشعل؟''

اس کے اس معصومانہ سوال پر میں نے جواب دینے کے بجائے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ تھپڑ اتنا زوردار تھا کہ سناٹے میں اس کی آواز گونج کر رہ گئی اور اس کے نچلے ہونٹ سے خون جاری ہو گیا۔

''امید ہے کہ تم یہ سوال اب دوبارہ نہیں پوچھو گے۔ میں تم سے زیادہ سوالات نہیں کروں گی، بس اتنا بتا دو کہ تم نے میرے ساتھ یہ سب کیسے کیا؟ جس دن میں تمہارے ماں باپ سے ملنے گئی تھی تبھی میں سمجھ گئی تھی کہ تم میرا ذہنی فتور نہیں ہو بلکہ زندہ ہو اور وہ بھی اس مکروہ کھیل میں تمہارے ساتھ برابر کے شریک ہیں کیونکہ جس شخص نے تیراکی میں گولڈ میڈل حاصل کیا ہو وہ بھلا دریا میں ڈوب کر کیسے مر سکتا ہے!

اس نے میرے منہ سے یہ انکشاف سنا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگا۔ ''ہاں! وہ کہتے ہیں نا کہ چور کتنا ہی عقلمند کیوں نہ ہو اپنے پیچھے کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور چھوڑ جاتا ہے۔ میں جس روز تمہارے گھر گئی تھی تو وہاں تمہارے ڈرائنگ روم میں رکھی بہت ساری ٹرافیز... اور شیلڈز تمہارے ماہر تیراک ہونے کی گواہی دے رہی تھیں۔ اس وقت تو میں نے اتنا دھیان نہ دیا مگر بعد میں مجھے سمجھ آیا کہ دراصل یہی بات مجھے کھٹک رہی تھی۔ تمہارے والدین نے جھوٹی داستان سنا کر مجھے مطمئن کرنے کی بھرپور کوشش کی مگر ناکام رہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں واقعی تم سے ملنے کو اپنا دماغی فتور تصور کر کے بالآخر صبر کر لیتی مگر ایک تو تمہارا تیراک ہونے کا ثبوت ملنا اور دوسرا میرا امید سے ہو جانا، دو ایسے واضح ثبوت تھے کہ میں انہیں کسی بھی طرح نظرانداز نہیں کر سکتی تھی۔''

وہ حیرت سے منہ کھولے میری باتیں سن رہا تھا جب میں خاموش ہوئی تو وہ بے تابی سے بول پڑا۔
''ٹھیک ہے لیکن اب تم مجھ سے کیا چاہتی ہو اور مجھے اس کھنڈر میں لانے کا تمہارا کیا مقصد ہے؟''

میں نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا۔ ''بکواس بند کرو! آج صرف میں سوال کروں گی اور تم جواب دو گے اور اگر تم نے ایسا کرنے سے انکار کیا تو میں تمہیں اسی ویرانے میں مرنے کے لیے چھوڑ جاؤں گی۔''

میری دھمکی سن کر خوف کے مارے اس کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی اور وہ جلدی سے بولا۔ ''م، میں سب کچھ بتا دوں گا مگر پلیز تم مجھ سے وعدہ کرو کہ سب سننے کے بعد مجھے یہاں سے جانے دو گی۔''

میں نے کوئی جواب دیے بغیر اپنے بیگ سے ٹیپ ریکارڈر نکالا اور ریکارڈنگ کا بٹن دبا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ میرا مطلب سمجھ کر اس نے اٹکتے اٹکتے جو کہانی سنائی اس کا لب لباب یہ تھا کہ اس کام کا آغاز اس نے چھ سال قبل ملتان سے کیا تھا۔ پہلے اس نے ایک یتیم اور بے آسرا لڑکی سے شادی کی اور بعد میں احمر اور اس کے والدین نے مل کر اس بیچاری لڑکی کو اتنا زچ کیا کہ وہ بالآخر خودکشی پر مجبور ہو گئی۔

ان کا پلان یہ تھا کہ اگر وہ خودکشی نہ بھی کرتی تو وہ اس کے کھانے میں خواب آور گولیاں ملا کر اسے مار دیتے اور کسی کو شک نہ ہوتا۔ بہرحال اس کے مرنے کے بعد احمر کو کھل کر اپنا کھیل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ اس کے والدین اور اس کا وہ دوست بھی اس کھیل میں برابر کے شریک تھے۔ یہ لوگ باقاعدہ ایک گروہ کی صورت کام کرتے تھے جن کا ٹارگٹ معاشرے کی ستائی یا احساسِ کمتری کی ماری پیسے والی لڑکیاں ہوتی تھیں۔ وہ ان کو گھیرتے اور اکثر شادی کر کے یا کبھی صرف شادی کا جھانسا دے کر لوٹ لیتے تھے۔ اگر کبھی کوئی لڑکی ان کو ڈھونڈتی ہوئی ان کے گھر پہنچ بھی جاتی تو وہ ان کے والدین کے ہاتھوں بیوقوف بن جاتی۔ مالک مکان وسیم تو نہیں البتہ وسیم کا ایک جاننے والا ضرور ان لوگوں کا ساتھی تھا۔ اسی نے وہ گھر دلوانے میں اور بعد میں تمام ثبوت مٹانے میں احمر کی مدد کی تھی۔ آج تک احمر مجھ سمیت چھ اور لڑکیوں کو بیوقوف بنا کر لوٹ چکا تھا اور آج ساتویں شکار کی تلاش میں میرے ہتھے چڑھ کر یہاں آ پہنچا تھا۔

اپنی کہانی سنا کر وہ امید بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا کہ اب میں اسے کب آزاد کرتی ہوں۔ شدید غصے کی لہر نے مجھے اپنے لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

میں نے ٹیپ ریکارڈر آف کیا اور اٹھ کر احمر کو لاتوں اور مکوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ اس وقت مجھ پر ایک جنون سا سوار ہو گیا تھا۔ میری ہر ضرب پر وہ بلبلا کر رہ جاتا، اس کو

یوں درد سے تڑپتا دیکھ کر میرے اندر لگی آگ کچھ ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ میری پوری کوشش تھی کہ زیادہ سے زیادہ اس کے خوبصورت چہرے کو نشانہ بناؤں۔ جب اسے مار مار کر میرا جنون کچھ کم ہوا تو میں تھک کر ایک جانب بیٹھ گئی۔ اس وقت احمر کی ناک اور ہونٹ سے خون جاری تھا جبکہ چہرے پر جابجا خراشیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ ادھ مرا سا ایک طرف سر ڈالے پڑا تھا، پانچ منٹ بعد میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر سیدھا کیا۔ اس وقت اس کا خوبصورت چہرہ زخمی ہو کر اتنا ڈراؤنا لگ رہا تھا کہ کوئی بھی اسے دیکھ کر آسانی سے ڈر جاتا۔ میں نے اپنا چہرہ اس کے کان کے قریب کیا اور پھنکاری۔ ''اس ریکارڈر میں بولو کہ تم اپنے کیے پر شرمندہ ہو اور ان بے قصور لڑکیوں کے ساتھ تم نے جو کچھ کیا اس پر تمہارا ضمیر بچھو کے انگارہا ہے اس لیے زندگی پر پچھتاوے کی آگ میں جلنے کے بجائے تم اپنی مرضی سے اپنی زندگی کو ختم کرنے کا فیصلہ کر رہے ہو۔''

میری بات مکمل ہوتے ہی بڑی مشکل سے وہ بولا۔ ''پ، پانی، پانی دے دو۔ میرا حلق سوکھ رہا ہے۔'' میں نے بیگ سے پانی کی بھری ہوئی بوتل نکالی اور اس کے سامنے رکھ دی۔ ''پانی تمہیں اسی شرط پر ملے گا جب تم میری بات پر عمل کرو گے ورنہ میں تمہیں اسی حالت میں یہاں بندھا ہوا چھوڑ جاؤں گی۔'' احمر بیچارگی سے پانی کی بوتل کو دیکھتا رہا پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ میری بات پر عمل کرنے کو تیار نہیں چنانچہ میں نے پانی کی بوتل اٹھا کر واپس بیگ میں رکھ لی اور آرام سے چلتی ہوئی باہر آ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

اب دوپہر کے دو بج رہے تھے یعنی میرے پاس زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے مزید رہ گئے تھے پھر اندھیرا چھانے لگتا۔ اس سے پہلے ہی مجھے اپنا کام مکمل کر کے یہاں سے نکلنا تھا۔ بہر حال میں چالیس، پینتالیس منٹ تک وہیں گاڑی میں بیٹھی گانے سن کر وقت گزارتی رہی پھر واپس اندر چل پڑی۔ اس وقت تک پُرہول سناٹے اور اکیلے پن نے احمر کا حوصلہ توڑ دیا تھا۔ یہی میں چاہتی تھی اسی لیے اس پر ظاہر کیا تھا کہ میں یہاں سے چلی گئی ہوں۔ چیخ چیخ کر اس کا گلا بیٹھ چکا تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ مجھے واپس آتا دیکھ کر جہاں اس کے چہرے پر اطمینان کا احساس جاگا وہیں اس کے منہ سے مغلظات کا دریا بہنے لگا۔ وہ مجھے گندی گندی گالیاں دے رہا تھا اور یہ عزم ظاہر کر رہا تھا کہ اس کے ہاتھ پیر کھلنے کے بعد وہ مجھے عبرت کا نشان بنا دے گا جبکہ میں اس کی بے بسی سے خوب لطف اندوز ہو رہی تھی۔

آج صحیح معنوں میں اونٹ پہاڑ کے نیچے آیا تھا۔ میں نے ٹیپ ریکارڈر نکالا تو اس کی گالیوں میں شدت آ گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ایک زوردار لات رسید کر دی جس کے نتیجے میں اس کے منہ سے اوغ کی آواز نکلی۔ اس نے خون تھوکا تو ساتھ اس کا ایک دانت بھی باہر آ گرا۔ درد اور بے بسی کے مارے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے لیکن میرے دل میں اس کے لیے رحم کا کوئی جذبہ نہ جاگا۔ جو کچھ اس نے میرے ساتھ، اپنی مظلوم بیوی اور دوسری لڑکیوں کے ساتھ کیا تھا وہ قطعی قابلِ معافی نہ تھا۔ اس نے دوبارہ پانی مانگا مگر میں نے وہی شرط عائد کر دی۔ چاروناچار اس کو میری خواہش پر عمل کرنا ہی پڑا کیونکہ میں دوبارہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

احمر اس وقت مکمل طور پر میرے رحم و کرم پر تھا اور وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر اس نے میری بات پر عمل نہ کیا تو میں اسے یہیں مرنے کے لیے چھوڑ جاؤں گی، ابھی کم از کم اسے ایک آس تو تھی کہ میں اسے وعدے کے مطابق ... آزاد کر دوں گی۔ جب اس نے پیغام ریکارڈ کروا دیا تو میں نے چپ چاپ بیگ سے ٹیپ نکالا اور اس سے پیشتر کہ وہ کچھ کہتا یا سمجھتا میں نے ٹیپ اس کے منہ پر مضبوطی سے چپکا دی۔ میرے ارادے جان کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں اور جب تک میں سامان سمیٹتی رہی وہ جل بن مچھلی کی طرح تڑپتا رہا، میں اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ جتنا رسیوں سے خود کو آزاد کروانے کی کوشش کرے گا یہ باریک ڈوریاں اتنی ہی اس کے جسم میں اترتی جائیں گی۔ یہ دراصل مچھلی پکڑنے کی ڈوری سے ملتی جلتی ڈوری تھی جسے کھولنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ اس کا جسم کئی کئی فٹ بلند ہو کر واپس گر رہا تھا منہ پر تو ٹیپ چپکا تھا اس لیے آواز تو نہیں سن پا رہی تھی مگر اس کی آنکھیں مجھ سے رحم کی بھیک مانگ رہی تھیں۔ میں کسی پتھر کی مورت کی طرح گونگی، بہری اور جذبات سے عاری بنی رہی اور پھر اپنی موجودگی کے تمام ثبوت مٹا کر جانے سے پہلے میں نے پلٹ کر احمر کی جانب دیکھا جو اپنی اشکبار آنکھوں سے میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں پگھل جاتی مگر اس کی ذات کی وجہ سے پے در پے اتنے صدمات جھیلنے کے بعد مجھ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ جب میں وہاں سے اکیلی روانہ ہو رہی تھی تو شام ہونے میں کچھ ہی دیر

باقی رہ گئی تھی پھر سیاہ اندھیرا اجالے کو اپنے اندر سمو لیتا۔

شہر واپس پہنچ کر میں نے اس کیسٹ کو گمنام نام اور پتے سے اسی پولیس انسپکٹر کو روانہ کر دی جو اس کیس کی تحقیقات کر رہا تھا پھر واپس ہوسٹل آ گئی۔ میں خود کو بالکل ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے میں ابھی ابھی کسی بھیانک خواب سے جاگی ہوں۔ بہت عرصے بعد میں نے ڈائننگ ہال میں سب کے ساتھ کھانا کھایا اور ایک دو خواتین سے علیک سلیک بھی کی۔ پروین آنٹی اور باقی خواتین میری شخصیت کا نیا پہلو دیکھ کر حیران تھیں۔ میں رات کو بھی سلیپنگ پلز لیے بغیر سو گئی اور صبح کو ہشاش بشاش اٹھی۔ کیونکہ آج کل اسکول کی چھٹیاں چل رہی تھیں اسی لیے میں نے اطمینان سے اپنے کام نمٹائے اور پھر دیر تک پروین آنٹی سے باتیں کرتی رہی۔ وہ بچاری بھی میری خوشی میں خوش مجھے ہمیشہ اسی طرح ہنستے مسکراتے رہنے کی دعائیں دیتی رہیں۔

اگلے دن شام کو حسب توقع میرے پاس پولیس اسٹیشن سے فون آیا۔ پولیس انسپکٹر نے انتہائی سنجیدہ لہجے میں مجھ سے بات کی اور مجھے فوری طور پر تھانے بلوایا۔ پولیس نے ملتان میں احمر کے والدین اور اس کے دوست کو گرفتار کر لیا تھا جبکہ کراچی میں وسیم کے اس جاننے والے کو بھی فوری کارروائی کر کے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ پولیس انسپکٹر نے اپنے تئیں مجھے یہ معلومات دی تھیں کہ احمر نے مرنے سے پہلے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی غرض سے یہ ساری باتیں ریکارڈ کر کے اسے بھجوا دی تھیں۔ میں دل ہی دل میں مسکراتی رہی کہ پولیس جس طرح چھاتی پھیلا کر اس کیس کا سارا کریڈٹ لے رہی ہے در حقیقت اس کے لیے مجھے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔

کچھ عرصہ بعد میں نے ایک این جی او جوائن کر لی جس کا مقصد دیہی علاقوں میں تعلیم کی اہمیت کا شعور بیدار کرنا تھا۔ اب میں پچھلے کئی سالوں سے اسی این جی او کے لیے کام کر رہی ہوں، کاموں میں میرے پاس سر کھجانے تک کی فرصت نہیں ہے۔ پروین آنٹی کے بے تحاشا اصرار پر میں ان کے گھر ہی شفٹ ہو گئی ہوں اور انہوں نے واقعی مجھے ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی ہے۔ البتہ امی اور ابو کو یاد کرتی ہوں تو آج بھی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ احمر کے والدین کو بارہ سال جبکہ باقی دونوں افراد کو آٹھ آٹھ سال قید بامشقت کی سزا ہوئی ہے جبکہ احمر خود ایک نفسیاتی امراض کے اسپتال میں داخل ہے۔ ڈاکٹروں نے اس کے ٹھیک ہونے کی بہت کم اُمید ظاہر کی ہے۔ جی ہاں! میں اتنی شقی القلب نہیں ہوں کہ اپنی پہلی محبت کو اس ویرانے میں کسمپرسی کی حالت میں مرنے کے لیے چھوڑ دیتی۔ اسے اعصاب کو کمزور کرنے والی دو ٹیبلٹ کھلا آئی تھی۔ باقی کام ویرانے اور ماحول نے پورا کر دیا اسے دو دن تک وہاں رہنے دیا پھر تیسرے دن میں نے پی سی او سے فون کر کے پولیس کو وہ جگہ بتا دی تھی جہاں میں نے احمر کو قید کیا تھا۔ پولیس نے جب اندھیری عمارت سے اسے ادھ مرا سا برآمد کیا تو وہ مکمل طور پر پاگل ہو چکا تھا۔ میرا مقصد اسے جان سے مارنا ہرگز نہیں تھا بلکہ میرے لیے یہی کافی تھا کہ اس پر بیتنے والی ان دو بھیانک راتوں نے اسے ذہنی طور پر مکمل ختم کر دیا تھا۔ وہ جب تک زندہ رہے گا، دن بھر 'مجھے معاف کر دو' چلاتا ہوا اپنے کپڑے پھاڑتا رہے گا جبکہ رات ہوتے ہی اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے شروع ہو جائیں گے اور وہ جنونیوں کی طرح دیواروں سے سر ٹکرائے گا اور اپنا جسم نوچے گا۔ پولیس نے بہت کوشش کی کہ اس کے منہ سے وہ نام اگلوا لیں جس نے اسے وہاں قید کیا تھا۔ مگر وہ پاگلوں کی طرح ٹکر ٹکر سب کی شکلیں دیکھ دیکھ کر ہنستا رہتا تھا یا اپنے منہ سے بہتی رال صاف کرتا رہتا تھا۔ آخر تنگ آ کر پولیس نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

میں اکثر احمر سے ملنے اسپتال جاتی رہتی ہوں۔ اب تو وہ مجھ سے بہت ہل گیا ہے، مجھے دیکھتے ہی خوشی سے تالیاں پیٹنے لگتا ہے اور لپک کر میرے پاس آ جاتا ہے پھر ٹوٹی پھوٹی زبان اور اشاروں کی مدد سے پتا نہیں کیا کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتا رہتا ہے۔ وہ کہتے ہیں نا کہ عورت اپنی پہلی محبت کبھی نہیں بھولتی تو شاید اسی لیے میں بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس دشمن جاں سے ملنے پہنچ جاتی ہوں کہ ہو سکتا ہے کہ اس کی خدمت کر کے ہی میرے بے چین دل کو قرار ملے۔

یہ محبت بھی بڑی ظالم چیز ہوتی ہے، اتنا سفر طے کر کے اور اس مقام پر پہنچ کر میں آج بھی دل کے ہاتھوں اتنی ہی بے بس ہوں جتنی اس سے پہلی بار ملاقات کے بعد خود کو محسوس کیا تھا۔ میں نے کچھ سوچے سمجھے بغیر ہی اپنی اوقات سے بڑھ کر کچھ پانے کی کوشش کی اور اب مجھے زندگی بھر اسی آگ میں جلنا ہے کیونکہ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ ”خواب کو حقیقت مان لیا جائے تو تعبیر کی حقیقت ایک اور خواب بن کے رہ جاتی ہے۔“